خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

جون 2016

June 2016

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ـــــ محمود ریاض
مدیرہ ـــــ شادرہ خاتون
مدیر ـــــ آذر ریاض
نائب مدیرہ ـــــ رضیہ جمیل
مدیرہ خصوصی ـــــ امت الصبور
بلقیس بھٹی
نفسیات ـــــ عدنان
اشتہارات ـــــ خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) -----	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ -----	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---	7000 روپے



محترم قارئین

اگر آپ کو ہماری یہ کتاب اچھی لگے تو ہماری حوصلہ افزائی کے لیے

Google پر جا کر Urdu Books سرچ کر کے ہماری ویب سائٹ

www.urdusoftbooks.com کو ایک مرتبہ وِزٹ کر لیں

اگر آپ کو ہماری ویب سائٹ Google کے پہلے پیج پر نظر نہ آئے تو

دوسرے یا تیسرے پیج پر چیک کر لیں،

وہاں آپ کو مزید اچھی کُتب ڈاؤن لوڈ کرنے کو ملیں گی۔ شُکریہ

Google urdu books  

All Images Books Videos Apps More Search tools

Page 2 of about 30,100,000 results (0.32 seconds)

Download Urdu Books PDF
www.**urdu**soft**books**.com/
Download or read online **Urdu Books**, PDF Books, Urdu Novels, Islamic Books, Computer eBooks, English to Urdu Dictionary, Free Urdu Digest and Magazine.

Urdu Books, Latest Digests, magazines
www.**books**tube.net/
download pdf **Urdu** digests magazines suspense pakiza aanchal ruhani sarguzashat rida dosheeza cooking health naye ufaq jawab e arz kids sports khawatin.

Free E On line PDF Urdu Sindhi Balochi and Islamic Books
iqbalkalmati.blogspot.com/
Is the largest collection of free **Urdu** Sindhi English and Islamic Pdf **Books Urdu** Novels Read Online and Download.

Best Urdu Books | PDF Format Free Download
urduvirsa.blogspot.com/
Urdu Novels, Islamic **Books**, English **Books**, Umera Ahmad, Faraz Saghar, Allama Iqbal,Free **Books** Download In Pdf Format...

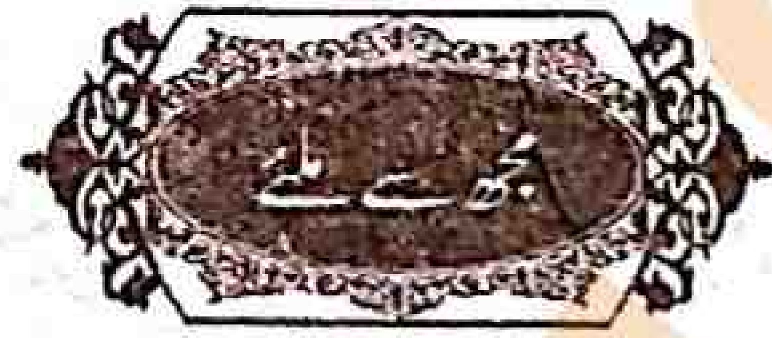
کہتی سنتی — مدیر — 14
کرن کرن روشنی — ادارہ — 15
ہمارے نام — نادرہ خاتون — 272



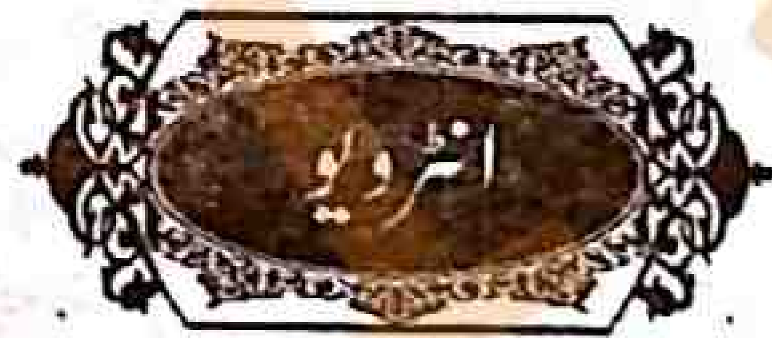
ہم نے انگریزی فلم دیکھی — انشا جی — 20



میری اماں — نعیمہ ناز — 259
میری ڈائری سے — امت الصبور — 270



اسد محمود سے باتیں — شاہین رشید — 30



آمنہ الیاس — شاہین رشید — 26
اعجاز کا رنگ — امت الصبور — 22
خامشی کو زباں ملے — ادارہ — 280



آب حیات — عمیرہ احمد — 108
دشتِ جنوں — آمنہ ریاض — 36



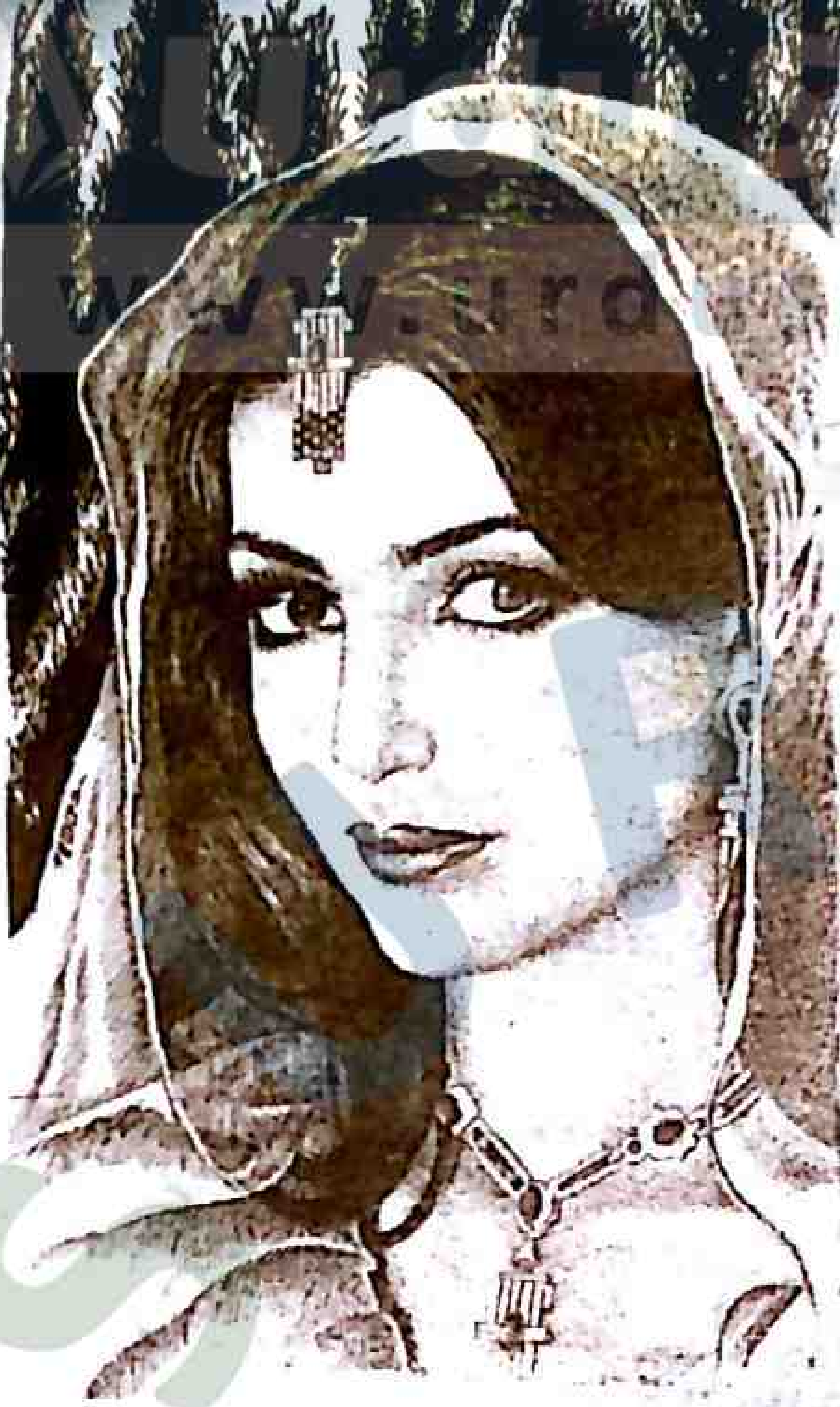
نمل — نمرہ احمد — 200
انصاف — غزالہ روشن — 68



لیس آئینہ — سائرہ رضا — 130
میڈا ابھی کوئی ہووے — ثمینہ عظمت — 154
بارشیں مقدر کی — حیا بخاری — 186



دلوں کا درجہ — ایمل رضا — 174
اعتراف — بنت سحر — 52
رنجش ہی سہی — رمشہ ناز — 63
وقت سے پہلے — ثنائلہ دلعیاد — 105
رشتے ناتے — سویرا فلک — 56





غزل، سعد عثمانی 265

نظم، کامی شاہ 264

غزل، علی ازمان 264

غزل، نائلہ جاوید 265



رنگا رنگ سلسلہ، شگفتہ جاہ 266

خبریں وبریں، واصفہ سہیل 282



آپ کی بیاض سے، خالدہ جیلانی 269



نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان 288



افطار و سحر کے پکوان، خالدہ جیلانی 286

آپ کا باورچی خانہ، صغریٰ کنول۔شوادرکوٹری 284



بیوٹی بکس کے مشورے، امت الصبور 290

جون 2016

جلد 44 شمارہ 2

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com



خواتین ڈائجسٹ کا جون کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

رب کریم کا شکر ہے کہ ایک بار پھر ہمیں رمضان المبارک کے فیوض و برکات سے مستفید ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ یہ مہینہ رحمت و بخشش اور جہنم سے آزادی کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں جہاں عبادتوں کا ذوق بڑھتا ہے وہیں رحمتِ خداوندی بھی عروج پر ہوتی ہے۔

یہ وہ مہینہ ہے جس میں ایک رات کی عبادت ہزار راتوں کی عبادت سے افضل ہے۔ اہلِ دل، پروردگار کی مہربانیوں اور رحمتوں کے انوار سے ہی فیض یاب نہیں ہوتے بلکہ وہ خود بھی ثمربار شاخوں کی طرح انسانوں کے لیے فیض رساں ثابت ہوتے ہیں۔ صدقہ، خیرات، نرمی، مہربانی اور درگزر کرکے اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت و بخشش کے طلب گار ہوتے ہیں۔

اس ماہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ساتھ اس کے بندوں کا بھی خیال رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حقوق العباد کی بھی بڑی اہمیت ہے۔

رمضان المبارک کا مہینہ اسلام کے ضابطہ حیات کی عملی تربیت کا اہتمام ہے۔ اسے ہم اپنی زندگی پر لاگو کریں تو دنیا اور آخرت میں فلاح پا سکتے ہیں۔

رب کائنات سے التجا ہے کہ وہ ہماری عبادتوں کو قبول فرما کر ہمیں اپنے ہدایت یافتہ بندوں میں شامل فرما لے۔ ہماری خطاؤں سے درگزر کرے۔ آمین۔

عید نمبر،

جولائی کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔ عید نمبر میں مہندی کے ڈیزائن، عید کے اشعار، عید کے پکوان اور خصوصی عید سروے بھی شامل ہوگا۔

مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ عید نمبر میں شامل ہو سکیں۔

عید سروے،

وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی لازمی عمل ہے۔ ہمارے معاشرے میں جہاں اور بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں وہیں رسوم و رواج بھی بدلے ہیں۔ تہوار منانے کا انداز بھی بدلا ہے۔ اس بار عید سروے میں ہم نے اسی حوالے سے سوال کیا ہے۔ سوال یہ ہے۔

۱۔ اپنے بچپن کی عید اور آج کے بچوں کی عید میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟ تفصیل سے لکھیں۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول ۔ نمل، ، حزالہ روش کا مکمل ناول ۔ انصاف،
- سائرہ رضا، حیا بخاری اور ثمینہ عظمت علی کے ناولٹ، ، عمیرہ احمد اور آمنہ ریاض کے ناول،
- ایمل رضا، بنت سحر، سویرا فلک، رشنہ ناز اور شمائلہ دلعباد کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ اور ماڈل آمنہ الیاس سے ملاقات، ، ٹی وی فنکار اسد محمود سے باتیں،
- حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ ۔ مصنفین سے سروے،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی رائے ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ آپ کی رائے جاننے کا ذریعہ آپ کے خطوط بھی ہیں۔ ہمیں اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔ منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

صلوٰۃ تسبیح

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے عباس رضی اللہ عنہ! کیا میں تمہیں ایسی عبادت کے بارے میں بتاؤں کہ جس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہارے اگلے اور پچھلے' نئے اور پرانے قصداً" اور سہواً" چھوٹے اور بڑے' چھپے اور ظاہر تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ تم روزانہ چار رکعت نماز تسبیح پڑھا کرو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو جمعہ میں ایک بار (سات دنوں میں ایک بار) یہ بھی نہ کرسکتے ہو تو مہینے میں ایک دفعہ پڑھ لیا کرو۔ اگر یہ بھی نہ کرسکو تو سال میں ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو اور اگر ایسا بھی نہ کرسکو تو پھر ساری عمر میں کم از کم ایک دفعہ یہ نماز پڑھ لو تو اللہ تعالیٰ تمہارے تمام گناہ معاف کردے گا۔"

آج کل کی بے پناہ مصروفیات میں نماز تسبیح کا روزانہ پڑھنا یقیناً" مشکل کام ہے حتیٰ کہ مہینے میں بھی ایک دفعہ اس کا اہتمام کرنے کا موقع شاید چند ہی خوش نصیب لوگوں کو ملتا ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تسبیح کی اتنی فضیلت بیان فرمائی ہے کہ اگر اسے سال میں ایک دفعہ بھی ادا کیا جائے تو اس کے بے پناہ اجر و ثواب سے مستفید ہوا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اس بابرکت نماز کی ادائیگی کے لیے رمضان المبارک سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہوسکتا۔ ذرا سی توجہ اور کوشش سے رمضان المبارک میں نماز جمعتہ المبارک سے قبل یا اس کے بعد چار رکعت نماز تسبیح باآسانی ادا کی جاسکتی ہے۔ اس طرح ماہ رمضان المبارک میں کم از کم چار دفعہ اس بابرکت اور بے پناہ اجر و ثواب کی حامل نماز کا اہتمام ممکن ہے۔

آپ چار رکعت نفل اس طرح ادا کریں کہ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد اور کوئی دوسری سورت پڑھیں۔ اس کے بعد قیام کی ہی حالت میں کلمہ تمجید پندرہ (15) بار پڑھیں۔

"سبحان اللہ والحمدللہ ولا الہٰ الا اللہ واللہ اکبر۔"

پھر رکوع میں جائیں۔ رکوع کی تسبیحات

پڑھیں پھر ان ہی کلمات کو دس بار دہرائیں۔
پھر رکوع سے اٹھ جائیں اور سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد دس بار یہی کلمات پڑھیں۔
پھر سجدے میں جائیں (سجدے کی تسبیحات اور دعائیں) پڑھنے کے بعد یہی کلمات دس بار پڑھیں۔ پھر سجدہ سے سر اٹھا کر جلسہ میں اور (جلسے کی دعائیں پڑھنے کے بعد) یہی کلمات دس بار پڑھیں۔
پھر دوسرے سجدے میں چلے جائیں اور دس بار یہی کلمات دہرائیں (پہلے سجدے کی طرح) پھر سجدہ سے سر اٹھائیں اور جلسہ استراحت میں کچھ اور پڑھے بغیر دس بار اس تسبیح کو دہرائیں۔
یوں ایک رکعت میں 75 تسبیحات ہو جائیں گی۔ اسی طرح چار رکعت پڑھی جائیں گی۔
تشہد میں تسبیحات التحیات سے پہلے پڑھیں۔

اعتکاف

اعتکاف کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ انسان چند دنوں کے لیے دنیا کی مشغولیات اور مصروفیات سے قطع تعلق کر کے مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرتے ہوئے اس کا رنگ اپنے اوپر چڑھا لے۔
رمضان المبارک کے آخری دس دنوں میں مسجد میں معتکف ہونا مسنون عمل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری زندگی باقاعدگی سے اعتکاف میں بیٹھنے کا اہتمام فرماتے رہے۔
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔
"جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کمر کس لیتے، راتوں کو جاگتے، اپنے گھر والوں کو جگاتے اور اتنی محنت کرتے جتنی کسی اور عشرے میں نہ کرتے۔" (بخاری و مسلم)
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ.....
"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرے کا اعتکاف فرماتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات بھی اعتکاف کرتی رہیں۔" (بخاری و مسلم)
اعتکاف تزکیۂ نفس اور تقویٰ اختیار کرنے کا بہترین نسخہ ہے۔ سال کے 365 دن انسان دنیا کے مسائل اور دیگر مصروفیات میں ڈوبا رہتا ہے۔ اگر ان 365 دنوں میں صرف دس دن اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور اپنے سال بھر کے گناہوں اور خطاؤں کی بخشش کے لیے وقف کر دیے جائیں تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں۔ اعتکاف کے دس دنوں کے لیے الگ سے ایک خصوصی ٹائم ٹیبل ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ جس میں چند گھنٹے آرام کے سوا زیادہ تر وقت تلاوت، مطالعۂ قرآن پاک، مطالعۂ حدیث، مطالعۂ کتب، حفظ اور ذکر و اذکار اور دیگر عبادت الٰہی میں گزارا جا سکتا ہے۔

شب قدر

رمضان المبارک وہ مہینہ ہے جس میں ایک رات ایسی ہے جسے ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔
قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔
"ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔" (القدر ۹۷:۱-۳)
یہ مبارک رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ اس رات کی فضیلت کو پانے کے لیے رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں بھرپور عبادت پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔
حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔
ایک سال رمضان المبارک آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم لوگوں پر ایک مہینہ آیا ہے جس میں ایک

رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا' وہ سارے کے سارے خیر سے محروم رہ گیا۔ اس رات کو خیر و برکت سے محروم وہی رہتا ہے جو واقعی محروم ہے۔" (ابن ماجہ)

چونکہ آخری عشرہ شروع ہونے تک روزہ داروں کی کافی تربیت ہو چکی ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کو سونے سے کندن بنانے کے لیے رمضان المبارک کے آخری عشرے اور بالخصوص طاق راتوں میں لیلتہ القدر تلاش کرنے کا حکم دیا ہے۔

اس حکم کا مقصد روزہ داروں کو زیادہ سے زیادہ عبادت الٰہی اور ذکر الٰہی کی ترغیب دینا ہے۔ چونکہ رمضان المبارک اپنی بھرپور رفعتوں کے ساتھ اختتام کی جانب بڑھ رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے قیام اللیل اور اعتکاف کے ذریعے تربیت دینا چاہتا ہے۔

انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے آسان سے مشکل کا اصول ایک کارگر نسخہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں پر یک لخت کوئی بوجھ ڈالنے کے بجائے ان کی تعلیم و تربیت ماہ رمضان المبارک میں اسی اصول یعنی آسان سے مشکل کے تحت کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے دو عشروں کی نسبت آخری عشرے میں زیادہ ریاضت اور عبادت کی تاکید فرمائی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ۔ "میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ شب قدر کون سی ہے تو میں اس میں کیا پڑھوں؟" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللھم انک عفو تحب العفوا فاعف عنی۔"

ترجمہ :۔ "اے اللہ! بے شک تو بہت معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے کو پسند کرتا ہے پس تو مجھے معاف فرمادے۔"

انسان سال کی 365 راتیں سو کر گزارتا ہے۔ اگر ان 365 راتوں میں ایک رات اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی خاطر عبادت میں جاگ کر گزاری جائے تو اس کے اجر و ثواب کا وعدہ ہزار راتوں کے برابر کیا گیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اس سے بھی بڑھ کر اجر و ثواب دیتا ہے۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

نماز' روزہ اور حج کا تعلق زیادہ تر بدن سے ہے۔ لیکن زکوٰۃ اور صدقات کا براہ راست تعلق مال و دولت سے ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے۔

"اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجیے جو کہ اس روز واقع ہوگی کہ ان کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں کو اور ان کی کروٹوں اور پشتوں کو داغ دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا یہ ہے وہ مال جس کو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔" التوبہ ۹: ۳۴-۳۵

اسی طرح ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"تم ہرگز نیکی حاصل نہ کر سکو گے جب تک وہ مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو جو تمہیں بہت عزیز ہے۔" (آل عمران ۳: ۹۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم سارے انسانوں میں سب سے زیادہ فیاض اور سخی تھے لیکن جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت اور فیاضی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فیاضی میں بارش لانے والی ہوا کی مانند ہو جایا کرتے تھے۔" (بخاری)

راہ خدا میں صدقہ و خیرات سے جہاں مال کی پاکیزگی کا فریضہ ادا ہوتا ہے وہاں اس سے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور نعمتیں بارش کی مانند خرچ کرنے والوں پر برستی ہیں بلکہ اس سے معاشرے میں موجود طبقاتی تقسیم اور عدم مساوات کی خلیج کو بھی پاٹنے کا موقع ملتا ہے۔ غریبوں اور ناداروں کی مشکلات میں کمی لانے اور ان کی مالی اعانت کے لیے اللہ تعالیٰ نے معاشرے کے

صاحب ثروت اور مال دار افراد پر ان کے مال و دولت کی پاکیزگی کی خاطر سال میں ایک دفعہ زکوۃ کی ادائیگی کو فرض قرار دیا ہے۔
زکوۃ کے لغوی معنی پاکیزگی کے ہیں۔ جبکہ شریعت کی رو سے زکوۃ مال کے اس حصے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں بتائے ہوئے طریقے یعنی نصاب کے مطابق معاشرے کے صاحب ثروت افراد معاشرے کے غریب، نادار، مساکین اور ضرورت مند افراد میں تقسیم کرتے ہیں۔
زکوۃ کی ادائیگی کے لیے ماہ رمضان المبارک بہترین مہینہ ہے۔ ایک تو اس ماہ مبارک میں کسی بھی فرض اور نفل عبادت کا اجر اللہ تعالیٰ کئی گنا بڑھا کر دیتا ہے اور دوم چونکہ معاشرے کے صاحب ثروت اور مال دار افراد تو اپنی مال داری اور ثروت کی وجہ سے افطاری میں انواع و اقسام کی نعمتوں سے مستفید ہوتے ہیں لیکن معاشرے کے غریب اور مفلوک الحال افراد جو روزے کی شدت کے باوجود اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے دن بھر محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان کو کھانے پینے اور پہننے کی وہ سہولیات نصیب نہیں ہوتیں جو کسی بھی انسان کا بنیادی حق ہیں۔ اس لیے اگر اس ماہ مبارک میں مال دار اور صاحب ثروت افراد معاشرے کے محروم افراد کے دکھوں کا احساس کرتے ہوئے اپنی زکوۃ اور صدقات پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کریں تو اس سے معاشرے میں غریب اور بے سہارا افراد کے دکھوں اور غربت کو بانٹنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔
رمضان المبارک میں خرچ کرنے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔
"جو شخص اس مہینے میں کسی روزہ دار کو افطار کرائے تو اس کے لیے گناہوں سے مغفرت اور دوزخ کی آگ سے رہائی ہے۔ اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا روزہ دار کو اور اس سے روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔"
صحابہ رضی اللہ عنہما نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے سب کے پاس اتنا سامان تو نہیں ہوتا کہ روزہ دار کو افطار کرائیں۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس کو بھی عطا کرتا ہے جو ایک گھونٹ دودھ، ایک کھجور یا پانی کے ایک گھونٹ سے کسی روزدار کو افطار کرائے گا۔" (بیہقی)
اس حدیث شریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی صاحب حیثیت نہیں ہے اور اس کے پاس کسی کو دینے کے لیے یا کسی کو افطار کرانے کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے تو ایک گھونٹ پانی یا ایک گھونٹ دودھ یا ایک کھجور سے بھی کسی مسلمان بھائی کو افطاری کرا کے گناہوں کی مغفرت اور جہنم کی آگ سے بچنے کا اہتمام کر سکتا ہے۔
اسلام صدقات و خیرات کی بھی بھرپور حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک میں ایک ایک دانہ اور ایک ایک پیسہ صدقہ و خیرات کرنے پر کم از کم سات سو گنا اجر کا وعدہ فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جس کو وہ چاہیں گے اس سے بھی زیادہ عطا کریں گے۔ زکوۃ کی ادائیگی کے علاوہ اس ماہ مبارک میں کوشش کرنی چاہیے کہ روزانہ کچھ نہ کچھ مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا جاتا رہے۔ جس سے مال و دولت میں برکت پیدا ہوگی۔ اس عمل سے جہاں صدقہ و خیرات کرنے والوں میں شکر گزاری اور ایثار و قربانی کا جذبہ فروغ پائے گا وہاں اس عمل سے غریب اور بے کس انسانوں کی امداد کی راہ بھی ہموار ہوگی۔
تقویٰ کے حصول کے لیے جہاں بدنی عبادت کی بہت زیادہ تاکید بیان کی گئی ہے وہاں مالی عبادت یعنی صدقہ و خیرات اور زکوۃ کی بروقت مستحقین کو ادائیگی بھی لازمی شرط ہے۔ اسلام حب مال اور دولت کو سینت سینت کر جمع کرنے کی ویسے بھی مخالفت کرتا ہے اس لیے اس مبارک مہینے کے توسط سے زیادہ سے زیادہ مال و دولت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا خصوصی اہتمام کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا باعث بن سکتا ہے۔ زکوۃ تقسیم کرتے وقت اس بات

"جی۔"
"طوائف کا کوٹھا اس میں ہے؟"
"جی۔"
"جیل کی سلاخیں بھی؟"
"جی۔جی۔"
"سب ایک دوسرے کے لیے ایثار کرتے ہیں؟ بلکہ ایثار کرنے کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں؟"
"جی۔"
"من کی آنکھیں پٹ پٹ کھلتی ہیں؟"
"جی ہاں۔جی ہاں۔"
"اسے بنے ہوئے پچاس سال سے زیادہ ہو گئے۔"
"آپ پروڈکشن کے معیار کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں۔"
"اس میں۔"لال موری پت" گایا گیا ہے؟"
"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"
"اس میں فردوس ہے۔ اعجاز ہے۔ غالباً" نغمہ بھی۔"
"جی ہاں۔ لیکن آپ کے سوالوں کا کوٹہ ختم ہو گیا۔ اب فلم کا نام بتایئے؟"
"روہنکھے ہو کر بولے۔" جناب آپ ہی بتا دیجیے۔ ہم ہار گئے۔"
ہم نے کہا۔"آپ نے تو ساری نشانیاں بتا دیں۔"
تب انہوں نے بتایا کہ ہیرو کی مار کٹائی۔ طالب و مطلوب کا بچھڑنا' ملنا۔ مری اور سوات کے سین' بے گناہ قیدی۔ طوائف کا کوٹھا۔ الٹی چھلانگ لگانے والا مسخرہ اور بڑھکیں مارنے والا ولن سب فلموں میں مشترک ہوتے ہیں۔ لال موری پت کا بھی ہر فلم میں ہونا ضروری ہے سچ کہ کاسٹ بھی قریب قریب ساری پنجابی فلموں کی ایک ہی ہوتی ہے لہٰذا بتائیں تو کیا بتائیں۔

یہ بیان ان صاحب کا تھا۔ ہم پر اس کی ذمے داری نہیں کیونکہ ہم تو عید بقر عید پر فلمیں دیکھنے والے ہیں۔ ہم تو اپنے مختصر تجربے کی روشنی میں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ فلمیں خصوصاً" "پنجابی فلمیں" تنہا دیکھنے کی نہیں۔ جاتے ہوئے غالب کی طرح اپنے ساتھ نوحہ گر' لے کے جانا چاہیے۔ جو رلانے والا سین ہو تو آپ کی آنکھیں تولیے سے پونچھے۔ کولہے مٹکانے کا سین ہو تو آپ کی آنکھیں' ہاتھ رکھ کر بند کر دے۔ ہنسانے والا سین ہو تو آپ کی بغل میں گدگدی کرے۔ آپ نڈھال ہونے لگیں تو آپ کو اسرو کھلائے۔ لخلخہ سنگھائے۔ آپ کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر

ساری فلم کے دوران میں آپ کے کانوں میں انگلیاں دیے رکھے۔ ہم اپنے ساتھ کسی فالتو آدمی کو نہ لے گئے تھے۔ لہٰذا اپنی ہی انگلیاں کانوں میں دیے رہے۔ پنجابی فلموں کا ہر کردار آغا حشر کا تربیت یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ اتنا اونچا بولتا ہے کہ سینماؤں کو ابھی فائر لگانے کی حاجت نہیں۔ ہاں کوئی آلہ آواز دھیمی کرنے والا ہو تو اس کا لگانا مستحسن ہو گا۔

اس فلم میں چھ گانے' آٹھ مزاحیہ سین' دس دردناک مناظر' تین قاتلانہ حملے' بارہ لپاڈکیاں اور پندرہ سسپنس تھے۔ یہ مسالا جس سے دوسرے ملکوں میں پچاس فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں ایک ہی فلم میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے فلم ساز محنت نہیں کرتے۔ پچھلے دنوں ٹیلی ویژن پر فلمسازوں اور فلم بینوں کا ایک مباحثہ ہوا تھا۔ وہاں ایک فلم بین نے اس بات کی تعریف کرنے کے بجائے اس پر اعتراض کیا۔ ٹیلی ویژن والوں نے دونوں پارٹیوں کے درمیان احتیاطاً" میزوں کا ایک جنگلا بنا دیا تھا۔ ورنہ ایک فلم ڈائریکٹر تو اس فلم بین کو ضرور مار بیٹھتے۔ ہائے ہائے ہمارے ملک کے پاگل پاگل پاگل پاگل فلم ساز۔ اگر وہ برا مانیں تو یوں ہی سہی۔ یہ پاگل پاگل پاگل پاگل فلمیں دیکھنے والے کہ ایک ہی فلم کو مختلف ناموں سے بار بار دیکھے جا رہے ہیں۔



ہم نے پچھلے دنوں ایک انگریزی فلم دیکھی

انشاء جی

ہم نے پچھلے دنوں انگریزی کی ایک فلم دیکھی۔ نام ہے اس کا۔۔۔

THE MAD MAD MAD MAD WORLD

یعنی (پاگل پاگل پاگل دنیا) فلم دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ جو چار بار پاگل لکھا ہے۔ دس بیس بار لکھنا چاہیے تھا۔ غالباً" جگہ کی گنجائش مانع رہی ہوگی۔

آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک شاہراہ پر کچھ موٹریں' ٹرک آگے پیچھے جا رہے ہیں۔ ایک کار لڑھک کر گہرے کھڈ میں گر جاتی ہے۔ لوگ نیچے پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ گاڑی کا سوار قریب المرگ ہے۔ اس نے بتایا کہ "یارو! میں تو دنیا سے سفر کر رہا ہوں۔ لیکن فلاں سطح مرتفع پر ایک خزانہ دبا ہے۔ لاکھوں کے نوٹ ہیں۔ نشانی اس کی دو کھجوریں ہیں" اما بعد۔

اک طرف منہ پھیر کر رونے لگے تیمار دار
اک طرف بیمار غم کچھ کہہ کے رخصت ہو گیا

بے شک بیمار غم کچھ کہہ کے رخصت ہو گیا۔ لیکن تیمارداروں کے رونے کی بات صحیح نہیں۔ سب نے فی الفور دوڑ لگا دی۔ سب کو پہلے پہنچنے کی فکر تھی۔ باقی فلم' دولت کی اسی دوڑ کی ہے۔ آخر میں۔۔۔ لیکن باقی آپ پردہ سیمیں پر دیکھیے۔ یہ فلم پرلطف تھی بہت پر لطف تھی چلتی رہی۔ اس میں سب کچھ تھا جو انشراح قلب کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اس میں اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو نہ تھی' لہٰذا ہمارے دوست ہمیں پابہ دست دگرے ایک مقامی' سراسر مقامی فلم میں لے گئے کہ فلم دیکھنی ہے تو یہ دیکھو۔ دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا۔

کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں
عشق و محبت اس میں پند و نصیحت اس میں
مار کٹائی سے معمور' مزاح کے لڈوؤں سے بھرپور۔

ظالم سماج کا تانا بانا بھی ہے اور زندہ ناچ گانا بھی ہے۔ جا بجا بے لوث محبت کے پھول کھلتے ہیں اور آخر عاشق معشوق گلے ملتے ہیں۔

فلم کا نام ہم نہیں لکھتے۔ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں بلکہ نہ لکھنے میں ایک حکمت ہے۔ اس شخص کا ذکر آپ نے سنا ہوگا۔ جو غصے میں بھرا الکف اڑاتا سینما کے منیجر کے پاس پہنچا اور کہا میری بیوی اس وقت ایک غیر مرد کے ساتھ بیٹھی سینما دیکھ رہی ہے۔ میں اسے گولی ماردوں گا۔ منیجر نے اسے تو بٹھایا۔ اندر ہال میں اسکرین پر اعلان کرا دیا کہ باہر کسی بی بی کا میاں پستول لیے بیٹھا ہے۔ ہم دو منٹ کے لیے لائٹ بند کرتے ہیں۔ وہ بی بی اور اس کا ساتھی چپ چاپ اندھیرے میں نکل جائیں۔ دو منٹ کے بعد لائٹ کھولی گئی تو ہال قریب قریب خالی تھا۔ پس جو فلم والا چاہے اسے اپنے سے متعلق کر لے۔ ہمارے دو دوستوں نے تو سوالات کرکے "کسوٹی" کے قاعدے سے بھی اس فلم کا نام بوجھنے کی کوشش کی۔

"یہ فلم پنجابی ہے؟" ہمارے عبید اللہ بیگ نے پوچھا۔

"جی۔" ہم نے جواب دیا۔

"مار کٹائی کے سین سے شروع ہوتی ہے؟" ہمارے افتخار عارف نے سوال کیا۔

"جی۔"

"اس میں وجہ بے وجہ مری اور سوات کے مناظر ہیں۔"

"جی۔"

"ولن بڑھکیں مارتا ہے؟"

"جی۔"

"مسخرہ الٹی چھلانگ لگاتا ہے؟"

"جی۔"

"طوائف کا کوٹھا اس میں ہے؟"

"جی۔"

"جیل کی سلاخیں بھی؟"

"جی۔جی۔"

"سب ایک دوسرے کے لیے ایثار کرتے ہیں؟ بلکہ ایثار کرنے کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں؟"

"جی۔"

"من کی آنکھیں پٹ پٹ کھلتی ہیں؟"

"جی ہاں۔جی ہاں۔"

"اسے بنے ہوئے پچاس سال سے زیادہ ہو گئے۔"

"آپ پروڈکشن کے معیار کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں۔"

"اس میں۔"لال موری پت"گایا گیا ہے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"

"اس میں فردوس ہے۔ اعجاز ہے۔ غالباً" نغمہ بھی۔"

"جی ہاں۔ لیکن آپ کے سوالوں کا کوٹہ ختم ہو گیا۔ اب فلم کا نام بتایئے؟"

"روکھے ہو کر بولے۔"جناب آپ ہی بتا دیجیے۔ ہم ہار گئے۔"

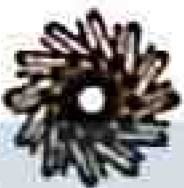
ہم نے کہا۔"آپ نے تو ساری نشانیاں بتا دیں۔"

تب انہوں نے بتایا کہ ہیرو کی مار کٹائی۔ طالب و مطلوب کا 'بچھڑنا' ملنا۔ مری اور سوات کے سین 'بے گناہ قیدی۔ طوائف کا کوٹھا۔ الٹی چھلانگ لگانے والا مسخرہ اور بڑھکیں مارنے والا ولن سب فلموں میں مشترک ہوتے ہیں۔لال موری پت کا بھی ہر فلم میں ہونا ضروری ہے حتیٰ کہ کاسٹ بھی قریب قریب ساری پنجابی فلموں کی ایک ہی ہوتی ہے لہٰذا بتائیں تو کیا بتائیں۔

یہ بیان ان صاحب کا تھا۔ ہم پر اس کی ذمے داری نہیں کیونکہ ہم تو عید بقر عید پر فلمیں دیکھنے والے ہیں۔ ہم تو اپنے مختصر تجربے کی روشنی میں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ فلمیں خصوصاً""پنجابی فلمیں" تنہا دیکھنے کی نہیں۔ جاتے ہوئے غالب کی طرح اپنے ساتھ نوحہ گر، لے کے جانا چاہیے۔ جو رلانے والا سین ہو تو آپ کی آنکھیں تولیے سے پونچھے۔ کولہے مٹکانے کا سین ہو تو آپ کی آنکھیں' ہاتھ رکھ کر بند کر دے۔ ہنسانے والا سین ہو تو آپ کی بغل میں گدگدی کرے۔ آپ نڈھال ہونے لگیں تو آپ کو اسپرو کھلائے۔ لخلخہ سنگھائے۔ آپ کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر

ساری فلم کے دوران میں آپ کے کانوں میں انگلیاں دیے رکھے۔ ہم اپنے ساتھ کسی فالتو آدمی کو نہ لے گئے تھے۔ لہٰذا اپنی ہی انگلیاں کانوں میں دیے رہے۔ پنجابی فلموں کا ہر کردار آغا حشر کا تربیت یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ اتنا اونچا بولتا ہے کہ سینماؤں کو ایمپلی فائر لگانے کی حاجت نہیں۔ ہاں کوئی آلہ آواز دھیمی کرنے والا ہو تو اس کا لگانا مستحسن ہو گا۔

اس فلم میں چھ گانے' آٹھ مزاحیہ سین' دس دردناک مناظر' تین قاتلانہ حملے' بارہ لپاڈکیاں اور پندرہ سسپنس تھے۔ یہ مسالا جس سے دوسرے ملکوں میں پچاس فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں ایک ہی فلم میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے فلم ساز محنت نہیں کرتے۔ پچھلے دنوں ٹیلی ویژن پر فلمسازوں اور فلم بینوں کا ایک مباحثہ ہوا تھا۔ وہاں ایک فلم بین نے اس بات کی تعریف کرنے کے بجائے اس پر اعتراض کیا۔ ٹیلی ویژن والوں نے دونوں پارٹیوں کے درمیان احتیاطاً" میزوں کا ایک جنگلا بنا دیا تھا۔ ورنہ ایک فلم ڈائریکٹر تو اس فلم بین کو ضرور مار بیٹھتے۔ ہائے ہائے ہمارے ملک کے پاگل پاگل پاگل پاگل فلم ساز۔ اگر وہ برا مانیں تو یوں ہی سہی۔ یہ پاگل پاگل پاگل پاگل فلمیں دیکھنے والے کہ ایک ہی فلم کو مختلف ناموں سے بار بار دیکھے جا رہے ہیں۔



فطری بات ہے، ہم جن کو پسند کرتے ہیں، جن سے لگاؤ رکھتے ہیں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں، ہماری قارئین بھی مصنفین کے بارے میں، ان کی ذات کے حوالے سے جاننا چاہتی ہیں۔ اس لیے ہم نے مصنفین کے لیے ایک سروے ترتیب دیا ہے۔ جس کے سوالات یہ ہیں۔

س 1۔ لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت سے منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟

س 2۔ آپ کے گھر والے، خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے؟

س 3۔ آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو؟ اب تک جو لکھا ہے، اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟۔

س 4۔ اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟۔

س 5۔ اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آیئے دیکھتے ہیں، مصنفین نے ان کے سوالات کیا جوابات دیے ہیں۔

حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

مصباح علی

ادب کی دنیا میں ہر ماہ تین ہیرے جو الگ ہی جگمگاتے ہیں۔ ان کی آب و تاب میں ذرا برابر فرق نہ پڑا۔ جیسے جیسے وقت گزرا تو سائٹی کے اتار چڑھاؤ، بدلتی روایات و خیالات، سماجی و ثقافتی تمدن کی تبدیلی کو اپنے اندر اس طرح سے سمو لیا کہ ہر قاری کو الگ دنیا کا تذکرہ نہ لگے۔ بلکہ اپنا ہم قدم، ہم خیال، اک دوست، اک رہنما ہاتھ تھامے چلتا دکھائی دے اور یہ سارے کریڈٹ اس ادارے کے چلانے والوں کو جاتے ہیں۔

1 ۔ سچ مانیں، پہلے تو پڑھتے ہی ہنسی آگئی۔ یعنی کہ پہلا سوال ہی صلاحیت کا داغ دیا۔ ارے جناب لکھنے کی صلاحیت جانے ہے یا نہیں، البتہ سوچنے کی بہت ہے۔ خاص کر جب امی جان کوئی کام بتا دیتیں وہ بھی کچن کے متعلق بلیقین مانو دم نکل جاتا، آنکھیں ابل پڑتیں، ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو جاتے اور سوچتی اگر میں رائٹر ہوتی تو کم از کم ایسی امی کبھی نہ رکھتی، جو کام کروائے، سوچ کا ارتکاز امی جان کا اٹھتا دھموکا دیکھ کر ٹوٹ جاتا۔ زبان کو تقویت ملتی۔

''اٹھ رہی ہوں، کیا ہو گیا بھئی۔۔۔ میری پیاری امی جان (مسکہ شروع) مجھ سے برتن دھلوالیں، پلیز ہنڈیا آپی بنا دیں گی۔'' چولہے کی اٹھتی ہلدی، مرچوں زدہ بھاپ میں خاک ہیرو اڑتے دکھائی دیتے۔ ہاں پانی کی چھم چھم اور برتنوں کی موسیقی میں کوئی تان سین سامنے آکر رک جاتا اور اس کے تار تب بکھرتے جب آپی آکر ٹونٹی بند کرتیں۔''

''او محترمہ! دھل گئے برتن۔۔۔ اور دیکھو ہیرو تمہارے قدموں میں۔۔۔؟''

''اوئی کاکروچ۔''

دو فٹ اچھلتی، چیخ نکلتی۔۔۔ ''لعنت ہے ایسے کام پر، زندہ و جاوید حسینہ کو جانور لاش سمجھ کر نوچنے لگیں۔''

اور رابدولت پھر سے بیڈ پر۔۔۔

اب آپ بتائیں ہم ایسے کام چور میں بھی تخلیقی صلاحیت ہو سکتی ہے۔ ارے وراثت کا پوچھ ڈالا تو

جناب میرے ماموں جان چھ سات کتابوں کے مؤلف ہیں اور سچ بتاؤں وہ تمام کتب انتہائی مذہبی موضوعات اور شرعی فلسفے کی تشریح بیان کرتی ہیں' ایسے میں میری تحریروں کا موازنہ آپ سے بہتر کون کر سکتا ہے کہ کتنی وراثت ملی ہوگی۔ (اوہ) میں تو ان کا نام فخر سے لے سکتی ہوں اور وہ میرا۔۔۔ (او مائی گاڈ)

2 ۔ آپ نے باقی گھر والوں کے شوق کا پوچھا تو ڈیئر امتل! ایک واقعہ برسوں سے سینے میں دفن ہے' آج پردہ اٹھائی ہوں' خواہ بعد میں جوتے پڑیں' گھنی میسنی' چورنی کے طعنے ملیں۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ بچپن میں مجھے اپنی آپاؤں کی چیزوں میں گھسنے کا بہت شوق تھا اور خاص کر ان کی غیر موجودگی میں اور یقیناً" یہ تب کی بات ہے جب میں 9th میں تھی۔ ایک مسودہ آپی کے بک ریک سے ملا۔ پہلے صفحے پر کوئی حیدر علی صاحب کشمیر پر دھواں دھار تقریر کر رہے تھے۔ چند صفحات پلٹے۔ اماں سے لڑتے ملے اور آگے سے پڑھا۔ (شاید سمجھ میں آجائے) وہ کشمیر کے مرغ زاروں میں کھوئے ہوئے تھے۔ تنگ آکر رکھ دیا اور سوچا۔ "مجھ سے ہوم ورک نہیں لکھا جاتا۔ آپی نے یہ ڈھیر کیسے لکھ لیا۔ بھلا ایسی داستانیں میرے مغز میں پریشر ککر کی طرح پکتی ہیں' مجھ سے سن لیتیں' لکھنا ہی تھا تو میرا کام لکھ دیتیں۔"

تب تک مجھے قطعاً" اندازہ نہیں تھا کہ سچ مچ تحریریں لڑکیاں ہی لکھ کر بھیجتی ہیں۔ (یہ ادب عالیہ پر احسان ہی رہا۔) میں سمجھتی تھی شاید پریس والے خود ہی لکھ کر چھاپتے ہیں اور آپی جیسے پڑھتے ہیں۔ دن رات صبح و شام پی ایس سی کا پیپر رہ جائے' مگر کوئی کہانی نہ بچنے پائے' پریکٹیکل نوٹ بک میں چھپا چھپا کر پڑھتیں' میں نے آپی کو ہمیشہ خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ ہی دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے پیدا ہوتے ہوئے اس ماہ کا پرچا ساتھ ہی لائی تھیں اور اب تک یہ ہی عالم ہے۔ بڑا بیٹا فرسٹ ایئر میں چلا گیا' مگر شوق میں کمی نہ آئی' نہ پڑھنے میں' نہ سنبھال کر پیٹی میں مقفل کرنے میں۔۔۔

ڈیئر امتل! یہ دوسرے سوال کا آخری جز بڑا شرمندہ کر رہا ہے۔ آپاؤں کے پڑھنے کا عالم تو بتا دیا' خالائیں ان سے دو ہاتھ' بلکہ دو گز آگے کر لو۔ میری تحریریں۔ فون کر کے پوچھتی ہوں۔ "کہانی پڑھی تھی؟ اچھا صبح پڑھ لینا۔" اگلے دن۔۔۔

"آج پڑھی؟ چلو شام کو پڑھ لینا۔"

(اگلی کال پر۔۔۔) "خالہ پڑھی؟ آپی پڑھی؟"

"پہلے یہ بتا' کس سے لکھوا کر بھیج رہی ہے۔"

"آپی! سچ میں نے ہی لکھی تھی۔"

"میں پھر کہہ رہی ہوں' باز آجا' اگر تو پکڑی گئی نا' تو جو یہ تیری دو آنکھیں ہیں نا ادارے والے باہر نکال دیں گے۔" (ہائے قسمت) میں نے حیرت سے سیل دیکھا۔

"آپی! سب کی دو ہی ہوتی ہیں۔"

"ہاں! مگر تیرے دو گڑھے رہ جائیں گے۔" کچھ دیر بعد (اپنی عمر کا لحاظ آیا ہوگا۔) "ویسے اگر تم نے خود لکھی ہے تو اچھی کوشش ہے۔ خط بھی آئے ہیں تیرے نام۔"

یہ تو بڑی اور چھوٹی آپی کی آرا تھیں اور میری بیسٹ فرینڈ خالہ وہ تعریف ایسے کرتی ہیں جیسے گورنمنٹ پاکستان پیٹرول مہنگا کرنے کے بعد سستا کرتی ہے۔

اور چھوٹے بھیا کی سوئی ابھی بھی وہیں اٹکی ہے۔ "ایڈیٹرز کہیں ترس کھا کر تیری کہانی تو نہیں لگاتے' انہیں بتا دے ترس کھانے کی ضرورت نہیں' ٹھیک ٹھاک آسامی ہے تو۔۔۔" اب بتائیں ایسی نایاب آرا کے درمیان کیسا محسوس ہوگا۔ لیکن میں بڑی ڈھیٹ چیز ہوں' جو کسی کی رائے دل پر لی ہو۔ (اور خود پسند) بھئی۔۔۔ اگر کوئی ہماری تعریف نہ کرے تو کیا خود بھی نہ کریں' ایسا ہو سکتا ہے۔ (بچ کے بابا۔)

رہا اپنی پسندیدہ تحریر تو جناب کریڈٹ میں ہیں ہی

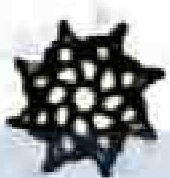
چند' ان میں سے کیا پسند کروں (اوہو)

4 ۔ یہ سوال انٹرسٹنگ ہے' اپنے علاوہ جناب سب ہی کی شوق سے پڑھتی ہوں اور بعد میں سوچتی ہوں کہ یہ سب میری بھی پڑھیں گی' یار برا مذاق اڑائیں گی۔ اور جب میری کہانی کا تذکرہ آتا ہے' پہلے خوشی ہوتی ہے' پھر حیرت۔۔ ارے ہاں! اک بات کہوں جنون قلب کا اکثر حوالہ ہوتا ہے جو حیران کر دیتا ہے۔ اتنی پسندیدگی پر میں نے بارہا پڑھا' دوربین لگا کر پڑھا' اپنی پیاری قاری بہنوں کا بہت شکریہ ادا کروں گی' ان کی انگلیوں سے ادا ہوتی تعریف میرے دل میں اترتی ہے۔(تھینک یو سو مچ۔)

میرے موسٹ فیورٹ مصنف اشفاق احمد ہیں۔ میں نے انہیں پڑھا کم ہے' مگر سنا بہت ہے اور بہت دل سے۔۔۔ اور نمرہ احمد کی تقریباً" تمام تحاریر پڑھی ہیں' زبردست مصنفہ۔۔۔ سائرہ رضا' سمیرا حمید' نایاب جیلانی' تنزیلہ ریاض' آمنہ ریاض سب پسند ہیں۔ ارے ہاں آمنہ مفتی بھی ان کا ایک افسانہ "مسافر" بہت پسند آیا۔ دل کھول کر تعریف کرتی ہوں۔ بہترین تحریر ہماری معاشرتی سوچ کی مکمل عکاس۔۔۔ اتنی زبردست یعنی کوئی گرہ کھولی بھی نہیں اور کوئی الجھن چھوڑی بھی نہیں' زبردست' ارے فرحت آپی کہاں گم ہو گئیں۔ میری بڑی پسندیدہ مصنفہ۔۔۔۔ "تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔" گفٹ کر رہی ہیں نا مجھے۔ میں مس کر رہی ہوں آپ کو۔۔۔

5 ۔ لو فائیو نمبر تو رہ گیا اور اگر جواب نہ دیا تو وہی زبان کا مسئلہ پسندیدہ اقتباسات اور شعر تو بہت ہیں' مگر امجد اسلام امجد کی یہ نظم بے تحاشا پسند ہے' بلکہ عمر کے اس حصے سے پسند ہے جب لفظوں کے مطلب بھی معلوم نہ تھے۔ اکثر کوئی نہ کوئی لائن ذہن میں گردش کرتی رہتی ہے۔

دن رات کے آنے جانے میں' دنیا کے عجائب
خانے میں
کبھی شیشے دھندلے ہوتے ہیں
کبھی سورج بات نہیں کرتا' کبھی تارے آنکھ بدلتے
ہیں
یکلخت کبھی منزل پیچھے رہتی ہے
کبھی آسیں توڑ نہیں چڑھتیں
کبھی خدشے پورے ہوتے ہیں
کبھی آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں
کبھی خواب ادھورے ہوتے ہیں
یہ سب صحیح ہے لیکن!
آشوب کے منظر نامے میں
دنیا کے عجائب خانے میں
کچھ سایہ کرتی آنکھوں کے پیاں تو دکھائی دیتے ہیں
ہونٹوں سے اگرچہ دور سہی
امکاں تو دکھائی دیتے ہیں
ہاں ریت کے اس دریا کے پار
اک پریوں والی بستی کے
عنواں تو دکھائی دیتے ہیں
منزل سے کوسوں دور سہی
پر درد سہی' رنجور سہی
زخموں سے مسافر چور سہی
پر کس سے کہیں اے جان وفا
کچھ ایسے گھاؤ بھی ہوتے ہیں
جنہیں زخمی آپ نہیں دھوتے
بن روئے ہوئے آنسو کی طرح
سینے میں چھپا کر رکھتے ہیں
اور ساری عمر نہیں روتے
نیندیں بھی مہیا ہوتی ہیں
سپنے بھی دور نہیں ہوتے
اب کس سے کہیں اے جان وفا۔۔۔ یہ اہل وفا
کس آگ میں جلتے رہتے ہیں
کیوں بجھ کر راکھ نہیں ہوتے
(آپ کہیں گی۔ پوچھا شعر تھا لکھ دیوان دیا)



فلم اور ٹی وی کی بہترین اداکارہ

آمنہ الیاس سے ملاقات

شاہین رشید



باصلاحیت افراد زندگی میں کتنے بھی کرائسس دیکھیں، مگر ایک دن آتا ہے کہ وہ اپنے ہنر، اپنے علم اور اپنی تعلیم کے بل بوتے پر اپنا مقام بنا لیتے ہیں۔ بے شک اپنے آپ کو منوانے میں ٹائم لگ جاتا ہے....
ملک کی معروف اداکارہ اور ماڈل "آمنہ الیاس" نے بھی شوبز کی دنیا میں جو نام کمایا ہے وہ بے حد محنت کے بعد کمایا ہے۔

"کیا حال ہیں آمنہ؟"

"جی اللہ کا کرم ہے۔"

"آمنہ! شوبز کی دنیا میں فیشن کی دنیا میں آپ کا ایک مقام ہے، مگر آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ بالکل بھی سوشل نہیں ہیں اور انٹرویو دینے سے بھی گھبراتی ہیں؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ انٹرویو اس لیے نہیں دیتی کہ کچھ غلط لکھا جائے تو امیج خراب ہوتا ہے اور اگر سوشل نہ ہوتی تو ترقی کیسے کرتی؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔ فضول میں ادھر ادھر نہیں جاتی۔"

"آپ آج جس مقام پر ہیں، اس کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا یا سب کچھ آسانی سے ہو گیا؟"

"اب وہ دور نہیں ہے کہ ایک ڈرامے میں کام کیا اور شہرت کی بلندیوں پہ پہنچ گئے۔ وہ پی ٹی وی کا زمانہ تھا۔ تفریح کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ مقابلے کی کوئی فضا نہیں تھی.... مگر اب چاروں طرف مقابلہ ہے تو اپنی جگہ بنانا نسبتاً" مشکل ہو گیا ہے۔ مگر اللہ کا ساتھ ہو تو ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔"

"آپ کو امید تھی کہ آپ کامیاب ہو جائیں گی۔"

"دیکھیں، جب انسان اچھی نیت سے گھر سے نکلے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی کامیابی دیتا ہے اور مجھے بالکل امید تھی کہ اللہ مجھے کامیابی دے گا، کیونکہ میں گھر کے حالات بہتر کرنے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔"

"کچھ بتائیں گی کہ کیا مشکلات تھیں کہ آپ کو گھر سے نکلنا پڑا؟"

"ہمارا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ ہم سونے کا نوالہ منہ میں لے کر نہیں پیدا ہوئے۔ ہماری کم عمری میں ہی ہمارے والد کا انتقال ہو گیا اور امی نے تن تنہا ہم بہنوں اور بھائی کی پرورش کی اور ہمیں اگرچہ کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ لیکن ہم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو تھے۔ ایک حساس دل تو رکھتے تھے.... اور اسی وجہ سے میں کم عمری میں ہی اس فیلڈ میں آگئی۔"

"کس طرح.... ؟ کون لایا؟"

"مجھے یاد ہے، میں سینٹ جوزف اسکول میں پڑھتی



تھی۔ میری عمر سولہ سال تھی۔ ایک دن ہمارے فیملی فرینڈ جو کہ بہت اچھے فوٹوگرافر بھی ہیں' انہوں نے ایک شوٹ کے لیے کہا اور یہ شوٹ ہی میری کامیابی کی پہلی سیڑھی بنا اور اس ساری کامیابی میں میری امی اور میری بہنوں کا ہاتھ ہے۔۔۔ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے مردوں کی طرح مضبوط بنایا۔۔۔ کہ سر پر مرد کا اور باپ کا سایہ نہ ہو تو گھر کی خواتین کو "مرد" بننا پڑتا ہے۔۔۔ اس پہلے شوٹ کے بعد۔۔۔ میں نے کافی پروفیشنل لوگوں کے ساتھ کام کیا اور ایمان داری کے ساتھ کیا' جس کا مجھے اچھا رزلٹ ملا۔"

"یہ نئی دنیا کیسی لگی آپ کو؟"

"بالکل۔۔۔ ایک نئی دنیا لگی۔ مجھے فوٹوگرافر عاکف الیاس نے متعارف کرایا اور مجھ سے بھی پہلے میری دو بہنیں عظمیٰ الیاس اور سلمیٰ الیاس بھی اسی فیلڈ سے وابستہ تھیں۔ لہٰذا امی نے تو خوشی خوشی اجازت دے دی۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں میرا اس فیلڈ میں آنا پسند نہیں آیا۔ مگر میں نے پروا نہیں کی کہ مجھے اپنی ماں اور بہنوں کی سپورٹ حاصل تھی۔۔۔ بس پھر اللہ تعالیٰ بھی راستے کھولتا گیا۔"

"پڑھائی مکمل کی؟ یا ماڈلنگ کی نذر ہو گئی؟"

"ہمارے گھر میں پڑھائی کا ماحول بہت سخت تھا۔ اس لیے اس سے تو آنکھ چرا ہی نہیں سکتے تھے' امی تعلیم پر کمپرومائز کرنے کی قائل نہیں' کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ساری زندگی یہ ہی ہمارے کام آئے گی اور ایسا ہی ہے۔ میں نے اپنا گریجویشن مکمل کرنے کے بعد باقاعدہ اس فیلڈ میں قدم رکھا۔ ہماری امی بہت لبرل خاتون ہیں۔ وہ حالات کے ساتھ چلتی ہیں۔۔۔ اور میں کم عمری میں ہی اچھی خاصی میچور ہو گئی تھی۔"

"شہرت آپ کو فلم "زندہ بھاگ" سے ملی۔۔۔ مگر پہلی فلم آپ کی "گڈ مارننگ کراچی" تھی۔۔۔ تو کیا یہ کامیاب نہیں ہوئی تھی؟"

""گڈ مارننگ کراچی" پاکستان میں بہت بعد میں ریلیز ہوئی اور یہ ہی میری پہلی فلم بھی تھی۔ صبیحہ سومار صاحبہ نے مجھے اس فلم کے لیے بک کیا تھا۔ یہ 2010ء کی بات ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مجھے فلم میں کام کرنے کی آفر آئی تو میں بہت گھبرائی کہ پتا نہیں میں کام کر سکوں گی کہ نہیں' لیکن پھر میں نے اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا۔۔۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ صبیحہ صاحبہ نے ہی مجھے بہت کچھ سکھایا۔ مجھے بہت گروم کیا۔ میں ان کی بہت شکر گزار ہوں کہ اداکاری میں انہوں نے میری بہت رہنمائی کی۔"

"ویسے اداکاری آسان ہے۔۔۔ یا ماڈلنگ؟ آپ کو کیا پسند ہے؟"

"دونوں مختلف فیلڈز ہیں اور دونوں کا مختلف کام ہے اور مجھے اداکاری کرنا زیادہ پسند ہے۔ ہمیں وہ کچھ یا وہ کردار پرفارم کرنا ہوتا ہے۔ جس کا ہماری اصلی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جبکہ ماڈلنگ اداکاری سے بہت مختلف ہے۔" اداکاری زیادہ مشکل کام ہے۔"

"اصل میں آپ کی فیلڈ کیا ہے' ماڈلنگ' فلم یا ڈرامہ؟"

"تینوں میری فیلڈز ہیں اور میں نے تینوں میں کام کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ مجھے ان تینوں شعبوں کو ساتھ لے کر چلنا آتا ہے اور میں نے یہ ثابت کیا ہے کہ میں ہر طرح کے کردار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ خواہ فلم ہو یا ڈرامہ ہو۔"

"کیا فلم میں ترقی کی گنجائش ہے ہمارے ملک میں؟"

"بالکل ہے۔۔۔ ہماری فلم انڈسٹری میں بہت گنجائش ہے' مگر شرط یہ ہے کہ سینئرز اور جونیئرز مل کر کام کریں۔۔۔ سینئرز اپنے تجربات سے اور جونیئرز اپنی نئی سوچ سے فلم انڈسٹری کو بہت آگے تک لے جاسکتے ہیں۔"

"آپ کو کون سا میڈیم زیادہ پسند ہے۔ فلم کا یا ٹی وی کا؟"

"دونوں الگ الگ میڈیم ہیں اور دونوں کے کاموں میں بھی بہت فرق ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جو بہت زیادہ ٹیلنٹڈ ہوتے ہیں وہ فلم میں جاتے بھی ہیں اور کامیاب بھی ہوتے ہیں۔۔۔ اور اگر ایک آرٹسٹ بیک وقت فلم اور ٹی وی میں کام کررہا ہوتا ہے تو وہ بیک وقت دو طرح کے تجربات سے گزر رہا ہوتا ہے۔۔۔ اور میں فلم کو زیادہ انجوائے کرتی ہوں۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ فلم بالکل مختلف ہے ڈراموں سے۔۔۔ مگر اہمیت دونوں کی بہت زیادہ ہے۔"

"فلم میں جو آئٹم سونگ ہوتے ہیں اُس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"آئٹم سونگ اچھے لگتے ہیں' مگر کسی کو آئٹم گرل سمجھ کر کاسٹ کرنا مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ اگر مجھے کوئی آئٹم گرل سمجھ کر کاسٹ کرے گا تو میں تو انکار کردوں گی۔"

"فلم اور ٹی وی کی مقبولیت کے بعد ماڈلنگ کو جاری رکھیں گی یا خیرباد کہہ دیں گی؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں' ایسا ممکن نہیں ہے' کیونکہ مجھے یہاں سے ہی مقبولیت ملی ہے۔۔۔ اور اس مقبولیت کی بنا پر میں فلم اور ٹی وی تک آئی ہوں۔ اس لیے میں سب شعبوں کو جاری رکھوں گی۔"

"گویا انٹرنیشنل معیار کا کام ہو رہا ہے۔ آپ کی باتوں سے ایسا لگ رہا ہے؟"

"میں تو سمجھتی ہوں کہ شوبز انڈسٹری نے نیا جنم لیا ہے۔ گزشتہ چند سالوں سے بہت اچھا کام ہو رہا ہے۔ گزشتہ دو تین سالوں میں جو فلمیں بنی ہیں اس کی وجہ سے لوگ فلم کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ سینما کا رخ کررہے ہیں لوگ۔۔۔ اور ہمارے ڈرامے تو پہلے ہی بہت مقبول تھے' انہیں مزید مقبولیت ملی ہے۔"

"فیوچر پلاننگ کرتی ہیں؟"

"میں اپنے ملک اور آرٹ و فلم کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں اور مجھے اپنا فیوچر بہت برائٹ نظر آتا ہے۔"

"آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

"جی۔۔۔ آج کل تو کافی مصروفیات ہیں۔ میں اس وقت فلم اور ٹی وی کے کافی پروجیکٹس میں کام کررہی ہوں اور یہ تمام پروجیکٹ ایسے ہیں جو مجھے بہت آگے تک لے جائیں گے۔ "مائیکل ہڈسن" کے کرائم ڈراما (Driven) کے لیے کام کررہی ہوں۔ ایک پروجیکٹ میں جاوید شیخ صاحب کے ساتھ کام کررہی ہوں اور ان کے ساتھ کام کرنا نہ صرف میرے لیے ایک بڑا اعزاز ہے' بلکہ ایک خوش گوار تجربہ بھی ہے۔۔۔ یہ سارے پروجیکٹ میرے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

"عموماً" جن بچیوں کے باپ کم عمری میں وفات پا جاتے ہیں' ان میں خود اعتمادی کی کمی رہ جاتی ہے۔۔۔ مگر آپ ماشاء اللہ کافی پراعتماد ہیں۔۔۔ امی کی بدولت یا خود سے۔۔۔؟"

"جی۔۔۔ یہ سارا اعتماد۔۔۔ اور یہ ساری بہادری میری امی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔۔۔ ان کی تربیت' ان کے



حوصلے، اعتبار، اعتماد نے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔۔۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی ماں سے بہت قریب ہوں اور ہر بات ان سے ڈسکس کرتی ہوں اور ان کے ساتھ ایک بھرپور زندگی گزار رہی ہوں۔"

"گڈ۔۔۔ مگر ان کی نصیحتیں تو بری لگتی ہوں گی؟" مسکراتے ہوئے۔۔۔ "ہرگز نہیں۔۔۔ کیونکہ وہ ڈائریکٹ نصیحت نہیں کرتیں، بلکہ ایسی باتیں کرتی ہیں کہ خود بخود ماننے کو دل چاہتا ہے۔"

"اپنی امی کی کوئی خاص بات جو دل میں اتر گئی ہو یا آپ نے اسے گرہ سے باندھ لیا ہو؟"

"بالکل۔۔۔ امی اکثر کہتی ہیں کہ۔۔۔ کسی بھی اس آدمی پر اعتماد نہ کرنا جو تمہاری بہت زیادہ تعریف کرے۔ کیونکہ ایسے لوگ قابل اعتبار نہیں ہوتے۔۔۔

"ویسے تعریف کرتے ہیں تو آپ کو خود کیسا لگتا ہے؟"

"اچھا لگتا ہے۔۔۔ مگر پھر امی کی بات یاد آجاتی ہے کہ جو تعریف کرے، وہ قابل اعتبار نہیں ہوتے۔۔۔ ویسے میں اپنی امی کی کاپی ہوں۔ اپنی امی سے متاثر ہوں۔۔۔ اس لیے ان کی طرح خوب صورت بھی ہوں۔۔۔ اور دبلی پتلی بھی ہوں۔"

"امی ایک نصیحت تو بہت کرتی ہوں گی کہ۔۔۔"

"کہ شادی کرلو۔۔۔ ایسا ہرگز نہیں کہتیں۔۔۔ وہ جہاندیدہ خاتون ہیں، بہت پڑھی لکھی اور لبرل۔۔۔ کہتی ہیں پہلے اچھی طرح سیٹل ہوجاؤ۔۔۔ پھر شادی کرنا۔۔۔ کیونکہ برا وقت آتے دیر نہیں لگتی۔۔۔ عورت کو اتنا مضبوط اور بااختیار ہونا چاہیے کہ وہ برے وقت کا مقابلہ آسانی سے کرسکے۔"

"بالکل ٹھیک کہتی ہیں آپ کی امی۔۔۔ ویسے پسند سے کریں گی آپ شادی؟"

"دیکھیں۔۔۔ اس بارے میں ابھی کچھ سوچا نہیں۔۔۔ جو اللہ کو منظور ہوگا۔۔۔ ہوجائے گا۔"

"کچھ آئیڈیل بنایا آپ نے۔۔۔ لائف پارٹنر کے بارے میں۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ سوچتی ہوں کہ لائف پارٹنر ایسا ہو جو ہنس مکھ ہو۔۔۔ خوش حال ہو۔۔۔ خود بھی خوش رہے اور مجھے بھی خوش رکھے۔ کھانا وغیرہ پکانا آتا ہو۔۔۔ تاکہ اگر بیوی مصروف ہو تو وہ خود پکالے۔۔۔ مذاق کر رہی ہوں، بس ایک اچھا انسان ہونا چاہیے۔۔۔ جو میرا خیال رکھے۔ ویسے میری دو بہنوں کی شادی ہوچکی ہے۔"

"اور کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"نہیں۔۔۔ بس۔۔۔ دعا کروں گی کہ اللہ میری والدہ کی عمر دراز کرے۔۔۔ کیونکہ وہ ہی میرا سرمایۂ حیات ہیں۔"





معروف فنکار

اسد محمود سے باتیں

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"اسد محمود۔"

2 "پیار کا نام؟"
"کوئی پیار کرنے والا ہی نہیں... اس لیے اسد ہی کہتے ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
"16جنوری 1990ء / لاہور۔"

4 "مادری زبان؟"
"پنجابی۔"

5 "قد / ستارہ؟"
"چھ فٹ، ویسے پانچ فٹ 11 انچ۔ شوز پہن کر چھ ہو جاتی ہے (مسکراتے ہوئے) ستارہ کیپری کورن۔"

6 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
"ایک چھوٹا بھائی ایک چھوٹی بہن / اور میرا نمبر پہلا ہے۔"

7 "تعلیم؟... / شادی؟"
"گریجویٹ ہوں / ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے چار پانچ سال تک۔"

8 "بچپن کے خواب؟"
"اداکار ہی بننا چاہتا تھا... جو کہ بن گیا۔"

9 "شوبز میں لانے کا سہرا؟"
"اپنا ٹیلنٹ اور پاپا کی تعلیم۔"

10 "پہلا پروگرام؟ ماڈلنگ / ڈراما / آن ایئر ڈراما؟"
"لو لائف آف لاہور اے پلس سے آن ایر ہوا تھا... ماڈلنگ سے تو اسٹارٹ لیا تھا۔ "خوشحال سسرال" آن ایر ہے۔"

11 "آپ کی رہائش؟"
"میں کراچی میں ہوتا ہوں اور فیملی لاہور میں۔"

12 "جلدی اٹھنے کے عادی ہیں؟"
"عادت تو بنانی پڑتی ہے... شوٹ ہو تو جلدی اٹھ جاتا ہوں اور شوٹ نہ ہو تو جب آنکھ کھل گئی، سمجھیں کہ میری صبح ہو گئی۔"

13 "اٹھ کے پہلا کام؟"
"پانی پینا۔"

14 "شوق کی راہ میں کس نے روڑے اٹکائے؟"
"رشتے داروں نے روڑے تو نہیں اٹکائے البتہ اعتراض ضرور کیا کہ یہ کیا کام کر رہے ہو۔"

15 "پسندیدہ تہوار؟"
"عیدیں اور اسلامی تہوار... باقی جو انگریزوں کے تہوار ہیں وہ نہیں مناتا۔"

16 "اپنے آپ میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟"
"قد تھوڑا اور لمبا ہونا چاہیے تھا... اس کے علاوہ تو کچھ

کمی نہیں ہے۔"

17 "کھانے کے شوقین ہیں؟"

"بہت زیادہ... مگر ڈائیٹ کی وجہ سے، بہت کم کھاتا ہوں۔ میں اسپورٹس مین بھی ہوں اور جم بھی جاتا ہوں۔"

18 "بھوک کس سے مٹاتے ہیں؟"

"منحصر ہے کہ کس جگہ پہ ہوں۔ شوٹ پہ ہوتا ہوں تو بسکٹ اور گھر پہ ہوں تو کھانا وغیرہ کھا کے۔"

20 "فخر کا لمحہ؟"

"جب میرا پہلا پروجیکٹ آن ایر ہوا۔"

21 "تھک جائیں پھر بھی جاتا ہے... کہاں؟"

"کہیں نہیں صرف اپنے بیڈ پہ۔"

22 "بچپن کا ایک کھلونا جو آپ کے پاس محفوظ ہو؟"

"بچپن کی بہت ساری یادیں کھلونوں کی طرح محفوظ ہیں۔ بچپن میں اتنے کھلونے ہی نہیں ہوتے تھے کہ کھیلتا۔"

23 "بچپن کی بری عادت، جو ابھی تک ہے؟"

"بچپن سے سچ بول رہا ہوں۔ یہی بری عادت ہے۔"

24 "کچھ کرنے کا سوچ لیں تو؟"

"تو کر کے رہتا ہوں۔ پیچھے نہیں ہٹتا۔"

25 "ٹھنڈے مزاج کے ہیں یا؟"

"بہت کول ہوں۔ مگر غصہ اس وقت آتا ہے جب کوئی غلط بیانی کرے یا دھوکا دے۔"

26 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"اسمارٹ فون۔"

27 "سات دنوں میں کون سا دن اچھا لگتا ہے؟"

"جمعہ کا دن۔"

28 "بارہ مہینوں میں پسندیدہ مہینہ؟"

"سردیوں کا... دسمبر پسند ہے۔"

29 "غصے میں کیا کرتے ہیں؟"

"یہ منحصر ہے اس بات پہ کہ غصہ کس پہ آرہا ہے۔ ویسے خاموشی اختیار کر لیتا ہوں یا پانی پی لیتا ہوں۔"

30 "خواتین میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"

"خوب صورتی اچھی لگتی ہے۔"

32 "گھر میں کون غصیل ہے؟"

"ابو... میرے والد۔"

33 "کون سی چیز وقت سے پہلے ملی؟"

"شہرت۔"

34 "بچت کس انداز میں کرتے ہیں؟"

"بچت اس زمانے میں کہاں ہوتی ہے... دو وقت کی عزت کی روٹی مل جائے بہت ہے۔"

35 "کس ملک میں مستقل رہنا چاہتے ہیں؟"

"صرف اور صرف پاکستان میں... کینیڈا کا پاسپورٹ ہونا چاہیے مگر رہائش پاکستان میں۔"

36 "پیسہ آسانی سے خرچ کر لیتے ہیں؟"

"جب باپ کی کمائی خرچ کرتا تھا تو پیسے کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا تھا... اب اپنی کمائی خرچ کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ پیسہ کمانا کتنا مشکل ہے۔"

37 "فوڈ اسٹریٹ جہاں کھانے کا مزہ آجاتا ہے؟"

"گوال منڈی۔ لاہور۔"

38 "کبھی برا وقت گزارا؟"

"بہت گزارا... مگر صبر و شکر کے ساتھ کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔"

39 "کس شخصیت کے ساتھ ایک شام گزارنا چاہتے ہیں؟"

"ابھی ایسی کوئی شخصیت زندگی میں نہیں آئی۔ اپنی فیملی کے ساتھ شام گزارنا چاہوں گا۔"

40 "خلوص و پیار محبت آپ کی نظر میں؟"

"یہ ایک بہترین تحفہ ہے جو ہم دوسروں کو دے سکتے ہیں۔"

41 "پسندیدہ ایئر لائن؟"

"امارات۔"

42 "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں؟"

"نہیں... لیٹا رہتا ہوں۔ پندرہ بیس منٹ تک۔ نیت نہیں ہو رہی ہوتی اٹھنے کی۔"

43 "اچھے اور پرخلوص کون لوگ ہوتے ہیں؟"

"پرائے لوگ۔"

44 "چھٹی کا دن کہاں گزارتے ہیں؟"

"گھر پر۔"

45 "سیر و تفریح کے لیے بہترین وقت؟"

"رات کا یا پھر صبح اگر موسم اچھا ہو' بادل چھائے ہوئے ہوں' کیونکہ دھوپ مجھے اچھی نہیں لگتی۔"

46 "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"

"تو اسے آزمانا نہیں چاہیے۔ آزمائش میں سارے پول کھل جاتے ہیں۔"

47 "اپنے لیے کوئی ایک لفظ؟"

"کول مین۔"

48 "عورت حسین ہو یا ذہین؟"

"ویسے تو حسین ہونی چاہیے' لیکن اگر ذہین بھی ہو جائے تو سونے پہ سہاگہ ہے۔"

49 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"کونہ نہیں "ماں کی گود" میں سکون ملتا ہے۔"

50 "ایک ماہ کی چھٹیاں لے کر کہاں جانا پسند کریں گے؟"

"ٹریولنگ کروں گا' ساحل سمندر پہ جاؤں گا مجھے بیچ (Beach) بہت اچھے لگتے ہیں۔ نادرن ایریاز بہت خوب صورت ہیں۔"

51 "سوشل ہیں؟"

"نہیں.... تنہائی پسند آدمی ہوں۔"

52 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتے ہیں؟"

"سب کے.... اور خاص بندوں کو تو بہت جلدی دیتا ہوں جواب۔"

53 "میوزک میں پسندیدہ چینل؟"

"8X.N۔"

54 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"

"بہت سے لوگوں کو فون نمبر دے کر پچھتایا ہوں۔"

55 "رانگ نمبرز میں کس کی تعداد زیادہ ہوتی ہے؟"

"قہقہہ.... لڑکیوں کی۔"

56 "اگر آپ کے والٹ کا جائزہ لیں تو کیا کیا نکلے گا؟"

"اے ٹی ایم کارڈز.... شناختی کارڈ.... کچھ نقدی ہزار دو ہزار' چھوٹی ڈائری جس میں فون نمبر ہوں گے اور گھر کی چابی۔"

57 "مہمان بننا اچھا لگتا ہے یا مہمانوں کا آنا اچھا لگتا ہے؟"

"مہمانوں کا آنا اچھا لگتا ہے کیونکہ مہمان اللہ کی رحمت و نعمت ہوتے ہیں۔"

58 "پاور میں آجائیں تو؟"

"لوئر اور مڈل کلاس فیملیز کے مسائل حل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

59 "ایک نصیحت جو بہت بری لگتی ہے؟"

"صبح ٹائم پہ اٹھ جانا۔"

60 "پیسہ جمع کرنے کا شوق ہے؟"

"بالکل نہیں.... مجھے اچھی اچھی یادیں جمع کرنے کا شوق ہے۔"

61 "انسان کی زندگی کا خوب صورت دور؟"

"اس کی جوانی۔"

62 "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"

"بہت زیادہ۔"

63 "کن پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟"

"دوستوں پر۔"

64 "اپنے لیے قیمتی چیز جو خریدی؟"

"جب بھی کوئی نیا اسمارٹ فون آتا ہے تو خریدتا ہوں اور خالصتاً" اپنی کمائی سے لیتا ہوں۔"

65 "کھانے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے؟"

"جب کبھی چٹائی پہ بیٹھ کر سب کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں۔"

66 "ہاتھ کا استعمال کرتے ہیں یا چھری کانٹے کا؟"

"ہاتھ کا.... ہاتھ سے ہی کھانے کا مزہ ہے۔"

67 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ 5 اسٹار ہوٹل یا ڈھابہ؟"

"ارے جناب ڈھابے میں کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

68 "دنیا سے کیا ریوارڈ لینا چاہتے ہیں؟"
"کہ جب دنیا سے چلا جاؤں تو سب کہیں "کیا اچھا انسان تھا ہم اسے ہمیشہ مس کریں گے۔"
69 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"بہت زیادہ ہے۔"
70 "اپنے آپ کو ساتویں آسمان پہ کب دیکھتے ہیں؟"
"جب میں صبح کے وقت شوٹ پہ آتا ہوں۔"
71 "کوکنگ سے لگاؤ؟"
"چائے بہت اچھی بنا لیتا ہوں اور انڈا بھی فرائی کر لیتا ہوں۔"
72 "عورت بہترین کک ہوتی ہے یا مرد؟"
"مرد بہترین کک ہوتا ہے۔"
73 "عشق کے بخار چڑھے؟"
ہنستے ہوئے... "اب تو اترے بھی زمانہ ہو گیا ہے۔"
74 "انسان کی زندگی کی خطرناک عمر؟"
"ٹین ایج... جس نے یہ عمر صحیح طرح پار کر لی' وہ زندگی میں کامیاب انسان بن سکتا ہے۔"
75 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"مجھے نہیں ڈر لگتا۔"
76 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"
"اندھی کے ساتھ ساتھ گونگی اور بہری بھی ہوتی ہے۔"
77 "میگزین اور اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں؟"
"بالکل کرتا ہوں... اور کرنا بھی چاہیے۔"
78 "کس طرح کے رویے دکھ دیتے ہیں؟"
"کوئی اگنور کرے۔ کوئی روڈ ہو جائے۔"
79 "آپ اکثر سوچتے ہیں؟"
"اکثر نہیں... ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہوں۔"
80 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"مہندی۔"
81 "شادی میں تحفہ بہتر رہتا ہے یا کیش؟"
"میرے خیال میں تحفہ۔"
82 "ماں کے ہاتھ کی کیا چیز پسند ہے؟"
"ناشتہ اور کھانا۔"

83 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"
"ارسطو سے۔"
84 "اپنا فون نمبر تبدیل کیا؟"
"جی دو بار۔"
85 "آپ کو فوبیا ہے؟"
"نہیں... کسی چیز کا فوبیا نہیں ہے۔"
86 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"
"موبائل فون اور والٹ کے علاوہ کچھ ضروری چیزیں۔"
87 "ایک کارنامہ جو انجام دینا چاہتا ہوں؟"
"نہیں جی ایسا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔"
88 "کبھی روڈ پہ لوٹے گئے؟"
"جی بالکل... کون محفوظ رہ سکتا ہے۔ ان لوگوں سے۔"
89 "پاکستان کے لیے آپ کے خیالات؟"
"پاکستان ماشاء اللہ روز بروز ترقی کر رہا ہے اور مزید بھی کرے گا۔ میں اس کا فیوچر بہت برائٹ دیکھ رہا ہوں۔"
90 "ماں ناراض ہو جائے تو؟"
"اچھا نہیں لگتا... منا لیتا ہوں انہیں۔"
91 "غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"
"فوراً" کرتا ہوں۔"
92 "دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟"
"سچویشن پر منحصر ہے... ویسے زیادہ تر دل کی نہیں دماغ کی سنتا ہوں۔"
93 "آپ کی ایک اچھی عادت؟"
"مجھے تو اپنی ساری عادتیں اچھی لگتی ہیں... صحیح جواب تو دوسرے دیں گے۔"
94 "کبھی چھپ چھپ کر باتیں سنی ہیں؟"
"نہیں جی... کوشش بھی نہیں کی۔"
95 "شہرت مسئلہ بنتی ہے؟"
"تب 'جب آپ آزادی سے کوئی کام نہیں کر سکتے' آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتے۔"
101 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"تو یہی سمجھوں گا کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہو گی عزت و شہرت بھی تو اسی نے دی ہے۔"

آمنہ ریاض

دشتِ جنوں

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔
معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔
فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ' وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آئے کت اور وسامہ' معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔
کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں تین بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔
صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے' رامین' کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔
شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہجہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں عرف مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔



باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔۔۔ خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تنک مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور نیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیرِ زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

٦
چھٹی قسط

وہ جانتا تھا، جلد یا بدیر سب اسے پاگل سمجھنے لگیں گے اور یہی ہو رہا تھا۔

معاویہ واپس تو چلا گیا، لیکن کچھ خاص خوش نہیں تھا وہ۔۔۔ گو کہ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا، لیکن وسامہ جانتا تھا، معاویہ کا رویہ ہر چیز واضح کر رہا تھا۔

وہ وسامہ کے ساتھ اس طرح پیش آ رہا تھا جیسے وسامہ کسی موذی مرض میں مبتلا ہو گیا ہو اور اس کے ٹھیک ہونے کی امید بھی باقی نہ رہی ہو اور یہ بات وسامہ کو عجیب الجھن اور بے زاری میں مبتلا کر رہی تھی۔

اس نے خود کو کئی بار یقین دلانے کی کوشش کی کہ جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے، وہ اس کی غلط فہمی ہے اور آسیب جیسی کسی چیز کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ لیکن ہر بار جب وہ خود کو باور کروا چکا ہوتا تو کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی جو یہ یقین دلاتی کہ وہ آسیب ہے اور بالخصوص اسی کے تعاقب میں ہے۔ ایک اچھا خاصا انسان، جو ضعیف الاعتقاد بھی



نہ ہو، معاشرے میں ایک مضبوط حیثیت بھی رکھتا ہو وہ جب اس طرح کے حالات کا شکار ہوتا ہے تو اسے ایک عام آدمی سے زیادہ ذہنی و جذباتی توڑ پھوڑ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

وہ دوسروں کی ذہنی گتھیاں کھول کر رکھ دیتا تھا اب اس کا اپنا ذہن مقفل ہو چکا تھا اور اس قفل کو توڑنے کا کوئی طریقہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جن، بھوت، آسیب کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ عموماً ان سے متعلقہ جو کہانیاں دنیا والوں نے بن رکھی ہیں۔ جھوٹ اور فریب پر مبنی رہی ہیں۔

سوال یہ نہیں تھا کہ فلک بوس آسیب زدہ تھا یا نہیں۔ سوال یہ تھا کہ وہ آسیب اس کے پیچھے ہی کیوں پڑ گیا تھا؟ اور بالفرض محال یہ اس کا وہم بھی تھا تو وہ وہم ختم کیوں نہیں ہو پا رہا تھا؟

یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے سوال اسے مزید سے مزید تر ذہنی ابتری کا شکار بنا رہے تھے۔

معاویہ نے جانے سے پہلے اس سے بات کرنے کی کوشش کی، لیکن زندگی میں پہلی بار وہ اس سے ڈھنگ سے بات نہیں کر سکا۔ اس بات کا اسے افسوس بھی ہوا، لیکن وہ کیا کرتا۔ اپنی ذہنی حالت جیسے اس کے قابو میں ہی نہیں رہی تھی، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا، سب کو کیسے اپنی بات کا یقین دلائے۔ معاویہ نے واپس جاتے ہی ملک کے مشہور و معروف سائیکاٹرسٹ سے اپائنٹمنٹ لی، لیکن جب یہ بات وسامہ کو پتا چلی تو وہ بے زار ہو گیا۔

"تم اپنا وقت اور پیسہ دونوں برباد کرو گے..... مجھے کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے.... میں تمہاری بات مان لیتا ہوں کہ تمہیں ضرورت نہیں ہے، لیکن کیا تم میری اور آئے کت کی خوشی کے لیے سائیکاٹرسٹ سے نہیں مل سکتے؟" معاویہ نے جذباتی ہتھیار پھینکا۔

وسامہ چپ سا رہ گیا۔ اس بات کے بعد وہ انکار نہیں کر سکتا تھا، لیکن اقرار خود اس کی اپنے حوصلے ہمت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا۔

"مجھے معاف کرنا معاویہ! لیکن میں نہیں جاؤں گا۔"

"او بھائی! ایک بار بات کر لینے میں کیا جاتا ہے؟" اس نے اصرار کیا۔ "دنیا کا کوئی سائیکاٹرسٹ میرا مسئلہ سمجھ نہیں سکتا.... وہ آسیب.... عقل سے ماورا چیز ہے.... مافوق الفطرت چیزیں سائیکالوجی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔" وسامہ جیسے جذباتی ہو کر بولا تھا۔

"زیادہ سے زیادہ کوئی سائیکاٹرسٹ کیا کرے گا؟ مجھے ذہن اور اعصاب کو پُرسکون کرنے کی دوائیاں دے دے گا؟ اس سے میں کچھ دیر کے لیے اس پریشان کن صورت حال سے کٹ جاؤں گا.... لیکن ان ادویات کے استعمال کے بعد کیا وہ آسیب بھی فلک بوس سے نکل جائے گا.... کیا اس کا اثر میری زندگی پر ختم ہو جائے گا؟"

معاویہ کوئی جواب نہیں دے پایا، وسامہ نے تھک کر فون ہی بند کر دیا۔ ابھی فون بند کیا ہی تھا کہ وسامہ کے پبلشر کا فون آ گیا۔ وہ کتاب کے آخری ڈرافٹ کا تقاضا کر رہا تھا۔ وسامہ نے اس سے وعدہ کیا کہ آخری ڈرافٹ وہ جلد ہی مکمل کر لے گا، لیکن فون بند کر کے اس نے خود سے اعتراف کیا، جن حالات میں وہ رہ رہا تھا آخری ڈرافٹ لکھنا اتنا بھی آسان نہ تھا اگر ایسا ہوتا تو اب تک یقیناً وہ ڈرافٹ مکمل کر چکا ہوتا۔

فوری طور پر دوسرا خیال جو اسے آیا وہ یہ تھا کہ وہ ملک کے ادبی حلقوں کا ایک مایہ ناز نام ہے۔ جہاں چاہنے والے تھے، وہیں ایک بڑی تعداد اس کے حاسدین کی بھی تھی، ایسے میں اس کی ذہنی حالت کی ابتری کی خبر فلک بوس سے نکلتی تو جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی اور اس کے نام کو نقصان پہنچانے کا باعث بنتی۔ اپنے نام کو خراب ہونے سے بچانے کا ایک یہ ہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ اس کی نئی کتاب جلد منظر عام پر آتی اور مخالفین اور حاسدین کا منہ بند کرا دیتی۔ وسامہ نے دل کڑا کر کے خود سے عہد کیا کہ اپنے ذہن کو آسیب کے خوف سے نکال کر وہ جلد لکھنے کی

کوشش کرے گا۔ لیکن اس روز اس سے اگلے روز اور پھر اس سے اگلے بھی روز وہ اپنا عہد پورا نہیں کر پایا۔
وہ ذہنی یکسوئی جو تخلیقی کام کے لیے ضروری ہوتی ہے' وسامہ کو مل ہی نہیں پا رہی تھی۔ ان ہی دنوں معاویہ نے اسے کچھ ادویات بھجوا دیں' جن کے بارے میں معاویہ کا کہنا تھا' اس نے کسی سائیکاٹرسٹ سے وسامہ کا کیس ڈسکس کرکے حاصل کی ہیں۔ وسامہ دوائیوں کے اس لفافے کو دیکھ کر عجیب سی ذہنی کیفیت کا شکار ہوا' لیکن ذہنی سکون کے لیے اس نے ان ادویات کا استعمال شروع کر دیا۔
ان ادویات کے استعمال کی وجہ سے وہ گھنٹوں سویا رہتا۔ لیکن یہ نیند دیکھنے والوں کے لیے تھی۔ خود اسے عجیب بے چینی سی محسوس ہوتی رہتی تھی اور ایسا لگتا تھا وہ سوئی جاگی کیفیت کا شکار ہے۔ سارا وقت اسے عجیب عجیب خواب اور مناظر نظر آتے رہتے۔ کبھی وہ خود بھاگ رہا ہوتا اور کبھی کوئی اس کے تعاقب میں ہوتا۔ سوتے ہوئے ایسا لگتا' کوئی ہیولا اس کے ساتھ آکر بیٹھا ہے' اسے ہاتھ لگا رہا ہے' آنکھ کھل جاتی تو غنودہ ذہن کے ساتھ یہ سائے اسے خود پر لپکتے ہوئے محسوس ہوتے۔ وہ سو رہا ہوتا تو دل چاہتا اٹھ بیٹھے اور جاگ جاتا تو ذہن مزید سونے کی ترغیب دینے لگتا۔ سر بھاری اور آنکھیں سرخ رہنے لگیں اور وہ بے چارہ جو یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کچھ لکھ پائے گا' ان چار حرفوں کو لکھنے سے بھی گیا جو اس سے پہلے لکھ پا رہا تھا۔
"آپ کی بات صحیح تھی' ان دوائیوں سے اور کچھ نہیں ہو رہا۔ صرف آپ سو رہے ہیں۔" اس روز آئے کت نے اس کی حالت سے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔
وسامہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش رہا۔ اب اکثر ایسا ہوتا تھا۔ آئے کت اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی' وہ خاموش رہتا' بلکہ صرف یہ ہی نہیں وہ پہروں خاموش بیٹھ کر گزار دیتا تھا اور آئے کت کو اس کی اس کیفیت سے خوف آتا تھا۔ اس نے دو چار بار وسامہ سے بات کرنے اور اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کی' لیکن ناکام ہونے کے بعد مایوس ہو کر اٹھ گئی۔ اس شام فلک بوس میں عامل بابا تشریف لائے جن کا دعوا تھا' وہ ہر قسم کے شرارتی جن اور آسیب کو قابو کرنے کا گر جانتے ہیں۔ جس طرح ضدی سے ضدی محبوب کو قدموں میں لایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بھوت اور بدروحوں کو بھی زیر کرنے کے طریقے موجود ہیں' بس آپ کو عمل آنا چاہیے۔
یہ عامل بابا' آئے کت کی دریافت تھے۔ وہ انہیں وادی سے لے کر آئی تھی اور صرف اس امید پر ڈھونڈ کر لائی تھی کہ ان کے عمل سے وسامہ بہتر محسوس کرنے لگے گا۔ اس کا خیال تھا' وسامہ عامل بابا کو دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرے گا' وسامہ ان دنوں بے زاری کا شکار ضرور تھا' لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس نے عامل بابا کو فلک بوس میں عمل کرنے کی اجازت دے دی۔ ایک تو یہ کہ وہ کوئی معمولی عامل نہیں لگ رہے تھے' ان کا حلیہ عامل کے حلیے سے یکسر مختلف تھا۔ انہوں نے عام سی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور عام عاملوں کی طرح داڑھی رکھنے کے بجائے کلین شیو تھے دوسرے عامل بابا کا پہلا جملہ ہی اسے چونکا گیا تھا۔

"یہ بچہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ قلعہ بدروح کے اثرات سے بھرا ہوا ہے۔" انہوں نے ادھر اُدھر کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ آئے کت اور وسامہ نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔
"آپ۔۔۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" وسامہ نے پوچھا۔
"میں اس بدروح کی موجودگی کو محسوس کر سکتا ہوں۔" عامل بابا نے سنجیدگی اور قدرے فکرمند لہجے میں کہا۔ ساتھ ساتھ وہ گہرے گہرے سانس لے رہے تھے اور ان کے چہرے پر فکرمندی بڑھتی جا رہی تھی۔

وسامہ یہ سن کر ایک دم سے پُرجوش ہوا کہ کوئی اور بھی ہے جو اس کے علاوہ آیوشمتی کی موجودگی کو محسوس کر سکتا ہے۔

"یہ دیکھو۔ دیکھو میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ بدروح یہیں، ہمارے آس پاس ہے۔"

عامل بابا اب سارے کمرے میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اور منہ اٹھائے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کسی لے میں بول رہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان پر آیوشمتی کی موجودگی کو محسوس کر کے وسامہ والی کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی۔ پھر عامل بابا چلتے چلتے رک گئے اور آنکھیں بند کر کے زیر لب کوئی ورد کرنے لگے۔ ورد کرتے ہوئے ان پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی، ایسے جیسے وہ بے چین ہو رہے ہوں۔ چہرے پر کرب ناک تاثرات آگئے۔ وہ اپنا سر اُدھر اُدھر مارنے لگے۔ "جا چلی جا... نکل جا فلک بوس سے... چھوڑ دے اس کا پیچھا۔"

وہ سر اِدھر اُدھر مارتے ہوئے زور زور سے بولنے لگے۔ آئے کت اور وسامہ سہم کر ایک دوسرے کے قریب ہو گئے، لیکن بول ایک لفظ بھی نہ سکے۔ عامل بابا نے آنکھیں کھولیں۔ ان کی آنکھیں ڈرا دینے کی حد تک لال ہو رہی تھیں۔ چند منٹ لگے انہیں اپنی اصل کیفیت میں واپس آنے میں...

"بہت طاقت ور آسیب ہے... اسے بھگانے کے لیے مجھے پوری رات عمل کرنا پڑے گا، لیکن آپ بے فکر ہو جائیں... اگرچہ اس عمل کو کرتے ہوئے میری جان کو خطرہ لاحق رہے گا، لیکن میں عمل اس وقت تک ختم نہیں کروں گا جب تک وہ آسیب آپ کا پیچھا چھوڑ نہیں دیتا۔" عامل بابا کا انداز بڑا تسلی آمیز تھا۔

"لیکن آپ کی جان کو تو ہم خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔" وسامہ نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ "میری فکر نہ کریں... میں نے اس سے زیادہ طاقت ور جنوں اور بدروحوں کو زیر کیا ہے... مشکل ہو گا، لیکن میں کر لوں گا..." عامل بابا بہت پریقین تھے۔

"اور بدلے میں... ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟" آئے کت نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ایک بار اس بدروح کو میرے قابو میں آلینے دیں... اس کے بعد سب کچھ طے کر لیں گے۔" عامل بابا نے مسکرا کر کہا۔ آئے کت تذبذب کا شکار ہوئی، لیکن پھر جلدی سے بولی۔

"آپ کا عمل کتنی دیر میں مکمل ہو گا؟ اور کیا آپ یہ عمل فلک بوس میں کریں گے؟"

"جی ہاں... عمل تو فلک بوس کے اندر رہ کر ہی کرنا ہو گا... اور کتنا وقت لگے گا اس کے بارے میں... میں حتمی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتا... چوبیس گھنٹے تو لازمی لگیں گے، شاید اس سے زیادہ وقت بھی لگ سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں۔"

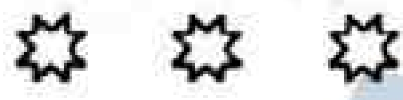
"سامان میں لکھ دیتا ہوں... مجھے یہ سب منگوا دیں۔" عامل بابا نے ایک پرچی۔ آئے کت کے ہاتھ میں تھما دی، جس پر لوبان کی لکڑی، قینچی، ایک سات گز لمبی رسی، دیسی انڈے، ایک سو سوئیاں ٹائپ چیزیں لکھی ہوئی تھیں۔

"ٹھیک ہے... میں ملازم سے یہ سب چیزیں منگوا دیتی ہوں۔"

"مجھے فلک بوس کا کوئی ایسا کمرہ دکھائیں، جو عمارت کے بالکل درمیان میں ہو... جو عمل میں کرنے والا ہوں، وہ عمارت کے درمیان میں ہی ہو سکتا ہے۔"

وسامہ خاموشی سے عامل بابا کو اس جگہ لے گیا، جسے فلک بوس کا درمیان کہا جا سکتا تھا۔ آئے کت نے عامل بابا کو ان کا مطلوبہ سامان منگوا دیا اور پُرامید دلوں کے ساتھ بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ مغرب سے پہلے تک عامل بابا

نے عمل کی تیاری کی اور مغرب کے بعد عمل شروع کیا، جس کے بارے میں ان کا دعوا تھا۔ چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔ وہ عمل شروع ہوا تو آیوشمتی نے انہیں چوبیس تو کیا چار گھنٹے بھی نکالنے نہیں دیے۔ ایسی درگت بنائی عامل بابا کی کہ وہ اس سے خوف زدہ ہو کر بھاگے اور پھر پلٹ کر فلک بوس کی طرف نہیں دیکھا۔ سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے اور۔۔۔ اور وسامہ کی یہ امید بھی ٹوٹ گئی۔



عامل بابا اتنی بری طرح خوف زدہ ہوئے تھے کہ اس رات خود پر بیتی ہوئی کیفیت کے بارے میں بتا بھی نہیں پا رہے تھے۔ وسامہ نے بڑی دقت سے انہیں بولنے پر مجبور کیا تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ بہت بھیانک چہرہ تھا۔۔۔ ایسے عمل کے دوران کانوں میں آوازیں ضرور آتی ہیں، لیکن آنکھیں اور کان بند رکھ کر عمل مکمل کرنا ہوتا ہے۔۔۔ آج سے پہلے کبھی میں نے ایسی کسی آواز پر آنکھیں نہیں کھولیں۔۔۔ لیکن کل۔۔۔ پتا نہیں کیوں ان آوازوں سے میں ڈر گیا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔ وہ چہرہ بالکل میرے سامنے تھا۔۔۔ اور ایسا کریہہ تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔۔۔ اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور ایک ہاتھ سے اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔۔۔ اگر میں وہاں سے بھاگ نہ گیا ہوتا تو وہ مجھے جان سے مار دیتی۔"

اور وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگے۔۔۔ صاف پتا چلتا تھا ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں رہی۔ وسامہ نے دیکھا ان کے چہرے اور بازوؤں پر مار پیٹ کے نشان تھے۔ دیوار سے ٹکرانے کی وجہ سے سر پھٹ چکا تھا، جس پر اس وقت پٹی بندھی تھی۔ وسامہ کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

"کوئی اور پیر فقیر، تانترک رہ گیا ہے، تو اسے بھی لے آؤ۔ تاکہ سب آئیں اور اس آسیب کے شر کا شکار ہو کر میری پریشانی میں اضافہ کرتے رہیں۔" وسامہ نے بے بسی بھرے غصے کے ساتھ آئے کت سے کہا تھا۔

آئے کت نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ "ان سب باتوں کے باوجود۔۔۔ میرا دل یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ یہاں آسیب جیسی کوئی چیز ہے۔" وہ جیسے یہ سب برداشت کرتے کرتے تھک چکی تھی اور آج بڑا تھک ہار کر ہی بولی تھی۔

"کیا کہنا چاہتی ہو تم؟" وسامہ بھڑک اٹھا۔ "تمہیں لگتا ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں یا اب تک آیوشمتی کی موجودگی کی وجہ سے جو بھی حادثات ہوئے ہیں وہ فرضی تھے؟"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔۔۔" وہ جلدی مگر تحمل سے بولی۔ "لیکن وہ تمام حادثات جو فلک بوس میں رونما ہوئے۔۔۔ اگر غور کریں تو محض حادثات بھی ہو سکتے ہیں۔۔۔ ہم کیوں انہیں آیوشمتی سے منسوب کرنے پر تلے ہوئے ہیں، جبکہ ہم نے کبھی اسے دیکھا بھی نہیں۔"

"کانسٹیبل اسلم کی موت کا کوئی جواز ہے تمہارے پاس؟" وسامہ کی ناراضی میں اضافہ ہوا۔ "اور اب اس عامل پر ہونے والا حملہ۔۔۔"

"ممکن ہے، وہ عامل عمل کے دوران ڈر گیا ہو۔۔۔ جو ایسی عجیب و غریب باتیں کر رہا ہے۔" آئے کت نے جھلاہٹ آمیز پریشانی کے ساتھ کہا۔

"ہر چیز کو ہم فرض نہیں کر سکتے آئے کت! میں تمہیں بتا رہا ہوں۔۔۔ میں نے اس عورت کی موجودگی کو محسوس کیا ہے۔۔۔ تم دیکھ لینا۔۔۔ جلد یا بدیر وہ خود بھی سامنے آ کر کھڑی ہو جائے گی۔۔۔ اور وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔" وہ ایک ٹرانس میں بولنے لگا تھا۔

"آپ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں۔" وہ دہل گئی۔
"ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں وسامہ! سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔" "ہم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ یہاں رہنا تمہاری خواہش تھی۔"
"آپ سے بڑھ کر کوئی خواہش عزیز نہیں ہے مجھے۔" وہ رو نکھی ہو گئی۔
"سارے فساد کی جڑ یہ فلک بوس ہے... نہ میں یہاں رہنے کی ضد کرتی' نہ یہ سب کچھ ہوتا... پہلے آپ کا ایکسیڈنٹ... اور پھر یہ آسیب..."
"تم کیوں ایسا سوچتی ہو... تمہاری غلطی نہیں ہے۔" وسامہ نے تڑپ کر کہا تھا' لیکن آئے کت رونے لگی' اس کے پچھتاوے بڑھنے لگے تھے' لیکن وسامہ نے طے کیا وہ لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔ یقیناً "یہ ایک اچھا فیصلہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ ہی سن رکھا ہے آسیب' جس جگہ قابض ہو وہاں کسی کو بسنے نہیں دیتا' تو ممکن ہے آیوشمتی اسی لیے وسامہ کو تنگ کرتی ہو کہ وہ دونوں فلک بوس کو چھوڑ کر چلے جائیں۔
وسامہ نے طے کیا' وہ فلک بوس سے چلے جائیں گے اور دوبارہ کبھی یہاں نہیں آئیں گے اور یہ بھی کہ وہ معاویہ کو قائل کرے گا' وہ فلک بوس کو بیچ دے اور دوبارہ کبھی یہاں نہ آئے۔ یہ طے کرتے ہی وہ قدرے پرسکون ہوا' لیکن اس روز بھی سونے کے لیے اسے نیند کی ایک سے زیادہ گولیوں کا سہارا لینا پڑا تھا۔ نیند جیسے اس سے روٹھ ہی گئی تھی۔



بشام میں اس رات گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ آئے کت سارے کام سمیٹ کر سونے کے لیے لیٹ گئی' وسامہ اس کے ساتھ لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔
"آپ سو کیوں نہیں جاتے؟؟"
"نیند نہیں آ رہی۔" اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ "سونے کی کوشش کریں وسامہ!"
"تم سو جاؤ... میں بھی تھوڑی دیر میں سو جاؤں گا۔" آئے کت نے بڑھ کر اس کے بازو پر سر رکھا اور چند منٹوں میں ہی سو گئی۔ اس روز وہ تھکی ہوئی تھی' سو نیند بھی خوب جم کر آئی۔ وسامہ جب کافی دیر تک کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا تو اس نے اٹھ کر نیند کی گولیاں کھائیں... دو' چار... اور وہ جانتا تھا وہ حماقت کر رہا ہے۔ لیکن نیند تھی کہ آ کر نہ دے رہی تھی۔ ویسے بھی اسے اب عادت پڑ چکی تھی۔ نیند کی دوائیاں کافی مقدار میں کھانے کی۔ بہرحال اس کے بعد اسے زیادہ تنگ ہونا نہیں کرنا پڑی اور وہ گہری نیند سو گیا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا' جب اسے ایسا لگا جیسے کوئی اس کے پاس آ کر بیٹھا ہو اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے جاگنے کے لیے کہہ رہا ہو۔ وسامہ کی نیند میں خلل پڑ گیا۔ ویسے بھی گہری نیند میں بھی اسے عجیب عجیب خواب نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا۔
"وسامہ! وسامہ!" ایک خوب صورت آواز اسے پکار رہی تھی۔
وسامہ نے بدقت تمام آنکھیں کھولیں اور بدک کر پیچھے ہٹا' کیونکہ ایک بھیانک چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا۔ وسامہ نے چیخ کر آئے کت کو مدد کے لیے پکارنا چاہا' لیکن کریہہ ہاتھ اس کے ہونٹوں پر مضبوطی سے جم گیا۔ وسامہ کی جان لرز گئی۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مر جانے کی حد تک کانپتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے پورے جسم کی طاقت لگا کر خود کو آزاد کروایا اور گرتا پڑتا بیڈ سے اٹھا اور گھسٹتا ہوا دروازے کی طرف بھاگنے لگا۔ بیساکھی اس کے ہاتھ میں نہیں تھی' لیکن وہ اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اپنی جان بچانے کے خیال سے سارے جسم

میں ایک الگ ہی قوت بیدار ہوگئی تھی۔ خود کو گھسیٹ کر چلتے ہوئے وہ بار بار مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے پلنگ سے اترتے ہی وہ آسیب بھی اٹھا اور ہوا پر تیرتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وسامہ کی رفتار میں تیزی آگئی' وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

سارا فلک بوس رات کی خاموشی اور اسرار میں ڈوبا ہوا تھا' باہر بارش تڑتڑ برس رہی تھی اور خوب گرج چمک کے ساتھ شاید صبح تک جاری رہنے والی تھی۔ وسامہ کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ خود کو اس آسیب سے بچانے کے لیے کہاں لے کر جائے۔ بالآخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ وہ تیزی سے تہ خانے کی طرف بڑھا اور جیسے تیسے تہ خانے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ یہاں اور بھی خاموشی اور اسرار پھیلا ہوا تھا۔ ایک انسان اضطراب میں جیسی حرکتیں کرسکتا ہے' وسامہ بھی بالکل ویسے ہی کررہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا وہ خود کو کیسے بچائے' اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ آسیب اس کے تعاقب میں ہے اور اسے خود کو اس آسیب کے شر سے بچانا تھا۔ تہ خانے میں ایک تابوت نما الماری پڑی ہوئی تھی۔ وسامہ نے ایک آخری سہارے کے طور پر خود کو اس الماری میں چھپالیا دروازہ بند کیا لاک لگ گیا۔

کانپتا ہوا وسامہ الماری کی دیوار کے ساتھ گھسٹتا ہوا نیچے بیٹھ گیا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور دل بے ہنگم انداز میں دھڑک رہا تھا۔ لیکن وہ خود کو یہاں محفوظ محسوس کررہا تھا۔ چند سیکنڈ وہ ایسے ہی ٹیک لگائے بیٹھا رہا' پھر اس کا ذہن نیند میں ڈوبنے لگا۔ وہ بے چارہ نہیں جانتا تھا' اس کا ذہن وقتی نیند میں نہیں' بلکہ ابدی نیند میں ڈوب رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

بردکلن کے اس خوب صورت کمرے میں بیٹھے ہوئے معاویہ کی آنکھیں بے حد لال ہورہی تھیں۔ وسامہ کی ڈائری کی داستان وہاں ختم ہوجاتی تھی' جہاں سے نیند کی گولیوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ باقی کی ساری باتیں معاویہ کی اپنی خود کی اخذ کردہ تھیں۔ سارے مفروضے تھے جو وسامہ کی موت کے بعد بطور نتیجہ جمع کیے گئے تھے۔ لیکن سو باتوں کی ایک بات' معاویہ کے لیے وسامہ کا اس دنیا سے چلے جانا ایک ایسا حادثہ تھا جس نے اس کی ساری شخصیت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اس کا بھائی' اس کا دوست چلا گیا۔ معاویہ کے لیے اس سے بڑا غم' اس سے بڑا نقصان اور کوئی نہیں تھا۔ اسے بار بار یہ پچھتاوا ستاتا کہ کاش اس نے وسامہ کی بات کا اعتبار کرلیا ہوتا۔ اگر وسامہ کہہ رہا تھا۔ فلک بوس میں آسیب ہے تو وہ مان کیوں نہیں گیا۔ اگر وسامہ کہہ رہا تھا' کوئی چیز اسے خوف زدہ کرتی ہے تو اس نے یقین کیوں نہیں کیا؟ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ بروقت وسامہ کو سائیکاٹرسٹ کے پاس لے گیا ہوتا اور اگر یہ نہیں تو کم سے کم اسے فلک بوس سے ہی اپنے ساتھ لے گیا ہوتا۔ زندگی میں ان گنت پچھتاوے تھے۔ لیکن ان پچھتاووں سے بھی زیادہ سوال تھے جن کے جواب وہ کئی سالوں سے ڈھونڈ رہا تھا اور جواب اسے ملتے نہ تھے۔ وہ بے خوابی کا مریض یوں ہی نہیں بن گیا تھا۔ زندگی میں بہت حادثات دیکھے تھے۔ اپنے قریبی عزیزوں کو خود سے دور ہوتے دیکھا تھا' ان سے بچھڑنے کا دکھ سہا تھا۔

اس طویل سفر میں وہ' وہ نہیں رہا تھا جو تھا اور جو بن گیا تھا ویسا کبھی بننا نہیں چاہتا تھا۔ دنیا کے لیے وہ ایک راز بن چکا تھا جو کسی پر کھلتا نہ تھا اور بہت سے راز تھے جن کا سراغ وہ تلاش نہ کرپایا تھا۔ اس وقت بھی اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ وہ سونا چاہتا تھا' لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ معاً اسے کچھ خیال آیا تو وہ اٹھا اور اپنے

اپارٹمنٹ سے باہر آگیا اس کا رخ ایڈمز اسٹریٹ کی طرف تھا۔وہ جگہ جہاں منفرا کا ہاسٹل تھا۔

٭ ٭ ٭

مونٹوک جانے کے لیے منفرا جتنی پُرجوش ہو رہی تھی اس صبح معاویہ سے ملاقات کے بعد اس سارے جوش و خروش پر جیسے پانی گر گیا۔وہ خود نہیں جانتی تھی۔ایسا کیوں ہوا لیکن اب وہ پہلے کی طرح تیاریاں نہیں کر رہی تھی۔پارک سے واپس آکر اس نے اطمینان سے شاور لیا۔پنیر اور چکن سے بنا ہوا ڈبل پٹی سینڈوچ کھایا۔اس سینڈوچ کو بنانے میں اس نے جان بوجھ کر ایک گھنٹہ صرف کیا تھا۔سینڈوچ کے ساتھ بہت اسٹرانگ سی کیپی چینو بنائی۔

ٹی وی لگا کر جب وہ اس کے سامنے بیٹھی اپنا سینڈوچ کھا رہی تھی اور کافی کے گھونٹ لے رہی تھی تو ایسا لگتا تھا دنیا میں اس سے زیادہ فارغ انسان اور کوئی نہ ہوگا اور یہ بھی کہ اس ڈائننگ کے دوران اس قدر ہائی کیلوریز ناشتا اس کے وزن میں کتنے پاؤنڈز کا اضافہ کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔وہ بلاوجہ خوش تھی اور اس خوشی کی اصل وجہ اس کے لاشعور میں چھپی ہوئی تھی۔

منفرا نے ڈاکٹر رحمن کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ بڑا سنبھال کر رکھا تھا۔ایسے جیسے وہ نسخہ نہ ہو کوئی مقدس صحیفہ ہو۔

اس روز چار بار بغیر کسی وجہ کے وہ نسخہ نکال کر اس نے دیکھا اور تسلی کرکے اپنی الماری میں رکھ دیا۔شام میں اسے مارکیٹ جانا پڑا جہاں اسے معاویہ کی کال موصول ہوئی' وہ اس کے ہاسٹل کے باہر کھڑا تھا اور اپنا نسخہ لینے آیا تھا۔

یہ سنتے ہی کہ معاویہ ہاسٹل آیا ہوا ہے' منفرا کے اندر جیسے بجلی سی بھر گئی۔اس کے حساب سے نسخہ اسے صبح معاویہ کے حوالے کرنا تھا۔اس طرح اچانک اس کا ہاسٹل پہنچ جانا خاصا حیران کن بات تھی۔وہ بھی اس صورت حال میں جبکہ اس نے بے حد سرسری انداز میں ہاسٹل کا ایڈریس اسے بتایا تھا۔بہرحال منفرا نے اس سے چند منٹ انتظار کرنے کا کہا۔(چند منٹ اس نے اپنی ایکسائٹمنٹ میں کہہ دیا تھا' جبکہ ہاسٹل کم سے کم بھی آدھا گھنٹے کی مسافت پر تھا۔) اگلا کام بھاگم بھاگ اپنا بل ادا کرنے کے بعد پارکنگ سے اپنی سائیکل نکال کر ہوا کی رفتار سے چلانے کا تھا۔اس سے زیادہ تیز سائیکل شاید اس نے زندگی میں کبھی چلائی ہو' لیکن اس کے باوجود اس کے پہنچنے سے پہلے معاویہ ٹی بی سے نسخہ لے کر جاچکا تھا اور یہ بات منفرا کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں تھی۔

"اسے جلدی تھی۔۔۔بار بار تمہیں بلانے کے لیے کہہ رہا تھا تو مجبوراً" میں نے پرسکرپشن اسے دے دیا۔"

ٹی بی نے بھی معذرت خواہانہ انداز میں کہا تھا۔وہ منفرا کی ایکسائٹمنٹ دیکھ چکی تھی اور جانتی تھی۔منفرا اپنے منہ سے تسلیم کرے یا نہ کرے' لیکن وہ معاویہ میں دلچسپی لے رہی تھی اور یہ بات اسے کچھ خاص پسند نہیں آرہی تھی۔معاویہ عجیب معمہ سا انسان تھا۔اس کے ماتھے پر لکھا تھا۔وہ کبھی نہ سمجھنے والی پہیلی ہے اور ٹی بی نہیں چاہتی تھی' منفرا اس پہیلی میں الجھے۔خصوصاً" تب جب وہ اس حالیہ ملاقات میں معاویہ کے بارے میں کچھ اور اندازے بھی لگا چکی تھی۔

"تم اتنی مایوس کیوں لگ رہی ہو؟ کیا میں یہ سمجھوں' تمہیں میرا اسے پرسکرپشن دینا برا لگا ہے۔"

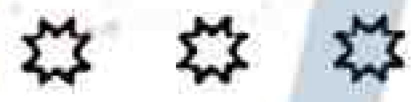
"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" منفرا نے سست سے انداز میں کہا۔ٹی بی اس کے انداز سے خفیف سی ہو گئی۔

"میں نہیں چاہتی تھی تم اس میں دلچسپی لو۔مجھے لگتا ہے' وہ تمہیں نقصان پہنچائے گا۔"

"کم آن نی بی! میں صرف اس پر تھوڑی ریسرچ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ ایک اچھا پروجیکٹ ثابت ہو سکتا ہے۔۔۔ اور اس سے آگے میں کچھ نہیں سوچ رہی۔" منفرا نے کہا۔ "آر یو شیور؟" نی بی جانے کیوں مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔

"سو فیصد۔۔۔" منفرا مسکرائی۔ "میں نوڈلز لائی ہوں۔۔۔ چلو ذرا پیٹ پوجا کا بندوبست کرتے ہیں۔"

محض نی بی کو چیئر اپ کرنے کے لیے اس نے کہا تھا' اپنا دل تو بجھ سا گیا تھا۔



کیف نے اپنا بیگ پیک کر کے رکھا اور ایک طرف بیٹھ کر بڑی خاموشی سے ان چار گھنٹوں کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ چار گھنٹے بعد اسے اسلام آباد کے لیے روانہ ہونا تھا۔

"کیف بیٹا!"

"جی امی؟"

"کیا تم مجھ سے ناراض ہو کر جا رہے ہو؟"

"نہیں امی! میری اتنی مجال کہاں۔"

"شکر ہے اللہ کا۔ اس نے ایسی تابع دار اور احترام کرنے والی اولاد سے نوازا ہے۔"

صباحت بیگم نے ہاتھ اٹھا کر رب کا شکر ادا کیا۔ تو کیف نے انہیں ناراضی سے دیکھا' یعنی اس کے لہجے کی اتنی رکھائی کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ امی کے نزدیک صرف یہ اہم تھا کہ وہ ہنستا ہوا' بات کرتا ہوا نظر آ تا رہے' دل میں جو ہے وہ رہے۔

"جی ہاں۔۔۔ نہ صرف تابع دار' احترام کرنے والی اولاد سے نوازا ہے' بلکہ بہت ہی بے وقوف اولاد سے بھی نوازا ہے۔" وہ جل کر بولا تھا۔

کچھ دور بیٹھی فہمینہ نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"دیکھو۔۔۔ تمہاری ناراضی اپنی جگہ درست' صحیح۔۔۔ لیکن مجھے بے وقوف کہنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔"

اس نے بڑی سنجیدگی سے مذاق کیا تھا۔ صباحت بیگم نے حیرانی سے اپنے دونوں بچوں کو دیکھا جن کی کوئی بھی بات کم سے کم ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"میں تمہیں نہیں خود کو کہہ رہا ہوں۔" کیف فرید جھلا کر بولا' اس کی کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی یا شاید کوئی سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

"اچھا۔۔۔ پھر ٹھیک ہے۔" وہ دوبارہ اپنی کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ارے کوئی مجھے بھی بتائے گا' آخر یہاں ہو کیا رہا ہے؟" صباحت بیگم نے کہا۔ "یہاں کچھ نہیں ہو رہا۔۔۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اب تک آپ نے اور ابو نے مجھے بے وقوف بنا کر رکھا ہوا تھا۔ بچپن سے یہ ہی کہتے آئے ہیں کہ کیف ہمارا لاڈلا اکلوتا بیٹا ہے۔۔۔ اس کی کوئی بات نہیں ٹالی جا سکتی۔۔۔ مجھے اب پتا چلا' میری کوئی بات آپ لوگ مان ہی نہیں سکتے۔" صباحت بیگم نے گہری سانس بھر کر پہلو بدلا اور بولیں۔

"جس چیز پر خود اب روشن کو ہی اعتراض نہیں ہے' تم نے اس کو ضد کیوں بنا لیا ہے؟"

"بات ضد کی نہیں ہے امی! آپ لوگوں نے مجھے ہرٹ کیا ہے۔۔۔ کیا گھر کے اکلوتے بیٹے کی اتنی سی بات بھی نہیں مانی جا سکتی تھی؟ اور کس مان سے جا کر میں نے خوش نصیب سے کہا تھا کہ وہ لوگ میرا کمرہ لے سکتی ہیں۔"

اسے سخت قلق ہورہا تھا۔

''ائے ہائے... ایک تو یہ منحوس ماری خوش نصیب...'' صباحت بیگم بھڑک کر بولیں۔

''خوش نصیب کو کچھ مت کہیں... وہ آپ کی مستقبل قریب کی بہو ہے... ایسا کوئی لفظ نہ بولا کریں اس کے لیے... جس کے لیے بعد میں آپ کو پچھتاوا ہو۔'' اس نے نروٹھے پن مگر اطمینان سے کہا اور باہر نکل گیا۔

فہمینہ، جو کب سے کتابوں میں سر دیے بیٹھی تھی، اس بات پر ایسے چونکی جیسے جانتی ہو کہ بخت جنگ کا بگل بجا گیا ہے۔

صباحت بیگم ہکا بکا۔ کیف جا چکا تو چند منٹ بعد بولنے کے قابل ہوئیں اور ایسے جیسے انسان عظیم ترین صدمے سے نکل ہی نہ پا رہا ہو۔

''ائے... ائے... فہمینہ! میں مرتی مرجاؤں گی، لیکن اس پچھل پیری کو اپنی بہو نہیں بناؤں گی۔'' یک دم وہ بھڑک کر بولی تھیں۔

''اوہو... آپ کس کی باتوں پر دھیان دے رہی ہیں... جانتی تو ہیں کیف کی مذاق کرنے کی عادت ہے۔'' وہ بے چاری پریشان ہو گئی کہ کیسے بات سنبھالے۔

''ارے ہاں... مذاق ہی کر رہا ہو گا۔'' صباحت بیگم نے ایسے کہا جیسے اس بات پر بھی یقین نہ ہو، لیکن خود کو یقین دلانا چاہتی ہوں۔

''مذاق ہی کر رہا تھا امی! آپ خواہ مخواہ جذباتی ہو گئیں... خود سوچیں، کہاں ہمارا لاکھوں میں ایک شہزادوں جیسا کیف... اور کہاں وہ پچھل پیری، کالی کلوٹی، موٹی ناک والی خوش نصیب۔''

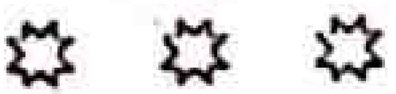
صرف ماں کا بلڈ پریشر نارمل کرنے کے لیے وہ ہر وہ لفظ بولتی چلی گئی جو خوش نصیب کا ذکر کرنے کے لیے ان کا من پسند ہو سکتا تھا۔ حالانکہ نہ تو خوش نصیب کی ناک موٹی تھی، نہ رنگ کالا۔

''اور چال دیکھی ہے اس کی... ایسے لہرا کر چلتی ہے جیسے دائیں بائیں چار چیزیں اپنی جگہ سے ہلا کر چھوڑے گی۔'' صباحت بیگم نے قدرے مطمئن ہو کر کہا ساتھ ہی بولیں۔

''اے فہمی! شام تک فضیلہ کا مہمان نہ آرہا ہوتا تو میں خود ہی پوچھ لیتی، لیکن اب وقت نہیں ہے... تو کیف سے نزدیک ہے... بڑی باتیں کرتے ہو تم دونوں بہن بھائی... ذرا سن گن لیتی رہنا... ایسا نہ ہو کیف کے دل میں وہ بدبخت ڈیرا ڈالے بیٹھی ہو اور ہمیں کانوں کان خبر نہ ہو۔'' ''آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں امی! میں کہہ تو رہی ہوں۔ کیف مذاق میں کہہ گیا ہے۔''

''تم سے جیسا کہا ہے ویسا کرو... کل کو سر پکڑ کر رونے سے بہتر ہے ابھی سدباب کر لیا جائے۔ ویسے بھی بڑی سائڈ لیتا پھرتا ہے خوش نصیب کی... کب کھوپڑی گھوم جائے، کچھ پتا نہیں... مرد کی نرم دلی بعض اوقات بڑے مسائل کھڑے کر دیتی ہے اور یہ ہمارا کیف تو ہے بھی معصوم... اس چلتر کی باتوں میں آکر کوئی انتہائی قدم ہی نہ اٹھالے۔''

وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئیں اور فہمینہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔



فضیلہ چچی کا مہمان نہ ہوا، آسمان سے اترا ہوا کوئی شہزادہ ہو گیا۔ جس کی سواری باد بہاری، سیدھی کوہ قاف سے فضل منزل میں اترنے والی تھی۔

فضیلہ چچی نے کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچ دیا تھا کہ سب ہی کی منتظر نگاہیں بار بار مرکزی دروازے تک آکر پلٹ جاتی

تھیں۔ کچن ہائی الرٹ تھا۔ روشن آرا کو ایسی لمبی فرمائشی کھانوں کی لسٹ تھمائی گئی تھی کہ سارا ہی گھر انواع واقسام کی خوشبوؤں سے بھر گیا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک تو ذائقہ بھی بہت تھا' پھر کچھ کھانا بناتی بھی بہت خوش دلی سے تھیں۔ ذائقہ خود بخود دوچند ہو جاتا تھا۔

ماہ نور ان کی مدد کو موجود تھی۔ منہا اور صیام کو صبح سے ہی تیار رہنے کا حکم ملا ہوا تھا۔ نہمینہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی' سو اس سے ایسی ایکٹوٹیز میں مدد کی توقع ذرا کم کم ہی رکھی جاتی تھی۔ باقی بچی خوش نصیب۔ تو اسے اپنی روشن امی اور ماہ نور کے صبح سے کچن میں گھسے ہونے کا ایسا زبردست افسوس لاحق تھا کہ اس نے کچن میں جھانک کر بھی نہ دیکھا۔ کہ نہ دیکھے گی نہ دل جلے گا۔ سارا وقت اوپر اپنے کمرے میں گھسی کبوتروں کی غٹرغوں سنتی رہی اور دل جلاتی رہی۔

شکر ہوا جب بارہ بجے کے قریب فریحہ آگئی۔ خوش نصیب کو اتنی زیادہ خوشی فریحہ کے آنے سے نہیں ملی تھی' جتنی وہ فریحہ کے ہاتھوں میں پکڑی لاہوری چرغے کی پلیٹ کو دیکھ کر خوش ہوئی۔

"اُف۔۔۔ قسم خدا کی۔۔۔ اتنی اچھی تم مجھے کبھی نہیں لگیں جتنی اس وقت لگ رہی ہو۔"

خوش نصیب نے خوب گہری سانس کھینچ کر چرغے کی خوشبو کو اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا۔

"ثمرین کے سسرال والے آرہے ہیں۔ امی نے ان کے لیے بنایا تھا۔۔۔ میں نے سوچا' تمہیں بھی چکھا دوں۔"

"ہائے۔۔۔ ماں صدقے جائے۔۔۔ تم بھی کبھی کتنا اچھا سوچ لیتی ہو فریحہ!" وہ نثار ہوتی نظروں سے فریحہ کو دیکھ کر بولی۔

فریحہ کو ہنسی آگئی۔ "پاگل ہی ہو۔"

"اچھا اس طرف آجاؤ۔" وہ فریحہ کو کمرے سے منسلک اس گیلری میں لے گئی جو فضل منزل کے صحن کی طرف کھلتی تھی۔ سامنے کی دیوار میں ساتھ ساتھ تین جھروکے بنے ہوئے تھے۔ جن پر فی الوقت چقیں لٹک رہی تھیں۔ جھروکوں سے آگے دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ جن پر خوش رنگ چادریں پھیلائی گئی تھیں۔ چارپائیوں کے درمیان بس اتنا ہی فاصلہ تھا کہ ایک انسان باسہولت کھڑا ہو سکے۔

خوش نصیب نے آگے بڑھ کر چقوں کی ڈوریاں کھینچیں' یہاں تک چقیں چھت سے جا لگیں اور باہر سے چھن چھن کر آتی روشنی مٹھی بھر دھوپ کے ساتھ ساری گیلری میں پھیل گئی۔ خوش نصیب نے فریحہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دوسری چارپائی پر بیٹھ کر چرغے سے انصاف کرنے لگی۔

فریحہ متاثر کن انداز میں ساری گیلری کو دیکھ رہی تھی۔ "واہ۔۔۔ بڑا اچھا سیٹ کر لیا ہے سب کچھ۔۔۔"

"سب روشن امی اور ماہ نور کے سگھڑ پنے کا کمال ہے۔" خوش نصیب نے فخریہ انداز میں کہا۔

"یہ چقیں دیکھ رہی ہو؟ ان دونوں نے مل کر بنائی ہیں اور وہ بھی صرف سات دن میں۔۔۔"

فریحہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"اتنا خوب صورت کام انہوں نے کیسے کر لیا؟" وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور ایک چق کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے متاثر کن انداز میں بولی۔

خوش نصیب نے ذرا دیر کو ہاتھ روک کر تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

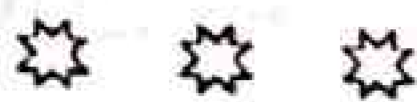
"کیا مطلب؟ میری امی اور بہن کوئی خوب صورت کام نہیں کر سکتیں کیا؟"

"ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔" فریحہ نے سر پیٹ لیا۔ "تمہیں تو سوال بھی پورے سیاق و سباق کے ساتھ سمجھانا پڑتا ہے۔۔۔ مجال ہے، جو آدھے جملے سے بات سمجھ لو۔"

"ہاں۔۔۔ تو میں ٹھہری سیدھی سادی معصوم لڑکی۔۔۔ تمہاری طرح چالاک تھوڑی ہوں جو ایک جملے سے پوری

داستان اخذ کر لے۔" وہ اترا کر بولی۔
"لو اور سنو... کہہ کون رہا ہے۔" فریحہ نے مذاق اڑایا۔ "پورا محلہ واقف ہے تمہاری معصومیت اور سیدھے سادے پن سے..."
"اچھا اب ایک چرغہ کھلا کر اتنی باتیں مت سناؤ۔" خوش نصیب نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ "روشن امی اور ماہ نور کا کام پسند آیا یا نہیں۔"
"ایسا بہترین کام ہے کہ کیا بتاؤں۔" اس نے بڑے دل سے سراہا۔
"میں تو سوچ رہی ہوں ثمرین سے کہوں روشن خالہ سے ایسی چقیں بنوا کر اپنے جہیز میں رکھ لے... قسم سے شان بڑھ جائے گی جہیز کی۔"
"ہاں بنوا لے... روشن امی کو ویسے بھی لڑکیوں کے جہیز کی چیزیں بنانے کا بہت شوق ہے۔ یاد نہیں... پچھلی گلی والی نغمانہ کے لیے کیسی بہترین کروشیے کی چادر بن کر دی تھی۔"
"یاد ہے... بہت نرم دل ہے روشن خالہ کا... ماہ نور بھی بالکل ان کے جیسی ہے... تم پتا نہیں کس پہ چلی گئیں۔
"زیادہ بک بک مت کرو... ہمارے گھر آج فضیلہ چچی کا کوئی مہمان آرہا ہے... مہمان ایک ہے لیکن دعوت کا کھانا ایسے بن رہا ہے جیسے کسی کا چھوٹا سا ولیمہ منعقد ہونے جارہا ہو... تم نے زیادہ زبان چلائی تو میں ایک بھی چیز تمہارے گھر نہیں بھجواؤں گی۔"
"بیٹا! فضیلہ چچی کا مہمان ہے۔ انہوں نے تمہیں ہی کھانے کو دے دیا تو بڑی بات ہوگی۔" فریحہ خوب ٹھٹھا لگا کر ہنسی تھی۔ خوش نصیب مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔
"اچھا سنو..." فریحہ نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا' جیسے اس بات کا یقین کر رہی ہو کہ کوئی ان کی بات تو نہیں سن رہا۔
"بیری پیر والے بابا جی نے تمہارے لیے پیغام بھیجا ہے۔"
وہ کھسکتی ہوئی جا کر خوش نصیب کے ساتھ بیٹھ گئی اور سرگوشی کی سی آواز میں بولی۔
"بیڑہ غرق..." خوش نصیب کے حلق میں نوالہ پھنس گیا۔ آنکھیں صدمے سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ منہ بند کرنا بھی بھول گئی۔
"ابھی ایک ملاقات ہوئی نہیں اور بابا جی نے پیغام بھی بھجوا دیا... بڑے ہی کوئی "ڈھیٹ" قسم کے بابا جی ہیں... اور کچھ نہیں تو کم سے کم میری اور اپنی عمر کا فرق ہی دیکھ لیتے... اونہہ... میں تمہیں صاف بتا رہی ہوں فریحہ! میں کوئی ان سے شادی وادی نہیں کروں گی۔"
فریحہ ہکا بکا۔
"کک... کیا بول رہی ہو خوش نصیب! تمہاری شادی کیوں ہونے لگی بابا جی سے...؟"
"ارے... تم نے خود ہی تو کہا... بابا جی نے پیغام بھیجا ہے۔" وہ تنک کر بولی۔
"فٹے منہ تمہارا..." فریحہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ "پیغام بھجوانے کا مطلب صرف یہ تھوڑی ہوتا ہے کہ شادی کا پروپوزل بھیجا ہے۔"
"اچھا..." اس نے آنکھیں پٹ پٹائیں اور معصومیت سے بولی۔ "اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا؟ پھر کیا مطلب ہوتا ہے فریحہ!"
"ارے وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" اس نے جھلا کر کہا۔ "کوئی ضروری بات بتانا چاہتے ہیں۔"
خوش نصیب اسے چڑا رہی تھی بس۔ لیکن اس وقت ذرا چپ سی رہ گئی۔

"نہیں فریحہ! میں اب باباجی کے پاس نہیں جاؤں گی۔" اس نے سنجیدگی اور قطعیت سے کہا تھا۔
"لیکن خوش نصیب!"
"یار! لیکن ویکن کچھ نہیں۔۔۔ روشن امی کو ذرا بھی خبر ہو گئی کہ میں مزار پر جاتی ہوں تو وہ بہت برا ناراض ہو جائیں گی۔۔۔ میں دنیا میں ہر چیز برداشت کر سکتی ہوں، روشن امی کی ناراضی نہیں۔"
"لیکن اگر تم نہیں جاؤ گی تو باباجی ناراض ہو جائیں گے۔" فریحہ نے کہا۔ "میری امی کہتی ہیں یہ اللہ لوک ہوتے ہیں، ان کی دوستی سے جتنا مرضی فائدہ اٹھاؤ، لیکن کبھی انہیں یا کسی بھی ایسے بزرگ کو ناراض نہ کرنا، ورنہ بڑا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔"
وہ اپنی طرف سے بڑا اچھا بن کر سمجھا رہی تھی۔
"وہ تو ٹھیک ہے۔" خوش نصیب الجھن آمیز لہجے میں بولی۔ "لیکن اس روز باباجی سے مل کر میری بڑی عجیب طبیعت ہو گئی تھی۔ سارا وقت ایسا لگتا رہا تھا جیسے سر گھوم رہا ہے۔"
"وہ کسی اور وجہ سے ہوا ہو گا۔" فریحہ نے پر یقین لہجے میں کہا۔ "میں اتنے عرصے سے باباجی کے پاس حاضری دینے جا رہی ہوں۔۔۔ میرے ساتھ تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔"
"عجیب بات ہے۔۔۔ پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟" وہ چرغہ کھانا بھول گئی۔
"اچھا چھوڑو نا۔۔۔" فریحہ نے اس کا دھیان بٹایا۔ "شام کو چلیں پھر۔۔۔؟"
خوش نصیب ذرا دیر کو سوچ میں پڑ گئی۔
"گھر میں مہمان آ رہے ہیں۔۔۔ شام کو گھر سے نکلی تو فضیلہ چچی کے ساتھ ساتھ روشن امی بھی برا مانیں گی۔" اس نے عذر تراشا۔
"ٹھیک ہے۔۔۔ جیسے تمہاری مرضی۔۔۔"
"اچھا تم تو ناراض مت ہو۔۔۔"
"بات ناراضی کی نہیں ہے۔۔۔" فریحہ نے کہا۔ "باباجی نے کہا ہے کہ تم سے ملنا ہے تو تمہیں وہاں جانا ہی ہو گا۔۔۔ ورنہ دیکھ لینا، باباجی تمہیں اپنے طریقے سے بلوا لیں گے۔"
یہ دھمکی نہیں تھی، لیکن خوش نصیب کو دھمکی کی طرح ہی لگی۔
"ایسا کیا کریں گے تمہارے باباجی؟"
"یہ تو مجھے پتا نہیں۔۔۔ لیکن بلوا لیں گے۔۔۔ یہ یقین ہے مجھے۔۔۔"
"اچھا۔۔۔" اس نے لحظہ بھر کو سوچا۔ "ایک کام کرتے ہیں۔۔۔ اگر آج بھی مجھے شامیر کی گاڑی نظر آ گئی تو میں تمہارے ساتھ باباجی کے پاس چلوں گی۔"
اس نے بس ایسے ہی کہہ دیا تھا۔
"شامیر کون؟"
"ہے کوئی۔۔۔" اس نے جلدی سے بات ہی بدل دی۔ "ثمرین کو بتانا، چرغہ بہت اچھا بنا تھا۔"
"ہائے توبہ۔۔۔ تم سارا کھا گئیں۔۔۔ اس میں ماہ نور کا بھی حصہ تھا۔"
"ماہ نور میری بہن ہے۔۔۔ میں نے کھایا، اس نے کھایا۔۔۔ ایک ہی بات ہے۔" اس نے فریحہ کو تسلی دی تھی۔



فہمینہ اسے ڈھونڈتی ہوئی عرفات ماموں کے پورشن میں آئی۔ وہ صباحت بیگم کا سکون برباد کر کے اطمینان

سے عرفات ماموں کے برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھا ریڈیو پر گانے سننے میں مصروف تھا۔ بہن نے کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے گھورا۔ وہ آنکھیں بند کیے سر دھن رہا تھا۔ فہمینہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کانوں سے ہیڈ فون اچک لیے۔

"تم سے کس نے کہا تھا امی کے سامنے اول فول بک کر جاؤ۔"

"اب میں نے کیا کر دیا؟" وہ حیران۔۔۔

"امی کے سامنے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ خوش نصیب کو ان کی بہو بننا ہے؟"

"اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔" کیف خفیف سا ہو گیا۔ "جو بات چند سال بعد انہیں پتا چلنی ہے، وہ ابھی کیوں نہ پتا چلے۔"

"ہر بات کو کرنے کا ہر وقت نہیں ہوتا میرے بھائی! ہر بات کے لیے ایک مناسب وقت ہوتا ہے۔"

"اور وہ مناسب وقت کب آئے گا؟" کیف نے الٹا اسی سے پوچھا۔

"مجھے تو نہیں لگتا ایسا مناسب وقت کبھی آئے گا جب میں خوش نصیب کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر سکوں۔۔۔"

فہمینہ نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا اور چوکڑی جما کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"تو اس میں کسی کا کیا قصور ہے۔۔۔ تم نے بھی تو وہاں دل لگایا ہے جہاں کوئی دشمنی نہیں لگاتا۔" معنی خیز انداز۔۔۔

"کوئی دشمنی اس لیے نہیں لگاتا کیونکہ جھگڑنے میں خوش نصیب سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ دل کے معاملات میں وہ اناڑی ہے۔۔۔ محبت میں مجھ سے نہیں جیت سکے گی۔" وہ زیرلب مسکرایا' آنکھوں میں یقین بھر کے۔۔۔

"تم اور تمہاری خوش فہمیاں۔۔۔"

فہمینہ نے دل میں آمین کہا، لیکن منہ سے یہ بولی۔

"امی اپنا بلڈ پریشر ہائی کیے بیٹھی ہیں۔۔۔ اب جا کر خود ہی سنبھالو۔"

"تمہیں ایم بی بی ایس کس لیے کروا رہے ہیں؟" کیف نے ابرو اچکا کر پوچھا۔ "ایک ہائی بلڈ پریشر کا مریض نہیں سنبھال سکتیں۔ آئی سی یو میں ڈیوٹی لگے گی تو کیا کرو گی؟"

"کیف پاگل پن کی باتیں مت کرو۔" وہ بولی تب ہی صباحت بیگم بھی اسے تلاش کرتی وہیں آگئیں۔ کیف کو دیکھ کر شاد ہوئیں اور جلدی سے قریب آکر بولیں۔

"اے کیف! چل۔۔۔ میرے سر کی قسم کھا کہ دوبارہ ایسی بات نہیں کرے گا۔" وہ جذباتی ہو رہی تھیں۔

"امی!" دونوں بہن بھائی ہی جھلا گئے۔

"ہاں تو کیوں ایسی فضول بات کی ہے کہ میرے دماغ میں گھنٹیاں بج رہی ہیں۔" وہ دل پر ہاتھ رکھے بول رہی تھیں۔

"امی! میری سمجھ میں نہیں آرہا آپ اتنا اوور ری ایکٹ کیوں کر رہی ہیں۔" فہمینہ جھنجلا گئی۔ "ویسے تو کیف مذاق ہی کر رہا تھا۔۔۔ لیکن اگر اس کی بات سچی بھی تھی تو اس میں کون سی بری بات ہے۔۔۔ خوش نصیب اتنی اچھی لڑکی تو ہے۔" "اے بیٹی! اچھی وہ صرف تمہاری نظر میں ہے۔۔۔ میرا تو بڑھاپا گلا کر رکھ دے گی۔" وہ متنفر لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"ایسی نحوست ہے اس لڑکی کی کہ بنتے کام بگاڑ دیتی ہے۔۔۔ میں اپنا بیٹا داؤ پر نہیں لگا سکتی۔" وہ بڑی جذباتی ہو کر بولنے لگ گئی تھیں۔

"اے کیف! چل میرے لال! کھا میرے سر کی قسم۔۔۔"

کیف بری طرح جھنجلا گیا۔ "قسم وسم تو میں نہیں کھاؤں گا۔" اس نے صاف ہی کہہ دیا' اس کے باوجود کہ فہمینہ مسلسل اسے امی کی بات ماننے کے اشارے کر رہی تھی اور اس کا جواب سنتے ہی صباحت بیگم کو ہول اٹھنے لگے تھے۔

"ارے... تو کیا میں سمجھوں وہ بات درست تھی؟" وہ دہل ہی گئی تھیں۔

"امی! کیف کی بات تو پوری سن لیں۔" فہمینہ ان کے اتنے جذباتی پن سے جہاں چڑ رہی تھی' وہیں اسے کیف پر بھی غصہ آ رہا تھا جو معاملے کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہا تھا۔ اس نے امی کو اپنے بازو کے حصار میں لیا' ساتھ ہی نظر بچا کر ایک ٹھوکر کیف کے پاؤں پر رسید کی' تاکہ اسے کوڈ ورڈ میں بات سمجھا سکے۔ کیف چڑ گیا۔ جھنجلا گیا' پھر ماں کی حالت کے آگے جیسے ہار مان کر بجھے ہوئے لاچار دل کے ساتھ بولا۔

"مذاق کر رہا تھا میں... دوبارہ ایسی بات نہیں کروں گا۔" اس نے منہ موڑ کر بچوں کی طرح کہا۔

"کھا میرے سر کی قسم۔" صباحت بیگم نے فٹ سے کہا۔

"یہ قسمیں وسمیں کھانے کی باتیں مجھ سے مت کیا کریں۔" وہ چڑ کر بولا۔ "کہہ دیا نا' دوبارہ ایسی بات نہیں کروں گا تو نہیں کروں گا۔" وہ جھنجلا کر اٹھا اور وہاں سے ہی چلا گیا۔ صباحت بیگم کا دل مزید ہولنے لگا۔

"میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا فہمی! تو مان نہ مان... کوئی بات ضرور ہے کیف کے دل میں..."

"اللہ کو مانیں امی! وہ کہہ تو رہا ہے' مذاق کر رہا تھا۔"

"اس چڑیل کا کیا پتا... ڈورے ڈال کر میرا بیٹا قابو کر لیا تو...؟"

"وہ چڑیل آپ کے بیٹے کی طرف دیکھنے کی روادار نہیں ہے... آپ پتا نہیں کیا کیا وہم پالے بیٹھی ہیں۔" وہ چڑ کر بولی اور یہ بات صباحت بیگم کے سر پر لگی' تلووں میں جا کر بجھی۔

"اے کیا کمی ہے میرے کیف میں... وہ تو میرا بیٹا ہی اس مرن جوگی کو گھاس نہیں ڈالتا' ورنہ کب کی میری بہو بن کر بیٹھی ہوتی۔"

اچانک ان کے اندر کی بیٹے کی ماں جاگ اٹھی تھی۔ فہمینہ نے جھنجلا کر سر پر ہاتھ مارا اور ان کے پیچھے چل پڑی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بنت سحر

اعتراف

رات کے اس پچھلے پہر جب ہر طرف سکوت اور اندھیرا چھا چکا ہے۔ میں لان میں سگریٹ سلگائے بیٹھا ہوں۔۔۔ کالی رات میں سگریٹ کا نارنجی شعلہ مجھے "خوف زدہ" کررہا ہے، مگر میں اس کو چھوڑ بھی تو نہیں سکتا نا۔۔۔ میں نے تھک ہار کر آنکھیں بند کرلی تھیں۔

"آئی کانٹ لیو اٹ"۔

گرم ہوا چلی اور۔۔۔ میں نے اپنے آپ کو جیسے کسی تندور کے دہانے پر پڑا ہوا پایا۔۔۔ میں جل رہا ہوں۔۔۔ پگھل رہا ہوں۔۔۔ مجھے فروزاں آوازیں دے رہی ہے۔۔۔ بلا رہی ہے۔ آوازوں کی بازگشت گونج رہی ہے بہت دور سے۔۔۔

"تم مجھ سے کبھی نفرت کر ہی نہیں سکتے۔" یقین کی اتنی مضبوط سرحد تھی فروزاں کی۔۔۔

"میں تم سے "محبت" بھی نہیں کرسکتا۔" میں نے یقین میں دراڑ ڈالی تھی۔

"اچھا۔۔۔؟ شاید ایک بات تم نہیں جانتے۔" وہ ہنس رہی تھی۔ مجھے تاؤ دلا رہی تھی۔

"کون سی بات؟"

"یہ ہی کہ میرے محبت میں تو تم کب سے گرفتار ہوچکے ہو۔" اب ہنسنے کی باری میری تھی اور میں خوب ہنسا تھا۔

"محبت۔۔۔! اور تم سے۔۔۔؟ آر یو کریزی۔۔۔؟" تم سے تو میں نفرت کا رشتہ بھی نہ رکھنا چاہوں، کجا یہ کہ محبت۔۔۔

سنہری آنکھوں میں نمی ابھری۔۔۔ پھسلنے کو بے تاب ہوئی، مگر یقین مضبوط رکھنے والی کا حوصلہ بھی بلا کا مضبوط تھا۔ فروزاں نے آنسو ہنسی کی اوٹ میں دبائے اور سر کھڑکی کے ساتھ لگالیا۔

"اتنے بڑے دعوے نہ کرو۔۔۔ ہار جاؤ گے۔ چلو میری قبر پر لال گلاب نہ سہی، پیلے پھول ہی لیتے آنا۔ میں خوش ہوجاؤں گی۔"

مجھے جی بھر کے اس ٹھگنی لڑکی پر غصہ آیا تھا۔ "تو پہلے تم مر کے تو دکھاؤ۔۔۔ روز تمہاری قبر پر پیلے پھولوں کی بارش ہوگی۔"

"جانے کیوں احمر۔۔۔ آج مجھے لگ رہا ہے کہ میرے مرنے کا سب سے زیادہ "دکھ" تمہیں ہی ہوگا۔"

اور آج میں چیخ چیخ کر کہنا چاہتا ہوں، بلک بلک کر رونا چاہتا ہوں۔

"ہاں۔۔۔ فروزاں ستار۔۔۔ تمہارے مرنے کا سب سے زیادہ دکھ مجھے ہی ہوا ہے۔"

"میں تو نفرت کی پتنگ کی ڈور تھامے چل رہا تھا۔ جانے کب۔۔۔ کیسے۔۔۔ کس طرح۔۔۔ پتنگ کی ڈور ہی بدل گئی اور وہ جو لکڑی کی ٹوٹے پٹ والی کھڑکی میں بیٹھی مجھے اسکول آتے جاتے دیکھتی رہتی۔ مسکراتی رہتی۔ ہنستی ہوئی لڑکی۔۔۔ وہ بلند قہقہے لگاتی تھی، جو گلی کے راستے میں دم توڑ دیتے تھے اور میں بستہ تھامے اسے گھورتا ہوا گزرنے لگتا تھا۔ مگر اس کے پاؤں میں پائل تھی، جو بجتی تھی اور اس کے سوال مجھے "زنجیر" کردیتے تھے، جادو کردیتے تھے۔"

"میجک گرل۔۔۔"

میں باورچی خانے میں بیٹھی اماں سے، ناشتا کرتے ہوئے سوال جواب کرتا رہتا تھا۔

"اماں۔۔۔ پہلی نظر کی نفرت بھی ہوتی ہے؟" میں

نوالہ منہ میں ڈالتا۔

اماں روٹی پلٹتی۔ "ہاں۔۔۔ ہوتی ہے۔"

"مجھے ہو گئی ہے۔" میں نے چنگیر اماں کی طرف بڑھائی۔ مگر اماں نے ہاتھ آگے نہ بڑھایا۔

"کس سے۔۔۔؟" وہ ہکا بکا مجھے دیکھ رہی تھیں اور میں اپنا منہ ان کے دوپٹے سے صاف کر رہا تھا۔ مجھے اسکول سے دیر ہو رہی تھی۔ اماں کے گال چومے۔۔۔ بستہ اٹھایا اور دروازے سے یہ جا۔۔۔ وہ جا۔۔۔ اماں نے مڑ کر دیکھا' آخری روٹی توے پر جل چکی تھی۔۔۔ اماں نے جیسے خود کلامی کی تھی۔

"پہلی نظر کی نفرت آخری نظر کی "محبت" ہوتی ہے۔" وقت نے یہ سرگوشی خوب دھیان لگا کر ذہن نشین کر لی تھی۔

☆ ☆ ☆

چھاجوں چھاج بارش برس رہی تھی۔ میرا یونیفارم' میرا بستہ 'سب چیزیں بھیگ چکی تھیں۔۔۔ بجلی کڑکی تھی۔ میں فروزاں کے گھر کے بیرونی طرف کھڑا بارش رکنے کا انتظار کرنے لگا تھا۔ تب ہی وہ کھڑکی میں نظر آئی تھی۔ وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ شاید اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ تب ہی اس کی نظر اچانک مجھ پر پڑی تھی۔۔۔ وہ ٹھٹکی' مگر پھر جلدی سے آنسو پونچھ لیے تھے۔

"تم رو رہی تھیں؟" میں نے قریب آکر پوچھا۔۔۔ میرے بھیگے بستے سے پانی ٹپک رہا تھا۔

"نہیں تو۔۔۔" وہ مکر گئی تھی۔

میں بھی چپ ہو گیا۔ گلی میں پانی بھرتا جا رہا تھا۔ بارش تیز ہو رہی تھی۔ خاموشی شان بے نیازی سے ٹہلتی ہوئی آئی اور ہمارے درمیان براجمان ہو گئی۔۔۔ سیکنڈ۔۔۔ منٹ۔۔۔ مجھے خوشی تھی کہ آج وہ "چپ" تھی۔

"احمر! میں رو رہی تھی۔۔۔ سوری میں نے تم سے جھوٹ بولا۔" وہ بول اٹھی تھی۔۔۔ اور معذرت کر رہی تھی۔

میں چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔ سانولی رنگت پر کاجل پھیل کر بدنما لگ رہا تھا۔ وہ بالکل بھی "خوب صورت" نہیں تھی۔

"مجھے ان کڑکتی بجلیوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ میں خوف زدہ ہو کر چلاتی ہوں۔۔۔ روتی ہوں۔۔۔ ابا' دادی'



نئی امی' کوئی بھی میری مدد کو نہیں آتا۔ میں بہادر لڑکی نہیں ہوں۔" وہ آنسو پی رہی تھی۔۔۔ میں جان گیا تھا۔

"تو تم بہادر لڑکی بن جاؤ نا۔۔۔" میں نے ترغیب دی تو۔۔۔ وہ مجھے دیکھنے لگی۔

"وہ کیسے۔۔۔؟" وہ مجھے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"بہادر لڑکیاں بجلی کی کڑک سے خوف زدہ نہیں ہوتیں۔۔۔ وہ رات سے نہیں ڈرتیں۔۔۔ وہ تنہا خوش رہتی ہیں۔ وہ خود ہی ہنستی ہیں اور روتی ہیں' مگر اپنا رونا دوسروں سے چھپا لیتی ہیں۔" میں نے نظر دوڑائی تھی۔ بارش ہلکی ہونے لگی تھی۔ اور پوری گلی بارش کے پانی سے بھر گئی تھی اور شڑاپ۔۔۔ شڑاپ۔۔۔ کی آواز سے گونج رہی تھی۔ جہاں بچے شلوار اوپر اٹھائے "بول میری مچھلی کتنا پانی" کھیل رہے تھے۔

اور کچھ دن بعد میں نے اس سے پوچھا تھا۔ کیا تم بریو گرل بن گئی ہو؟" فروزاں ستار نے آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر لیے۔۔۔ "میں کبھی بہادر لڑکی نہیں بن سکتی۔"

"کیوں۔۔۔؟" میں حیران ہوا۔۔۔ ایسا کیا تھا جو وہ بہادر نہیں بن سکتی تھی۔

"تمہیں نہیں پتا' میرا دل چھوٹا ہے۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ میں ہنسنے لگا تھا یہ سن کر۔ یہاں تک کہ میرے ہاتھ سے بستہ چھوٹ گیا تھا اور میں بستہ جھاڑتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ مجھے کتنی ہنسی آئی تھی۔

"وہ چڑیا جیسا دل رکھتی ہے۔"

ابا' اماں اور میں رات کو آنگن میں چارپائیوں پر سونے کے لیے لیٹے ہوئے تھے اور اماں مجھے کہانی سنا رہی تھیں۔۔۔ چاند کی مدھم روشنی میں بیلے کی کلیاں چٹخ رہی تھیں۔ روشنی۔۔۔ خوشبو۔۔۔ اللہ۔ "اماں کیا کسی کا اتنا چھوٹا دل بھی ہوتا ہے۔۔۔ چڑیا جیسا۔۔۔" میں نے کہانی سنتے سنتے پوچھا۔

"تمہیں کس نے کہا؟"

"فروزاں کہتی ہے کہ وہ بہادر نہیں بن سکتی اس کا دل بہت چھوٹا ہے۔"

"ستار کی بیٹی جو چھوٹے قد کی ہے؟" اماں نے پوچھا تھا۔

"ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔ جو ہر وقت کھڑکی میں بیٹھی رہتی ہے۔"

"ارے۔۔۔ وہ اس نمانی کے دل میں تو سوراخ ہے۔۔۔" چاند کی روشنی بوجھل ہونے لگی۔

"دل میں سوراخ۔۔۔" میں جو تارے گن رہا تھا۔۔۔ چونک سا گیا۔

"ہاں۔۔۔ یہ مرض جان لیوا ہوتا ہے' بس دعا کر' اللہ اسے شفا دے۔" بیلے کی کلیاں مرجھانے لگی تھیں۔

"میں کیوں دعا کروں۔۔۔ مجھے تو وہ بالکل بھی اچھی نہیں لگتی۔ اسے دیکھ کر ہی نفرت محسوس ہوتی ہے اس سے۔۔۔"

"نا۔۔۔ احمر۔۔۔ ایسے نہیں کہتے۔"

"اماں۔۔۔ فروزاں کہتی ہے کہ میں اسے "اچھا" لگتا ہوں۔" میں نے ہنس کر بتایا تھا۔

"تو بھی اسے کہہ دیا کہ تم بھی اسے "پسند" کرتے ہو۔۔۔ مریض کا دل رکھنے سے اللہ راضی ہوتا ہے۔"

اماں نے میرے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا تھا اور میں چاہ کر بھی اماں سے کہہ نہ پایا تھا۔

"اماں آپ کے بیٹے احمر کو دل رکھنے نہیں آتے۔"

☼ ☼ ☼

وقت نے زندگی کے اوراق دھیرے دھیرے پلٹے تھے۔۔۔ بچپن گزرا۔۔۔ لڑکپن آیا۔۔۔ جوانی پہلے پھل کی طرح وجود پر اتری۔۔۔ وہی روز و شب تھے۔۔۔ فروزاں ستار اب بھی کھڑکی میں بیٹھی خلا میں نظریں دوڑاتی رہتی۔ اب میں کالج کے آخری سال میں تھا۔۔۔ شاید وقت مجھ پر مہربان ہوا تھا' میری جوانی نکھر کر سامنے آئی تھی۔۔۔ اور۔۔۔ وہ۔۔۔ فروزاں ستار' پیلی پھٹک' اندر دھنسی آنکھیں' چپ چپ سی۔۔۔

"میں تمہیں اچھی لگتی ہوں؟"

"نہیں۔۔۔"

"میں تمہیں بری لگتی ہوں؟"

"نہیں۔۔۔"

وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھے "اچھی" نہیں لگتی تھی۔ وہ مجھے بری بھی نہیں لگتی تھی تو پھر۔۔۔؟ میں مسکرایا تھا۔

"تم مجھے بہت بری لگتی ہو۔" آخر میں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ مجھے دل رکھنا نہیں آتا۔

وہ ہنسی۔۔۔ اور۔۔۔ زور زور سے ہنستی گئی، یہاں تک کہ اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

اس نے گردن جھٹک کر کہا تھا۔ "ہاں احمر۔۔۔ مجھے اندازہ تھا کہ تم یہ ہی کہو گے۔"

مجھے تاؤ آیا تھا۔ "تو پھر پوچھا کیوں۔۔۔؟" وہ کھڑکی کا پردہ تھامے کھڑی تھی۔۔۔ سرسوں کے پھول سی زرد۔۔۔

"کبھی کبھی دل چاہتا ہے نا کہ "اندازے" غلط ہو جائیں۔"

مجھے اس "لافنگ گرل" پر ہنسی آئی تھی۔

"افسوس تمہارے اندازے کبھی غلط نہیں ہوں گے۔" اور وہ ہنستی آنکھوں کا "پانی" چھلکاتی مجھے دیکھتی کھٹ سے کھڑکی بند کر گئی تھی۔

میں محظوظ ہوتا ہوا پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھتا گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ کھڑکی کی جھری سے مجھے وہ دیکھتی جا رہی ہے۔ روتی جا رہی ہے۔۔۔ اور اپنے آنسو "آپ" ہی صاف کرتی جا رہی ہے۔ زندگی نے مجھے "راستے" بدلنا سکھا دیا تھا۔ اور میں نے بہت آسانی اور مکمل اطمینان سے فروزاں ستار کی طرف جاتے رستے بدلے تھے اور خوب بدلے تھے اور میں نے خود کو اس بات پر داد دی تھی۔۔۔ اور خوب داد دی تھی۔

"ہاں۔۔۔ ارے واہ۔۔۔ احمر جبار تو اچھا راستے بدلنے والا ہے۔"

اور اس دن زبردست بارش ہوئی تھی۔ ہمارے گھر کے سامنے گلی میں لگا، نیم کا درخت جڑ سے اکھڑ کر گر پڑا تھا۔ بجلی کی کڑک۔۔۔ گرج چمک۔۔۔ تیز روشنی۔۔۔ اور بڑی بوڑھیوں کی تسبیح کے دانے گراتی ہوئی آوازیں۔۔۔

"الٰہی رحم کر۔۔۔ ہمیں بخش دے۔۔۔"

اور جب بارش تھمی تو پتا چلا کہ ستار صاحب کی بیٹی "فروزاں ستار" کے دل نے، خوف کے مارے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ مر گئی تھی۔۔۔ میں نے سنا۔۔۔ ٹھٹکا۔۔۔ اور۔۔۔ وقت نے کچھ عرصے پہلے جس بات کو ذہن نشین کر لیا تھا۔ اسی بات کو میرے سامنے اگل دیا۔۔۔ پہلی نظر کی محبت اہم ہو یا نہ ہو۔۔۔ مگر پہلی نظر کی نفرت آخری نظر کی محبت ضرور ثابت ہوتی ہے۔۔۔ لفظوں نے میرے گرد حصار باندھا۔۔۔ میں جکڑا گیا۔۔۔ آہ۔۔۔

"میں بہادر لڑکی نہیں بن سکتی، میرا دل چھوٹا ہے۔"

"میں کسی دن بجلی کی کڑک سے تکیے کانوں کے اوپر رکھے، خوف سے مر جاؤں گی۔" اور۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ "لافنگ گرل" مر گئی۔۔۔ میری پہلی نظر کی نفرت یا پہلی نظر کی نفرت کا آخری نظر میں بدلتی محبت کا جنازہ۔۔۔

"میری سوتیلی ماں، ابا، دادی مجھے پیار نہیں کرتے۔۔۔ تم مجھ سے پیار کرتے ہو نا؟" وہ بازگشت میری سماعت میں انڈیلی گئی، سیسے کی طرح۔۔۔ مجھے اپنا جواب سنائی دیا تھا۔

"مجھے تم سے بالکل بھی پیار نہیں۔۔۔" مجھے دل رکھنا نہیں آتا تھا۔ شاید۔۔۔ فروزاں ستار مجھے اسی بات کی سزا دے گئی ہے اور۔۔۔ میں رات کے اس پہر اس کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر رو رہا ہوں۔۔۔ روتا جا رہا ہوں۔ ہلکی ہوا سے قبر کی مٹی اڑتی جا رہی ہے۔۔۔ جنگلی پھولوں کی مہک آوارہ پھر رہی ہے۔

میں نے اس کی قبر کو لال گلابوں کا لباس پہنا دیا ہے۔ اسے لال گلاب پسند ہیں نا۔ قبر کی مٹی سے مجھے اس کی خوشبو آ رہی ہے۔

"مجھے تم سے محبت۔۔۔ آہ۔۔۔!"

ہوا چل رہی ہے۔۔۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو۔۔۔ لال گلابوں کی خوشبو۔۔۔

اور احمر جبار روتا ہوا کہہ رہا ہے۔

"مجھے فروزاں ستار سے محبت ہے۔"

سویرا فلک



اتوار کا دن تھا۔ وہ صبح سے ہی کچن میں مصروف تھیں۔ ناشتہ تو سب ہلکا پھلکا ہی کرتے تھے مگر دوپہر کے کھانے پر مدیحہ ضرور اہتمام کرتی تھیں۔ کیونکہ سب بچے گھر پر موجود ہوتے تھے۔ دوپہر کے بارہ بج چکے تھے مگر گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ کیونکہ بچے سو رہے تھے۔ وہ کچن میں مشغول تھیں تب ہی ابرار چلے آئے۔

"کیا بنا رہی ہیں بیگم صاحبہ آج؟" ابرار نے تیزی سے ہنڈیا میں چمچ چلاتی مدیحہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بریانی بنا رہی ہوں۔ وہی ایک چیز ہے جو سب شوق سے کھا لیتے ہیں۔ نہیں تو کسی کو روٹی چاہیے تو کسی کو چاول۔ تو کسی کو گریوی والا سالن تو کسی کو شوربے والا۔" مدیحہ نے بدستور سالن بھونتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تو ہے۔ ایسا کرو ساتھ میں شامی کباب بھی فرائی کر لو یا کچھ بھنا ہوا بنا لو اور میٹھے میں کسٹرڈ یا فیرنی۔" ابرار کچن میں رکھی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کی طرف آ کر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے اور ٹیبل پر رکھی سلاد بنانے کے لیے ___ سبزیوں کی پرات اپنی طرف کھسکالی۔ وہ اکثر یونہی چھوٹے موٹے کاموں میں مدیحہ کی مدد کر دیتے تھے۔

"واہ کیا بات ہے جناب کی۔ یہاں دنیا مہنگائی کا رونا رو رہی ہے اور جناب کو شاہ خرچیاں سوجھ رہی ہیں۔" مدیحہ اب بریانی کے سالن کو دم پہ رکھ کر چاول چننے لگی تھیں۔

"یار! اب میری فرمائشی لسٹ اتنی طویل بھی نہیں کہ تم مجھ پر فضول خرچی کا بورڈ لگا دو۔ چھٹی کا دن ہے اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ بچوں کے بہانے ذرا ہم بھی مزے کر لیتے۔ اور پھر خدانخواستہ ہمارے حالات اتنے بھی خراب نہیں۔ میری اپنی نوکری اچھی چل رہی ہے۔ ماشاء اللہ بچے ہمارے لائق فائق ہیں۔ عاشر بینک میں منیجر ہے طوبیٰ لیکچررشپ کر رہی ہے۔ تم خود اسکول میں پرنسپل ہو اور کیا چاہیے۔ اللہ کے کرم سے بہت سوں سے اچھا کما کھا رہے ہیں۔" ابرار کو مدیحہ کا ہر وقت کا رونا حقیقتاً" برا لگتا تھا۔

"توبہ ہے! آپ تو بچوں کی طرح برا مان جاتے ہیں بلکہ لیکچر دینا ہی شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کی اور میری نوکری کون سی گورنمنٹ کی ہے جو پینشن ملے گی تو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی عیش کریں گے۔ پھر ریٹائرمنٹ کون سا دور ہے۔ میرے چار پانچ سال اور آپ کے بھی تقریباً" اتنے ہی۔ ابھی ہمارا طاہر پڑھ رہا ہے۔ ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد کہیں جاب ملے گی اور سب سے بڑھ کر طوبیٰ کی شادی کا مسئلہ۔ آج کل کی مہنگائی میں شادی کا خرچہ کم ہے کیا؟"

مدیحہ ابھی بھی اپنے دل دماغ کی کہہ رہی تھیں۔

"یار! مسئلے اتنے ہیں نہیں۔ جتنے تم نے بنا لیے ہیں۔ اول تو ہماری اتنی سیونگ ہے کہ ہم بچی کی شادی سمیت ریٹائرمنٹ کے بعد یعنی بڑھاپے کے اخراجات بھی اٹھا لیں گے۔ دوسرا ایک ہی بچی ہے ہماری۔ کوئی لائن تو ہے نہیں اور اس کے فرض سے بھی ہم دوران ملازمت سبکدوش ہو جائیں گے تو ہمیں سہولت ہی

رہے گی۔ یہ بات بھی میں کتنی دفعہ سمجھا چکا ہوں مگر تمہاری تو منطق ہی نرالی ہے۔" ابرار اب باری باری سبزیوں کے قتلے بنا رہے تھے۔

"اس میں نرالی منطق کی کیا بات ہے۔ ابھی آپ نے کہا کہ ایک بچی ہے تو کون سی بھاری ہے جو کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کے پلے سے باندھ دوں۔"



مدیحہ نے ہرا دھنیا کتر کر سالن میں ڈالا۔

"خدا کو مانو اللہ کی بندی۔ عادل ایرا غیرا نتھو خیرا نہیں۔ میرے بہنوئی کا سگا بھانجا ہے۔ اور اصغر بھائی کی فیملی کتنی مہذب اور پڑھی لکھی ہے، تم اچھی طرح جانتی ہو۔ عادل کی جاب پرائیوٹ ہے مگر لڑکا قابل ہے۔ ترقی کرے گا۔ اور دیکھنے میں شہزادہ نہ سہی مگر قبول صورت ہے۔ اور ویسے بھی قبول صورت کی اصطلاح لڑکیوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔"

"کیا بات کہی ہے آپ نے! ارے نہ اپنا گھر ہے نہ گاڑی۔ اور میری طوبیٰ ایسی پریوں جیسی ہے اور وہ عادل کیسا سنولایا ہوا ہے۔ کوئی جوڑ تو ہو۔" مدیحہ اب بریانی کی تہہ لگانے لگی تھیں۔

"تم بس جوڑ جوڑنے کی رٹ لگائے رکھو۔ تمہاری عقل شریف میں کبھی بھی یہ بات نہیں آئے گی کہ جوڑے بنانا انسان کا نہیں اوپر والے کا کام ہے، یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔" ابرار نے اب گاجر، مولی اور کھیرے کے قتلے پلیٹ میں سجانا شروع کردیے۔ وہ کافی سلیقے قرینے کے آدمی تھے۔

"تو میں کیا اس کی دشمن ہوں۔ جوڑے بے شک اللہ بناتا ہے مگر کیا انسان اپنی آنکھیں بند کرلے حقیقت پسندی سے کام نہ لے۔" مدیحہ نے بریانی دم پر رکھی اور ان کے پاس آبیٹھیں۔

"بالکل لے۔ یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ آنکھیں کھولو۔ طوبیٰ ستائیس برس کی ہو گئی ہے۔" ابرار نے مدیحہ کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ سلاد کی پلیٹ مدیحہ کی جانب کھسکائی اور اٹھ کر کچن سے باہر چلے گئے۔



راحت منزل بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ آج ابرار کی بڑی بہن انجم کے اکلوتے بیٹے سعد کی رسم مایوں تھی۔ چاروں جانب رنگ و نور کا سیلاب امڈا ہوا تھا۔ ہر جانب قہقہے تھے اور ہر چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا کیونکہ سعد خاندان کا سب سے بڑا لڑکا تھا اور اس خاندان کی یہ پہلی خوشی کی تقریب تھی۔ سو سب ہی پرجوش اور خوش تھے۔ صرف ایک چہرہ تھا جس پر زمانے بھر کی بیزاری طاری تھی اور وہ چہرہ تھا۔ مدیحہ بیگم کا۔ ابرار کئی بار ٹوک چکے تھے مگر وہ ہر بار ایک ہی بات کہہ دیتیں۔

"مجھے نہیں آتی منافقت۔ بتا چکی ہوں آپ کو کہ میرے سر میں درد ہے۔ زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر نہیں بیٹھ سکتی۔ میں جو ہوں، جیسی ہوں جیسا اندر سے محسوس کرتی ہوں ویسی ہی نظر آتی ہوں۔ دوسرے لوگوں کی طرح منہ پر نقابیں چڑھا کر نہیں رہ سکتی۔"

"بہت ضدی عورت ہو تم اور انتہا درجے کی خود غرض۔" ابرار تاسف سے کہتے ہوئے کھانے کا انتظام دیکھنے میزوں کی جانب بڑھ گئے تو وہ بھنویں اچکا کر واپس روتی صورت بنا کر سیٹ پر جا بیٹھیں۔ پوری تقریب میں وہ یونہی لیے دیے دور دور رہیں۔ دو دن بعد بارات کی تقریب تھی۔ طوبیٰ تیار ہو کر نیچے آئی تو ابرار احمد کو ٹی وی دیکھتا پا کر بولی۔

"ابو! چلیں دیر ہو رہی ہے۔ واصفہ پھوپھو کا کتنی دفعہ فون آچکا ہے۔ عاشر بھائی کو بھی سعد بھائی نے فون کیا تھا کہ گاڑی نکلنے والی ہے۔"

"ہاں ہاں چلو۔ میں تو تیار ہی بیٹھا ہوں۔ اپنی امی کو بلاؤ۔ وہ تو لگتا ہے، پارلر چلی گئی ہیں تیار ہونے۔ اب تک تیار ہو کر نہیں آئیں۔" ابرار نے شرارتی لہجے میں کہا۔ وہ بچوں کے ساتھ یوں ہی دوستوں کی طرح رہتے تھے۔

"نہیں بابا! مما تو جا ہی نہیں رہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں۔ آج تو ان کی طبیعت بہت ہی خراب ہے۔ بالکل نہیں جا سکتیں۔" طوبیٰ نے افسردگی سے کہا تو ابرار کے چہرے سے بھی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی۔

"تم بھائی کو بلاؤ، گاڑی میں بیٹھو۔ میں اور تمہاری امی بھی آتے ہیں۔ خاندان کی پہلی اور قریبی شادی ہے۔ مس کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے مدیحہ کے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور طوبیٰ ان کی ہدایت کے مطابق بھائیوں کو بلانے ان کے

کمرے کی طرف چلی گئی۔ اسے معلوم تھا کہ ابرار بچوں کے اچھے دوست ضرور تھے مگر انہوں نے ان کی حدود مقرر کر رکھی تھیں۔ بچوں کو بخوبی معلوم تھا کہ انہیں کب کیا اور کیسے کرنا ہے اور یہی اصل تربیت ہے۔

"آپ تیار نہیں ہوئیں؟ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" ابرار نے بیڈ پر ٹانگیں پسار کر لیٹی ہوئی مدیحہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اف ابرار! آج تو سچ میں ہمت نہیں۔ آپ میری طرف سے معذرت کر لیجیے گا۔" مدیحہ نے منہ بناتے ہوئے کہا تو ابرار کا ضبط جواب دے گیا۔

"مدیحہ بیگم تمہیں کب رشتوں کو برتنے کا سلیقہ آئے گا؟"

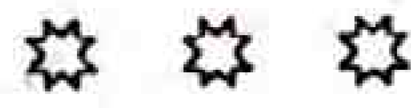
"کیا مطلب ہے اس بات کا۔ بات سنیے یہ آپ ہر وقت بیوی پر ہی آنکھیں نکالنے کیوں چلے آتے ہیں۔ اپنے گھر والوں، اپنے بہن بھائیوں کو تو آپ کچھ نہیں کہتے۔ بھلے وہ کسی کا حق مار دیں۔" مدیحہ نے بھی اپنی آنکھیں ماتھے پر چڑھالیں۔

"مدیحہ! یہ کون سا وقت ہے ایسی باتیں کرنے کا۔ دوسروں کی خوشیوں میں خوش ہونا سیکھو۔ میرے گھر والے محبت کرنے اور بانٹنے والوں میں سے ہیں اسی لیے میں قدر کرتا ہوں ان کی اور ایسا کون سا شب خون مار دیا انہوں نے تمہارے ارمانوں پر جو تم اس قدر بدظن ہو ان سے۔" ابرار کا غصہ مدیحہ کی ہٹ دھرمی کے باعث بڑھتا جا رہا تھا مگر مدیحہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھیں۔

"واہ! آفرین ہے بھئی آپ پر۔ بہن بھائیوں کی محبت کی ایسی پٹی بندھی ہے آنکھوں پر کہ بیوی تو بیوی، بیٹی کا دکھ بھی نظر نہیں آتا۔ ارے میں پوچھتی ہوں کیا کمی ہے میری طوبیٰ میں اور ایسے کیا ہیرے جڑے ہیں سمیعہ کی حرا میں کہ نصرت آپا نے سعد کے لیے طوبیٰ کے بارے میں سوچنا تک گوارا نہیں کیا۔ مگر آپ تو ہیں ہی بیوقوف۔ کام پڑنے پر دونوں بہنیں ابرار بھائی، ابرار بھائی کی مالا جپتی رہتی ہیں اور اب دیکھو کیسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال دیا۔ اور بہنوں نے گٹھ جوڑ کر کے خاموشی سے آپس میں رشتہ جوڑ لیا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ حد ہوتی ہے مدیحہ بیگم۔ یہ رشتے ناتے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ مگر تم جیسی پڑھی لکھی جاہل عورت کو یہ فلسفہ سمجھانا ایسا ہی ہے جیسے بھینس کے آگے بین بجانا اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں ان تمام معاملات سے نہ صرف باخبر تھا بلکہ ہر معاملے میں پیش پیش بھی تھا۔ مگر تمہیں اسی لیے لاعلم رکھا کیونکہ میں تمہاری ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تم کبھی دوسروں کی خوشیوں میں خوش نہیں ہو سکتیں۔ تم ہر معاملے میں اپنا مفاد دیکھتی ہو۔ سمیعہ نے نصرت آپا کی کڑے وقتوں میں کس قدر مدد کی۔ اس وقت جب وہ اور دس سال کا سعد، حارث بھائی کے جانے کے بعد اکیلے تھے۔ انہیں سہارے کی، مدد کی ضرورت تھی تو تم نے ان سے رابطہ رکھنا، ان کی مالی تو کیا اخلاقی مدد کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ تمہاری تو پوری کوشش رہتی تھی کہ میں بھی اپنی بیوہ بہن سے ہر تعلق ختم کر لوں۔ کہیں ان کی کفالت کے چکر میں تمہارے میاں کا بینک بیلنس خالی نہ ہو جائے۔ اور آج جب سعد لائق فائق ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔ نصرت آپا دو کمروں سے نکل کر ڈیفنس کے بنگلے میں پہنچ گئی ہیں تو تمہیں رشتے یاد آ رہے ہیں۔ نہیں مدیحہ بیگم یہ دنیا ہے۔ یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر چلتی ہے۔ اس لیے ہر انسان کو اپنا حق مانگنے سے پہلے اپنا فرض ادا کرنا آنا چاہیے۔ کون کہے گا کہ تم ایک اسکول کی پرنسپل ہو۔ جبکہ تم خود زندگی کے پرنسپلز (اصولوں) سے نابلد ہو۔ مگر میں تمہاری طرح نادان اور بیوقوف نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے اپنے ہر عمل کا جواب دینا ہے اور اتنا تو تمہیں بھی معلوم ہی ہو گا کہ حقوق العباد کا درجہ حقوق اللہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس لیے دس منٹ میں تیار ہو کر نیچے آجاؤ۔ ورنہ مجھ سے امید نہیں رکھنا کہ میں تمہارے خاندان میں ہونے والی کسی تقریب میں شرکت کروں گا۔" وہ کڑے تیوروں سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر

چلے گئے اور مدیحہ کو لگا کہ انہیں ابرار اپنے پیروں تلے روندتے ہوئے گئے ہیں۔ نظروں سے گرنا ایسا ہی ذلت آمیز ہوا کرتا ہے۔



"ارے مدیحہ بھابی! شکر آپ خیریت سے آگئیں۔ مجھے اتنی فکر ہو رہی تھی۔ اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی آنے میں؟" مدیحہ اور ابرار کو ہال میں داخل ہوتا دیکھ سمیعہ لپک کر آئیں تو مدیحہ شرمندہ ہو کر رہ گئیں۔

"میں ٹھیک ہوں سمیعہ! معذرت کہ تھوڑی دیر ہو گئی ہمیں بس پتا نہیں کیا ہوا اچانک۔ اصل میں اسکول میں اسپورٹس ویک چل رہا ہے۔ تمہیں تو پتا ہے اکاؤنٹ کو مینیج کرنا کتنا ہیکٹک ہوتا ہے شاید اسی لیے تھکاوٹ سے طبیعت خراب ہو گئی۔ اب ٹھیک ہوں میں۔" مدیحہ نے پہلے سے سوچا ہوا بہانہ بنایا۔ مگر حقیقت میں وہ اب سمیعہ کا پرخلوص برتاؤ دیکھ کر ان سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھیں۔

"کوئی بات نہیں بھابھی! آپ آگئیں اور ٹھیک ہیں۔ یہی بہت ہے۔ چلیں آئیں پہلے ذرا تصویریں بنوالیں۔ ورنہ مووی والے تو دولہا دلہن پر ہی پورا رول خالی کر دیں گے۔" سمیعہ نے ہنستے ہوئے کہا اور محبت سے مدیحہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ابرار نے مدیحہ کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ ایک بار پھر شرمندگی سے نظریں چرا گئیں۔ اسٹیج پر پہنچیں تو نصرت آپا لپک کر مدیحہ کے پاس چلی آئیں۔ اور ان کے رخسار پر نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"اللہ تیرا شکر! مدیحہ آج تو تم نے ڈرا ہی دیا بیٹا۔ میں سوچ رہی تھی ایسا کیا ہو گیا کہ مدیحہ گھر کی تقریب میں لیٹ ہو گئی۔ اب کیسی طبیعت ہے۔ ابرار! ڈاکٹر کو دکھایا۔ آرام کروانا تھا نا۔"

"معذرت چاہتی ہوں آپا۔ بس جانے کیا ہوا اچانک۔ لیکن اب سب ٹھیک ہے۔ آپ پلیز پریشان نہ ہوں۔" مدیحہ نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"جی آپا۔ اب سب کچھ ٹھیک ہے۔" ابرار نے مدیحہ کی جانب گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو مدیحہ کا دل چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ واقعی کسی اور کی نظروں میں گرنے سے زیادہ ذلت آمیز خود کی نظروں میں گرنا ہوتا ہے۔

"چلیں جی جلدی جلدی بیٹھیں آپ لوگ۔" فوٹو گرافر نے آواز لگائی تو گویا مدیحہ کی جان میں جان آگئی۔ کیوں کہ اب وقتی طور سب کی توجہ ان پر سے ہٹ گئی تھی۔ تصویریں بنوانے کے بعد وہ اسٹیج سے نیچے آکر سامنے والے صوفے پر آکر بیٹھ گئیں۔ نصرت آپا اور سمیعہ مہمانوں کو دیکھنے نکل گئیں۔ ابرار کے ذمے کھانے کی نگرانی تھی سو وہ اس طرف چلے گئے۔ مدیحہ خاموشی سے اسٹیج کے سامنے رکھی کرسیوں پر آ بیٹھیں اور گہرا سانس لے کر پہلے ادھر ادھر دیکھا پھر یک ٹک اسٹیج کی طرف دیکھنے لگیں۔

حرا روایتی سرخ عروسی جوڑے میں سعد کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ "آف وائٹ کریم کلر کی شیروانی اور میرون کلاہ پہنے سعد کسی شہزادے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں کے چہروں پر خوشی کے رنگ بے حد نمایاں تھے۔ فوٹو گرافر پوری تندہی سے ان کے مختلف انداز کے کلوز اپ لے رہا تھا۔ اسی لمحے طوبیٰ جو وہیں اسٹیج پر موجود تھی فوٹو گرافر کی ہدایت پر حرا کی ماتھا پٹی درست کرنے لگی تو مدیحہ غیر ارادی طور پر حرا اور طوبیٰ کا موازنہ کرنے لگیں۔ طوبیٰ آج شاکنگ پنک اور آف وائٹ کنٹراس والی خوب صورت میکسی میں ملبوس تھی۔ لائٹ سوفٹ میک اپ اور جدید ہیئر کٹ کے ساتھ وہ بھی بے حد خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ حرا سے چار سال بڑی تھی۔ مگر اس کی اور حرا کی خوب بنتی تھی۔ اس لیے طوبیٰ ابھی بھی حرا کے آس پاس ہی موجود تھی۔ موقع ملتے ہی حرا کے اشارے پر وہ اس کے ساتھ جا بیٹھتی تھی اور پھر کانوں میں جانے کیا شرارت بھری سرگوشیاں کرتی تھی کہ حرا کے چہرے پر شرمگیں مسکراہٹ ابھر آتی تھی۔ دونوں کو برابر میں بیٹھا دیکھ کر مدیحہ کے دل میں عجیب خیال

آیا۔ "کاش میری طوبیٰ، حرا کی جگہ ہوتی۔" وہ چشمِ تصور میں طوبیٰ کو دلہن بنا دیکھ رہی تھیں کہ ایک دم ماہین نظروں کے سامنے آگئی۔ وہ حرا کی بہن تھی۔ اس میں اور طوبیٰ میں دو سال کا فرق تھا۔ وہ بھی طوبیٰ سے چھوٹی تھی۔ اس کی شادی پانچ سال قبل سمیعہ کے سسرالی رشتے داروں میں ہوئی تھی۔ دھان پان سی ماہین اب تو دو بچوں کی ماں بن کر اس قدر پھیل گئی تھی کہ طوبیٰ سے بھی بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گود میں اڑھائی سال کے بچے کو لیے بہن کے برابر میں بیٹھنے آئی تو فوٹو گرافر نے طوبیٰ کو ہٹا دیا۔

"باجی جی! آپ ذرا سائیڈ میں ہو جائیں۔ یہ سِسٹرز کا گروپ فوٹو ہے۔ بھائی جی! آپ ادھر دولہا کی سائیڈ میں آجائیں۔" فوٹو گرافر نے ماہین کے میاں عامر سے کہا جو دوسرے بچے کو سنبھالتے ہوئے بیوی کے برابر میں ہی آبیٹھا تھا۔ طوبیٰ گڑبڑا کر اسٹیج سے ہی اتر آئی۔ اس نے ماں کو جھلملاتی آنکھوں سے دیکھا اور تیز قدموں سے ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔ مدیحہ کو لگا ان کا دل گویا کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ اولاد کا دکھ ایسا ہی جان لیوا ہوتا ہے۔ آج پہلی بار انہیں بیٹی کی آنکھوں میں شکوہ نظر آیا کیونکہ آج ہی ابرار نے ان کی آنکھوں پر بندھی "میں" کی پٹی اتار پھینکی تھی۔ "کیا میں واقعی خود غرض ہوں؟" ان کے ضمیر نے انہیں بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔

"مدیحہ تم اس طرح بات بے بات رشتے مسترد کر کے ٹھیک نہیں کر رہی ہو۔ دیکھو شادی ایک دینی اور معاشرتی فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ فطری تقاضا ہے۔ اس طرح ہماری بیٹی ہم سے بددل بھی ہو سکتی ہے۔ لڑکیاں ویسے ہی حساس ہوتی ہیں۔ ہر چیز محسوس کرتی ہیں۔" ماہین کی شادی کے وقت بھی جب مدیحہ نے طوبیٰ کے لیے ایک اور رشتے کو مسترد کر دیا تھا تو ابرار نے انہیں واضح طور پر سمجھانے کی ایک اور کوشش کی تھی۔

"عجیب باتیں کرتے ہیں آپ۔ میں کوئی دشمن ہوں اس کی۔ لڑکیاں ناسمجھ اور نادان ہوتی ہیں۔ جذباتی ہوتی ہیں۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتی ہوں اس لیے اس کا رشتہ ایسی ویسی جگہ نہیں کر سکتی۔ مگر آپ پتا نہیں کیوں نہیں سمجھتے کہ بعد کے رونے سے ابھی کا رو لینا اچھا ہے۔" وہ ہمیشہ کی طرح اڑی رہیں اور ابرار ہمیشہ کی طرح خاموش ہو گئے اور شاید یہی ان کی غلطی تھی۔ بعض اوقات بے جا خاموشی بھی نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔ وہ گھر کا امن قائم رکھنے کی خاطر خاموش رہے مگر مدیحہ بیگم اس رویے کو ان کی کمزوری اور اپنی حمایت سمجھتی رہیں۔

"آپ نے مجھے آئینہ دکھانے میں اتنی دیر کیوں کر دی ابرار؟" انہوں نے پلکوں کی باڑ پر آتے آنسوؤں کو انگلیوں کی پوروں میں جذب کرتے ہوئے خود کلامی کی۔ وہ آج خود آگہی کی منازل طے کر رہی تھیں مگر ان کی ذات کے عیاں اور ڈھکے چھپے پہلوؤں کے درمیان فاصلہ اس قدر زیادہ تھا کہ خود شناسی کی یہ مسافت انہیں بڑی کڑی اور دقت آمیز محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بظاہر سب کے سامنے موجود تھیں مگر اس وقت وہ خود کو اس ہجوم میں بھی تنہا محسوس کر رہی تھیں۔ انسان کی انا، اس کا غرور اس کو یونہی تنہا کر دیتا ہے۔ چاروں اطراف رونق کے باوجود انہیں خود میں سناٹے اترتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ایسے میں ایک شناسا سا آواز نے انہیں بری طرح چونکا کر رکھ دیا۔ اپنے نام کی آواز پر وہ چونکیں تو لمحہ بھر کو ٹھٹک کر رہ گئیں۔ آواز گو کہ شناسا سی تھی مگر آواز دینے والے وجود کو پہچاننے میں انہیں ذرا دقت محسوس ہوئی۔ تب ہی اس وجود نے ان کو اس مشکل سے نکالا۔

"ارے مدیحہ! مجھے نہیں پہچانیں۔ میں ثریا۔۔۔ ایچ پی وائے اسکول کی تمہاری کولیگ۔"

"اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ یاد آیا۔ کیسی ہو تم؟ یہاں کیسے؟ بہت عرصہ ہو گیا تمہیں دیکھے ہوئے اور پھر تم بدل بھی تو گئیں۔" مدیحہ کی یادداشت لوٹی تو انہوں نے سوالات کی بھرمار کر دی اور ساتھ ہی ان کے گلے لگ گئیں۔

"ہاں، واقعی بہت عرصہ ہو گیا۔ بھئی میرے ہزبینڈ، سعد کے آفس میں ہوتے ہیں۔ تو تمام اسٹاف ممبرز کو

بھی سعد نے بمعہ فیملی انوائیٹ کیا تھا۔" ثریا نے مسکراتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"اچھا! بس دیکھو کیسے ملاقات ہو گئی۔ اچھا آؤ یہاں بیٹھو۔ گھر کہاں ہے تمہارا۔ میں آؤں گی یا تم چکر لگاؤ۔ میں یہاں قریب میں ہوں۔ مل کر خوب باتیں کریں گے۔" مدیحہ بہت پرجوش تھیں۔ ثریا ان کی پرانی کولیگ ہونے کے ساتھ ساتھ بی ایڈ میں ان کی کلاس فیلو بھی رہی تھیں۔ دونوں میں دوستی بھی خوب تھی۔ پھر مدیحہ نے شادی اور بچوں کی مصروفیات کے باعث کچھ عرصے جاب سے کنارہ کشی کیا اختیار کی، سب سے جیسے کٹ کر ہی رہ گئیں۔

"ضرور کیوں نہیں۔ تم سناؤ۔ تم کیسی ہو؟ تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

"میرے ماشاء اللہ تین بچے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ ابھی نظر نہیں آ رہے ورنہ ملواتی تمہیں۔ تم سناؤ تمہارے کتنے بچے ہیں۔ شادی کب کی؟ بتایا بھی نہیں۔ تمہارے بچے بھی اب میرے بچوں کے ہم عمر ہی ہوں گے۔ ہم نے سارے کام تقریباً" ساتھ ساتھ ہی کیے۔ بی ایڈ، پھر جاب..... بس شادی ذرا میری پہلے ہو گئی۔" مدیحہ نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ذرا نہیں بہت پہلے۔ میری شادی چھ سال قبل ہی ہوئی ہے۔ بچے نہیں ہیں۔ کیونکہ زیادہ عمر کے باعث اب میں ماں نہیں بن سکتی۔ بہت پیچیدگیاں ہو گئی ہیں عمر بڑھنے کے باعث۔ میں اپنے میاں کی دوسری بیوی ہوں۔ ان کی پہلی بیوی حادثے میں فوت ہو گئی تھی اور اتفاق سے اولاد بھی کوئی نہیں تھی۔ اب تو ہر چیز سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔" ثریا نے آزردگی سے کہا۔

"مگر کیوں..... کیا کمی تھی تم میں؟" مدیحہ کے لہجے میں بھی افسردگی در آئی۔ وہ واقعی دکھی ہو رہی تھیں۔ ثریا اسٹاف کی سب سے خوش شکل اور ایکٹو ممبر تھیں۔

"کوئی کمی ہوتی تو اچھا ہوتا مدیحہ۔ اماں سمجھوتہ کر لیتیں۔ مگر انہیں یہی لگتا رہا ہے کہ میں اپنی اکلوتی اور خوش شکل بیٹی کے لیے سمجھوتہ کیوں کروں۔ پھر جب وہ اپنا ہم پلہ، ہم پسند اور ہم نسب داماد تلاش کرتے کرتے تھک گئیں تو انہوں نے "سمجھوتے" نامی کشتی کو میرے جہیز کے ہمراہ کر دیا جسے میں نے ساری زندگی برداشت کے چپو کے سہارے گھسیٹنا ہے۔ ورنہ ناؤ کنارے کیسے لگے گی۔ اور پھر وہ خود اپنے ہاتھوں کیے گئے مجھ پر اس کرم کو میرا نصیب کہہ کر بری الذمہ ہو گئیں۔" ثریا نے نم آنکھوں سے مدیحہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو مدیحہ کو لگا کہ ان کے وجود کو طوفانی جھکڑوں نے جکڑ لیا ہے۔ وہ دم سادھے ثریا کو دیکھے جا رہی تھیں کہ یکایک کھانے کا شور اٹھا تو ثریا نے انہیں کندھے سے پکڑ کر ہلایا اور کھانے کی ٹیبل کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ ثریا اپنا کھانا لے کر اپنے ہزبینڈ کی طرف چلی گئیں۔ اور مدیحہ حق میزبانی ادا کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

کھانا کھانے کے فوراً" بعد ہی رخصتی کا شور مچ گیا کیونکہ ہال کے بند ہونے کا ٹائم قریب تھا۔ مدیحہ بھی اسٹیج کے قریب جا پہنچیں۔ حرا کو سہرا پہنا کر اسٹیج سے اتارا گیا تو سمیعہ اور ماہین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حرا کو ماں اور بہن کی ہچکیاں سنائی دیں اس کی آنکھوں میں ٹھہرا پانی بھی پلکوں کی باڑ توڑتا رخساروں پر بہہ نکلا۔ اس جذباتی منظر پر سب ہی خواتین آبدیدہ ہو گئیں۔ خود مدیحہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور جب حرا باری باری سب سے ملتی ہوئی ان کے پاس آئی تو اسے گلے لگا کر دعا دیتے ہوئے انہیں ایک ہی خیال بار بار آتا گیا کہ بیٹیاں تو واقعی سب کی سانجھی ہوتی ہیں، انہیں خود سے جدا کرنا کبھی بھی والدین کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں ہوا کرتا مگر لوگ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے انہیں دعاؤں کے سائے میں رخصت کر ہی دیتے ہیں کیونکہ اللہ کے اس حکم کی بجا آوری کر کے ہی والدین دین و دنیا میں سرخرو ہوتے ہیں اور یہ عمل ان کے لیے دلی طمانیت اور دائمی خوشی کا باعث بھی بنتا ہے۔ مدیحہ نے اپنی بیٹی کے نصیب، سب کا خالق اور سب کا جوڑ بنانے والے مالک کے سپرد کرنے کا عزم کر لیا اور اب ان کی نگاہیں اصغر بھائی کو تلاش کر رہی تھیں۔





رنجش ہی سہی

رمشاہ ناز

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آپھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

میرا موڈ بہت آف تھا... گھر میں اب اکیلے رہنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ اور دیواریں کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھیں۔ اتوار کا دن تھا... سو آفس بھی نہیں گیا تھا۔ اس لیے گھر میں کچھ زیادہ ہی اداسی محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ انسان ہمیں اپنا عادی بنا لیتے ہیں۔ پانچ سال پہلے بھی میں اس گھر میں اکیلا رہتا تھا... مگر کتنا مطمئن تھا۔ اچھی بھلی روٹین سیٹ تھی۔ روز آفس جانا۔ اتوار کا دن سو کے گزار دینا... مگر اب تو نیند بھی آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے جلا ہوا ٹوسٹ انڈے کے ساتھ کھا کے کڑوی چائے پی تھی۔ مزاج بھی کڑوا ہو رہا تھا۔

علینہ نے مکمل طور پہ مجھے اپنا عادی بنا لیا تھا وقت پہ کھانا... آفس جانے سے پہلے کپڑے تیار ملتے تھے۔ میری فائلز اور تمام دوسری چیزیں بھی وہی سیٹ کرتی تھی۔ ایک اچھی بیوی والی تمام خوبیاں اس میں موجود تھیں۔ وہ میرے مزاج کا بھی بہت خیال رکھتی تھی۔ ان پانچ سالوں میں اس نے میرا اس طرح خیال رکھا تھا کہ میں لو میرج کے خلاف بات کرنے والے لوگوں

سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس کے آنے سے اُس سونے گھر میں بہار آگئی تھی۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ بس اولاد کی نعمت سے محروم تھے، مگر ہم ذرا بھی ناامید نہیں تھے۔ زندگی بہت خوب صورتی سے رواں دواں تھی۔ مگر کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں، جو زندگی بدل کر رکھ دیتے ہیں اس میں تاریکیاں بھر دیتے ہیں۔

پندرہ دن پہلے میرے اور علینہ کے درمیان ہونے والے جھگڑے نے سب کچھ بدل کے رکھ دیا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کے چلی گئی تھی اور یہ پندرہ دن میں نے کیسے گزارے یہ میں ہی جانتا ہوں۔ مجھے آج وہ بہت یاد آرہی تھی۔ اتوار کو ٹی وی پر میرا اور علینہ کا فیورٹ شو آتا تھا۔ چینل بدلتے بدلتے وہ پروگرام لگ گیا۔ گلوکارہ وہ غزل گا رہی تھی جو ہم دونوں کو بہت پسند تھی۔ پروگرام لگتے ہی وہ تمام یادیں تازہ ہوگئی تھیں جب ہم اکٹھے بیٹھ کے یہ پروگرام دیکھتے تھے۔ اب جو غزل لگی ہوئی تھی وہ میرے تمام جذبات کی عکاسی کر رہی تھی۔ غزل کا ایک ایک لفظ میرے دل کی آواز لگ رہا تھا۔

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آپھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

میرا دل چاہ رہا تھا کہ علینہ ایک بار واپس آجائے۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ اگرچہ غلطی میری نہیں تھی۔

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم رہ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

مجھے حیرانی تھی کہ وہ اس طرح مجھ سے دور کیسے رہ سکتی تھی۔ ٹھیک ہے، وہ آکے مجھ سے پہلے جیسا سلوک نہ بھی کرے، یہ بھی مجھے منظور ہے۔ کبھی کبھی دل کرتا کہ میں خود اسے فون کرکے بلالوں اس سے معافی مانگ لوں، مگر میں ایسا کیوں کروں، میری غلطی تو نہیں ہے۔ میرے ساتھ پانچ سال رہ کے بھی اسے میری نیچر کا پتا نہیں چلا۔ اس نے مجھ پہ شک کیا تو کیوں کیا۔ میں اس کے علاوہ کسی اور لڑکی کے بارے میں سوچ بھی کیسے سکتا ہوں اور کیا وہ بھی یہ پروگرام دیکھ رہی ہوگی؟ اسے بھی تو بہت پسند تھا۔

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

غزل کا ہر لفظ میرے دل میں پیدا ہونے والے جذبات کو ہوا دے رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے کوئی میرے دل کا حال پڑھ رہا ہو۔ مجھے یہ پروگرام زہر لگتا تھا۔ پرانے گانوں اور غزلوں سے مجھے ویسے ہی الرجی تھی، مگر میں شاہ زیب کے لیے ہر اتوار کو ان کے ساتھ بیٹھ کے دیکھتی تھی۔ وہ اس پروگرام کو شدت سے پسند کرتے تھے۔ پرانی غزلوں میں ان کی جان تھی۔ اس نے میں بھی شروع میں اپنی پسندیدگی ظاہر کرتی تھی، مگر پھر آہستہ آہستہ عادت ہوگئی۔ اور مجھے بھی ایسی موسیقی اچھی لگنے لگی۔ شاید اسے کسی کے رنگ میں رنگنا کہتے ہیں اور یہ عادت ہر اچھی بیوی میں ہوتی ہے اور میں بھی اچھی بیوی تھی۔

مجھے میرے گھر آئے ہوئے پندرہ دن ہوگئے تھے، مگر زیبی کا کوئی فون نہیں آیا تھا۔ میں نے گھر والوں کو اپنے جھگڑے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ کیونکہ بہرحال ہماری لو میرج تھی اور لو میرج میں لڑائی ہوجائے تو لوگ ویسے ہی بڑی باتیں کرتے ہیں کہ ''پہلے تو بڑا پیار کا بھوت سوار تھا سر پہ۔ اب کیا ہوا۔'' یہ فطری سی بات ہے کہ ہر گھر میں تھوڑی بہت نوک جھونک تو ہو ہی جاتی ہے، مگر دنیا نہیں سمجھتی۔

میں نے اپنے گھر والوں سے کہا تھا کہ وہ کسی کام سے شہر سے باہر گئے ہیں۔ کچھ ماہ بعد آئیں گے، مگر بھابھیوں کی نگاہیں صاف بتاتی تھیں کہ انہیں میری بات پہ یقین نہیں آیا۔ ایک بار میں کچن میں پانی پینے کے لیے جانے لگی تھی کہ کچھ آوازوں نے میرے قدم روک دیے۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟ علینہ سچ بول رہی ہے؟'' بڑی بھابھی نے چھوٹی سے پوچھا۔

"سچ پوچھو آپا! تو مجھے سفید جھوٹ لگتا ہے۔۔۔ بھلا بتاؤ نہ کوئی فون کال، نہ خط پتر۔۔۔ دال میں کچھ کالا ہے۔۔۔" چھوٹی بھابھی نے تبصرہ کیا۔

"ارے پوری دال ہی کالی ہے۔۔۔ میاں چھوڑنے تک نہیں آیا۔ خود ہی آگئیں منہ اٹھا کے۔۔۔ ہمارے سینوں پہ مونگ دلنے۔۔۔"

میں بہت پریشان تھی۔۔۔ اس سے پہلے کہ محلے کے لوگ بھی باتیں کرنے لگیں، مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔ پھر میں سوچی کہ جب غلطی میری نہیں ہے تو میں کیوں جھکوں؟ مگر دنیا والے۔۔۔

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

گلوکارہ اپنی میٹھی آواز کا ترنم جگائے ہوئے تھی اور میرے زخم پھر سے ہرے ہوگئے تھے۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی زیبی، آپ اس حد تک گر جائیں گے۔" میں رندھی ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔

"علینہ سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔ ایسا نہیں ہے جیسا تم سوچ رہی ہو۔۔۔ وہ صرف میری کولیگ ہے۔۔۔ اور کچھ نہیں۔۔۔" شاہ زیب مجھے سمجھا رہا تھا۔

"کولیگ ہے؟ اس طرح ہنس ہنس کے کولیگز سے باتیں کی جاتی ہیں؟ اور باہر لنچ بھی کیا جاتا ہے؟ ہے نا؟" میں بہت غصے میں تھی۔

"ہاں ہم ہوٹل گئے ضرور تھے، مگر کچھ دیر میں میرے باقی کولیگز کو بھی آجانا تھا۔ ہم وہاں اکیلے بیٹھنے کے لیے نہیں گئے تھے۔۔۔ میری پروموشن کی خوشی میں سب نے ٹریٹ مانگی تھی یار۔۔۔ اس لیے میں ان کو وہاں لنچ کروانے لے گیا تھا۔۔۔ باقی سب کار پارک کر کے آنے ہی والے تھے کہ تم نے اپنی دوست کے ساتھ ہمیں وہاں دیکھ لیا۔۔۔" شاہ زیب صفائی پیش کر رہا تھا۔

"بس کردیں۔۔۔ زیبی پلیز۔۔۔!" میں غصے میں نہ جانے کیا کچھ بول رہی تھی۔ "صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ وہ آپ کی گرل فرینڈ ہے۔۔۔ بتائیں کب شادی کر رہے ہیں۔۔۔؟ یا پھر جسٹ ٹائم پاس کے لیے رکھا ہے اس کو اور کتنی ہیں؟"

تڑاخ۔۔۔ ایک زوردار تھپڑ میرے گال پر رسید کر کے مجھے خاموش کروایا گیا تھا۔۔۔ اور میں پتا نہیں کیا کیا بول کے گھر چھوڑ کے آگئی تھی۔ شاید غلطی ہم دونوں کی تھی۔۔۔ مگر مجھے امید تھی کہ زیبی مجھ سے معافی مانگیں گے، مجھے لینے آئیں گے۔۔۔ مگر وہ نہیں آئے۔

کچھ تو میرے پندار محبت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

آنسو سب حدیں توڑ کے بہہ نکلے۔۔۔ سارے لمحات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے۔

اک عمر سے ہوں لذت گریہ سے بھی محروم
اے راحت جاں، مجھ کو رلانے کے لیے آ

میری چھوٹی بہن اقرا میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کے پریشان ہوگئی۔

"اک عمر سے ہوں لذت گریہ سے بھی محروم۔۔۔"

میں روتے روتے بے حال ہوگئی تھی۔

"اے راحت جاں مجھ کو رلانے کے لیے آ" میں بے ہوش ہوگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اب تک دل خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

مجھے ہمارے درمیان ہونے والی اس آخری گفتگو بلکہ لڑائی کے تمام الفاظ یاد آرہے تھے۔۔۔ میں نے اس دن پہلی بار علینہ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔۔۔ اور وہ غصے سے بے قابو ہوگئی تھی۔۔۔ کچھ دیر ہم خاموش رہے۔

پھر وہ بولی "برا لگا۔۔۔؟ سچ کڑوا ہی لگتا ہے۔۔۔ میں جا رہی ہوں۔۔۔ رہیں آپ اکیلے۔۔۔" اس نے ضروری سامان پیک کیا، سیل فون پکڑا اور جاتے ہوئے کہہ کر گئی۔

"اگر کچھ دن میں طلاق کے پیپرز نہ آئے تو میں خلع کے لیے کیس دائر کردوں گی۔۔۔" اس کے یہ الفاظ

مجھ پہ بم کی طرح گرے۔
میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔۔۔ میں بے حس و حرکت وہیں کھڑا رہ گیا۔۔۔ اور دروازہ بند ہونے کی آواز پورے گھر میں گونج گئی۔۔۔

"مانا کہ محبت کا چھپانا ہے محبت
چپکے سے کسی روز جتانے کے لیے آ"

میرے دل کا عالم عجیب ہو رہا تھا۔ عجیب بے چینی سی پھیل رہی تھی چاروں طرف۔۔۔

جیسے تجھے آتے ہیں نہ آنے کے بہانے
ایسے ہی کسی روز نہ جانے کے لیے آ

میں نے فون پکڑا اور ساری انا بالائے طاق رکھتے ہوئے علینہ کو کال کی۔۔۔ نمبر آف جا رہا تھا۔ میں نے دیوانہ وار بار بار نمبر ڈائل کیا۔۔۔ مگر بے سود۔۔۔ پھر میں نے ارادہ کیا کہ خود اسے لینے جاؤں گا۔۔۔ ہاتھ جوڑ کے معافی مانگوں گا۔۔۔ مگر اسے لے آؤں گا۔۔۔

کچھ دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میں بیڈ پہ لیٹی تھی۔ امی، ابو اور ایک بھابھی بھی پاس موجود تھیں۔ ویسے تو بلا کی بناوٹی تھیں، مگر اس وقت وہ کیوں بناوٹی خوشی ظاہر کر رہی تھیں، یہ سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔

"مبارک ہو علینہ! تم ماں بننے والی ہو۔۔۔" مجھے کچھ دیر تک سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ میں اس بات پر خوش ہوں یا اداس۔۔۔ مجھے نہیں پتا میں کب رونے لگی۔۔۔

امی نے پریشان ہو کر پوچھا۔۔۔ "کیا ہوا بیٹا! اتنی خوشی کی بات پہ تمہیں رونا کیوں آیا۔۔۔؟"

"خوشی کے آنسو ہیں ماں جی۔۔۔" بھابھی نے میری جگہ جواب دیا۔

پھر میں نے ایک بیوی بن کے نہیں بلکہ ماں بن کر سوچا۔۔۔ بے اختیار میں نے موبائل آن کیا۔۔۔ پھر کچھ دیر موبائل ہاتھ میں لے کر بیٹھی رہی۔۔۔

اچانک امی بولیں۔ "بیٹا! شاہ زیب کو بھی خوش خبری سنا دو۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہوں۔۔۔ پھر اسی غزل کا ایک شعر لکھ کے بھیج دیا۔

میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ چکا تھا۔ اور وہ الفاظ سوچ رہا تھا جو کہہ کے مجھے علینہ سے معافی مانگنی تھی۔ میں نے ہمت کر کے دستک دی۔۔۔ کہ اچانک میرے موبائل پر کوئی میسج آیا۔۔۔

کچھ تو میرے پندار محبت کا بھرم رکھ۔۔۔
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

میرے محبوب کا در میرے لیے کھل چکا تھا۔۔۔ میسج پڑھ کے میں تقریباً" بھاگتے ہوئے اندر گیا۔ اندر بھابھی تھیں۔ میں نے سلام کیا اور علینہ کا پوچھا۔۔۔

"واہ! اتنی کوئیک سروس۔"

بھابھی بہت خوش تھیں شاید۔۔۔ پھر وہ مجھے کمرے میں علینہ کے پاس لے گئیں۔

میں نے میسج کر دیا تھا، مگر ان کا جواب نہیں آیا۔۔۔ مجھے بہت امید تھی، مگر اب وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ شاید بزی ہوں۔۔۔ میں نے دل میں سوچا، مگر پھر اچانک وہ میرے سامنے تھے۔۔۔ میں بہت حیران ہوئی۔ بلکہ بہت خوش ہوئی۔ آخر انہوں نے بھی اپنی انا کی قربانی دے ہی دی۔

"مبارک ہو بیٹا! تم باپ بننے والے ہو۔" ابو نے شاہ زیب کو گلے لگا لیا۔

علینہ کو بستر پہ دیکھ کے میں بہت پریشان ہو گیا تھا کیوں کہ سب اس کے گرد یوں جمع تھے جیسے وہ بیمار ہو۔ پھر اچانک مجھے ابا نے دنیا کی سب سے بڑی خوش خبری سنا کر گلے لگا لیا۔۔۔

"مبارک ہو بیٹا! تم باپ بننے والے ہو۔" یہ الفاظ میرے کانوں میں شیرینی گھول گئے۔

ہم دونوں نے اپنی اپنی انا کی قربانی دے دی تھی اور خوشیوں نے ہمارے گھر پہ دستک۔۔۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ ہمیں چھوٹی سے چھوٹی غلط فہمی کو بھی دور کر لینا چاہیے کہیں یہ اتنی بڑی غلطی نہ بن جائے کہ گناہ کبیرہ لگنے لگے۔۔۔ رنجش دور بھی کی جا سکتی ہے۔

چند قدم اٹھا کے۔۔۔ "الفت کے۔۔۔ محبت کے۔۔۔"



غزالہ روشن

انصاف

معدوم ہوئے وقتوں میں دور کہیں سبزے سے لپٹے ایک پہاڑ پر ایک جوگی آسن جمائے بیٹھا تھا۔ مضبوط جثہ، لمبے بال، تیکھے نقوش اور پختہ عزم سے سجا سخت چہرہ، وہ کب سے یہاں بیٹھا تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا، کہنے والے کہتے تھے کہ وہ تقریباً" سو سال سے ریاضت کر رہا تھا مگر صحیح وقت کسی کو معلوم نہ تھا، وہ کہاں سے کھاتا پیتا تھا؟ اس سے بھی کوئی واقف نہ تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ اس کے پاس غیب سے دستر خوان اترتے تھے اور کوئی کہتا تھا کہ وہ رات کی تاریکی میں آس پاس کے درختوں کے پھلوں سے بھوک مٹاتا تھا مگر اصل بات کسی کو پتا نہ تھی۔ وہ یہاں کیوں بیٹھا تھا؟ کیا مانگ رہا تھا؟ اس رمز سے بھی کوئی آشنا نہ تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ۔۔۔ مگر اب جانے بھی دیجیے کہ جب.. کسی کو کیا فرق پڑتا ہے کہ کہنے والے کیا کہتے تھے۔

اس جوگی کے گرد زیست اپنے سارے رنگوں

مکمل ناول





بمسیت ناچتی جیسے وہ کوئی داسی تھی جو بھاؤ بھید ' عشوہ و غمزہ دکھاتے اس کے گیان دھیان کو توڑنا چاہتی تھی مگر جوگی کسی طور متوجہ ہی نہ ہوتا تھا۔ سرخ 'گلابی' قرمزی' نارنجی' پیلے اور نہ جانے کون کون سے رنگوں سے سجے پھول 'خوشبوئیں بکھیر کر اپنی چھب دکھلاتے مگر جوگی کی بند آنکھ نہ کھلتی۔

سبزہ زار پر چوکڑیاں بھرتے ہرن ' سرخ یاقوت آنکھوں والے خرگوش ' نغمے الاپتے معصوم پرندے حیرت و استعجاب سے اس کے پتھر ہوئے جسم کو دیکھتے کہ شاید کبھی کوئی جنبش ہو مگر نہیں 'کوئلیں کوکتیں ' مور رقص کرتے 'جھرنے موسیقی سناتے مگر کسی بھی نظارے نے جوگی کو نظر بھر کر خود کو دیکھنے پر مجبور نہ کیا اور وہ آنکھیں موندے اور شاید من کی آنکھیں کھولے ریاضت میں مشغول رہا۔

اسی حال میں اس کو سو سال بیت گئے۔ آخر کار یہ تپیا رنگ لائی' اللہ بزرگ و برتر نے اس کی ریاضت کو قبولیت کی سند بخشتے ہوئے اپنا ایک فرستادہ اس کے پاس بھیجا کہ وہ جوگی سے عزت و تکریم کے ساتھ اس کی خواہش پتا کرے کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ دلوں تک رسائی رکھنے والے نے اسے یہ اعزاز بخشا کہ اس کی خواہش یوں انوکھے ڈھنگ سے معلوم کی جائے تاکہ اسے اپنے خاص ہونے کا احساس ہو' اللہ کا بھیجا یہ پیغامبر ایک خوب صورت انسان کے روپ میں کہیں افق سے نمودار ہوا اور جوگی کی طرف بڑھنے لگا۔

اس کا ریشم و حریر کا نفیس لمبا لبادہ 'سبز مخملی گھاس پر سفید بادل کی طرح لہراتا تھا اور اس کے صافے میں لگا ہیرا قوس قزح کے سارے رنگ سمیٹے جگمگاتا تھا۔ اس کے چاروں طرف تتلیاں اور بھنورے جیسے رقص کرتے تھے اور سکون 'اطمینان اور خوشی کی لہریں گویا اس کے وجود سے پھوٹتی تھیں۔ اس کے قدم زمین سے کچھ اوپر تھے اور چہرے پر ایک الوہی مسکراہٹ تھی۔ سبک خرامی سے چلتا یا تیرتا ہوا وہ فرستادہ جوگی کے سامنے جا کر رک گیا۔ اس کے کندھے خم تھے اور نظریں نیچی جیسے کہ وہ مقابل پیامبر ہستی کا مرتبہ جانتا ہو۔ جوگی نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ہاں شاید سو سالوں میں پہلی بار اپنی آنکھیں کھولیں تو ان آنکھوں کی سرخی اور جلال دیکھ کر چرند پرند کچھ سہم سے گئے۔ پھر اس نے آنکھیں پیامبر کی جانب گھمائیں اور پاٹ دار آواز میں مخاطب ہوا۔

"کیا جاننے آئے ہو؟"

پیامبر نے پوری تکریم کے ساتھ جواب دیا۔ "اے جلیل القدر ہستی' اللہ بزرگ و برتر نے آپ کی ریاضت کو قبولیت بخشی اور مجھے یہ ذمے داری کہ جان پاؤں کہ آپ اس کے بدلے کیا چاہتے ہیں؟ زمین و آسمان کے خزانے' ہر نعمت' ہر رحمت آپ کے لیے حاضر ہے۔ آپ جو چاہیں 'ارشاد فرمائیں۔"

جوگی نے سرخ ڈوروں والی آنکھیں گھمائیں اور پھر آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے بس انصاف چاہیے۔"

پیامبر یوں پیچھے ہٹا کہ جیسے اس کے پر جلنے لگے ہوں۔

کچھ لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "آپ کی خواہش مقدم مگر اللہ بزرگ و برتر آپ کو سو سال کی مزید مہلت دیتا ہے کہ آپ اس پر نظر ثانی کر لیں۔" یہ کہہ کر اس نے چند ساعت جوگی کے جواب کا انتظار کیا مگر اس کو محو استغراق پا کر اپنا لبادہ سمیٹ کر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی طرح غائب ہو گیا۔



"مائرہ 'مائرہ اٹھو بیٹا! ماموں کے ہاں جانا ہے۔ تمہیں بتایا بھی تھا پھر بھی تم ابھی تک گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہی ہو 'اٹھو بس اب۔" رابعہ خاتون نے اپنی چھوٹی بیٹی کو جھنجھوڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

آج ان کے بھائی فرید کے ہاں میلاد و قرآن خوانی کی تقریب تھی اور وہ سب وہاں مدعو تھے۔ بڑی بیٹی ماہ نور تو کب کی تیار بھی ہو چکی تھی مگر مائرہ یونیورسٹی سے آ کر

بس تھوڑی دیر سولوں، کہہ کر ابھی تک خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔

"اف امی، یہ ورکنگ ڈیز میں تقریبات رکھنے کی کیا تک بنتی ہے بھلا؟ میرا سمسٹر ختم ہونے کو ہے۔ آپ کو پتا ہے لگاتار کلاسز ہو رہی ہیں۔ آج بھی دو گھنٹے کی ڈرامے کی کلاس لی سر کریم نے اس کے بعد میم لبنیٰ نے ہسٹری پڑھا پڑھا کر میرے تو دماغ کی چولیں ہلا دی ہیں۔ امی میں نہیں جارہی۔"

مائرہ صاحبہ بیڈ پر ہی بیٹھی آنکھیں بند کیے جھومتے ہوئے یونیورسٹی کا حال نشر کرتی جارہی تھیں، آخری جملہ واپس تکیے پر گرتے ہوئے فرمایا گیا مگر امی بھی چوکس تھیں فوراً" تکیہ قبضے میں کر لیا اور پھر وہی تکیہ کھینچ کر مارا۔

"فوراً" اٹھ جاؤ۔ ایک اکلوتا ماموں ہے اس کی خوشی میں بھی نہیں جانا ہے کیا؟ چلو شاباش میرا بچہ، جلدی جا کر شاور لے لو نیند بھاگ جائے گی۔ نور نے تمہارے کپڑے بھی پریس کر دیے ہیں۔ جلدی سے اٹھ جا میرا بچہ۔" امی کے پچکارنے پر وہ بادل نخواستہ اٹھی۔ ٹائم دیکھا۔ گھڑی چار بجا رہی تھی۔

"چلو دو گھنٹے تو سولی۔" خود کو تسلی دیتے وہ واش روم میں گھس گئی۔ باہر آئی تو سامنے لیمن کلر پر ملٹی کلر کی کڑھائی والا سوٹ، میچنگ جیولری اور چپل تیار رکھی دیکھ کر اس کو بے اختیار اپنی بہن پر پیار آگیا۔ دل چاہا جا کر گلے سے لگا لے مگر فی الحال اتنا وقت نہیں تھا، سو جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے، بال سلجھا کر یونہی چھوڑ دیے کہ گیلے بالوں کو کیا اسٹائل دیتی، میک اپ کے نام پر کاجل اور ہلکی لپ اسٹک لگانے کی ہی اجازت تھی سو بمشکل پندرہ منٹ میں تیار ہو کر جب وہ باہر آئی تو امی اور ماہ نور بڑی چادریں پہنے بالکل تیار کھڑی تھیں۔ ماہ نور نے اس کی استری شدہ چادر اپنے بازو پر ڈالی ہوئی تھی۔ بہن پر ایک بار پھر پیار امڈا اور اس دفعہ اظہار میں بھی دیر نہ کی۔

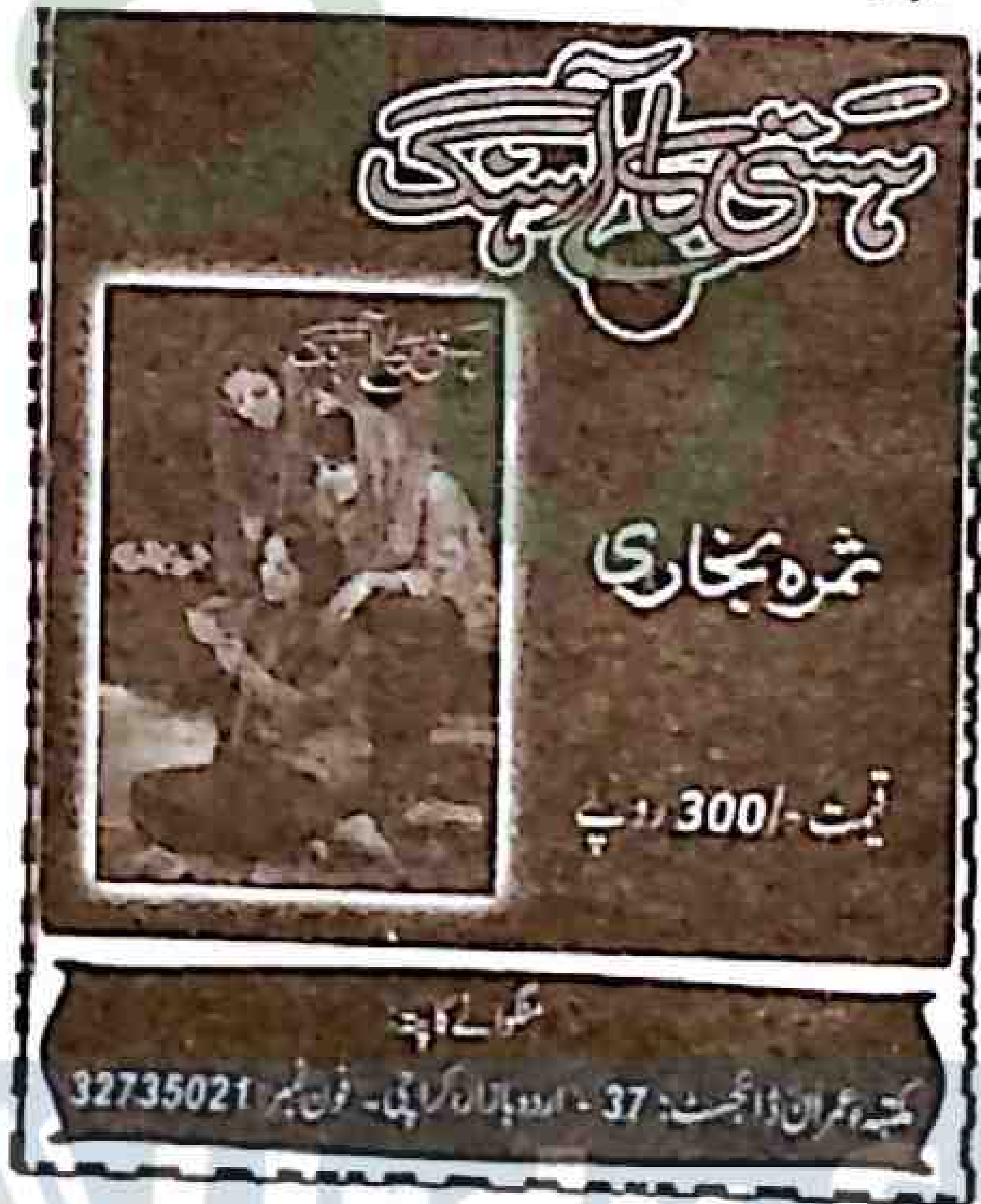
"جیو میری بہن، اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے۔"

مائرہ دعا ہمیشہ بڑے بوڑھوں کے انداز میں اچھے طریقے سے دیتی تھی کیونکہ امی ہمیشہ کہتی تھیں کہ دعا ہمیشہ بہترین انداز میں دو، کبھی بھی مذاق میں مت دو کیونکہ کون سا وقت قبولیت کا ہو، ہم نہیں جانتے۔ سو ابھی بھی یہ دعا سن کر ماہ نور جھینپ گئی جب کہ امی نے بڑے صدق دل سے آمین کہا۔

آسمانی کپڑوں میں ملبوس ماہ نور بہت پیاری لگ رہی تھی اوپر سے اس کے چہرے پر بکھری نرمی اس کے اندر کی اچھائی کا پتا دیتی تھی۔ کم مائرہ بھی نہ تھی، گورا رنگ، کرنجی آنکھیں، لمبے بال۔ دونوں بیٹیاں ہی حسن کا مرقع تھیں اوپر سے رابعہ بیگم کی تربیت گویا سونے پر سہاگہ تھی۔ رابعہ خاتون نے دل ہی دل میں دونوں کی نظر اتارتے ہوئے ان کے نصیب جلد کھلنے کی دعا کر ڈالی۔

"ویسے ماں جانی (یہ مائرہ کے لاڈ سے امی کو پکارنے کا انداز تھا) یہ ماموں جان کے ہاں ہفتہ وار درس و قرآن خوانی تو اتوار کو ہوتا ہے۔ یہ آج کی تقریب کس خوشی میں ہے؟" راستے میں مائرہ نے پوچھا۔

"بیٹا تمہیں بتایا تو تھا کہ حسن پڑھائی مکمل کر کے امریکہ سے آیا ہے۔ اس خوشی میں رکھی گئی ہے یہ تقریب بہت لمبے عرصے کے بعد وطن واپس لوٹا ہے۔



میرے بھائی کی تو خوشی دیدنی ہے۔"

"اوہ اچھا' اچھا ہاں یاد آگیا کہ ولی عہد حسن فرید تخت و تاج سنبھالنے وطن واپس آگئے ہیں۔ ویسے امی اکیلے آئے ہیں یا کوئی گوری بھی لائے ہیں؟" مائرہ شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"ارے تیرے منہ میں خاک' میرا بچہ ایسا کام کیوں کرنے لگا۔ شریفوں کا خون ہے۔ ماں باپ کی رضا سے زندگی کا ساتھی چنے گا۔ خبردار جو یہ اول فول وہاں جا کر بولی۔" رابعہ بیگم پہلے تو غصے میں بولیں پھر کسی خیال میں کھو کر جیسے خود کلامی کرتے ہوئے کہنے لگیں "کاش بھائی جان میری ماہ نور کے لیے پیام دے دیں۔ اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے۔"

"ارے رے رے امی' بس بس اپنے خیالات کی ٹرین کو ذرا روکیں۔ میری بہن کو کوئی رشتوں کی کمی ہے جو آپ یہ آہیں بھر بھر کر دعائیں مانگ رہی ہیں۔ آپ کو خود اپنے منہ سے یہ بات کہہ کر ماہی کو ہلکا کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ میری بہن کا نصیب بہت اچھا ہو گا انشاء اللہ اور یہ اپنا مارے گا تو چھاؤں میں ڈالے گا۔ یہ کون سی منطق ہے۔ میری تو آج تک سمجھ میں ہی نہیں آئی یعنی اپنا مارے گا ضرور اور مرنے کے بعد چھاؤں ہو یا دھوپ کیا پتا چلتا ہے؟ لو بھلا۔"

"اف توبہ! مائرہ تم سے کون جیتے۔ کتر کتر چلتی ہے تمہاری زبان۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔" رابعہ بیگم تو زچ ہی ہو گئیں۔

"ویسے امی' ممانی بڑی اچھی ساس ہوں گی۔ کتنا اللہ اللہ کرتی ہیں' ڈیفنس میں رہ کر بھی اتنی پابندی سے درس کا اہتمام کروانا' قرآن کی تجوید' تلاوت' ترجمہ' تفسیر کی کلاسز منعقد کروانا بڑی بات ہے۔ ہر بات میں کسی نہ کسی آیت یا حدیث کا حوالہ کتنے اچھے طریقے سے دیتی ہیں کہ بات دل میں اتر جاتی ہے۔"

کم گو ماہ نور ویسے بھی ہر کسی کے بارے میں اچھا سوچنے اور اچھا بولنے کی عادی تھی سو اس وقت بھی دل کھول کر اپنی ممانی کو سراہ رہی تھی۔ رابعہ خاتون نے بھی تائید میں سر ہلایا۔

"ہاں بیٹا' اللہ کا شکر ہے کہ بڑا مذہبی ماحول ہے گھر کا۔ میرے بھائی کو ہر طرح سے سکھ دیا ہے زبیدہ نے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سے شادی کے بعد ہی میرے بھائی کی قسمت بدلی۔"

"مگر امی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ممانی کی اپنی دونوں بیٹیاں اپنے ہی گھر میں ہونے والے درس میں کبھی شریک کیوں نہیں ہوتیں اور نہ ہی وہ پردہ کرتی ہیں بلکہ ہمارے چادر لینے کو بھی وہ تضحیک آمیز نظروں سے دیکھتی ہیں اور مجھے لگتا ہے حسن بھائی بھی ایسے ہی آزاد خیال ہوں گے اور آپ بتاتی ہیں نا کہ ماموں ممانی کی پسند کی شادی تھی تو مجھے تو لگتا ہے ان کے بچے بھی اسی ڈگر پر چلیں گے تو امی یہ آدھا ادھورا اپنانے کا فائدہ؟ جب اپنے ہی گھر والے عمل نہ کرتے ہوں تو دوسروں پر تبلیغ کا اثر کیسے ہو گا؟"

مائرہ کے حقیقت پسندانہ تجزیے پر امی سے کوئی جواب بن نہ پڑا تو۔ "بھئی آج کل کی اولاد قابو میں کہاں آتی ہے۔" کہہ کر خاموش ہو گئیں جبکہ ماہ نور کی ایک کڑی نظر نے "اب بہت ہو گئی بس" کا اشارہ دے دیا تو باقی کا راستہ چپ رہ کر ہی کاٹا۔



رابعہ اور فرید دو ہی بہن بھائی تھے۔ دونوں کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ والد نوکری پیشہ تھے اور تنخواہ اتنی ضرور تھی کہ گھر خوش اسلوبی سے چل رہا تھا اور بچے بھی اچھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔۔ رابعہ خاتون کے لیے بی اے کرنے کے بعد عادل کا رشتہ آگیا تھا سو وہ اپنے گھر کی ہو گئیں۔ فرید جو ان سے دو سال چھوٹے تھے ان دنوں یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی کوششوں میں مصروف تھے اور بالآخر ان کو کامرس فیکلٹی میں داخلہ مل ہی گیا تھا۔ ادھر رابعہ تو اپنی گھریلو ذمہ داریوں میں مصروف ہو گئیں جبکہ فرید پڑھائی کے ساتھ ساتھ کچھ اور سرگرمیوں میں بھی مشغول ہو گیا۔

رابعہ اپنے گھر کی بڑی بہو تھیں۔ عادل سے چھوٹا ایک اور بھائی اور دو نندیں تھیں' پھر ساس سسر بھی

حیات تھے۔ گھر کی ساری ذمہ داری گو اس کے سر نہیں ڈالی تھی مگر یہ اتفاق ہی تھا کہ اس کی شادی میں ہی اس کی ایک نند کو پسند کر لیا گیا اور لڑکا چونکہ باہر کام کرتا تھا تو فوراً" ہی شادی کا غلغلہ مچ گیا۔ اب شادی والے گھر کے سو کام' اوپر سے دلہناپے کے شروع شروع کے دن جب ہر لڑکی کو میکہ بھول کر سسرال والوں کو سمجھنے' اپنانے کا کشٹ اٹھانا پڑتا ہے۔ سو رابعہ بھی سب کچھ بھول بھال کر شادی کی تیاریوں اور انتظامات میں مصروف ہو گئی۔ میکے آنا بھی ہوا تو بس کھڑے کھڑے ماں باپ کی خیر خیریت پتا کر کے واپس آ گئی۔ عادل بہت سلجھے ہوئے انسان تھے اکثر اس کو خود ہی اس کے گھر لے جاتے تھے مگر موقع ایسا تھا کہ رابعہ کو خود بھی رکنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ کہیں چار مہینے بعد جب نند کی شادی' ویزا' رخصتی کا شور تھما تو عادل خود ہی رابعہ کو دو دن کے لیے میکے میں رکنے کا کہہ کر چھوڑ آئے۔

اب جو رابعہ گھر آئی اور آرام سے بیٹھ کر گھر کے ماحول کا جائزہ لیا تو ماحول میں کچھ تناؤ سا محسوس ہوا۔ پہلے اس کو یہ لگا کہ شاید وہ اتنے دنوں بعد میکے آئی ہے تو اس کو کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے مگر صبح سے رات تک اس کو پتا چل گیا کہ گھر میں کوئی مسئلہ چل رہا ہے۔ گھر میں پہلے کی طرح کھانے پر فرید کا انتظار نہیں کیا گیا بلکہ امی نے دسترخوان بچھا کر رابعہ کو کھانا لگانے کا کہا۔ رابعہ نے فرید کے آنے پر دسترخوان لگانے کو کہا تو امی چپ ہو گئیں جبکہ ابا درشتی سے بولے۔

"آجائے گا وہ نوابزادہ' ہو گا مصروف رنگ رلیوں میں' تم کھانا لگاؤ بیٹی' پھر باتیں کریں گے۔" رابعہ کے تو پیٹ میں بل پڑنے لگے۔ فرید ماں سے زیادہ ابا کا لاڈلا۔ دونوں کے درمیان باپ بیٹے کا نہیں بلکہ دوستوں جیسا تعلق تھا۔ گو کہ اس تعلق میں بھی ادب و احترام ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا۔ ابا اپنے بیٹے کے بنا حلق سے نوالہ نہیں اتارتے تھے اور آج وہی ابا' بیٹے کے بغیر کھانا لگانے کا کہہ رہے تھے۔

رابعہ بری طرح الجھ گئی ماں باپ سے اشاروں کنایوں میں دوپہر سے کئی بار پوچھ چکی تھی کہ کیا کوئی بات ہوئی ہے؟ کوئی پریشانی ہے مگر ماں باپ نے تو جیسے زبان پر قفل ڈال لیے تھے۔ کچھ نہیں ہوا' کوئی مسئلہ نہیں تم پریشان نہ ہو' جیسے جملے کہہ کر اس کو چپ کرا دیا گیا مگر وہ کیسے پریشان نہ ہوتی۔ اس گھر میں زندگی کے آخر چوبیس سال گزارے تھے' اس گھر کے مکینوں کی محبت خون کے ساتھ رگوں میں بہتی تھی' جو خوشگوار ازدواجی زندگی گزارتے ہوئے بھی بے چین رکھتی تھی۔ دل ہمک ہمک کر میکے جانے کی ضد کرتا تھا وہ کیسے پریشان نہ ہوتی۔

جیسے تیسے اس نے دسترخوان پر کھانا چنا۔ اماں' ابا مسلسل باتیں کرتے ہوئے اس سے اس کے سسرال کے بارے میں پوچھتے رہے۔ سب کیسا رویہ رکھتے ہیں عادل کیسا ہے؟ خیال رکھتا ہے؟ وغیرہ' وغیرہ وہی خدشات جو ہر ماں باپ کو بیاہی بیٹی کی طرف سے لاحق ہوتے ہیں۔ رابعہ تسلی بخش جواب دیتی گئی۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سب بہت اچھے' خیال رکھنے والے تھے اور وہ خود بہت متحمل اور صابر تھی سوفی الحال سکون اور خوشی اس کے وجود سے جھلکتی تھی۔ کھانے کے بعد ابا معمول کے وظائف پڑھنے اپنے کمرے میں چلے گئے تو رابعہ نے ایک بار پھر امی سے پوچھا کہ کیا بات ہوئی ہے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ امی کی آنکھوں میں نمی تو آئی مگر زبان سے کچھ نہ ادا ہوا۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ فرید کا کچھ پتا نہ تھا۔ رابعہ نے امی کو سونے کے لیے بھیجا اور خود فرید کا انتظار کرنے لگی۔ دل میں ٹھان لیا تھا کہ اب فرید سے ہی اگلوائے گی کہ معاملہ کیا ہے۔ رات تقریباً" گیارہ بجے دستک ہوئی۔ رابعہ نے جا کر دروازہ کھولا۔ فرید اسے دیکھ کر چونکا پھر مسکرایا۔

"ارے آپا! تم کب آئیں؟"

"میں تو صبح سے آئی ہوئی ہوں مگر تمہاری شکل اب نظر آ رہی ہے۔ کہاں غائب ہو؟ کہاں تھے اتنی رات تک؟ یونیورسٹی تو دوپہر میں ختم ہو جاتی ہے نا؟"

"ارے آپا سانس تو لینے دو' تم تو ایک دم ہی برس پڑیں۔" فرید ہنستے ہوئے بولا۔ رابعہ کو بھی احساس ہوا کہ انہیں ایک دم یوں تابڑ توڑ سوال نہیں کرنے چاہئیں تھے۔ وہ ایک دم نرم پڑتے ہوئے بولیں۔

"اچھا تم منہ ہاتھ دھو لو' میں کھانا گرم کر کے لا رہی ہوں۔ تمہارے پسندیدہ نرگسی کوفتے بنے ہیں' آج پھر مجھے اپنے بھائی سے ڈھیروں باتیں بھی کرنی ہیں۔"

فرید کھانے کے لیے منع کرتے کرتے ایک دم رک گیا۔ ایک تو بہن پرائی ہو گئی تھی' اس کا دل توڑنا اچھا نہیں لگا۔ دوسرا گھر میں جو فضا تھی اس کو ختم کرنے میں رابعہ اہم کردار ادا کر سکتی تھی' سو وہ خاموشی سے کمرے میں آکر رابعہ کے کھانا لانے کا انتظار کرنے لگا۔ کھانے کے بعد وہ اور رابعہ باتیں کرنے لگے اور پھر حسب توقع رابعہ نے اس سے پوچھا۔

"یہ گھر میں کیا مسئلے چل رہے ہیں فرید؟ تمہاری اور ابا کی کوئی ناراضی ہے کیا؟"

فرید نے سر جھکا لیا اور کچھ لمحوں کے بعد بولا۔ "آپا بات یہ ہے کہ یونیورسٹی میں میری ایک لڑکی سے بہت اچھی بات چیت ہو گئی ہے۔ ہم شادی کرنا چاہتے ہیں بس یہی وجہ ہے ابا کی ناراضی کی۔"

رابعہ کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ان کا تیئس سالہ محض تیئس سالہ بھائی جو ابھی بی کام آنرز کے پہلے سال میں تھا' ان کے سامنے بیٹھا شادی کی خواہش ظاہر کر رہا تھا۔ لمحے سے بھی کم وقت میں ان کو اپنے والدین کی خاموشی کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ ان کے وضع دار' شریف ماں باپ بیاہی بیٹی کو اس کے کم سن بھائی کے عشق و معشوقی کے قصے کیسے سناتے۔ جس بیٹے کو ابھی پڑھ لکھ کر ان کا سہارا بننا تھا' وہ کسی اور جہاں کی سیر کو نکل پڑا تھا' رابعہ کو یوں خاموش دیکھ کر فرید کچھ مایوس سا ہو کر بولا۔

"آپا! میں سمجھا تھا تم تو میری بات سمجھو گی مگر تم بھی۔" رابعہ کے حلق سے بمشکل آواز نکلی۔

"فرید! ان سب باتوں کے لیے تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ یہ کوئی عمر ہے...؟" فرید ان کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور ان کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"آپا تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کی ہے مگر امی ابا میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں۔ آپا' دیکھو ہم ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں ایم کام کر کے ایک معمولی تنخواہ پر ملازم لگوں گا اور ہم ساری زندگی خواہشوں کو پورا کرنے کی تگ و دو میں لگے رہیں گے۔ زوبی بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے' چار بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ کروڑوں کی جائیداد کی وارث ہے۔ تم سوچو اس سے شادی کر کے میں اپنا بزنس شروع کر سکتا ہوں۔ ہم زمین سے آسمان پر چلے جائیں گے۔ امی ابا کا بڑھاپا بھی سنور جائے گا اور میں ابھی شادی کے لیے نہیں کہہ رہا۔ میں صرف نکاح کرنا چاہ رہا ہوں۔ زوبی کے بہت رشتے آرہے ہیں لہٰذا وہ چاہتی ہے کہ ہم نکاح کر لیں۔ اس کے والدین کو بھی کسی بات پر اعتراض نہیں ہے۔ ان کے لیے صرف زوبی کی خوشی مقدم ہے۔ لیکن یہاں تو امی ابا نے آسمان سر پر اٹھا لیا ہے۔"

"وہ اتنے کم حیثیت لوگوں میں داماد اس لیے ڈھونڈ رہے ہیں کہ وہ ساری زندگی ان کے سامنے سر نہ اٹھا سکے۔ تم غلامی کی زندگی جینا چاہتے ہو فرید؟"

"آپا! میں صرف ایک پُر تعیش زندگی چاہتا ہوں اور بس۔ اس کے لیے جب مجھے ایک موقع مل رہا ہے تو میں اسے کیوں گنواؤں؟" فرید نے قطعیت سے کہا۔

رابعہ اس کے بعد بھی تقریباً" ایک گھنٹے تک فرید سے بحث کرتی رہیں مگر جلد ہی ان کو اپنی کوشش کے لاحاصل ہونے کا اندازہ ہو گیا۔ زبیدہ' فرید پر بری طرح فریفتہ تھی اور بے دریغ دولت اس پر لٹا رہی تھی۔ پرفیومز' برانڈڈ اشیاء' ڈیزائنر کپڑے جو کہ اس وقت خالصتاً" امیر ہی افورڈ کر سکتے تھے اب فرید کی الماری میں' کمرے میں جا بجا رکھے نظر آرہے تھیں۔ جگہ جگہ گھومنا' نت نئے ہوٹلز میں کھانا کھانا' تفریحات کا وہ طلسم کدہ جو دولت کی چابی سے کھلتا ہے' وہ زبیدہ نے فرید کے لیے کھول دیا تھا اور فرید پر زبیدہ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ رابعہ کو خوب سمجھ آرہا تھا کہ بہتری

اسی میں ہے کہ فرید کی بات مان لی جائے۔ ورنہ جذبات کے اس منہ زور سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوشش میں خاندانی وقار اور عزت کو ڈوبنے میں دیر نہیں لگے گی۔ یہی بات رابعہ نے بڑے سلیقے سے والدین کو سمجھائی اور ان کے سمجھانے پر بالآخر امی ابا فرید کا رشتہ لے جانے پر تیار ہو گئے۔

زبیدہ کا گھر حسب توقع بے انتہا وسیع و عریض اور شاندار تھا۔ فرید کے والدین اور رابعہ کی توقعات کے برعکس زوبی کے اہل خانہ بہت خوش دلی اور گرمجوشی سے ملے اور اسی پُرتپاک استقبال کی وجہ سے شام کی چائے پر ہونے والی ملاقات رات کے کھانے تک چلی گئی۔ یہ رشتہ چونکہ پہلے سے ہی تقریباً" طے شدہ تھا لہٰذا دیگر معاملات بھی زیر بحث آگئے۔ یہاں آکر رابعہ کے والدین پر ایک نیا انکشاف ہوا' وہ یہ کہ زوبی کے والدین فوراً" شادی کرنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ باہر کے کسی ملک میں مستقل کاروبار شروع کرنا چاہ رہے ہیں سو وہ زبیدہ کی شادی کر کے جانا چاہتے ہیں کیوں کہ باہر ان کا قیام غیر معینہ مدت کے لیے ہو گا۔

رابعہ کے والدین فوراً" شادی کے اس مطالبے کو پورا کرنے میں متامل تھے ان کے نزدیک اتنی کم عمری میں فرید اگر شادی کرے گا تو ذمہ داریاں اٹھائے گا یا اپنا مستقبل بنائے گا مگر وہاں تو جیسے ہر اعتراض کا جواب پہلے سے تیار تھا۔ زبیدہ کے والدین فرید کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے تک ہر ذمہ داری اٹھانے کو تیار تھے۔ اس کے علاوہ دوسرا حل بھی موجود تھا کہ فرید صبح کچھ دیر ان کے پاکستان میں پھیلے کاروباری معاملات کو دیکھنے دفتر آئے گا اور پھر یونیورسٹی جا کر تعلیم مکمل کرے گا اور پھر دوپہر میں واپس دفتر آکر کاروبار سنبھالے گا' اس طرح وہ بزنس بھی سیکھ لے گا جو اس کے تعلیمی معاملات سے ہی متعلق ہے یعنی کامرس۔ زبیدہ شادی کے بعد فرید کے والدین کے ہی ساتھ رہے گی تاکہ دونوں کو ایک دوسرے کا سہارا ملے۔ رابعہ اور رابعہ کے والدین کے پاس کچھ کہنے کو بچا ہی نہیں کہ یہاں تو ہر معاملہ پہلے ہی طے شدہ تھا۔ بہتر یہی تھا کہ ہر بات پر آمنا صدقنا کہہ لیا جائے۔

شادی کی تاریخ بھی وہیں طے کر لی گئی جو کہ محض دو مہینے بعد کی تھی۔ تاریخ طے ہونے کے بعد زبیدہ کو شگن ڈالنے کے لیے بلایا گیا۔ زبیدہ کے والدین نے کم از کم اس معاملے میں روایتی پن برقرار رکھا کہ زبیدہ پہلے سے بڑوں کے درمیان آکر نہیں بیٹھی اور جب سامنے آئی تو منگنی کی روایتی دلہن کی طرح کامدار شلوار قمیص میں ملبوس تھی' سر پر دوپٹا اوڑھا ہوا تھا۔

زوبی پر نظر پڑتے ہی رابعہ کی سمجھ میں آگیا کہ اس جیسی امیر لڑکی نے فرید کا انتخاب کیوں کیا۔ رابعہ اور فرید کا گھرانہ حسن کی دولت سے مالا مال تھا۔ خاص کر فرید تو کوئی یونانی دیوتا لگتا تھا۔ جب کہ زبیدہ واجبی شکل کی لڑکی تھی اور آنکھوں میں بھی معمولی بھینگا پن تھا۔ اس جیسی لڑکی کا فرید پر مرمٹنا عام بات تھی مگر اسے فرید کی توجہ مل جانا غیر معمولی بات تھی' سو اس توجہ کو مستقل حاصل کرنے کے لیے وہ یہ سارے پاپڑ بیل رہی تھی اور کامیاب بھی ہو چکی تھی۔ فرید مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا' شریف تھا' گھرانہ بھی متوسط تھا' کوئی گرا پڑا نیچ خاندان نہ تھا۔ فرید ذہین تھا' آگے اس کا مستقبل روشن تھا۔ ہر لحاظ سے وہ زبیدہ کے لیے بہترین انتخاب تھا رہ گئی بات دولت کی کمی کی تو وہ زبیدہ کے پاس وافر تھی لہٰذا اس کی پروا کس کو تھی۔

قصہ مختصر زبیدہ اور فرید کی شادی ہو گئی اور وقت نے ثابت کیا کہ فرید کا فیصلہ درست تھا۔ دولت اگر عورت کی قسمت سے ملتی ہے تو زبیدہ اس معاملے میں دھنی تھی۔ فرید نے اپنے سسر اور سالوں کے ساتھ مل کر پہلے کاروباری اسرار و رموز سیکھے' پھر جب زبیدہ کو اس کے والد نے جائیداد میں سے حصہ دے دیا تو فرید نے اپنا الگ کاروبار شروع کیا۔ کچھ کر دکھانے کی لگن' محنت' پچھلا تجربہ اور سسر صاحب کے وسیع و عریض تعلقات نے فرید کے کاروبار کو چار چاند لگا دیے۔ دولت گویا برسنے لگی اور پُرتعیش زندگی کا ہر وہ خواب جو فرید نے دیکھا تھا وہ پورا ہوا۔

زبیدہ اچھی بہو بھی ثابت ہوئی۔ وہ فرید کے والدین

کا حتی المقدور خیال رکھتی تھی۔ ویسے بھی اسے کرنا ہی کیا ہوتا تھا۔ گھر میں ہر کام کے لیے نوکر چاکر تھے۔ زبیدہ کو صرف ان کی نگرانی کرنا ہوتی تھی۔ ساس سسر کے کھانے پینے اور دیگر معاملات کے لیے وہ ان سے پوچھ پوچھ کر ہدایات دیتی جاتی۔

"امی' آج کھانا کیا بنواؤں؟" امی کھچڑی یا دلیہ یا کچھ بھی نرم غذا بتا دیتیں' وہ خانساماں کو بلا کر ہدایات دے دیتی۔ امی نہال کہ بہو کتنا خیال رکھتی ہے۔ کھانے کی ٹیبل پر بیٹھتے تو اپنے ہاتھ سے ڈشز بڑھا بڑھا کر دیتی جاتی۔ فرید ہوتا تو وہ بھی یہ سب دیکھتا اور مطمئن ہو جاتا۔ دوائیں لانا' ڈاکٹر کے پاس لے جانا' موسم کی مناسبت سے لباس بنوا کر دینا' ہر کام کی ہدایات زبیدہ کو صرف متعلقہ ملازموں کو دینی ہوتی تھیں اور کام ہو جاتا تھا۔ میٹھی زبان اور دوسروں سے کام کروانے کا فن' یہ وہ دو گر تھے جن کی بنا پر زبیدہ نے شوہر کے دل اور اس کے گھر پہ آسانی حکمرانی کی۔ ساس سسر بھی بلاوجہ تنگ کرنے والے نہ تھے۔

رابعہ کو آنے کا موقع کم ہی ملتا۔ آتیں بھی تو چند گھنٹوں کے لیے اور چند گھنٹوں میں ماں باپ سے دکھ سکھ کہتیں یا عام نندوں کی طرح بھاوج کا جینا حرام کرتیں پھر یہ بھی تھا کہ بھائی ان کے والدین کا خیال رکھتی تھی اور نند بھی جب آتی تھی تو کھانے پر اہتمام کرنا' تحفے تحائف دینا اور حال احوال پوچھنا بھی اچھے طریقے سے کرتی تھی مگر اس سارے اہتمام کے باوجود رابعہ کبھی کبھی محسوس کرتی تھی کہ زبیدہ ان سے کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی ہے۔ اس کے رویے میں ایک غیر محسوس سا گریز ہوتا تھا جیسے ایک حد قائم کر رہی ہو اور اس چیز نے رابعہ کو کبھی بھی بھابھی سے بے تکلف نہیں ہونے دیا۔ والدین کی مختصر علالت اور چند مہینوں کے وقفوں سے آگے پیچھے انتقال کے بعد یہ تکلف اور گریز اور بھی بڑھ گیا۔

اللہ کی قدرت کہ رابعہ' زبیدہ کے پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد امید سے ہوئیں اور یوں زبیدہ اور فرید کے پہلے بیٹے حسن کی پیدائش کے ایک سال بعد ماہ نور دنیا میں آئی اور اس کے کوئی ڈیڑھ دو سال بعد مائرہ۔ جب کہ زبیدہ اور فرید کو بھی اللہ نے دو بیٹیوں سے نوازا۔ ارم اور ماریہ۔ رابعہ کا سارا حسن اور عادل کے تیکھے نقوش ماہ نور اور مائرہ نے چرا لیے لیکن ارم اور ماریہ نے فرید کا ذرا بھی رنگ نہ لیا۔ دونوں پوری کی پوری زبیدہ پر گئی تھیں۔ ہاں حسن میں باپ کی کافی شباہت تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ دونوں کے بچوں نے جوانی کی دہلیز پار کرلی۔ حسن بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم حاصل کرنے امریکہ چلا گیا۔ ارم نے لندن اسکول آف اکنامکس سے گریجویشن کر لیا۔ ماریہ نے باہر جا کر پڑھنے کے بجائے انڈس ویلی سے فیشن ڈیزائننگ میں ماسٹرز کر لیا۔ ادھر رابعہ کے بچوں کے پاس اتنے وسائل نہ تھے' سو ماہ نور نے کراچی یونیورسٹی سے بی فارمیسی کی ڈگری لے لی اور مائرہ انگریزی ادب میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ رابعہ اس پر ہی بے انتہا مطمئن اور قانع تھیں۔ ماہ نور ایک اچھی کمپنی میں جاب کر رہی تھی اور مائرہ کے لیے بھی آگے مستقبل روشن تھا۔ انتظار تھا تو بس اب دونوں کے اچھی جگہ رشتے طے ہو جانے کا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ فرید حسن کے لیے ماہ نور کا ہاتھ مانگ لیں مگر گھر میں عادل سمیت سب اس بات کے خلاف تھے مگر رابعہ آج بہت امید اور ارمانوں کے ساتھ بھائی کے گھر آئی تھیں۔

رابعہ بیٹیوں کے ہمراہ جب فرید کے گھر پہنچیں تو جھٹپٹا ہو چلا تھا گو کہ یہ لوگ گھر سے ساڑھے چار بجے نکل چکی تھیں مگر رکشے میں بھی ملیر سے ڈیفنس کے اس فیز تک آتے ان کو تقریباً" ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا تھا۔ سردیوں کے دن تھے سو اذان مغرب بس ہوا ہی چاہتی تھی۔ اس ملگجے اندھیرے میں فرید کا گھر گویا بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ گھر کی عمارت پر تو آرائشی لائٹوں سے روشنی کی ہی گئی تھی مگر اردگرد کے درختوں پر بھی رنگ برنگی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں میلاد و قرآن خوانی کی نہیں بلکہ شادی کی کوئی تقریب ہو رہی ہے۔ مائرہ نے تو اس خیال کو زبان بھی دے ڈالی۔

"امی آپ کو یقین ہے کہ ماموں نے میلاد کا ہی کہا

تھا، حسن بھائی کی منگنی کا نہیں؟"

"تم چپ کرو اور جلدی اندر چلو۔ لگتا ہے ہم بہت دیر میں آئے ہیں۔" رابعہ تیز تیز قدم اٹھاتی اندر داخل ہوئیں تو ان دونوں نے بھی تقلید کی۔ لان میں پہنچ کر یہ تینوں پھر مبہوت رہ گئیں۔ وسیع و عریض سبز گھاس والے لان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گول میزیں اور کرسیاں لگا کر بیٹھنے کا انتظام تھا۔ کرسیاں ــــــ شاہانہ انداز کی تھیں۔ ان پر سفید سلک کے سیٹ کور تھے جبکہ پشت سلور کلر تھی۔ ارد گرد لگے تمام درخت بے انتہا باریک سلور فینسی لائٹوں سے جگمگا رہے تھے۔ اسٹیج جو نعت خواں کے لیے بنایا گیا تھا، وہاں پر بھی کرسٹل کے سلور فانوس روشنیاں بکھیر رہے تھے پورے ماحول پر چاند کی روشنی جیسا جھلملاتا سفید رنگ غالب تھا۔ واحد رنگین چیز میزوں پر رکھے کرسٹل کے گلدانوں میں پڑے سرخ گلاب اور اسٹیج کے اطراف رکھے دو رقص کرتے موروں کے مجسمے تھے۔ یہ موروں کے مجسمے سبزی مائل نیلے پتھروں سے تراشے گئے تھے اور بے حد چمکدار تھے۔ ان کے اٹھے ہوئے اور پھیلے ہوئے پر سنہری دھات سے بنائے گئے تھے اور مور کے پروں کا تاثر مکمل کرنے کے لیے پروں میں موجود بیضوی دائروں میں ایک بڑا سبز چمکدار پانی کے قطرے کی شکل کا پتھر اور اگلے دائرے میں نیلا چمکتا ہوا قطرے کی شکل کا پتھر جڑا ہوا تھا۔ یہ مجسمے بلاشبہ صناعی کا شاہکار تھے اور ان کی قیمت ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں تھی۔ زبیدہ ایسے نوادرات جمع کرنے کی بہت شوقین تھیں اور ان کی نمائش کی بھی اور ایسے حسین مجسموں کی نمائش کے لیے آج سے بہتر دن کون سا ہو سکتا تھا۔ باقی سارے ماحول کو اسی لیے سلور رکھا گیا تھا کہ اس پس منظر میں یہ مجسمے بے انتہا واضح ہوتے اور وہ ہو رہے تھے۔

"جائزہ مکمل ہو گیا ہو تو اب آگے بڑھیں؟" بت بنی مائرہ کو ماہ نور نے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

"ہائے ماہی! کتنا حسین ہے سب اور وہ مور' اف اللہ!!"

"اتنی روشنی کا کیا فائدہ کہ آنکھیں ہی چندھیا جائیں۔" ماہ نور کہہ کر آگے بڑھ گئی جبکہ مائرہ "ہیں' کیا کہا" کہتی اس کے پیچھے لپکی۔

ابھی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ نہیں شروع ہوا تھا۔ ان لوگوں کو ملازم اندر ڈرائنگ روم میں بٹھا گیا۔

"امی آپ مجھے تھوڑی دیر اور سو لینے دیتیں' یہاں تو کوئی ہے ہی نہیں یا پھر میں بابا کے ساتھ آجاتی رات میں۔" مائرہ کا نیند پوری نہ ہونے کا دکھ پھر سے تازہ ہو گیا۔

"اب مجھے کیا پتا تھا! بیٹا ہمارے گھروں میں تو عصر سے مغرب تک ہی میں یہ تقریبات ختم ہو جاتی ہیں اور پہلے فرید کے ہاں بھی اتنا ہی ٹائم لگتا تھا۔ آج نہ جانے کیا خاص بات ہے۔"

"بھئی' خاص بات تو ہے نا آپا' میرا بیٹا آیا ہے آج۔ اس کے آنے کی خوشی میں یہ تو شکرانہ ہے۔" فرید اندر داخل ہوتے' خوشدلی سے ہنستے ہوئے بولے' انہوں نے آخری جملہ سن لیا تھا۔ ان کے پیچھے ایک دراز قد خوبرو نوجوان جو کہ یقیناً "حسن" تھا اور کچھ فاصلے پر ممانی چلتی ہوئی آرہی تھیں۔ رابعہ کو تو بھتیجے کو دیکھ کر مارے خوشی کے گویا سکتہ ہی ہو گیا۔ فوراً "پرس سے پیسے نکال کر صدقہ کیا اور پھر بھتیجے کے گلے لگ گئیں۔

"ماں صدقے میرا بچہ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ نظر نہ لگے۔ فرید! یہ تو بالکل تمہاری جوانی کی تصویر ہے۔" رابعہ گرد و پیش سے بے خبر بھتیجے کی بلائیں لے رہی تھیں جبکہ مائرہ ممانی کے تاثرات بغور دیکھ رہی تھی۔

ممانی اس وقت بے انتہا خوب صورت جامنی رنگ کے زمین کو چھوتے گاؤن میں ملبوس تھیں۔ سر پر ہم رنگ حجاب یوں لپٹا تھا کہ ایک بال بھی نظر نہ آتا تھا۔ عرصہ ہوا انہوں نے تقریبات میں شلوار قمیص یا ساڑھی جیسے لباس کے بجائے یہ برقعہ نما گاؤنز پہننا شروع کر دیے تھے۔ بقول ان کے عورت کو ڈھیلا ڈھالا لباس پہننا چاہیے اور اس کے لیے گاؤن اور حجاب سے بہتر کچھ نہیں' مائرہ کو اس بات سے شدید اختلاف تھا وہ اور ماہ نور اکثر ممانی کے اس طرز لباس پر

بحث ہوتی تھی۔

مائرہ کہتی تھی کہ "لباس بھی ڈھیلا سلوایا جا سکتا ہے اور عورت کا لباس ایسا ہونا چاہیے جو دوسروں کو متوجہ نہ کرے۔ ممانی بھری محفل میں جب گاؤن پہن کر آتی ہیں تو نہ دیکھنے والا بھی ان کو دیکھتا ہے دوسرے ان کے گاؤن دور سے ہی اپنی قیمت بتاتے ہیں تو یہ کونسی سادگی ہوئی بھئی۔" جبکہ ماہ نور کہتی تھی کہ گاؤن جتنا ڈھیلا لباس ہو ہی نہیں سکتا اور رہی بات قیمتی ہونے کی تو جب اللہ نے ان کو نوازا ہے تو وہ کیوں نہ اپنے اوپر خرچ کریں۔" مائرہ کہتی "تو پھر یہ سادگی کا پرچار کیوں۔" دونوں کی بحث چلتی رہتی یہاں تک کہ امی ڈانٹ دیتیں کہ "اپنے اعمال کی فکر کرو، دوسروں کی پروا چھوڑ دو۔" لہٰذا اس وقت بھی مائرہ تنقیدی نظروں سے اور ماہ نور ستائشی نظروں سے ممانی کو دیکھ رہی تھی۔

جامنی گاؤن پر اسی کے ہم رنگ چھوٹے بڑے نگینے لگے تھے جو روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ ہاتھوں میں موجود ڈائمنڈ کے کڑے اور نفیس انگوٹھیاں روشنی منعکس کر رہی تھیں۔ میک اپ یقیناً کسی بڑے سیلون سے کروایا گیا تھا۔ بظاہر یہ لگتا تھا کہ چہرے پر صرف ہلکی لپ اسٹک موجود ہے مگر ممانی کی آنکھوں کا بھینگا پن، چہرے کی جھریاں، داغ دھبے، سب مہارت سے کیے گئے میک اپ کے باعث نظر نہیں آتے تھے۔ وہ اپنی عمر سے دس سال کم نظر آتی تھیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود ان کے چہرے پر ایک نامحسوس کرختگی تھی اور فی الحال اس کرختگی میں نفرت اور بیزاری کے بھی کچھ رنگ واضح جھلکتے تھے۔

مائرہ نے ایک نظر اپنی ماں کے چہرے پر ڈالی۔ چکن کے بادامی رنگ کے عام سے سوٹ میں ملبوس، کسی بھی سنگھار سے مبّرا اس کی ماں کا حسین چہرہ اپنی نرمی اور حلاوت کے باعث دور سے چمکتا تھا اور اتنے بار سنگھار کے باوجود ممانی امی کے سامنے پھیکی نظر آتی تھیں۔ رہی سہی کسر ان کے چہرے پر پھیلے کرخت تاثرات پوری کر رہے تھے، جو رابعہ کو اپنے بیٹے کو پیار کرتے دیکھ کر ان کی دلی کیفیت ظاہر کر رہے تھے۔ مائرہ کو صرف ایک لمحہ لگا تھا یہ جاننے میں کہ ممانی کے ذہن میں کیا چل رہا ہے اور اگلے ہی لمحے اس نے آگے بڑھ کر امی کو نرمی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"چلیں امی اب ہم دونوں بہنوں کو بھی ہمارے بھائی سے ملنے دیں۔" اور اس جملے پر ممانی کے چہرے پر اطمینان اسے واضح نظر آیا تھا۔

"حسن بھائی! یہ آپ کی ماہ نور بہن اور میں مائرہ بہن۔" اس کے بار بار بہن کہنے پر امی جزبز ہو رہی تھیں مگر کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔

"آپ کی جب شادی ہوگی تو ہمارا بھی نیگ تیار رکھیے گا یہ نہ ہو کہ پھوپھی زاد بہنیں سمجھ کر دیں ہی نہ۔ ہم آپ کی پکی والی بہنیں ہیں۔"

"بالکل بھئی بالکل، آپ کا نیگ تو پکا ہے۔" حسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کو اپنی اتنی خوب صورت کزنز سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی تھی اور ماہ نور کے لیے اس کی نظروں میں پسندیدگی واضح تھی۔ جب ہی اس نے آپ دونوں کے بجائے صرف آپ کا نیگ، کہا تھا مگر پسندیدگی سے کیا ہوتا ہے یہ فیصلہ تو قدرت کرتی ہے کہ کس کو کیا ملنا ہے۔

اللہ اللہ کر کے کوئی رات آٹھ بجے میلاد کی تقریب شروع ہوئی۔ اسٹیج پر موجود بے انتہا خطیر معاوضے پر فقط ایک گھنٹے کے لیے میلاد پڑھنے والی مشہور و معروف نعت خواں کے علاوہ پوری محفل میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو یہ بتاتی کہ یہاں امیر ترین لوگوں پر مشتمل رنگ و بو کی محفل نہیں بلکہ میلاد منعقد ہو رہا ہے۔ ماحول کو پاکیزگی کا رنگ دیتا سفید و سلور رنگ اب رنگ برنگے ملبوسات میں غائب ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ زمردیں پتھروں کے موروں کی خوب صورتی بھی ماند پڑ گئی تھی۔ محفل میں موجود خواتین کی اکثریت نفیس اور مہین ترین لباسوں میں ملبوس تھی۔ اکثریت کے لباس میں آستینوں اور دوپٹے کی موجودگی کو اضافی سمجھا گیا تھا اور جنہوں نے بادل نخواستہ دوپٹہ لیا تھا وہ بھی سر پر اوڑھنے سے احتراز کر رہی تھیں۔ استاد قیانوسی تو بس وہی تینوں ماں بیٹیاں لگ رہی تھیں، جو بڑے جذب کے عالم میں

میلاد سن رہی تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ زبیدہ جو ہر ہفتے درس وغیرہ کرواتی تھیں کیا ان کا حلقہ احباب بس ایسے لوگوں پر مشتمل تھا؟ خود زبیدہ بھی میلاد سننے کے بجائے آنے والوں کے استقبال اور انتظامات کی نگرانی میں مصروف تھیں۔

بارے میلاد سننے کی آزمائش (اکثریت کے لیے) ختم ہوئی 'نعت گو خطیر معاوضہ 'جوڑے' پھل مٹھائیاں لے کر رخصت ہوئی اور گویا محفل رنگ پر آ گئی۔ مرد و زن ٹولیوں کی شکل میں کھڑے ہو کر مشروبات کے گلاس تھامے خوش گپیاں کرنے لگے اور زبیدہ بیٹے کو کسی اعزاز کی طرح لیے لیے ایک ایک مہمان سے متعارف کرانے لگیں۔

محفل میں ایک سے بڑھ کر ایک طرح دار لڑکی موجود تھی۔ زبیدہ خاص طور پر ان لڑکیوں سے حسن کو ضرور ملوا رہی تھیں مگر حسن کی توجہ بار بار بھٹک کر اس میز تک جاتی تھی جہاں آسمانی دوپٹہ سر پر لیے ماہ نور کوئی پری لگ رہی تھی۔ وجہ اس کی انفرادیت تھی۔ اس بے حجابانہ محفل میں جہاں خود اس کی اپنی بہنیں مغربی لباس میں ملبوس پھر رہی تھیں' وہ ڈھکی چھپی لڑکی مرکز نگاہ بنی ہی تھی۔ وہ ساری محفل چھوڑ کر ان کی ٹیبل تک آ گیا۔ اس وقت تک کھانا پیش کیا جا چکا تھا اور رابعہ کی فیملی کھانا کھاتے ہوئے کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ عادل بھی آفس سے آ کر محفل میں شریک ہو چکے تھے۔ حسن پہلے تو ان سے پُرتپاک طریقے سے ملا پھر وہیں رکھی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"بھئی کس بات پر اتنی ہنسی آ رہی ہے؟" ماہ نور اور مائرہ نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی پھر جیسے کچھ طے کر کے ہنسی قابو میں کرتے ہوئے مائرہ بولی۔

"حسن بھائی' تارڑ صاحب اپنے چین کے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں چینیوں کا ایک مہمان بھوک کی وجہ سے انتقال کر گیا تو بس اس کے بعد چینیوں نے تہیہ کر لیا کہ مہمان کو اگر مارنا ہی ہے تو کھلا کھلا کر مارنا ہے۔ لہٰذا اب چینی طعام میں جب مہمان یہ سمجھتا ہے کہ بس یہ آخری کورس ہے تو

دراصل وہ طعام کا آغاز ہوتا ہے۔ اتنے کورس آتے ہیں کہ مہمان کورس میں الاپنے لگتے ہیں کہ "تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں۔" اتنا کہہ کر مائرہ پھر بے تحاشا ہنسنے لگی جب کہ حسن کچھ ہونق سا اس کی شکل دیکھتا رہا۔ یہ تارڑ صاحب کون تھے؟ اور اس حوالے کا مقصد کیا تھا؟ اس کے تو سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ اس کا کوئی رد عمل نہ پا کر ماہ نور نے وضاحت کی۔

"اس کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لگتا ہے آج آپ کے ہاں بھی دعوت کا مقصد لوگوں کو کھلا کھلا کر مارنا ہے۔ اتنے انواع و اقسام کے کھانے ہیں۔"

"اوہ اچھا۔" حسن مسکرایا۔ "ہاں بس ممی نے کچھ زیادہ ہی اہتمام کر ڈالا۔ ویسے اس میں اتنا ہنسنے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"ارے ہم اس بات پر تھوڑی ہنس رہے تھے ہم تو اس بات پر ہنس رہے تھے کہ تیرے عشق کی انتہا پہلے کون الاپے گا۔" مائرہ کہتے کہتے پھر ہنسنے لگی۔

حسن کو اس پر بھی کوئی خاص ہنسی نہ آئی تو مائرہ کہنے لگی۔

"ارے حسن بھائی' آپ ہنس لیں نا کہ آپ بھی باادب ثابت ہوں۔"

"ارے بھائی مجھے معاف کر دو۔ نہ جانے کیا کیا بولے جا رہی ہو۔" حسن تو زچ ہو گیا تو ماہ نور نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"ارے آپ اس کی باتیں نہ سنیں' یہ تو پاگلوں کی طرح بولتی ہی چلی جاتی ہے۔"

"بالکل حسن بیٹا' یہ تو تمہیں لمحوں میں اوٹ پٹانگ باتوں سے پاگل کر دے گی۔" خاموشی سے کھانا کھاتی رابعہ بھی بولیں۔

"ارے نہیں پھپھو! یہ تو میری پیاری سی بہن ہے۔" حسن نے خوش دلی سے کہا تو سب کے چہروں پر پھر مسکراہٹ بکھر گئی۔ دو دو آنکھوں نے یہ منظر بہت نفرت سے دیکھا تھا۔ نظر نے اس نفرت کو دماغ تک بڑی سرعت سے پہنچایا اور دماغ نے لمحوں میں کچھ شاطرانہ چالیں سوچ لی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اس تقریب کی اگلی صبح رابعہ کا گھرانا صحن میں رکھی چھوٹی گول میز کے گرد جمع ہو کر ناشتہ کر رہا تھا۔ آج ہفتہ تھا لہٰذا عادل، ماہ نور اور مائرہ تینوں کی چھٹی تھی۔ رات فرید نے ان کو اپنی گاڑی میں گھر بھجوا دیا تھا مگر پھر بھی وہ سب بہت دیر سے سوئے تھے۔ رات سے شروع ہونے والے ماہ نور اور مائرہ کے تبصرے ابھی بھی جاری و ساری تھے۔ بیچ بیچ میں رابعہ بھی لقمہ دیتیں جب کہ عادل اخبار پڑھنے میں مگن تھے۔

"تم نے زبیدہ مامی کا پرس دیکھا تھا؟ لگتا تھا گاؤن سامنے رکھ کر بنوایا گیا ہے۔ جیسا ڈیزائن گاؤن پر تھا ویسا ہی پرس پر تھا۔" مائرہ کا مشاہدہ تیز تھا۔

"توبہ ہے تم اتنی چھوٹی چھوٹی چیزیں کہاں سے دیکھ لیتی ہو۔ مامی بمشکل پندرہ منٹ ڈرائنگ روم میں ہم سے ملی تھیں پھر پوری تقریب میں وہ مہمانوں میں مصروف رہیں تو تم نے کہاں سے دیکھ لیا پرس۔" ماہ نور مائرہ کو چڑانے کے لیے بولی۔

"بیٹا! دیکھنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔" مائرہ گردن اونچی کر کے بولی۔ اماں بابا کی موجودگی میں تاڑنے کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کیا۔

"ویسے امی، آپ تو ہر وقت میرا بھائی، میری بھابھی کا نغمہ گنگناتی ہیں (راگ الاپنے کو مہذب بنایا گیا) مگر ماموں، مامی تو ہمیں لفٹ ہی نہیں کراتے مجال ہے کسی ایک مہمان سے بھی آپ کو متعارف کرایا ہو۔"

"ہاں امی! یہ تو مجھے بھی برا لگا تھا کہ ہم اجنبیوں کی طرح ایک کونے میں بیٹھے رہے۔ حد تو یہ ہے کہ ارم اور ماریہ سے بھی میں خود اٹھ کر ملنے گئی۔ ایک تو وہ اتنا عجیب سا کوٹ پینٹ نما لباس پہنی ہوئی تھیں اوپر سے بلند و بانگ قہقہے لگا رہی تھیں۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ اعلا تعلیم یافتہ لڑکیاں ہیں۔" ماہ نور بہت کم کسی کی برائی کرتی تھی اور اگر آج وہ کچھ منفی باتیں کر رہی تھی تو مطلب یہ تھا کہ اس نے واقعی کچھ بہت غلط محسوس کیا ہے۔ مائرہ نے بغور اس کی شکل دیکھی اور سوچا۔

"چلو اس سے اکیلے میں تفصیل پوچھوں گی۔"

"ارے بیٹا، ان کا ماحول ہی ایسا ہے حالانکہ زبیدہ تو بڑی پردے والی ہے۔ بس یہ آج کل کی اولاد قابو میں آتی کہاں ہے۔ پھر ارم اور ماریہ بڑی بڑی کمپنیوں میں کام کر رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہاں یہ سب ہوتا ہو۔ لیکن حسن تو مجھے بہت سلجھا ہوا، مودب لگا۔ بڑا مختلف لگا آج کل کے نوجوانوں سے۔ اللہ کرے فرید، ماہ نور کے لیے۔" رابعہ بیگم کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ عادل نے اخبار رکھتے ہوئے ان کا جملہ کاٹ دیا۔

"رابعہ خاتون، آپ کو ان بچیوں کی باتیں شاید سمجھ میں نہیں آرہیں۔" ماہ نور اور مائرہ دونوں سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ بابا جب امی کو آپ کہہ کر مخاطب کرتے تھے تو معاملہ گمبھیر ہوتا تھا۔

"یہ بچیاں مسلسل آپ کو وہ دکھا رہی ہیں جس سے آپ مستقل چشم پوشی کرنا چاہ رہی ہیں۔ آپ کے بھائی کا گھرانہ ہمارے گھرانے سے کسی بھی طرح مطابقت نہیں رکھتا۔ وہ بے انتہا آزاد خیال ہیں بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کے ہاں آزادی ہر چیز گزر جانے کی حد تک ہے۔ میری بچیاں اس ماحول میں جائیں، یہ میں قطعاً" برداشت نہیں کروں گا۔ اگر آپ یہ سوچتی ہیں کہ یہ وہاں جا کر کوئی جادو کی چھڑی گھما کر سارے ماحول کو ٹھیک کر دیں گی تو آپ احمقوں کی جنت میں رہ رہی ہیں اور رہی بات آپ کی بھابی کے دیندار ہونے کی تو بات گو کہ تلخ ہے مگر سچ یہ ہے کہ آپ کی بھابی نے دین فیشن کے طور پر اپنایا ہوا ہے۔ یہ صرف ملمع ہے، اندر سے ان کے خیالات اپنے بیٹے اور بیٹیوں جیسے ہی ہیں، ورنہ ان کو کہیں تو روک ٹوک کرتیں۔"

عادل بہت سخت لہجے میں بات کر رہے تھے۔ کل رات انہوں نے خود زبیدہ اور اس کی دونوں بیٹیوں کو ان کے مرد دوستوں کے ساتھ کھڑا دیکھا تھا۔ ان کی بیٹیاں ان کے سامنے اپنے دوستوں سے انتہائی بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور وہ بھی ان کا ساتھ دیتے ہوئے ہنس رہی تھیں۔ پھر یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ

ایک اہم فون سننے ایک نیم تاریک گوشے میں آئے تو وہاں ان کا بیٹا حسن اپنے کسی دوست کے ساتھ بیٹھا کوئی مشروب پی رہا تھا اور اپنے دوست سے کہہ رہا تھا۔
"پی لے یار' بڑی مشکل سے منگوائی ہے۔ پاپا نے دیکھ لیا تو مار ڈالیں گے۔"
"اچھا اور تو جو امریکہ میں رہ کر اتنی پی پلا کے آیا ہے' وہ پتا چل گیا تو پھر کیا کریں گے۔" اس کے دوست نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر پوچھا۔
"ارے اس کی خیر ہے۔ وہاں صرف پینا پلانا تھوڑی تھا اور بھی رنگینیاں تھیں میرے دوست۔ اب کیا سب کچھ بتا دیں ماں باپ کو۔" حسن نے کہا اور دونوں ہنسنے لگے۔ جب کہ عادل خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ حسن یقیناً "عادی بلانوش تھا تب ہی کچھ دیر بعد جب وہ ان کی ٹیبل تک آیا تھا تو اس کی چال' آواز انداز سب نارمل تھا۔ ہاں بس آنکھوں میں معمولی سرخی تھی۔
عادل یہ سب کچھ بیوی اور بیٹیوں کے سامنے نہیں کہہ سکتے تھے مگر جو کچھ رابعہ سوچ رہی تھیں اس کو اب سختی سے روکنا بہت ضروری تھا سو انہوں نے وہی کیا تھا۔ اخبار تہہ کر کے اٹھتے ہوئے وہ بولے۔
"اور ماہ نور کے لیے میرے ایک دوست نے اپنے بیٹے کے لیے کہا ہے۔ شاید اگلے ہفتے وہ لوگ ماہ نور کو دیکھنے آئیں۔ ہم جیسے ہی لوگ ہیں اور لڑکا کینپ (کراچی نیوکلیئر پاور پلانٹ) میں انجینئر ہے۔ ان شاءاللہ وہ لوگ ماہ نور کو پسند کر گئے تو باقی تفصیلات بھی طے کر لی جائیں گی لہٰذا آپ ماہ نور کی فکر نہ کریں۔"
عادل قطعیت سے کہتے اندر چلے گئے تو مائرہ تو خوشی سے اچھلنے لگی' جب کہ رابعہ ان دونوں پر برسنے لگیں کہ باپ کے سامنے برائیاں کرنا ضروری تھا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ اس فیصلے میں ان دونوں کی باتوں کا کوئی عمل دخل نہیں تھا اور وہ اس بات سے بھی ناواقف تھیں کہ ان کی آنکھوں پر بھائی بھائی کی محبت کی پٹی بندھی ہوئی ہے جس نے واقعی ان کو بہت کچھ دیکھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

عادل اور رابعہ کے گھر میں جہاں ایک الجھن بھرا باب بند ہوا تھا وہیں اسی صبح فرید اور زبیدہ کے گھر ایک طوفان کی آمد آمد تھی جس کا منبع حسن کا ماہ نور کے لیے اظہار پسندیدگی کرنا تھا۔ سوئے اتفاق فرید کے بھی تمام اہل خانہ آج ناشتے کی میز پر موجود تھے۔
"بابا' میں ماہ نور سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" حسن کی اس بات نے ہر نفس کو سکتے میں ڈال دیا تھا۔ اس سکتے کو سب سے پہلے ارم کے قہقہے نے توڑا اور پھر ماریہ کی ہنسی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔
"وہ پردے کی بوبو' پتا ہے کل میں نے اپنے دوستوں سے اسے یہی کہہ کر ملوایا تھا۔ دیکھنے والی شکل ہو گئی تھی اٹھارویں صدی کے نمونے کی۔" ارم انتہائی تضحیک آمیز انداز میں کہہ رہی تھی جب کہ زبیدہ مسکرا رہی تھیں۔
فرید جز بز ہونے کے علاوہ اور کچھ کر نہیں سکتے تھے غلامی کی زندگی کی جو پیش گوئی رابعہ نے کی تھی' وہ من و عن درست ثابت ہوئی تھی۔ بزنس ٹائیکون فرید شمشیر خان کے پیروں کے نیچے سے آج بھی زبیدہ ایک لمحے میں زمین کھینچ سکتی تھیں کہ ہر چیز کی مختار کل وہی تھیں اور رابعہ' زبیدہ کے ناپسندیدہ افراد کی فہرست میں سب سے اوپر تھیں۔ یہ فرید بہت اچھی طرح جانتے تھے' لہٰذا خاموشی میں ہی نجات سمجھی' ارم کے اس تبصرے پر حسن نے کچھ حیران ہو کر ان سب کو دیکھا اور بولا۔
"کیوں "ممی بھی تو پردہ کرتی ہیں اور مجھے تو وہ کوئی فیری لگی' بجائے کسی عجوبے کے۔" زبیدہ کا چہرہ نفرت اور غصے سے تاریک ہوا اور جب وہ بولیں تو ان کا لہجہ یہ غصہ ظاہر کر رہا تھا۔
"دیکھو حسن تم کان کھول کر میری ایک بات سن لو۔ رابعہ کی بیٹی ہرگز میری بہو نہیں بن سکتی۔ میں خاندان میں اول تو تمہاری شادی کروں گی ہی نہیں اور اگر مجھے کرنی بھی ہوئی تو میں اپنے بھائیوں کی بیٹیوں میں سے کسی کا انتخاب کروں گی نہ کہ کسی ٹٹ پونجیے خاندان کا' مجھے بہو اور اس کا گھرانہ اپنے ہم پلہ

چاہیے۔ کل تمہیں مسٹر اینڈ مسز جہانزیب کاروانی کی بیٹی رعنا سے ملوایا تھا نا' اس لڑکی کو میں نے تمہارے لیے فائنل کیا ہے۔ اکلوتی ہے۔ والدین کی کروڑوں کی جائیداد کی وارث' ہائیر ایجوکیٹڈ' ہماری سوسائٹی میں موو کرنا آتا ہے اسے۔ اب تم کیا پارٹیز میں وہ سات گز کی چادر میں لپٹی ہوئی ماہ نور کو لے کر جاؤ گے' سوچو ذرا۔"

"مما' وہ تو دوپٹے میں ہی الجھ کر کہیں گر جائے گی۔" ارم ہنسی۔ "اور بھائی! تم مما کے پردے کی تو بات ہی نہ کرو۔ مما کا پردہ تو فیشن ٹرینڈ بن گیا ہے۔ کل بھی میری کتنی فرینڈز نے مما کی تعریف کی اینڈ مما! یور گاؤن واز جسٹ امیزنگ' آپ نے کہاں سے ڈیزائن کروایا۔"

گفتگو کا رخ کہیں اور ہو گیا۔ حسن کی بات گویا چٹکیوں میں اڑادی گئی تھی اور یہ واضح تھا کہ ماہ نور کو وہ اپنا نہیں سکتا۔ وہ کوئی عاشق تو تھا نہیں کہ جوگ لے لیتا' بس اس کی معصومیت اور حجاب نے متوجہ کر لیا تھا۔ بھید بھری کتاب کا ورق ورق پڑھنے کو دل مچل اٹھا تھا۔ پاپا نے بھی اس کا ساتھ نہیں دیا تھا' بس خاموشی سے ناشتہ کرتے رہے تھے۔ حسن ایک اور کوشش کر کے اپنی بات منوانے کے لیے ان کے پاس رات میں اسٹڈی میں چلا آیا۔

"آؤ آؤ ینگ مین' آج اولڈ مین کی یاد کیسے آگئی؟" فرید خوشدلی سے بولے۔

"کہاں پاپا' آپ کہاں سے اولڈ مین ہو گئے۔ یو لک ینگر اینڈ فریش دین می۔" حسن لاڈ سے ان کے کندھے کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے بولا۔ "سچ پاپا آپ کو اکثر لوگ میرا بڑا بھائی سمجھتے ہیں۔"

"اوہ اچھا' آج تو مکھن کی موٹی والی تہہ لگائی جا رہی ہے باپ کو۔ اب یہ بھی بتادو برخوردار کہ کام کیا ہے؟" فرید بھی آخر حسن کے باپ تھے۔ حسن پہلے تو جھجکا پھر اس نے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"پاپا آج صبح میں نے ناشتے کی ٹیبل پر ماہ نور سے رشتے کی بات کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کم از کم آپ تو میرے اس فیصلے میں میرا ساتھ دیں گے لیکن آپ تو بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ پاپا آخر اس رشتے میں برائی کیا ہے؟" فرید' حسن کی بات سن کر کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر گہری سانس لے کر گویا ہوئے۔

"برائی تو کوئی نہیں ہے بیٹا' لیکن خود مجھے بھی یہ رشتہ بے جوڑ لگتا ہے۔ دیکھو بیٹا ہمارے اور رابعہ آپا کے گھر کے ماحول میں بہت فرق ہے اور یہ فرق ساری زندگی نہیں مٹ سکتا۔ پھر شادی کے بعد جب یہ محبت چاہت کا خمار اترے گا تب یہ فرق تمہیں اور بھی محسوس ہو گا۔ بہتر یہ ہے کہ تم اپنے ہی جیسے ماحول کی پروردہ لڑکی سے شادی کرو تاکہ تم دونوں ایک دوسرے کو کمپلیٹ کرو نہ کہ ساری زندگی ایک دوسرے کو بدلنے کی تکلیف سے گزرو۔ انسان جس ماحول میں پرورش پاتا ہے' وہ اس کے خون میں رچ بس جاتا ہے۔ نہیں نہ کہیں لاکھ ملمع چڑھانے کے باوجود بھی اصل نکل ہی آتا ہے اور پھر تم دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے جو کبھی ختم نہیں ہو گا۔ دوسرا یہ کہ تم اپنی ماں کو جانتے ہو۔ وہ بے انتہا ضدی عورت ہے' کسی ناپسندیدہ لڑکی کو وہ ہرگز بہو بنا کر نہیں لائے گی' لائے گی بھی تو تمام عمر دونوں میں سرد جنگ چلتی رہے گی اور چکی کے ان دو پاٹوں میں تم تمام عمر پسو گے۔ کیوں خود کو مشکل میں ڈالتے ہو یار۔ رعنا سے مل لو' اچھی بچی ہے۔ آئی ہوپ یو ول ناٹ اگریٹ یور ڈسیشن' امید ہے تم اپنے فیصلے پر نہیں پچھتاؤ گے۔"

حسن نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر "اوکے پاپا" کہہ کر باہر چلا آیا۔ گھر میں سب اس کے مخالف تھے اور وہ فی الحال اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ سب کی مخالفت مول لے کر ماہ نور سے شادی کر لے۔ لیکن دل اپنی خواہش سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ حسن نے فی الحال اس معاملے کو پس پشت ڈالنے کا سوچا۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ عرصے میں وہ سب کو اپنے حق میں سازگار کر لے گا مگر قسمت میں تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔

کچھ دن اور گزرے تھے کہ رابعہ کے گھر سے ماہ نور کی منگنی کا بلاوا آگیا۔ حسن پر تو یہ خبر بجلی بن کر گری جب کہ زبیدہ نے سکون کا سانس لیا۔ منگنی کی رسم

رابعہ کے گھر پر ہی منعقد کی گئی تھی جس میں صرف فرید اور زبیدہ نے ہی شرکت کی۔ زبیدہ کا خیال تھا کہ لڑکا اور اس کی فیملی ایویں ہی ہوگی مگر ان کا لایا گیا منگنی کا سامان اور دیگر لوازمات اور ان کی گاڑیوں کے جدید ترین ماڈلز دیکھ کر ان کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ لڑکے والوں کی مالی حیثیت کیا ہے۔ دل میں موجود حسد کچھ اور بڑھا۔ ان کی ارم بھی تقریباً" ماہ نور کی ہم عمر تھی مگر اتنی دولت کے باوجود اس کے لیے کوئی رشتہ نہ آیا تھا۔ زبیدہ نے خود ایک دو گھرانوں میں پیام بھیجے تھے مگر وہاں سے بھی مثبت جواب نہیں ملا تھا اور یہاں ماہ نور کو بیٹھے بٹھائے یہ شاندار رشتہ مل گیا تھا۔

ماہ نور کی شادی عید کے فوراً" بعد طے کی گئی تھی۔ شادی کی تیاریوں کے لیے تقریباً" چھ مہینے کا وقت تھا رابعہ بری طرح مصروف ہو گئیں اور اس مصروفیت میں وہ فرید کے گھر ایک بار بھی نہ جا سکیں۔ ورنہ شاید ان کو فرید کے گھر پر چھایا تناؤ اور اضطراب محسوس ہو جاتا، جو ماہ نور کی شادی طے ہو جانے کے باوجود حسن کی ضد کی وجہ سے پھیلا ہوا تھا۔ حسن کا کہنا تھا کہ ابھی صرف منگنی ہوئی ہے۔ رشتہ ختم ہو سکتا ہے مگر زبیدہ کسی طور نہ مانیں۔ یہاں تک کہ ایک دن جب حسن ان کو منانے کی پھر کوشش کر رہا تھا وہ بلند آواز میں چلا اٹھیں۔

"تمہاری بکواس سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ جاؤ جا کر کرلو شادی اس ماہ نور سے مگر یاد رکھنا میں سوسائیڈ کرلوں گی۔ دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔"

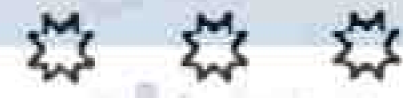
ان کے چلانے کی آواز سن کر ارم اور ماریہ بھی کمرے میں آ گئی تھیں اور ارم نے انتہائی نفرت سے حسن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسا بھی کیا ہے اس دو ٹکے کی لڑکی میں جو تم نے ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ یاد رکھنا اگر وہ اس گھر میں آئی نا تو میں اس کے چہرے پر ایسڈ ڈال دوں گی، پھر تم مرتے رہنا اس کے حسن پر۔" ماریہ نے بھی ایک تنفر بھری نگاہ اس پر ڈالی تھی اور وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گیا تھا۔ اس کے گھر والے رابعہ سے اتنی نفرت کرتے تھے اسے آج اندازہ ہوا تھا۔ اتنے دنوں سے وہ بلاوجہ خود کو خوار کر رہا تھا۔ اسے کون سا ماہ نور سے طوفانی عشق ہوا تھا۔ وہ تو بس اس کی ضد بن گئی تھی۔ مگر حالات اتنے ناموافق ہیں، یہ اندازہ اسے نہیں تھا۔ اب بہتری اسی میں تھی کہ وہ خاموشی سے زبیدہ کی پسند اپنا لیتا۔ آخر ساری کرتا دھرتا تو وہی تھیں۔ ان کے مخالف جانا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا تھا۔

عید کے بعد ماہ نور کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ رابعہ نے اپنی حیثیت کے مطابق ہر چیز بہترین دی تھی، فرید اور زبیدہ نے بھی جہیز کے کافی سامان کے علاوہ لڑکے کو پچاس ہزار کی سلامی دی تھی۔ اتنے کھلے دل سے ماہ نور کو دینے کا مقصد محبت نہیں بلکہ اپنی بڑائی اور امارت کا اظہار کرنا تھا۔

زبیدہ اس خیال میں تھیں کہ ان کی امارت سے متاثر ہو کر کوئی اچھا خاندان ان کی بیٹیوں کا رشتہ مانگ لے گا۔ ارم اور ماریہ کا معیار بہت اونچا تھا، وہ کسی معمولی رشتے پر راضی ہونے والی تھیں ورنہ فرید جیسے بہت سے رشتے تھے جو شادی کے ذریعے اپنے قسمت بدلنا چاہتے تھے مگر ارم اور ماریہ ایسے رشتوں کو پیرا سائٹ کا نام دیتی تھیں۔ زبیدہ اپنی مثال دیتیں تو وہ صاف کہتیں۔

"ضروری نہیں ہر کوئی پاپا جیسا ایماندار اور مخلص ہو ہمیں دھوکے باز ملا تو کیا ہو گا۔ ہمیں ایسا اسپاؤز (شریک حیات) چاہیے جو کما کر ہمیں لا کے دے، نہ کہ ہماری دولت پر رال ٹپکاتا پھرے۔" زبیدہ خاموش ہو جاتیں مگر اس شادی میں اپنے ہم پلہ لوگ دیکھ کر وہ ایک اور کوشش کرنا چاہ رہی تھیں اور اس کے لیے نہ صرف وہ اپنی امارت کا پورا مظاہرہ کر رہی تھیں بلکہ ارم اور ماریہ کو بھی زبردستی ساتھ لے کر آئی تھیں، جو اس وقت بیزار صورت بنائے، اسٹیج پر سرخ لباس میں دلہن بنی ماہ نور کو دیکھ دیکھ کر جل رہی تھیں اور جلے کٹے تبصرے کر رہی تھیں۔ رہی سہی کسر مائدہ کا حسن پورا کر رہا تھا، جو رائل بلیو میکسی میں ملبوس تھی اور بلاشبہ محفل کا حسین ترین چہرہ تھی۔



زبیدہ کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود ارم اور ماریہ کے تو رشتے طے نہ ہو سکے البتہ حسن نے ایک دن رعنا سے ملنے کی خواہش ظاہر کردی۔ وہ سب ڈنر ٹیبل پر موجود تھے جب حسن نے زبیدہ سے یہ بات کی۔ اس کی رعنا سے ملنے کی بات پر ارم اور ماریہ نے اسے "آگئی عقل ٹھکانے پر" والی نظروں سے دیکھا' جب کہ زبیدہ اطمینان سے گویا ہوئیں۔

"بیٹا! یو آر ٹو لیٹ ناؤ' رعنا کی تو شادی کو بھی چار مہینے ہو چکے۔ آپ شاید ماہ نور کے خیالوں سے اب باہر آئے ہیں ورنہ آپ کو یاد ہوتا کہ مسٹر اینڈ مسز جہانزیب نے آپ کے سامنے ہی شادی کا کارڈ ہمیں دیا تھا۔ خیر وہ کوئی آخری لڑکی تو نہیں تھی ہم آپ کے لیے کوئی اور لڑکی دیکھوں گی۔ یو ڈونٹ وری۔" زبیدہ حسن کی شادی پر آمادگی کا سن کر بے حد مطمئن ہو گئی تھیں لیکن اب انہوں نے جلد از جلد۔ بھولائی تھی۔ مائرہ کی شکل میں ابھی ایک خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ کل کو اگر حسن اس کے لیے ضد کر بیٹھتا تو وہ کیا کرتیں۔ اس دفعہ تو ان کی خودکشی کی دھمکی کارگر ہوئی تھی مگر وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا جاتا تو وہ تو خالی ہاتھ رہ جاتیں' لہٰذا ارم اور ماریہ کے لیے رشتوں کی تلاش موقوف کرکے انہوں نے شدومد سے بہو ڈھونڈنی شروع کردی' نظر انتخاب بالآخر زویاریہ پر جاکر ٹھہری جو ہر لحاظ سے ان کے معیار پر پورا اترتی تھی۔

شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی زبیدہ نے بازاروں کی خاک چھاننا شروع کردی۔ مختلف برائیڈل ڈیزائنر کے پاس جاجا کر ان کا دماغ پکا ہو گیا۔ بہت چھان پھٹک کے بعد ــــ برائیڈل ڈیزائنر فائنل ہوئے پھر زیورات اور بری کے دیگر لوازمات کا انتخاب سر پر آپڑا۔ میک اپ کا سارا سامان تو ان کی بھابیاں امریکہ سے خرید کر بھجوا رہی تھیں جس کے لیے زبیدہ ان کو ہر دو دن بعد فون کرکے ہدایات دیتی رہتی تھیں۔

"لپ اسٹک فلاں برانڈ کی ہی ہو' میک اپ بیس فلاں کمپنی کا' لائنر یہاں کا تو پرفیوم رینج وہاں کی۔ اور پھر بھی غیر مطمئن نظر آتی تھیں۔ فکر تھی تو بس یہ کہ کوئی چیز کم معیار کی نہ آئے' بری ایسی ہو کہ لوگ عش عش کر اٹھیں۔ اس خوب سے خوب تر کی تلاش اور واہ واہ کروانے کے چکر میں وہ اپنے گھر اور گھر کے مکینوں سے بے خبر ہو گئی تھیں۔

ارم اور ماریہ' فرید کو تو کسی خاطر میں لاتی ہی نہ تھیں۔ یہ صرف زبیدہ کا ہی ڈر تھا جو وہ لوگ رات کو جلدی یعنی بارہ بجے تک گھر پر دکھائی دیتی تھیں۔ اب تو جیسے دونوں کو کھلی چھوٹ مل گئی تھی۔ دونوں کے معمولات میں آتا فرق' زبیدہ نے اپنی مصروفیات میں محسوس ہی نہیں کیا اور یہ فرق کتنا خطرناک ثابت ہونے والا تھا وہ یہ بھی نہیں جان سکی تھیں۔

زبیدہ کی تیاریاں شادی کا دن آنے تک جاری رہیں۔ مایوں' مہندی' ہر تقریب پر روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا اور ولیمہ پر تو خرچے کی کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا۔ ڈیڑھ سو سے زائد کھانے کی ڈشز تھیں۔ پاکستانی' چائنیز' اٹالین' انڈین کون سا کھانا وہاں موجود نہیں تھا۔ میٹھے کی پچاس سے زائد اقسام تھیں۔

اتنی گہما گہمی میں ایک ٹیبل پر ماہ نور اور مائرہ اس محفل اور محفل میں شریک لوگوں پر سرگوشیوں میں تبصرے کررہی تھیں اور رابعہ کی تنبیہی نظروں کے باوجود ہنستی ہی چلی جارہی تھیں۔

مائرہ کو آج نارڈ صاحب پھر یاد آرہے تھے اور وہ میلاد میں حسن کا ہونق چہرہ یاد کرکے بری طرح ہنس رہی تھی۔ آج اس کا آخری پیپر تھا اور حسن کی شادی میں یہ واحد موقع تھا جس میں وہ شریک ہوئی تھی۔ اس کے ماسٹرز کا یہ آخری سمسٹر تھا اور وہ پوزیشن لانے کے لیے جان توڑ محنت کررہی تھی لہٰذا مہندی' مایوں اور نکاح میں وہ امی کے اصرار کے باوجود شریک نہیں ہوئی تھی۔ اس کے نہ آنے پر زبیدہ نے تو سکھ کا سانس لیا تھا کہ اس کی موجودگی میں تو کوئی اور لڑکی نظر ہی نہ آتی

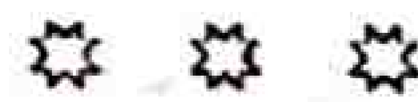
مگر آج وہ ڈل گولڈن لباس میں ملبوس کئی نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھی اور زبیدہ کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ ارم اور ماریہ مہنگے ترین لباس اور میک اپ کے باوجود اس کے آگے ماند نظر آتی تھیں اور کتنے ہی لڑکوں کی ماؤں نے ان کے پاس آکر ان سے مائرہ کے بارے میں استفسار کیا تھا، جسے انہوں نے خوب صورتی سے ٹال دیا تھا۔

ان تمام باتوں سے بے خبر مائرہ اور ماہ نور لوگوں پر تبصرے کر رہی تھیں۔ فی الحال گفتگو کا مرکز ارم تھی جس کی آنکھوں کے گرد پڑے حلقے گہرے میک اپ کے باوجود بہت واضح ہو رہے تھے، وہ بہت کمزور بھی لگ رہی تھی اور پہلے والی تیزی طراری، جو اس کے مزاج کا خاصا تھی، مفقود نظر آرہی تھی۔ اس کا جائزہ لیتی مائرہ نے ماہ نور سے کہا۔

"ایسا نہیں لگتا کہ جیسے اس میں خون کی شدید کمی ہوگئی ہے۔"

"ویسے ہونا تو نہیں چاہیے یہ تو خود خون پی جائے کسی کا بھی۔" ماہ نور اب ماموں کی فیملی کے بارے میں یونہی تلخ بولتی تھی۔

میلاد میں ارم نے جو اس کا مضحکہ اڑایا تھا، ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ بھول نہیں پائی تھی۔ آج ارم خود اس سے آکر ملی تھی مگر ماہ نور جانتی تھی کہ یہ سب کچھ اس کے شوہر کے عہدے اور امارت کی وجہ سے تھا لہٰذا وہ ان کے لیے کوئی نرم گوشہ رکھنے سے قاصر تھی، سو ابھی بھی اس کا لہجہ کسی بھی فکر اور رحم کے جذبے سے عاری تھا مگر مائرہ ہنوز ارم کو فکر مندی سے دیکھ رہی تھی اس بات سے بے خبر کہ وہ خود کسی کی نظروں کے حصار میں ہے۔



شہریار آفندی شہر کے ممتاز ترین بزنس مین تھے۔ مٹی کو سونا بنانے والا محاورہ ان پر صادق آتا تھا۔ وسیع و عریض لیدر گڈز کے کاروبار کے علاوہ فائیو اسٹار ہوٹلز کی ایک چین، ڈپارٹمنٹل اسٹورز اور پٹرول پمپ بھی ان کی ملکیت تھے۔ دو بیٹیوں کی شادی معروف ترین اور امیر ترین خاندانوں میں کر چکے تھے۔ ایک بیٹی باہر زیر تعلیم تھی۔ دو شادی شدہ بیٹے بھی دیار غیر میں مقیم خاندانی بزنس سنبھال رہے تھے جبکہ ایک بیٹا شایان آفندی حال ہی میں تعلیم مکمل کر کے لوٹا تھا اور اب اپنے والد کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

فرید نے حسن کی شادی پر بذات خود جا کر آفندی فیملی کو دعوت دی تھی اور ان کے بے حد اصرار پر شہریار آفندی اپنے بیٹے شایان اور بیوی مہر آفندی کے ہمراہ محض ایک گھنٹے کے لیے آئے تھے۔ زبیدہ اور فرید نے ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی خاص کر زبیدہ جو کہ شادی کی دعوت دینے کے لیے ان کے محل نما گھر جا کر کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئی تھیں۔ ان کی بے حد آؤ بھگت کر رہی تھیں۔ انہوں نے ارم اور ماریہ کو بھی بطور خاص مہر سے ملوایا تھا۔ مہر ایک خوش اطوار اور خوش اخلاق خاتون تھیں مگر ان کی امارت نے ان کے اندر قدرتی طور پر ایک خاص رکھ رکھاؤ پیدا کر دیا تھا، جو مقابل کو محتاط رکھتا تھا۔ اب شادی کے کچھ ہی مہینے بعد اتنی کروفر والی خاتون کو اپنے ڈرائنگ روم میں شاہانہ انداز سے براجمان دیکھ کر تو زبیدہ پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ بے انتہا جوش سے مہر کی طرف بڑھیں۔

"ارے آپ! زہے نصیب، ہماری تو قسمت جاگ گئی کہ آپ یہاں آئیں۔ اب میں آپ کو کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔" زبیدہ گرم جوشی سے کہتی ان سے گلے ملنا چاہ رہی تھیں مگر مہر نے صرف مصافحہ پر ہی اکتفا کیا اور واپس صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"ہمیں آپ کے پاس آنا تو پہلے تھا مگر یہ چھ سات مہینے ہم بے انتہا مصروف رہے۔ شہریار کی ہارٹ پرابلم اچانک ہی بڑھ گئی تھی۔ ایمرجنسی میں لندن جا کر ان کا بائی پاس کروانا پڑا پھر ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اتنا لمبا سفر کر پاتے سو بس، تاخیر ہو گئی۔ اصل میں ہم آپ کے پاس ایک خاص کام سے آئے ہیں۔"

"ارے مسز آفندی! آپ جو کہیں، ہم آپ کی خدمت کرنے کے لیے حاضر ہیں مگر پہلے تو آپ میری طرف سے معذرت قبول فرمائیں کہ ہم آفندی صاحب کی عیادت کو نہیں آسکے۔ اصل میں فرید نے بتایا بھی نہیں اور یہ مصروف بھی بے انتہا رہتے ہیں ورنہ ہم ضرور آتے۔ خیر آپ یہ بتائیے کہ کیسے آنا ہوا؟ کس کام کا ذکر کر رہی تھیں آپ؟"

زبیدہ نے ڈرائنگ روم میں رکھے مٹھائی اور پھل کے ٹوکرے اور تحائف پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ان کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ آج ان کی بیٹیوں میں سے کسی کی قسمت کھلنے والی ہے۔

"ہاں اصل میں آپ کے بیٹے حسن کی شادی میں شایان کو کوئی لڑکی بے انتہا پسند آگئی تھی۔ اب ہے تو یہ نازیبا حرکت مگر اس نے اس لڑکی کی اپنے سیل فون سے تصویر لے لی تاکہ ہمیں دکھا سکے۔ لڑکی ہے تو بلاشبہ چاند کا ٹکڑا سو ہمیں بھی بہت پسند آئی۔ ہم نے کچھ لوگوں سے پتا کیا تو معلوم ہوا یہ لڑکی آپ کی بھانجی ہے۔"

لفظ بھانجی پر زبیدہ نے چونک کر مہر کی شکل دیکھی۔ ان کی سماعت میں کسی نے پگھلا ہوا سیسہ اتارا تھا۔ وہ انتہائی سرد لہجے میں بولیں۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مسز مہر! میری کوئی بھانجی نہیں ہے۔ میں اکلوتی بیٹی ہوں اپنے والدین کی، میری صرف تین بھتیجیاں ہیں اور دو بیٹیاں۔"

"ارے نہیں آپ غلط سمجھیں مسز فرید۔ آپ کی بھانجی سے مراد آپ کے ہسبینڈ مسٹر فرید کی بھانجی۔ کیا نام ہے ان کی بہن کا۔۔۔ آں ہاں، رابعہ میں رابعہ کی بیٹی مائرہ کے لیے آپ کے توسط سے رشتہ لے جانا چاہتی ہوں۔"

مسز آفندی کے پاس پوری معلومات تھیں۔ زبیدہ نے سن ہوتے دماغ کے ساتھ ان کو کوئی جواب دینا چاہا مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکیں۔ ان کے اندر جیسے لاوا ابل رہا تھا۔ انہیں لگا وہ کچھ کہیں گی تو منہ سے لفظ نہیں شعلے نکلیں گے۔ بہتر یہ تھا کہ پہلے خود پر قابو پایا جائے۔ مسز آفندی بغور ان کے تاثرات نوٹ کر رہی تھیں اور کچھ حیران نظر آتی تھیں کہ آخر ایسا بھی کیا کہہ دیا تھا انہوں نے۔

"آپ ٹھیک تو ہیں مسز فرید؟" بالآخر مہر نے پوچھ ہی لیا۔

"جی جی مجھے اکثر ایسا اسٹروک ہو جاتا ہے۔ آج گرمی بہت ہے نا اور لگ رہا ہے اے سی بھی صحیح کام نہیں کر رہا۔ میں پانی پی کر آتی ہوں۔" زبیدہ یہ کہتے ہوئے فوراً" اٹھ کر باہر نکل گئیں جب کہ مسز آفندی حیرت سے لوازمات سے بھری ٹرالی پر رکھے پانی کے جگ کو دیکھتی رہ گئیں۔ پانی تو موجود تھا پھر باہر جانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کچھ الجھ سی گئیں۔

زبیدہ سیدھی اپنے واش روم میں گئیں۔ وہاں انہوں نے پانی کے چھپاکے منہ پر مارے پھر باہر آکر ٹھنڈا یخ پانی پیا۔ تین گلاس پانی پی کر ان کو محسوس ہوا کہ اب ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بحال ہو رہی ہیں۔ انہوں نے تیزی سے سوچنا شروع کر دیا کہ وہ مسز آفندی کو کیا جواب دیں۔ مسز آفندی جب یہ جان سکتی تھیں۔ کہ مائرہ رابعہ کی بیٹی اور رابعہ فرید کی بہن ہیں تو ان کے گھر تک بھی پہنچ سکتی تھیں اگر زبیدہ ان کو لے جانے سے منع بھی کر دیتیں تو وہ خود پہنچ جاتیں اور یہ تو اور زیادہ غلط ہو جاتا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ مائرہ کی ابھی تک کہیں بات طے نہیں ہوئی تھی۔ وہ ماسٹرز کر کے ایک غیر ملکی اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ اگر زبیدہ اس کی منگنی ہو جانے کا جھوٹ بولتیں تو یہ جھوٹ بھی پکڑا جاتا۔ کوئی راہ فرار نظر نہیں آرہی تھی۔ پھر زبیدہ کو ایک راہ سوجھ ہی گئی۔ وہ اپنا حلیہ درست کر کے ڈرائنگ روم میں آئیں اور مسکراتے ہوئے بولیں۔

"میں معذرت چاہتی ہوں مسز آفندی۔ پتا نہیں آج اچانک ایسے کیسے ہو گیا۔ ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں آپ؟" مسز آفندی نے ایک بار پھر اپنا مدعا بیان کیا تو وہ

بولیں۔
"ہاں ہاں ضرور مہر! میں آپ کو رابعہ کے گھر لے جاؤں گی مگر فی الحال وہ لوگ ایک ہفتے کے لیے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ میرے خیال سے آپ آنے والے اتوار کو ان کے گھر چلیں تو بہتر ہو گا۔ ویسے ایک بات آپ کو بتادوں کہ وہ لوگ تو آپ کے معیار کے نہیں ہیں۔ بہت ہی غریب ہیں اور لڑکی بھی خاص پڑھی لکھی نہیں ہے۔ بھئی ہم نے تو بہت کہا کہ ہماری ارم اور ماریہ جتنا نہیں تو تھوڑا بہت تو پڑھاؤ، ہم اخراجات برداشت کریں گے مگر لڑکیوں کو خود ہی دلچسپی نہیں تو ہم کیا کر سکتے تھے۔ اب آپ کا گھرانا تو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے تو یہ لڑکی کچھ مناسب تو نہیں ہے۔"
مسز آفندی نے بہت تحمل سے زبیدہ کے اعتراضات سنے پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔
"اصل میں زبیدہ! ہم تو صرف اپنے بیٹے کی خوشی دیکھ رہے ہیں اور لڑکی ہمیں بھی بہت پسند آئی ہے۔ ان کے کم حیثیت ہونے سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے ہم لڑکی سے شادی کر رہے ہیں۔ ہمیں بیٹے کے لیے اچھی بیوی اور اپنے لیے اچھی بہو چاہیے۔ کیا ہمیں دولت کی کمی ہے جو ہم دولت مند لڑکی تلاش کریں۔ ہماری بڑی دو بہوئیں بھی ہمارے بیٹوں کی پسند ہیں ہم نے ان سے بھی کوئی جہیز نہیں لیا۔ ہمیں ضرورت ہی نہیں ہے اور رہی بات کم تعلیم یافتہ ہونے کی تو وہ ہمارے گھر میں آکر مزید پڑھ سکتی ہے۔ ویسے میرے خیال سے تو انگریزی ادب میں ماسٹر کی ڈگری بہت ہے البتہ اگر وہ چاہے تو ایم فل اور پی ایچ ڈی بھی کر سکتی ہے۔"
زبیدہ کو ایک بار پھر پسینے آنے لگے۔ مسز مہر کی معلومات مکمل تھیں۔ یہ چال تو بری طرح ناکام ہوئی تھی مگر وہ بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھیں۔
"اچھا زبیدہ، ہم چلتے ہیں اب۔ آپ کا بہت وقت لیا اور معذرت کہ ہم ایسے دن آگئے جب آپ کی طبیعت بھی ناساز تھی۔"
"ارے نہیں وہ تو بس ایسے ہی گرمی سے طبیعت بگڑ گئی، آپ جب چاہیں آئیں، آپ کا ہی گھر ہے۔ ارے، یہ سارے لوازمات تو لیتی جائیں۔ یہ تو شاید آپ رابعہ کے گھر لے جانے کے لیے لائی تھیں۔" مسز آفندی کے باہر قدم بڑھانے پر زبیدہ نے ان کے لائے مٹھائی کے ٹوکروں اور تحائف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"ارے مسز فرید! یہ آپ نے کیا بات کر دی۔ بھئی ہم پہلی دفعہ آپ کے گھر آئے تھے کیا خالی ہاتھ آتے۔ یہ آپ کے لیے ہی ہے۔ کسی کے گھر خالی ہاتھ جانا ہماری روایت نہیں۔" مسز آفندی نے بہت نرمی سے زبیدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور رخصت ہو گئیں، جب کہ زبیدہ کو تو چکر ہی آنے لگے۔ تحائف کی مالیت لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے تو تھی ہی، تو جب کسی کے ہاں جانے پر وہ اتنا کچھ لے کر جاتی تھیں تو وہ مائرہ کو کیا کچھ نہیں دیں گی۔ زبیدہ کا تو جلن اور حسد سے برا حال ہو گیا۔
"یہ رابعہ کی بیٹیاں قسمت کی دھنی ہیں۔ ساری زندگی اس رابعہ نے میرا کلیجہ جلایا اور اب اس کی بیٹیاں بازی لے کر جارہی ہیں میری بیٹیوں پر۔ نہیں، میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔ میں مائرہ کو اتنے اونچے خاندان کی بہو بننے نہیں دوں گی۔ میں ہر حد تک جاؤں گی اس رشتے کو روکنے کے لیے۔"
زبیدہ چوٹ کھائی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ ان کے پاس ایک ہفتے کا وقت تھا۔ اس ایک ہفتے میں انہوں نے مہر آفندی کو رشتہ لے جانے سے روکنا تھا اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھیں۔ ان کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور بالآخر ان کی سمجھ میں ایک حل آگیا تھا۔ ان کے شاطرانہ دماغ نے ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اب اس پر عملدر آمد کرنا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر اپنے منصوبے کا جائزہ لیا اور اس کو ہر سقم سے پاک کر کے وہ اٹھیں اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگیں۔ رابطہ ہو جانے پر ایک کرخت مردانہ آواز نے ان سے استفسار کیا۔
"بولیے میڈم جی! کیا کام ہے؟"

☆ ☆ ☆

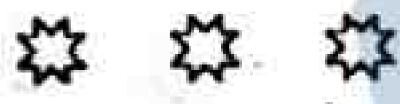
جوگی کی ریاضت کو مزید سو سال بیت چکے تھے۔ وہ ویسے ہی آسن جمائے گیان دھیان میں مگن تھا جیسے سو سال پہلے تھا۔ وہ کیا مانگ رہا تھا یہ تو اب راز نہیں رہا تھا مگر کیوں مانگ رہا تھا؟ یہ ابھی تک سربستہ راز تھا۔ ان سو سالوں میں موسموں کا تغیر جیسے اس کو چھو کر بھی نہیں گزرا تھا مگر ایک عجیب بات یہ ہوئی تھی کہ اب اس کے اردگرد وہ غزال' وہ چرند و پرند کچھ کم ہی نظر آتے تھے۔ نہ جانے معدوم ہو گئے تھے یا سہم کر اس کے قریب نہیں آتے تھے۔ سو سال مکمل ہونے کی شام میں خدا کا فرستادہ ایک بار پھر جوگی کے پاس اس کی خواہش پوچھنے حاضر ہوا۔

اس دفعہ وہ پیامبر نارنجی رنگ کے لبادے میں ملبوس تھا۔ لبادہ اتنا شفاف تھا کہ جیسے ڈوبتی شام کے سارے شفق رنگ اس سے منعکس ہو رہے تھے مگر نہ جانے کس چیز کا بنا ہوا تھا کہ ایسا لگتا تھا کہ نارنجی رنگ آگ کی لپٹوں میں ڈھلتا جاتا ہے۔ فرشتہ اس بار جوگی کے عین سامنے ظاہر ہوا' اس بار وہ خم نہ تھا اور اس کی نظر جھکی ہونے کے بجائے براہ راست جوگی کو دیکھ رہی تھی' نظر میں سوال تھا مگر سوال زبان تک نہ آیا تھا کہ جوگی نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک بار پھر اطراف کے معدودے چند چرند پرند سہم گئے۔ وہ آنکھیں ایسی ہی ڈرا دینے والی تھیں۔ آنکھوں میں سے جیسے آگ کے شعلے لپکتے تھے جو یا تو بھسم کر دیتے یا خود ہی جل جل کر فنا ہو جاتے۔ مگر ان شعلوں کا اس فرستادے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ تو خود ایک دہکتا ہوا شعلہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی نظر جمی رہی یہاں تک کہ جوگی نے لب کھولے ۔ ہاں سو سال میں پہلی دفعہ لب کھولے اور گونج دار آواز میں بولا۔

''مجھے انصاف چاہیے' بس انصاف چاہیے۔''

فرشتے کے لبادے کا رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا۔ نہ جانے اس کی کسی جنبش کے باعث ایسا ہوا یا ڈوبتے آگ کے گولے نے کوئی کرن منعکس کر ڈالی مگر ایسا لگا جیسے جلتی آگ میں کسی نے تیل ڈال کر شعلہ بڑھایا ہو۔

فرشتہ پیچھے ہٹا اور بولا۔ ''تم کو سو سال کی مہلت اور دی جاتی ہے کہ اپنی خواہش کو پرکھ لو۔'' اور پلک جھپکتے غائب ہو گیا۔



ماہ نور پچھلے کچھ ہفتوں سے بہت پریشان تھی۔ اس کے سیل فون پر کسی اجنبی نمبر سے (جو ہر تھوڑے دن بعد تبدیل ہو جاتا تھا) کالز' واہیات پیغامات کا جیسے ایک طوفان آیا ہوا تھا۔ شروع میں اس نے ان کالز اور پیغامات کو نظرانداز کیا مگر جب یہ سلسلہ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تو اس نے مناسب سمجھا کہ فواد کو بتادے' یہ نہ ہو کہ وہ اسے بھی ان باتوں میں ملوث سمجھ لے۔ پیغامات کو پڑھ کر تو فواد کا دماغ ہی جیسے گھوم کر رہ گیا۔ فوری طور پر اس نے ماہ نور کا سم کارڈ بلاک کروا کر نیا نمبر ایشو کروالیا۔ کچھ دن سکون رہا پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

انتہائی لچر اور واہیات پیغامات میں ماہ نور کا نام لے کر اظہار محبت اور فحش باتیں کہی جاتیں' اس چیز نے فواد کو بھی ماہ نور کی طرف سے شک میں ڈال دیا تھا۔ پھر ایک دن لینڈ لائن پر کسی نے فون کیا۔ فواد نے فون اٹھایا تو اسے کہا گیا۔

''میری جان ماہ نور کو تو بلا دیں۔ بات کرنی ہے جانم سے بہت دن ہو گئے۔'' فواد کا تو پارہ ہائی ہو گیا۔ فون پر جو اس نے مغلظات سنائیں تو وہاں سے نہ جانے کیا کیا کہا گیا کہ فواد نے فون پٹخ دیا۔ ماہ نور جو اس کی بلند آواز اور تواتر سے دی جانے والی گالیاں سن کر وہاں آ کھڑی ہوئی تھی' اس وقت ششدر رہ گئی جب فواد نے اسے تھپڑ مار کر پوچھا۔

''کون ہے یہ اور تمہیں کیسے جانتا ہے؟ لینڈ لائن پر کیسے آیا اس کا فون؟ کیسے جانتا ہے وہ یہاں کا کوڈ اور تمہارا نیا سیل نمبر؟ بتاؤ مجھے۔''

فواد اور ماہ نور ہاکس بے روڈ پر بنی کیمپ کالونی کے

فیزون میں رہائش پذیر تھے۔ سیکیورٹی کے پیش نظر یہاں پر براہ راست کال نہیں کی جا سکتی تھی۔ باہر سے آنے والی ہر کال پہلے فون آپریٹر تک آتی تھی پھر آپریٹر مطلوبہ گھر کا نمبر ملا کر دیتا تھا یا کال کرنے والے کو مطلوبہ گھر کا کوڈ ملانا ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فواد کو ماہ نور پر شک گزرا اور نہ کوئی اجنبی مغالطے میں تو اس کے گھر کا کوڈ نہیں ملا سکتا تھا۔

فواد کے گھر والے گلستان جوہر میں رہائش پذیر تھے جبکہ فواد پلانٹ کے قریب ہونے کی وجہ سے کالونی میں مقیم تھا۔ اگر گھر میں کوئی اور بھی موجود ہوتا تو شاید وہ ماہ نور کو کچھ رعایت دے دیتا مگر اور تو کوئی تھا ہی نہیں لہٰذا وہ آپے سے باہر ہو کر ماہ نور پر برس پڑا تھا۔ بیچاری ماہ نور روتی جاتی تھی اور "میں نہیں جانتی یہ کون ہے" کی گردان کیے جاتی تھی۔

فواد کا جب غصہ تھوڑا ٹھنڈا ہوا تو اس نے سوچنا شروع کیا کہ کہیں یہ کوئی سازش تو نہیں ہے۔ ماہ نور سے شادی کو تقریباً" سال بھر ہونے کو تھا' اس نے آج تک کوئی قابل گرفت بات نہیں دیکھی تھی۔ ماہ نور تو لباس تک کے معاملے میں بے انتہا محتاط تھی تو کہاں وہ ایسے آدمی سے بات کرتی جو اس قدر غلیظ ذہنیت اور زبان رکھتا ہو۔ اس گھٹیا آدمی کی باتیں یاد آتے ہی اس کا خون پھر ابلنے لگا۔ اس معاملے کو وہ فوری طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کینیپ چند انجینئرز کو ٹریننگ کے لیے کینیڈا بھجوا رہا تھا اور وہ ان میں شامل تھا۔ ان کو بھیجنے سے پہلے ان کے کچھ انٹرویوز' ٹیسٹ وغیرہ ہونے تھے جن میں کلیئر ہونا لازمی تھا پھر مزید کچھ کاغذی کارروائیاں بھی پوری کرنا لازمی تھیں۔ اس کا پاسپورٹ بھی زائد المیعاد ہو چکا تھا وہ اس کو بھی دوبارہ بنوانے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔ آج کل وہ صحیح معنوں میں گھن چکر بنا ہوا تھا اور اوپر سے یہ مسئلہ آ کھڑا ہوا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اس نے آپریٹر کو فون کر کے پہلے تو وہ نمبر حاصل کیا جس پر سے اسے ابھی کال کی گئی تھی۔ حسب توقع یہ سیل فون نمبر تھا۔ پھر وہ ماہ نور کا فون اٹھا لایا اور اس میں موجود وہ تمام نمبر ایک کاغذ پر اتارنے لگا جہاں سے وہ واہیات پیغامات موصول ہو رہے تھے۔ یہ کاغذ احتیاط سے رکھ کر وہ اپنے بیڈ روم میں آیا جہاں ماہ نور ہنوز رونے میں مصروف تھی۔

"چلو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔ زیادہ سامان پیک کرنا' تمہیں کم از کم ایک مہینہ وہاں رکنا ہو گا۔" فواد کی بات پر ماہ نور کرنٹ کھا کر بیڈ پر سے اٹھی اور اس سے لپٹ گئی۔

"آپ کوئی بھی قسم اٹھوا لیں فواد' میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نہیں جانتی یہ کون آدمی ہے؟ مجھے کیسے جانتا ہے؟ آپ سوچیں فواد اگر میں ایسی ہوتی تو آپ کو ان پیغامات کا کیوں بتاتی۔ میرا سیل فون کہاں پڑا ہوتا ہے مجھے تو پتا بھی نہیں ہوتا' اگر میں غلط ہوتی تو سیل فون میں سیکیورٹی کوڈ لگا کر رکھتی' آپ سے چھپا چھپا کر رکھتی۔" فواد ان سارے خطوط پر پہلے ہی سوچ چکا تھا لہٰذا نرمی سے بولا۔

"آئی ایم سوری ماہ نور! میں نے تم پر بلاوجہ ہاتھ اٹھایا لیکن وہ باتیں ہی اتنی فحش کر رہا تھا کہ میرا خون کھول اٹھا۔ اس کی بکواس سن کر میرا دماغ گھوم گیا اور بس میں ہاتھ اٹھا بیٹھا۔ پلیز تم مجھے معاف کر دو۔ تمہیں تمہارے گھر اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ آنے والے اگلے کچھ دن میری بے انتہا مصروفیت کے ہیں شاید میں رات کو بھی گھر نہ آؤں اور پھر مجھے کینیڈا جانا پڑ جائے پندرہ دن کے لیے تو میں اب اس صورت حال میں تمہیں یہاں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ ویسے تو کالونی محفوظ ہے مگر رات کو تم اکیلی نہیں رہ سکتیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم اپنے والدین کے پاس رہ لو' جب تک میں واپس نہ آ جاؤں۔ اوکے؟"

ماہ نور نے سکون کا سانس لیا اور پھر اگلی صبح وہ فواد کے ہمراہ عادل' رابعہ اور مائرہ کے سامنے بیٹھی' سارا قصہ سنا رہی تھی۔ فواد کے تھپڑ مارنے کو اس نے حذف کر دیا تھا جس پر فواد نے اسے ممنون نظروں سے دیکھا تھا۔ عادل بہت گہری نظر سے فواد کا مشاہدہ کر رہے تھے لہٰذا جب ماہ نور خاموش ہوئی تو وہ فواد سے مخاطب ہو کر بولے۔

"بیٹا فواد، عموماً" ایسی صورت حال میں مرد کا شک فوراً" عورت پر جاتا ہے۔" فواد نے ایک دم ان سے نظر چرالی۔ عادل نے بولنا جاری رکھا۔ "مگر میں تمہیں یہ بتا دوں کہ تم میری بیٹی کے متعلق کبھی ایسا سوچنا بھی مت۔ میری دونوں بیٹیاں انتہائی مضبوط کردار کی حامل ہیں۔ میں کبھی ایک لفظ بھی ان کے کردار کے بارے میں نہیں سن سکتا۔ تم تو خیر پڑھے لکھے سمجھ دار ہو، ایسی غلطی نہیں کرسکتے۔ مگر بیٹا اگر تمہیں کبھی بھی یہ شک گزرے کہ اس سارے قصے میں ماہ نور انوالوہے تو تم بجائے اس کو ٹارچر کرنے کے میرے پاس چھوڑ جانا، میں تم سے صفائی کا ایک لفظ نہیں کہوں گا نہ اپنی بیٹی کے کردار کی وضاحتیں دوں گا کیونکہ مجھے اپنی بیٹی پر اتنا یقین اور بھروسا ہے کہ اس کی پاکیزگی ثابت کرنے کے لیے وضاحتیں دینا، مجھے اس کی تذلیل لگے گا۔ تم بخوشی اس سے جان چھڑا سکتے ہو اگر کبھی تمہیں اس پر شک ہو۔"

ایک ایک لفظ الگ، لہجہ دوٹوک، فواد کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ نم ہوتی پیشانی، صاف کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں نہیں ابو۔ میں ایسا کیوں کروں گا۔ میں ماہ نور پر شک کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں ابھی اپنے ایک انسپکٹر دوست کے پاس جا رہا ہوں۔ یہ نمبر اس کو دیتا ہوں تاکہ وہ ان کو ٹریس کرے۔" پھر فواد تو تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا جب کہ ماہ نور عادل سے لپٹ کر رو پڑی۔

"تھینک یو بابا! آپ بہت بہت اچھے ہیں، سب باپوں سے اچھے۔" عادل نے نرمی سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے اس کے آنسو صاف کیے اور آہستہ سے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے بولے۔

"اس گال پر مرہم لگالو بیٹی، سوج گیا ہے۔" اور پھر تیزی سے اندر چلے گئے مگر ماہ نور ان کی آنکھوں کی نمی دیکھ چکی تھی۔ اس کے دل سے بے اختیار اس خبیث کے لیے بددعا نکلی تھی جس کی وجہ سے اس کے ساتھ یہ سب ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

مائرہ اسکول بس سے اپنے اسٹاپ پر اتری۔ اسکول میں امتحانات ہو رہے تھے اور امتحانی کاپیاں گھر لا کر جانچنے کی اجازت نہیں تھی لہٰذا تمام تدریسی عملہ اسکول میں ہی بیٹھ کر نتائج تیار کرتا تھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ واپسی کے لیے اسکول بس کا انتظام کر دیا گیا تھا جو نزدیکی اسٹاپ پر اتار دیا کرتی تھی۔ اسٹاپ سے گھر تک کا فاصلہ تھوڑا سنسان گلیوں پر مشتمل تھا، مائرہ عموماً" یہ فاصلہ تیز قدموں سے طے کرتی تھی اور اکثر تو وہ رابعہ کو فون کر دیتی تھی تو رابعہ اسے لے کر گھر آجاتی تھیں مگر آج اس کا ذہن ماہ نور کے ساتھ ہونے والے واقعے میں بری طرح الجھا ہوا تھا، اوپر سے آج رزلٹ جمع کرانے کی آخری تاریخ تھی سو وہ تمام اساتذہ بے پناہ مصروف رہے تھے اور آج گھر واپس آتے آتے مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔

مائرہ سوچوں سے اس وقت باہر نکلی جب بس اس کے اسٹاپ پر رکی اور بے اختیار اس نے خود کو کوسا تھا کہ اتنی مصروفیت میں سے دو منٹ نکال کر امی کو کال کر لیتی تو کیا ہو جاتا۔ سو اس وقت اسے یہ سنسان راستہ خود ہی طے کرنا تھا۔ اللہ کا نام لے کر اس نے چلنا شروع کیا۔ گلی میں دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آرہا تھا۔ مائرہ نے رفتار تیز کرنا چاہی مگر اسی وقت ایک بے انتہا تیز رفتار گاڑی اس کے قریب آکر رکی اور ایک مردانہ گرفت نے اسے دبوچ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی اس کو بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ ہوش و حواس کھوتی مائرہ کے ذہن میں آخری خیال یہ آیا تھا کہ کیا وہ اغوا ہو رہی ہے؟

ادھر گھر میں رابعہ بے چین تھیں۔ وہ جلے پیر کی بلی کی طرح صحن اور کمرے میں چکر لگا رہی تھیں۔ ماہ نور کئی دفعہ مائرہ کے سیل فون پر فون کر چکی تھی مگر فون ہنوز بند تھا۔ عادل بھی گھر آچکے تھے اور کئی دفعہ اسٹاپ پر بھی جا کر دیکھ چکے تھے۔ ماہ نور نے مائرہ کی کولیگ سے فون کر کے واپسی کے وقت کا بھی پتا کیا تھا اور رابعہ اور

عادل یہ جان کر مزید پریشان ہو گئے تھے کہ مائرہ کو اسکول بس مغرب کے وقت اسٹاپ پر چھوڑ کر جا چکی تھی۔
رابعہ اب رونا شروع ہو چکی تھیں۔ ماہ نور بڑی ہمت کر کے خود کو سنبھال کر انہیں تسلیاں دے رہی تھی۔ رابعہ روتے ہوئے کہنے لگیں۔
"اللہ جانے ہمارا کون دشمن ہے جو یہ سب کر رہا ہے۔ پہلے ماہ نور اور اب مائرہ' نہ جانے کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟ اللہ میری بچی کی حفاظت کرنا۔" عادل اٹھ کر فواد کا نمبر ملانے لگے۔ رابطہ ہونے پر انہوں نے فواد کو ساری صورت حال بتائی تو فواد نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔
"انکل! آپ کچھ دیر مزید انتظار کریں۔ ہو سکتا ہے وہ کسی دوست کے گھر چلی گئی ہو۔ اگر وہ بارہ بجے تک نہیں آتی تو میں پولیس میں رپورٹ درج کرواتا ہوں۔ اصل میں معاملہ لڑکی کا ہے تو تھوڑا محتاط تو رہنا پڑے گا۔ یہ نہ ہو کہ بلاوجہ کی بدنامی گلے پڑ جائے۔ ان شاء اللہ وہ آجائے گی۔"
عادل کو مشورہ مناسب لگا۔ کچھ دیر انتظار کر لینا بہتر تھا' اگر خدانخواستہ گیارہ بارہ بجے تک مائرہ نہیں آتی تو پھر وہ ایف آئی آر درج کرواتے مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ رات گیارہ بجے دروازے پر زوردار دستک ہوئی تھی۔ عادل نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ دھپ سے کسی چیز کے گرنے کی۔ گاڑی تیزی سے ریورس ہوئی اور اس کی تیز ہیڈلائٹس عادل کی آنکھیں چندھیا گئیں اور پھر گاڑی زن سے ان کے سامنے سے نکل گئی۔ عادل نے تھوڑا آگے ہو کر دیکھنا چاہا کہ وہ دھپ کی آواز کس چیز کے گرنے کی تھی تو جیسے ان کے قدموں سے زمین کھسک گئی۔ وہ کوئی انسانی وجود تھا اور بلاشبہ وہ کوئی لڑکی تھی۔ عادل بھاگتے ہوئے اس کے قریب گئے اور بے ہوش پڑی مائرہ کو دیکھ کر انہیں جیسے چکر آ گئے۔ انہوں نے فوراً" اس کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور تیزی سے گھر کے اندر لا کر دروازہ بند کر دیا۔ شکر تھا کہ آس پاس کے کسی گھر کا کوئی دروازہ نہیں کھلا تھا ورنہ وہ لوگوں کے سوالات کا جواب دیتے دیتے تھک جاتے۔
اندر کمرے میں بیٹھی رابعہ اور ماہ نور تیزی سے باہر آئی تھیں اور مائرہ کو ایسی حالت میں دیکھ کر رابعہ تو زمین پر گرنے لگی تھیں جب نور اور عادل نے ان کو سنبھالا۔

عادل نے سخت لہجے میں کہا۔ "خود کو سنبھالو رابعہ کچھ نہیں ہوا مائرہ کو' یہ بات کسی کو پتا نہیں چلنی چاہیے۔ فواد کو بھی نہیں۔ اسے اندر لے جاؤ۔ دیکھو اگر ہوش میں آجائے تو ابھی کچھ مت پوچھنا اس سے اور بالکل نارمل رہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں' میں فواد کو فون کرتا ہوں۔" رابعہ اور ماہ نور مائرہ کو اس کے کمرے میں لے گئیں جب کہ عادل نے فواد کو فون کیا۔
"ہاں بیٹا فواد' آگئی ہے مائرہ گھر پر' تم ٹھیک کہہ رہے تھے اپنی دوست کے ہاں چلی گئی تھی۔ بہت ڈانٹا ہے میں نے اسے۔" عادل زبردستی ہنستے ہوئے بولے۔
"ارے انکل' شکر ہے وہ محترمہ آگئیں' میں تو بس ابھی اپنے انسپکٹر دوست کو فون کرنے ہی والا تھا۔ چلیں اب آپ اس کو ڈانٹیں نہیں' پیار سے سمجھادیں۔"
"ہاں ہاں بیٹا' کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ آج کل کی اولاد ڈانٹ سے اور بگڑ جاتی ہے۔ اچھا چلو بیٹا تم اپنا کام کرو میں بھی اب سونے جاتا ہوں۔"
عادل نے فواد سے مختصر بات کر کے فون بند کر دیا۔ یہ تو واضح تھا کہ کوئی ان کے گھرانے سے دشمنی میں یہ سب کر رہا ہے' مگر وہ کون ہے؟ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ وہ مائرہ کے کمرے میں آگئے جہاں رابعہ اور ماہ نور مائرہ کو ہوش میں لانے کی کوششیں کر رہی تھیں۔
"ہیلو' میں مسز فرید بات کر رہی ہوں مہر۔ کیسی ہیں آپ؟" زبیدہ نے مسز آفندی کو کال کی تھی تاکہ وہ ان سے مائرہ کا رشتہ لے جانے کے بارے میں بات کر سکیں۔
"ہاں میں نے اس لیے آپ کو فون کیا ہے مسز آفندی کہ اس دن آپ آئی تھیں نا میرے ہاں اس بچی

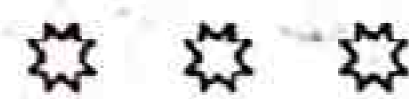
کے رشتے کے لیے تو میرے خیال سے آپ اس سلسلے میں فرید سے براہ راست بات کرلیں۔ اصل میں دیکھیں نا فرید اس کے ماموں ہیں تو پہلے تو ان سے ہی بات ہونی چاہیے پھر وہ جیسا بہتر سمجھیں گے آپ کو جواب دیں گے اور پلیز آپ ان کو یہ نہ بتایئے گا کہ آپ پہلے ہمارے گھر آچکی ہیں اور مجھ سے بات کرچکی ہیں۔ دراصل فرید تھوڑے شاؤنسٹ ہیں ان کو برا نہ لگ جائے کہ ان سے پہلے مجھ تک بات کیوں پہنچ گئی۔"

فرید کے شاؤنسٹ ہونے والی بات سن کر مہر نے بھنویں اچکائیں جیسے حیرت کا اظہار کررہی ہوں۔ ان کے حلقے میں فرید ''مسٹر زبیدہ'' کے نام سے جانے جاتے تھے۔ وجہ ان کی جی حضوری تھی۔ ایسا بندہ شاؤنسٹ کیسے ہوگیا؟ یہ مہر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا مگر اس بات پر بحث کرنا مناسب نہیں تھا سو وہ زبیدہ سے بولیں۔

"ارے آپ مجھے کل ہی بتادیتیں تو میں کل ہی فرید بھائی کا انتظار کرلیتی، خیر کوئی بات نہیں۔ میں بات کرلوں گی اور آپ بے فکر رہیں۔ آپ سے میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ یہ سمجھیں او کے خدا حافظ۔"

زبیدہ نے سکون کا سانس لے کر فون رکھ دیا۔

وہ مہر سے کل یہ سب کیسے کہہ دیتیں جب کہ ان کا کام تو آج ہوا تھا۔ بس اب سب کچھ مہر کے سامنے لانا تھا وہ بھی رابعہ کے گھر پر اور اسی لیے انہوں نے خود کو لاتعلق ظاہر کرنے کا سوچا تھا۔ انہوں نے مہر کے لائے سارے لوازمات ملازموں میں تقسیم کردیے تھے اور تحائف کو چھپالیا تھا۔ وہ فرید کو جانتی تھیں کہ وہ ان کو عین موقع پر ہی شایان کے رشتے کا بتائیں گے اور پھر جو کچھ وہاں ہوگا اس کا شک ان پر کیسے جائے گا جب ان کو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ زبیدہ کا منصوبہ مکمل اور ہر جھول سے پاک تھا۔



مائرہ اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی تھی۔ رابعہ اور ماہ نور میں سے کوئی نہ کوئی ایک اس کے پاس موجود رہتا تھا۔ رابعہ اس کی خاموشی سے بے حد پریشان تھیں مگر ماہ نور کو بھروسا تھا کہ مائرہ جلد ہی خود کو سنبھال لے گی۔

وہ بے انتہا مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ وقتی طور پر ضرور پریشان ہوتی تھی لیکن جلد ہی پریشانی کے مرحلے سے نکل کر مسئلے کے حل کے لیے کوشاں ہوجاتی تھی۔ ابھی بھی اس کے چہرے پر سوچ کی تحریر واضح تھی' اس کا یوں خاموش بیٹھنا اس بات کی بھی دلیل تھا کہ کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا ہے۔ ماہ نور اب اس کی چپ ٹوٹنے کی منتظر تھی اور اسے یقین تھا کہ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ عادل آج دفتر جاتے ہوئے باہر دروازے پر تالا ڈال گئے تھے تاکہ کوئی بھی ان کے گھر والوں سے ملنے نہ آسکے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی بھی ابھی مائرہ سے ملے یا اسے دیکھے انہوں نے سختی سے کسی کو بھی یہ بات بتانے سے منع کردیا تھا حتیٰ کہ فواد اور فرید کو بھی۔ ماہ نور نے مائرہ کی خرابی طبیعت کا بتا کر اس کے اسکول سے چھٹی لے لی تھی۔

ایک بوجھل دن یونہی گزر گیا۔ خیر رہی کہ نہ کوئی آیا نہ کوئی گیا اور نہ ہی کسی کا کوئی فون آیا۔ اگلی صبح عادل، رابعہ اور ماہ نور ناشتہ کررہے تھے کہ مائرہ کمرے سے باہر آئی۔ اس کا چہرہ دھلا ہوا تھا اور بال سلیقے سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ آکر ان کے ساتھ بیٹھ گئی اور بڑے نارمل انداز میں ماہ نور سے مخاطب ہوئی۔

"میرا ناشتہ نہیں بنایا ماہی؟ پلیز مجھے بھی لادو۔ بھوک لگ رہی ہے بہت۔" ماہ نور سرعت سے 'ابھی لائی' کہتی اٹھی اور رابعہ نے مائرہ کو ساتھ لگالیا۔ مائرہ کچھ دیر ان سے لگی رہی پھر الگ ہوتے ہوئے بولی۔

"بابا! یہ جو کچھ ماہ نور کے ساتھ ہوا اور جو میرے ساتھ ہوا یہ ایک ہی سلسلے کی کڑی ہے۔ یہ کوئی ہم سے دشمنی کررہا ہے مگر ایک حد میں رہ کر بابا، مجھے اغوا کرنے والوں نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ بس کچھ عجیب سی باتیں کررہا تھا ایک لڑکا اور پھر وہ مجھے چند گھنٹوں میں یہاں چھوڑ بھی گئے۔ مجھے لگتا ہے بابا یہ کوئی اپنا ہی ہے، ورنہ ان لوگوں کو میرا گھر کیسے پتا تھا اور ماہی کے گھر کا کوڈ نمبر؟"

عادل بغور مائرہ کو سن رہے تھے۔ اس بات پر تو وہ بھی متفق تھے کہ یہ جو کوئی بھی ہے وہ جاننے والا ہی ہے۔ مگر کون اور کیا چاہتا ہے ؟ اس راز سے کون پردہ اٹھاتا۔
ابھی وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ رابعہ بول پڑیں۔
"جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اللہ کا شکر ہے تم محفوظ ہو۔ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اگر اس بات کی کھوج میں پڑیں گے تو بیٹا تمہارا نام اچھلے گا۔ رہی ماہ نور کے مسئلے کی بات تو وہ شادی شدہ ہے اور فواد دیکھ رہا ہے اس مسئلے کو مگر بیٹا تم ابھی کنواری ہو۔ ہم اگر یہ بات زبان پر لے آئے کہ تم چند گھنٹوں کے لیے غائب رہیں تو تم بلاوجہ بدنام ہو جاؤ گی۔ کوئی تمہاری پاک دامنی پر یقین نہیں کرے گا۔ نہیں بیٹا! مجھے ابھی تمہیں بیاہنا ہے۔" وہ بولتے بولتے ہانپ سی گئیں۔ مائرہ نے ان کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔
"امی دنیا نے تو حضرت بی بی مریم پر بھی بہتان لگایا تھا تو مجھ پر بھی الزام لگانا کون سی نئی بات ہو گی مگر ایسے لوگوں کو سبق تو ملنا چاہیے نا۔"
رابعہ سے پہلے عادل نے مائرہ کو ٹوک دیا۔ "نہیں بیٹا! تمہاری امی درست کہہ رہی ہیں۔ واقعی یہ کوشش لاحاصل ہے۔"
"تم ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالو اور ناشتہ کر کے آرام کرو۔ ابھی دو تین دن اسکول جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" ماہ نور اس کے آگے ناشتہ رکھتے ہوئے بولی۔ مائرہ بھی مزید کچھ کہنے کا ارادہ موقوف کر کے ناشتہ کرنے لگی۔ ناشتہ کر کے وہ کمرے میں آ گئی۔ ایک کتاب لے کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ جس رات وہ اغوا ہوئی تھی اس کے مناظر پھر اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں تھی۔ چکراتے سر کو تھامتے ہوئے اس نے نظر اٹھائی تو اس کے برابر رکھی کرسی پر ایک خوبرو نوجوان بیٹھا اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ مائرہ متوحش ہو کر اٹھ بیٹھی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی تو وہ لڑکا بولا۔
"کیا میرے سر پر مارنے کے لیے کوئی چیز ڈھونڈ رہی ہیں ؟ لاحاصل کوشش ہے۔ اول تو یہاں ایسی کوئی چیز ہے نہیں، دوسرا اگر آپ مجھے مار بھی دیں گی تب بھی باہر تو نہیں جا سکیں گی۔"
"ک ک کون ہو تم ؟ کیا چاہتے ہو ؟ مجھے یہاں کیوں لائے ہو ؟" مائرہ نے کانپتی لرزتی آواز میں پوچھا۔
"کون ہیں ؟ کیا چاہتے ہیں ؟ کیوں لائے ہیں ؟ سب کے جواب دیتے ہیں میو! تمہیں جلدی کیا ہے ایسی ؟" اطمینان سے جواب دیا گیا۔
میو ؟ یعنی یہ لڑکا اس کا نام جانتا تھا، کیسے ؟ مائرہ نے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرنا شروع کر دی۔ شاید وہ اسے باتوں میں الجھا کر نکل پاتی یا کوئی سراغ بعد میں کام آتا اگر وہ رہا کر دی جاتی۔
"تم مجھے کیسے جانتے ہو ؟" مائرہ نے اس سے پوچھا۔
"پھر ایک فضول سوال ؟ چچ۔۔۔ تم لڑکیاں بھی ناصبر نہیں کرتی ہو۔ بابا کہا نا سب بتاتا ہوں۔ دیکھو میں تمہیں بہت عرصے سے دیکھ رہا ہوں اس اسٹاپ پر آتے جاتے۔ بہت اچھی لگتی ہو تم مجھے۔ بس اس لیے تمہیں یہاں اپنا مہمان بنا لیا۔ اب تم مجھ سے باتیں کرو جیسے دو دوست کرتے ہیں۔ میں تھوڑا سائیکو ہوں عجیب عجیب خواہشیں کرتا ہوں۔ بس تمہارے ساتھ تھوڑا اچھا وقت گزارنا ہے، صرف باتیں کرتے ہوئے۔ ہاں ہاں میں کسی کی بددعا نہیں لیتا بھائی (کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے) اللہ سائیں سے بڑا ڈرتا ہوں میں۔ چلو شاباش تم مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرو پھر تمہیں گھر بھی جانا ہے۔" مائرہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے جیسے تصدیق چاہی۔
"کیا کیا کہا تم نے ؟ تم مجھے گھر چھوڑ دو گے ؟ واقعی ؟"
"ہاں بالکل اور جتنی جلدی تم مجھ سے باتیں کرنا شروع کرو گی اتنی جلدی گھر جاؤ گی۔ تو اسٹارٹ مائے بیوٹی۔ چلو تم بتاؤ اپنے بارے میں۔" وہ لڑکا اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ مائرہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہوئی اور ہاتھ چھڑانا چاہے مگر اس لڑکے نے سختی سے اس کے

ہاتھ پکڑ لیے اور سرد آواز میں بولا۔

"اگر تم میرے کہنے کے مطابق عمل کرو گی تو یہاں سے رہا ہو جاؤ گی ورنہ رات یہیں گزارنی پڑ جائے گی اب سوچ لو تم۔ چلو چہرے پر اسمائل لاؤ اور بتاؤ اپنے بارے میں گھر نہیں جانا بے بی کو؟" اس لڑکے کے چہرے اور آنکھوں میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ مائرہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ خود کو اس نے ذہنی طور پر تیار کیا اور مسکراتے ہوئے اس سے بات کرنے لگی۔

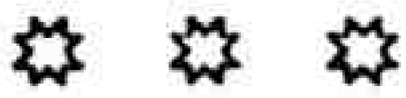
وہ لڑکا اس سے چھوٹے چھوٹے سوالات کرتا رہا مگر اپنے بارے میں اس نے ایک لفظ نہ کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ دو گلاسوں میں کولڈ ڈرنک ڈال کر لایا اور اس کے قریب بیٹھ کر پینے لگا۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ مائرہ کو قد آدم گلاس ونڈو کے پاس لے گیا۔ ونڈو پر سے پردے ہٹا کر وہ مائرہ کو چاند دکھانے لگا۔ جہاں کہیں مائرہ کی مسکراہٹ مدہم ہوتی، وہ ٹوک دیتا۔ کافی دیر تک وہاں کھڑے رہنے کے بعد وہ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ لڑکے نے صوفے کی پشت پر اپنا بازو پھیلا لیا اور پھر باتیں کرنے لگا پھر اس نے صوفے کے برابر رکھی میز پر رکھے کرسٹل کے گلدان میں سجے لمبی شاخوں والے ایک گلاب کو اٹھایا اور صوفے سے نیچے اتر کر ایک گھٹنے پر بیٹھ گیا اور مائرہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ پھول میری نئی دوست میرو کے نام" آں ہاں! مسکراہٹ غائب نہ ہو اور ویسے تمہیں یہ پھول تمہارا منگیتر دیتا تو تم کیسے لیتیں؟ تم لڑکیاں دونوں ہاتھ ہونٹوں پر رکھ کر اور پھر ایسے ایسے ہاتھ جھٹکتی ہو نا، ویسے کر کے دکھاؤ نا، مجھے بڑا اچھا لگتا ہے یہ ری ایکشن۔"

"نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" مائرہ نے حکم پر عمل کیا تو اس نے خوش ہو کر پھول اسے دیا اور کہا "ذرا اسے سونگھو تو ایسی خوشبو تمہیں کہیں کسی گلاب میں نہیں ملے گی۔" بادل نخواستہ مائرہ نے پھول سونگھا اور اگلے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

"مائرہ، مائرہ، کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔" ماہ نور نے مائرہ کا کندھا ہلایا تو مائرہ چونک کر حال میں واپس آئی۔

"کیا سوچ رہی تھیں؟ جو ہو گیا اسے بھول جاؤ، کچھ نہیں ہو گا۔" ماہ نور اسے تسلی دے رہی تھی جبکہ مائرہ چاہتے ہوئے بھی اسے کچھ نہ بتا سکی۔



اس واقعے کو تین چار دن گزر چکے تھے۔ رابعہ، ماہ نور اور عادل مطمئن ہونے لگے تھے کہ شاید یہ کسی غلط فہمی میں ہو جانے والا حادثہ تھا، اب کچھ غلط نہیں ہو گا مگر مائرہ جانتی تھی کہ یہ خاموشی، طوفان آنے سے پہلے کی خاموشی تھی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا وہ کوئی اتفاق نہیں تھا۔ کرنے والوں نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ منصوبہ تھا کیا؟ مگر وہ کچھ بھی کہہ کر گھر والوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ان ہی دنوں اس کے لیے ایک رشتہ بھی آ گیا اتفاق سے لڑکا مائرہ کے ہی اسکول میں پڑھاتا تھا مگر علیحدہ ونگ میں لہٰذا یہ رشتہ کسی رشتہ کرانے والی کے توسط سے آیا تھا اس میں کسی پسندیدگی کا عمل دخل نہیں تھا۔ وہ لوگ جمعے کو مائرہ کو دیکھ کر اور اتوار کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر چلے گئے تھے۔ رابعہ نے فرید کو ساتھ چلنے کا کہنے کے لیے فون کیا مگر وہاں سے فرید نے انہیں ایک سرخوشی کے عالم میں مسٹر آفندی کے بیٹے کا رشتہ لانے کی خبر سنائی۔

"آپا! تم جانتی نہیں ہو وہ کتنے بڑے لوگ ہیں۔ میری مائرہ کے تو نصیب کھل گئے ہیں۔ تم ابھی ان لوگوں کو منع کر دو۔ میں اور زبیدہ آتے ہیں ان کو اتوار کو لے کر۔ اچھا ہوا مسز آفندی نے پہلے مجھ سے بات کی زبیدہ سے نہیں۔ اب اس کو تو عین وقت پر بتاؤں گا تم بس تیاریاں کرو شادی کی اب سمجھو رشتہ پکا ہے۔ وہ لوگ تو مائرہ کو پسند کر ہی چکے ہیں اور تم شایان آفندی کی طرف سے مطمئن ہو جاؤ وہ میری ذمہ داری ہے۔"

ان کے جوش اور خوشی کو دیکھ کر رابعہ کچھ کہہ ہی نہ سکیں اور "ٹھیک ہے آپ آ جائیں ان کو لے کر۔ کہہ کر فون بند کر دیا جب کہ دوسرے فون پر یہ ساری گفتگو

سنتی ہوئی زبیدہ ہنس پڑیں کہ فرید یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ زبیدہ کو بے وقوف بنا رہے ہیں جب کہ دراصل سب کچھ ان کے منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ آج تو ایک اور نیا نکتہ ہاتھ آگیا تھا کہ مائرہ کے لیے جس لڑکے کا رشتہ آیا تھا وہ اسی کے اسکول میں پڑھاتا تھا۔

"واہ' یہ تو سونے پر سہاگہ ہی ہو گیا ہے۔" زبیدہ خباثت سے مسکرائیں پھر ایک نمبر ڈائل کر کے کچھ ہدایات دینے لگیں۔

آخر کار اتوار کا دن بھی آپہنچا۔ فرید نے صبح زبیدہ کو رشتے کے بارے میں بتایا تھا اور زبیدہ نے لازوال اداکاری کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ وہ فرید پر خوب چلائیں اور کہا کہ ان کو اپنی اولاد کے علاوہ ساری دنیا کی فکر ہے۔ مزید یہ کہ وہ ہرگز ساتھ نہیں جائیں گی جب اس طرح ان سے باتیں چھپائی جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

فرید کا پہلے تو دل چاہا کہ وہ کہیں کہ ہاں تم نہ جاؤ تو بہتر ہے پھر انہیں خیال آیا کہ وہ اکیلے مسز آفندی کو ساتھ لے کر جاتے اچھے نہیں لگیں گے کیونکہ مسٹر آفندی تو فی الحال مکمل صحت یاب نہیں ہوئے تھے لہٰذا وہ تو نہیں آرہے تھے۔ یہ سوچ کر فرید نے زبیدہ کو منانا شروع کر دیا اور چونکہ اتنے سالوں میں وہ کہنہ مشق ہو چکے تھے لہٰذا زبیدہ مان گئیں۔ شام میں وہ رابعہ کے گھر روانہ ہوئے۔ فرید اور زبیدہ کی سلور سوک آگے تھی جسے فرید چلا رہے تھے جبکہ مسز آفندی لینڈ کروزر میں گارڈ اور ڈرائیور کے ہمراہ تھیں۔ ان دو گاڑیوں کے پیچھے ایک بائیک بھی تھی جسے کسی نے نوٹ نہیں کیا سوائے زبیدہ کے اور وہ مسکرا دی تھیں۔

مہر' رابعہ کے گھر میں داخل ہوئیں تو ان کی شاندار شخصیت دیکھ کر رابعہ اور عادل مرعوب سے ہو گئے۔ رہی سہی کسر ان کے لائے مٹھائی' پھل کے ٹوکروں اور تحائف نے پوری کر دی۔ رابعہ بڑی عزت سے مہر کو ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ مہر بھی بڑے اچھے طریقے سے رابعہ سے ملی تھیں ان کے انداز میں کوئی کروفر نہ تھا۔ رشتے کی بات بھی انہوں نے بڑے سبھاؤ سے کی تھی۔ ویسے ہی انکساری سے رشتہ مانگا جیسے مانگا جاتا ہے۔ اپنی دولت کا زعم یا رابعہ کے کم حیثیت ہونے کا کوئی شائبہ ان کے لہجے میں نہ تھا۔ مائرہ جب کمرے میں آئی تو وہ ماشاء اللہ کہتے ہوئے اٹھیں اور مائرہ کو اپنے برابر میں بٹھالیا۔

"بھئی آج تو ہم گھر جا کر اپنے بیٹے کا شکریہ ادا کریں گے جس نے ہمیں جوتیاں گھسنے سے بچا کر یہ ہیرا ڈھونڈ نکالا۔ ہمارا بس چلے تو تمہیں آج ہی گھر لے جائیں۔ تمہارے ماں باپ کے سامنے عرضی تو ڈال دی ہے اب یہ ہاں کریں تو ہماری مراد پوری ہو۔ بھئی تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں نا ہماری بہو بننے پر۔" مہر کے ہلکے پھلکے انداز پر مائرہ نے تو شرما کر سر جھکا لیا جب کہ باقی سب مسکرانے لگے۔ عادل کو رابعہ نے باہر آنے کا اشارہ کیا جب وہ باہر آئے تو وہ انہیں ایک کونے میں لے جا کر بولیں۔

"آپ اب رسمی طور پر سوچنے کا وقت مت مانگ لیجیے گا۔ فرید نے لڑکے کی ہر طرح سے گارنٹی دی ہے اور اس شہر میں کون ہے جو آفندی خاندان سے واقف نہیں۔ یہ رشتہ نعمت غیر مترقبہ ہے۔ خدا کے لیے بس ہاں کر دیں اور ان کے انداز سے لگتا ہے شادی بھی جلدی کریں گی بس جو بھی تاریخ مانگیں' دے دیجیے گا۔"

عادل نے اندر سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی سر ہلایا کہ رابعہ کی بات بھی درست تھی اور اندر جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ عادل دروازے کی طرف اور رابعہ واپس ڈرائنگ روم میں چلی گئیں ابھی وہ بیٹھی ہی تھیں کہ عادل مسز آفندی کے ڈرائیور کے ساتھ اندر داخل ہوئے جس نے ایک لفافہ مسز آفندی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میڈم یہ کوئی آدمی آپ کے لیے دے کر گیا ہے۔ کہہ رہا تھا بہت ضروری ہے اس لیے گھر پر آپ کا انتظار کرنے کے بجائے یہیں دینے آگیا۔ سیکیورٹی کلیئرنس کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ آپ تک

یہ فوراً" پہنچادوں اس لیے ڈسٹرب کیا۔ معذرت چاہتا ہوں۔"

مسز آفندی نے لفافہ لے لیا اور ڈرائیور کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ مودبانہ انداز میں سرہلاتا پلٹ گیا جب کہ مہرنے کچھ حیران ' کچھ متجسس ہوتے ہوئے وہ لفافہ کھول لیا۔ لفافے میں سے کچھ تصویریں نکلیں جنہیں دیکھتے ہی ان کے چہرے پر موجود مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ساری تصویریں دیکھ لینے کے بعد انہوں نے وہ تصویریں مائرہ کی جانب بڑھائیں اور سرد لہجے میں کہا۔

"بیٹا تم بتاؤ گی کہ یہ کیا ہے؟"

مائرہ نے لرزتے ہاتھوں سے وہ تصویریں لے لیں۔ ایک تصویر میں وہ ایک لڑکے کے ساتھ بیٹھی کولڈ ڈرنک (اور دیکھنے والوں کے لیے شراب) پی رہی تھی۔ دوسری تصویر میں وہ لڑکا اسے کھڑکی سے باہر کچھ دکھا رہا تھا اور وہ چہرے پر مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ تیسری تصویر میں وہ لڑکا اسے پھول پیش کررہا تھا اور وہ جیسے اپنی خوشی چھپانے کے لیے دونوں ہاتھ منہ پر رکھے بے حال ہو رہی تھی۔ چوتھی تصویر میں وہ لڑکا اس کے بے انتہا قریب اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لیے اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھے ہوئے تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

دیکھنے والوں کے لیے یہ ایک مکمل رومانٹک لو اسٹوری کے سین تھے مگر حقیقت صرف مائرہ جانتی تھی۔ چوتھی تصویر یقیناً" اس کے بے ہوش ہونے کے بعد کی تھی۔ مائرہ یہ سب کچھ کروانے والے کے شیطانی دماغ کو داد دیے بغیر نہیں رہ پائی۔ تصویر بھیجنے والا بخوبی واقف تھا کہ وہ ڈرا دھمکا کے مائرہ کے چہرے کے تاثرات حاصل نہیں کرسکے گا جو اس ساری منصوبہ بندی کا اہم جزو تھے 'لہٰذا اس نے مائرہ کے سامنے رہائی کا پانسہ پھینکا جو یقیناً" سیدھا ہی پڑا تھا۔ رہی بات چوتھی تصویر کی تو اس کے لیے مائرہ کا ہوش میں نہ رہنا ہی بہتر تھا کیونکہ ہوش میں تو وہ کبھی راضی نہ ہوتی۔ یہ بھی شکر تھا کہ مزید اس سے بری کوئی تصویر نہیں تھی مگران ہی تصویروں نے قیامت ڈھادی تھی تصویریں اب کمرے میں موجود ہر شخص کے ہاتھوں میں باری باری گھوم رہی تھیں۔ زبیدہ کے علاوہ ہر کوئی شاک میں تھا۔ انہوں نے وہ تصویریں فرید پر ایک طنزیہ نظر ڈالتے ہوئے انہیں پکڑا دی تھیں اور پھر با آواز بلند بولی تھیں۔

"ارے مائرہ بیٹا' اگر تمہیں اس اسکول ٹیچر سے شادی کرنی تھی تو ہمیں بتادیا ہوتا' بھئی یہ سب ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

فرید اور رابعہ نے چونک کر زبیدہ کی شکل دیکھی تھی۔ ان کو اس رشتے کے بارے میں دونوں نے بتایا تھا مگر ساتھ یہ بھی تو بتایا تھا کہ مائرہ اس لڑکے کو نہیں جانتی پھر وہ اس رشتے کو محبت کا شاخسانہ کیوں قرار دے رہی تھیں۔ رابعہ نے وضاحت کرنا چاہی مگران کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ ادھر مسز مہر ایک بار پھر مائرہ سے تصویروں کی بابت سوال کررہی تھیں۔

"مسز مہر' یہ تصویریں اصلی نہیں ہیں۔ لگتا ہے کسی نے نقلی بنوائی ہیں۔ مجھے تو یہ کوئی سازش لگتی ہے۔" کمرے میں چھائی خاموشی کو بالآخر فرید کی آواز نے توڑا تھا۔

"اچھا' اگر یہ بات ہے تو یہ بھی ابھی پتا چل جائے گا فرید بھائی۔" مسز مہر نے فون اٹھا کر کوئی نمبر ملایا' کچھ ہدایات دیں پھر ڈرائیور کو اندر بلوا کر لفافہ اچھی طرح بند کرکے اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"یہ اس ایڈریس پر موجود ڈیجیٹل لیب میں لے جاؤ اور ہمیں رپورٹ لا کر دو ایک گھنٹے میں۔"

مائرہ نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں۔ تصویریں اصلی تھیں' وہ جانتی تھی سوائے اس لڑکے کے چہرے کے۔ تصویریں کیسے اتاری گئی تھیں' اس کے تاثرات کیسے حاصل کیے گئے تھے' وہ چیخ چیخ کر بھی دنیا کو بتاتی تو کوئی یقین نہ کرتا۔

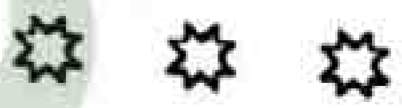
اس کا دل چاہا وہ مرجائے

مگر یہ اتنا آسان تو نہیں تھا۔ ڈرائیور ایک گھنٹے میں واپس آگیا تھا اور مسز مہر نے رپورٹ پڑھنے کے بعد

عادل کی طرف بڑھادی تھی۔
"تصویریں اصل اور حقیقی ہیں۔ صرف لڑکے کا چہرہ کمپیوٹر کی مدد سے تبدیل کیا گیا ہے۔"
عادل کو تو چکر آگئے۔ یہ سب کیسے ہوا تھا وہ نہیں جانتے تھے مگر یہ ہوا اسی دن تھا جب مائرہ اغوا ہوئی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ وہ خود اپنے منہ سے کیسے کہہ دیتے کہ ان کی بیٹی کو اغوا کیا گیا تھا۔ یہ تو اور بھی ذلت آمیز بات تھی۔ آخر کار انہوں نے مسز مہر کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
"بہن جی، آپ یہاں آئیں ہماری خوش قسمتی مگر شاید یہ خوشی ہمارے نصیب میں نہیں، ہم معافی چاہتے ہیں۔ ان تصویروں کے بارے میں ہم کوئی وضاحت نہیں دے سکتے۔ اللہ ہم پر رحم فرمائے۔" یہ کہتے ہوئے عادل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے جب کہ مسز مہر بھونچکا ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگی تھیں وہ تو یہ سمجھ رہی تھیں کہ عادل وضاحتیں پیش کریں گے مگر وہ تو ہاتھ جوڑے ان کو جانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ فرید کی بات ان کے دل کو لگنے لگی کہ یہ کوئی سازش ہے۔ آخر تصویر پہنچانے والے کو کیسے پتا کہ وہ یہاں موجود ہیں؟ ان کا نام، ان کے آنے کا وقت، یہ سب وہ کیسے جانتا تھا؟ ان سارے سوالات کا فوری طور پر تو جواب نہیں مل سکتا تھا سو فی الحال انہوں نے واپس لوٹ جانے میں بہتری جانی اور پرس اٹھا کر باہر نکل گئیں۔



فرید بغور زبیدہ کا چہرہ دیکھ رہے تھے جو اس وقت بیڈ روم میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کسی کریم سے چہرے کا مساج کرتی، کچھ گنگنا رہی تھیں اور بے حد خوش نظر آتی تھیں۔
"یہ آج تم اتنی خوش کیوں ہو؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟" فرید زبیدہ سے نہ جانے کیا جاننا چاہ رہے تھے۔
"ہاں میں بہت خوش ہوں۔ کچھ رکے ہوئے کام تھے۔ آج مکمل ہوگئے ہیں اور نتیجہ توقع سے بڑھ کر ہے۔ سو آئی ایم ہیپی۔" فرید، زبیدہ کا جواب سن کر کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر بولے۔
"زبیدہ! یہ سب کچھ جو آج ہوا اس میں تمہارا تو ہاتھ نہیں ہے نا؟" زبیدہ کے متحرک ہاتھ رک گئے۔ ایک لمحے کو ان کا دل چاہا کہ صاف صاف کہہ دیں کہ ہاں میں نے ہی کروایا ہے سب مگر پھر رک گئیں۔ اگر فرید ان کو اس بات پر جان سے ہی مار دیتے تو وہ کیا کر لیتیں، جسمانی طور پر تو وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ انہیں فرید پر ہنسی بھی آئی بھلا چور کیا منہ سے اقرار کرے گا کہ ہاں میں نے چوری کی ہے۔ آؤ مجھے سزا دو۔
"فرید، آپ مجھے اتنا گھٹیا سمجھتے ہیں؟" زبیدہ آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔
"مانا کہ مجھے رابعہ اور اس کی فیملی پسند نہیں ہے مگر میری اپنی بھی دو بیٹیاں ہیں میں اتنی شقی القلب نہیں ہو سکتی۔ اگر میں نے ایسا کچھ کیا ہو تو پھر اللہ انصاف کرے۔ میں نے تو ہمیشہ آپ کا بھلا ہی چاہا ہے مگر میں شاید آج تک اپنی کم صورتی کے باعث آپ کا دل نہیں جیت پائی۔" زبیدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور فرید کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ زبیدہ کو معافیاں مانگتے ہوئے منانے لگے اور زبیدہ ٹشو سے آنکھیں خشک کرتی، خود کو داد دینے لگیں۔



رابعہ کے گھر صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ اتنی ذلت، ایسی رسوائی کا تو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ فواد کینیڈا جا چکا تھا ورنہ وہ بھی لازمی اس موقع پر موجود ہوتا اور کچھ بعید نہ تھا کہ یہ منظر دیکھ کر ماہ نور کو طلاق ہی دے دیتا۔ اس وقت بھی رابعہ رو رہی تھیں اور ماہ نور انہیں تسلیاں دے رہی تھی۔ عادل ایک کرسی پر خاموش بیٹھے تھے جبکہ مائرہ کسی سوچ میں گم تھی۔ رابعہ روتے ہوئے بولیں۔
"میری تو سمجھ میں نہیں آرہا یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ہمارا کون دشمن بن گیا ہے؟ کس کو فائدہ ہے

اس سب سے۔"

"ممانی کو۔" مائرہ بولی۔ "ممانی کو فائدہ ہے امی۔"

"تیرا تو دماغ خراب ہے، تو تو ہمیشہ ہی ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہے۔ ارے وہ کیوں کرے گی ایسا۔ اسے کس چیز کی کمی ہے۔"

"کمی ہے امی، خوب صورتی کی کمی ہے۔ ان کی بیٹیاں بھی ان کے جیسی ہیں ان کے رشتے نہیں آ رہے اور یہاں اتنا اچھا رشتہ آگیا، وہ یہ برداشت نہ کر سکیں۔ انہوں نے ہی یہ سب کیا ہے تاکہ میرا رشتہ نہ ہو سکے اور ماہ نور کے ساتھ بھی وہی کوئی کھیل، کھیل رہی ہیں۔" مائرہ کا ذہن بالکل درست خطوط پر کام کر رہا تھا مگر رابعہ ماننے کو تیار نہ تھیں۔

"زبیدہ ایسا نہیں کر سکتی۔ اس کو تو رشتے کا پتا بھی نہیں تھا۔ فرید نے خود بتایا تھا مجھے کہ وہ عین وقت پر زبیدہ کو بتائے گا تو وہ یہ سب کیسے کروا سکتی ہے اور تمہارے ساتھ جو ہوا، وہ تو پیر کو ہوا جب کہ زبیدہ کو تو اگلے اتوار کو رشتے کا پتا چلا۔ ماہ نور کو اس نے اتنا کچھ دیا شادی میں، حسد کرتی تو کیا اتنا پیسہ لٹاتی؟ اور اس کی بیٹیوں کے لیے تو رشتوں کی لائن لگی ہوئی ہے۔" رابعہ کو تو بھاوج دیوی لگتی تھی کوئی۔

"میں نہیں مانتی امی! کہ ان کو پتا نہیں تھا۔ خواتین پہلے خواتین سے ان معاملوں میں بات کرتی ہیں، ایسا کیسے ہو گیا کہ مسز مہر نے براہ راست ماموں سے بات کر لی؟ اور ماہ نور کو جو کچھ انہوں نے دیا وہ ان کا شو آف تھا، وہ بھی اپنی بیٹیوں کے رشتوں کے لیے جن کی بقول آپ کے لائن لگی ہوئی ہے اگر ایسی لائن لگی ہوئی ہے تو ابھی تک شادی ہوئی کیوں نہیں امی۔" مائرہ کے پاس ٹھوس دلائل تھے رابعہ سے جواب بن نہ پڑا۔

"بیٹا! اب اس بحث کو رہنے دیں۔ بس جو ہونا تھا ہو گیا۔ اگر یہ تصویروں والی بات پھیلی تو ہم یہ شہر چھوڑ دیں گے۔ آپ بے فکر رہیں۔ دنیا ایک رشتے پر ختم نہیں ہو گئی ہے اور آپ اپنی ممانی کے بارے میں کچھ نہ کہیں، کسی پر بہتان نہیں لگا سکتے ہم، یہ بھی گناہ عظیم ہے بیٹا۔" عادل نے ثالث کا کردار ادا کرتے ہوئے بحث سمیٹ دی۔ رابعہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آنے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

سیل فون کی گھنٹی تواتر سے بج رہی تھی۔ مہر نے فون اٹھا کر اسکرین پر نظر ڈالی۔ زبیدہ کالنگ، مہر نے کچھ اچنبھے سے فون کا سبز بٹن دبایا۔ زبیدہ انہیں کیوں کال کر رہی تھیں۔ اب تو رشتے کی بات ختم ہو چکی تھی۔

"ہیلو مسز آفندی! کیسی ہیں آپ؟ زبیدہ بات کر رہی ہوں۔ آپ تو اس دن کے بعد سے پلٹ کر ہی نہیں آئیں۔ کوئی ناراضی ہے ہم سے۔" زبیدہ، مہر سے پکی سہیلیوں کی طرح بات کر رہی تھیں۔

"ارے نہیں زبیدہ، اصل میں، ہم شہریار کی طبیعت کی وجہ سے زیادہ آتے جاتے نہیں ہیں، کوئی بے انتہا ضروری کام ہو تو ہی نکلتے ہیں۔ آپ فرمائیے، کیسے یاد کیا؟"

"اصل میں مہر میں یہ بات تو آپ سے اس دن ہی کہنا چاہ رہی تھی جب آپ میرے گھر آئی تھیں مگر آپ مائرہ سے رشتہ کرنا چاہ رہی تھیں تو مجھے کسی کا رشتہ خراب کرنا اچھا نہیں لگا مگر اب میں سمجھتی ہوں کہ آپ سے یہ بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" زبیدہ بہت سنبھل سنبھل کر بول رہی تھیں۔

"دیکھیے ان کم حیثیت لوگوں میں رشتہ لے جا کر تو آپ نے دیکھ لیا اب کیوں نہ آپ اپنے ہی سرکل میں کوئی لڑکی دیکھ لیں۔"

"ہاں زبیدہ میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ آج کل مگر کوئی لڑکی ہو بھی تو نا۔ شایان کے معیار کے مطابق

مسز مہر کچھ کچھ سمجھ تو رہی تھیں اسی لیے شایان کے معیار یعنی مائرہ جتنی خوب صورت لڑکی کی پیش بندی کر دی تھی جو ناکام رہی۔ زبیدہ بڑے جوش سے بولیں۔

"ارے مسز آفندی، معیار کیا بس خوب صورتی ہوتا ہے؟ دینداری، حسب نسب، دولت مندی کے

بعد کہیں خوب صورتی کا نمبر آتا ہے۔ حدیث مبارک تو پڑھی ہی ہو گی نا آپ نے جس میں عورت کو منتخب کرنے کی چار وجوہات بیان فرمائی گئی ہیں۔ بھئی آپ ہی بتائیں کیا میرے گھرانے میں تینوں باتیں موجود نہیں ہیں؟ میرے گھر پر ہونے والی محافل کے بارے میں تو آپ جانتی ہی ہوں گی، مجھے بھی دیکھا ہے آپ نے کہ میں کس طرح کا لباس پہنتی ہوں ہاں میری بیٹیاں تھوڑا فیشن کے مطابق کپڑے پہنتی ہیں مگر ابھی بچیاں ہیں میچور ہوں گی تو ان میں تبدیلی آہی جائے گی۔ آخر تربیت تو میں ہی کر رہی ہوں اور جہاں تک خوب صورتی کا سوال ہے تو آپ مجھے اور فرید کو دیکھیں وہ کتنے وجیہہ اور میں معمولی شکل و صورت کی مگر لوگ ہماری میرڈ لائف کی مثالیں دیتے ہیں۔" زبیدہ بولتی ہی چلی گئیں دراصل انہیں لگ رہا تھا کہ مسز شہریار کچھ کچھ قائل ہو گئی ہیں۔ وہ خود بھی دیندار ہی تھیں مگر ان کا دین عمل کرنے کا نام تھا۔ زبیدہ کی طرح محض دکھاوے کا اور حسب ضرورت آیات اور احادیث کو استعمال کر کے (نعوذ باللہ) اپنا مطلب نکالنے کا نہیں تھا۔ فی الحال تو وہ زبیدہ کی باتوں سے قائل ہو چلی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ اپنے بیٹے پر مرضی مسلط نہیں کر سکتی تھیں لہٰذا انہوں نے زبیدہ سے کہا۔

"آپ درست کہہ رہی ہیں زبیدہ بیگم! ہم بیٹے سے پوچھ کر ہی کوئی جواب دے سکیں گے۔ زندگی انہوں نے گزارنی ہے ہم نے نہیں۔ اللہ نے چاہا تو ہم آپ کو مثبت جواب دیں گے۔"

زبیدہ کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ کچھ اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہوں نے شاداں و فرحاں فون بند کر دیا۔

مسز مہر نے اسی شام شایان آفندی کو بلا کر اس سے زبیدہ کے دیے گئے ارم کے رشتے کے بارے میں پوچھا تھا۔ شایان، ارم کی شکل پر اعتراض نہ کرے اس کے لیے انہوں نے بھی زبیدہ کی سنائی گئی حدیث کا مفہوم شایان کو سنایا تھا۔ شایان بہت تحمل سے ماں کی بات سنتا رہا، صرف دینداری کے لفظ پر وہ مسکرایا تھا۔ مہر نے اس کی مسکراہٹ کو نوٹ کیا مگر کچھ کہا نہیں بلکہ اپنی بات مکمل کرتی رہیں۔ جب وہ چپ ہوئیں تو شایان نے بہت نرمی سے کہا۔

"امی آپ بہت بھولی ہیں۔ آپ ایک لمبے عرصے سے پاپا کی بیماری کے باعث باہر نہیں نکلی ہیں ورنہ آپ کو بہت کچھ پتا چل جاتا۔ بہرحال میں کسی کی عیب جوئی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ جو خصوصیات آپ بتا رہی ہیں ان میں سے دینداری تو ارم اور ماریہ میں نام کو بھی نہیں ہے اور آج کل وہ جو حرکتیں کرتی پھر رہی ہیں ان سے ان کا خاندانی حسب نسب بھی پتا چل رہا ہے۔ آپ پلیز ان کو منع کر دیں۔"

"ارے بیٹا ہم ایسے کیسے ان کو منع کر دیں۔ ہم سے کھل کر بات کرو شایان۔" مہر کی آواز میں تحکم تھا۔ شایان نے زچ ہو کر ان کی شکل دیکھی۔

"میں آپ کو بس اتنا بتا دوں کہ ارم ڈرگ ایڈکٹ ہے، آج کل ہر اس کلب میں موجود ہوتی ہے جہاں ڈرگز اور ڈرنکس بہ آسانی مل جاتی ہیں اور ماریہ بدنام زمانہ لڑکے فیروز سبزواری کے ساتھ دن رات دیکھی جا رہی ہے اور وہ دونوں آج کل مزید کیا کر رہی ہیں یہ ایک بیٹا تو ماں کو نہیں بتا سکتا۔ امی پلیز اسٹے آؤٹ آف دس (اس معاملے سے دور رہیں) اور زبیدہ آنٹی کو منع کر دیں۔ آج کل ویسے ارم منظر عام سے غائب بھی ہے، ویسے ممکن ہے زبیدہ آنٹی کو سب پتا ہو، اسے کسی مرکز بحالی صحت میں داخل کروایا ہوا ہو اور اسی لیے وہ شادی کروانا چاہ رہی ہوں۔ آپ منع کر دیں بس۔"

"منع تو ہم کر دیں گے مگر یہ بتاؤ تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا؟" مہر کے کڑی نظروں سے گھورنے اور سخت لہجے میں کیے گئے سوال پر شایان بے اختیار ہنس پڑا۔

"اوہ کم آن امی، آپ کو لگتا ہے کہ میں جاتا ہوں ان جگہوں پر؟ مجھے اس سے زیادہ واہیات کام نہیں ملا کرنے کو؟ امی میرے ہر طرح کے دوست ہیں اور ایسی باتیں چھپتی نہیں ہیں، ویسے میں اگر کبھی گیا تو آپ سے پوچھ کر جاؤں گا۔"

"ٹانگیں نہیں توڑ دیں گے ہم تمہاری۔" مہر واقعی توڑ بھی دیتیں۔ شایان ان کے گال چوم کر ہنستا ہوا باہر

چلا گیا اور مہر کسی سوچ میں ڈوب گئیں۔ انہوں نے شایان کو مائرہ کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا' بلاوجہ کسی لڑکی کے بارے میں باتیں بنیں' یہ انہیں گوارا نہ تھا اور ان کا دل نہ جانے کیوں ان تصویروں کو اصل نہیں مان رہا تھا۔ مگر زبیدہ کو یہ سب بتانا بہت ضروری تھا تاکہ اگر وہ اس سب سے ناواقف ہیں تو اپنی بیٹیوں پر نظر رکھیں اور اگر انہوں نے جانتے بوجھتے بھی یہ رشتہ دیا ہے تو وہ شرمندہ ہو جائیں۔ یہی سوچ کر مہر نے کچھ دن بعد زبیدہ کو فون ملایا تھا اور ساری بات بتائی۔ حسب توقع زبیدہ چراغ پا ہو گئی تھیں۔

"میری بیٹیاں ایسی حرکت کر ہی نہیں سکتی ہیں مہر' آپ کو رشتہ نہیں کرنا' نہ کریں مگر میری بیٹیوں پر الزام تراشی سے پہلے سوچ تو لیا ہوتا کہ وہ کس کی بیٹیاں ہیں۔"

"مسز فرید! میں الزام اور بہتان تراشی کرنے والوں میں سے ہوتی تو یہ خبر آپ کو میں نہیں' ہمارے سرکل کی وہ خواتین سناتیں' جن کا کام ہی چٹخارے لے لے کر دوسروں کے عیب اچھالنا ہے۔ میں نے اپنے ذرائع سے بھی تصدیق کروائی ہے اور پھر آپ سے بات کی ہے اور بات کرنے کا مقصد آپ کو ذلیل کرنا نہیں بلکہ خبردار کرنا ہے۔ میں بھی بیٹیوں والی ہوں' کسی کی بیٹی کی عزت اچھالوں گی تو کل خود بھی یہی سب بھگتوں گی۔ امید ہے آپ سمجھ گئی ہوں گی۔"

مہر کے دو ٹوک لہجے پر زبیدہ سُن رہ گئیں۔ ان کا آخری جملہ تو ان کو تازیانہ بن کر لگا تھا۔ تو کیا جو انہوں نے کیا تھا اس کا نتیجہ وہ بھگتنے والی ہیں؟ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا میں نے کیا برا کیا۔ میں نے تو بس تصویریں بنوائیں اس کی عزت پر تو ہاتھ نہیں ڈلوایا۔ نہیں میری بیٹیوں کو کچھ نہیں ہو گا۔" زبیدہ خود کو تاویلیں دیتی' کچھ حواس باختہ سی ارم کے کمرے کی طرف بھاگی تھیں۔



رابعہ' عادل' ماہ نور اور مائرہ "ٹک ٹک دیدم' دم نہ کشیدم" کی تفسیر بنے فرید کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ رابعہ' فرید کے بہت دنوں سے رابطہ نہ کرنے پر گھبرا کر ان کی خیریت معلوم کرنے چلی آئی تھیں۔ ماہ نور اور مائرہ گھر پر رکنا چاہ رہی تھیں مگر رابعہ بہت وہمی ہو چکی تھیں سو انہیں اکیلے چھوڑنے پر راضی نہ ہوئیں۔ سو اب یہ پوری فیملی فرید اور زبیدہ کو حیران پریشان ہو کر دیکھ رہی تھی۔ فرید آنکھوں کی نمی پینے کی کوشش کر رہے تھے اور زبیدہ جیسے سکتے میں تھیں۔ کمرے میں پھیلے سناٹے کو عادل نے توڑا۔

"اتنا کچھ ہو گیا فرید اور تم نے ہمیں بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔"

یہاں آ کر ان کو پتا چلا تھا کہ ارم گزشتہ ایک ہفتے سے گھر سے غائب ہے۔ جس دن زبیدہ اس کے کمرے میں گئی تھیں ارم مدہوش اپنے بیڈ پر پڑی تھی اس کے کمرے میں جابجا ڈرگز والی سگریٹ پڑی تھیں۔ روم فریج میں شراب کی بوتل نے زبیدہ کے حواس مختل کر دیے تھے۔ وہ اپنی سازشوں میں اتنی مصروف تھیں کہ انہیں اپنے گھر میں نقب لگنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ پہلے تو وہ ملازموں پر خوب چلائیں کہ کسی نے ان کو کچھ بتایا کیوں نہیں' پھر فوری طور پر انہوں نے گھر پر ہی ڈاکٹر کو بلوا کر ارم کا علاج شروع کروایا تھا۔ ارم کی حالت دگرگوں تھی۔ اس کو نشے کی بری طرح لت پڑ چکی تھی۔ وہ چیختی چلاتی نشہ مانگتی تھی مگر اس پر سخت پہرہ لگا ہوا تھا مگر ایک رات وہ یہ پہرہ توڑ کر نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی اور اب تک لاپتہ تھی۔ فرید ہر جگہ' یہاں تک کہ اسپتال اور مردہ خانے میں پتا کر چکے تھے مگر نتیجہ لاحاصل تھا۔ پولیس بھی کوئی سراغ لگانے میں ناکام تھی۔

ارم پوری پلاننگ کے ساتھ گئی تھی۔ اس کی گاڑی اور سیل فون بھی غائب تھا۔ اس کے تمام دوست بھی لاعلم تھے کہ وہ آخر گئی کہاں؟ رابعہ یہ سب کچھ سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

"ابھی تو ایک غم تازہ تھا کہ دوسرا زخم بھی لگ گیا۔ نہ جانے کون ہمارا دشمن بن گیا ہے؟ فرید ہم نے کس

کے ساتھ کب برا کیا ہے؟"

"میں، میں بن گئی تھی آپ کی دشمن۔" زبیدہ کا جملہ تھا کہ کوئی ایٹم بم جوان سب کے پرخچے اڑا گیا تھا۔

"کیا؟ کیا کہا تم نے؟ کیا کیا ہے تم نے ارم کے ساتھ؟" فرید نے انہیں جھنجھوڑ ہی ڈالا۔

"ارم کے ساتھ نہیں کیا ان دونوں کی بیٹی کے ساتھ کیا۔ میں نے مائرہ کو اغوا کروایا تھا اس کا رشتہ ختم کروانے کے لیے مگر میں یہ بھول گئی کہ دوسروں کے ساتھ برا کرنے والا خود بھی کبھی خوش نہیں رہ پاتا۔" اتنے دنوں سے بیٹی کی گمشدگی کا غم اور ضمیر کی چبھن سہتے سہتے زبیدہ آخر کار مزید برداشت نہ کر سکی تھیں وہ سب کچھ بتاتی چلی گئیں اور کمرے میں موجود نفوس حیرت، دکھ اور کراہت سے ان کا گھناؤنا چہرہ دیکھتے رہ گئے۔

"مگر ارم کے ساتھ میں نے کچھ نہیں کیا، پتا نہیں کہاں چلی گئی میری بچی؟" ان کا جملہ مکمل ہوتے ہی رابعہ اٹھ کھڑی ہوئیں ان کے ساتھ باقی لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے رابعہ! ایک لفظ کہے بغیر باہر نکلنے لگیں تو زبیدہ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایسے مت کرو رابعہ! مجھے برا بھلا کہو، مگر ایسے خاموش نہ رہو۔ میں تم سے جلن میں اندھی ہو گئی تھی۔ تمہاری خوب صورتی مجھے ہر جگہ کم تر بناتی تھی اس لیے میں نے تمہیں نیچا دکھانا چاہا۔ تم مجھے معاف کر دو پلیز۔"

"اللہ تم پر رحم کرے زبیدہ!" رابعہ باہر نکل گئی تھیں سب نے ان کی تقلید کی اور فرید، زبیدہ پر نفرت بھری نگاہ ڈالتے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

پندرہ دن بعد بالآخر ارم مل گئی تھی لیکن ساحل سمندر پر پڑی ایک پھولی ہوئی لاش کی صورت میں۔ وہیں پولیس کو اس کی گاڑی اور سیل فون بھی مل گیا تھا۔ بظاہر یہ لگتا تھا کہ ارم وہاں آئی اور پھر اس نے سمندر میں کود کر خود کشی کر لی مگر فرید یہ ماننے کو تیار نہیں تھے۔ ان کے دباؤ پر ارم کے سیل فون سے ڈیٹا حاصل کر کے پولیس ان دو لڑکوں تک جا پہنچی تھی جو منشیات فروش تھے اور پہلے بھی گرفتار کیے جا چکے تھے۔ ان لڑکوں نے اعتراف کیا کہ ارم ان سے ڈرگز خریدنے آتی تھی مگر پندرہ دن پہلے جب وہ آئی تو اس کے پاس زیادہ رقم نہیں تھی اور وہ ان کے ہی فلیٹ میں رک گئی تھی۔ جب رقم ختم ہو گئی تھی تو نشے کے حصول کے لیے ارم نے دوسری راہ اختیار کی تھی اور یہ سلسلہ شاید کچھ اور دن چلتا اگر زیادہ نشے کا استعمال ارم کو موت کے منہ میں نہ پہنچا دیتا، خود کو قتل کے الزام سے بچانے کے لیے انہوں نے اسے سمندر میں پھینک دیا تھا۔ مگر پکڑے گئے۔

ارم کے ہی سیل فون سے وہ نمبرز بھی مل گئے جن سے ماہ نور کو کالز اور پیغامات ملتے تھے۔ سو یہ معمہ بھی حل ہوا کہ ماہ نور کے تبدیل شدہ نمبرز بھی کیسے ان پیغامات اور کالز کرنے والوں تک پہنچ جاتے تھے۔ ظاہر ہے فرید کے سیل فون سے ماہ نور کا نمبر حاصل کرنا ارم کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اپنی تمام تر سازشوں، حسد اور جلن کے ساتھ ارم دو گز زمین کے ٹکڑے میں دفن ہو گئی اور اس بغض و عناد کو جنم دینے والی زبیدہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہیں کہ ارم کی لاش دیکھ کر انہیں پر فالج ہو گیا تھا، جو ان کے بولنے، ہلنے جلنے کی صلاحیت تو لے گیا تھا مگر سب کچھ دیکھنے، محسوس کرنے اور سننے کی صلاحیت چھوڑ گیا تھا۔

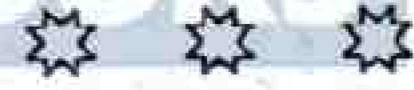
کچھ عرصے بعد ماریہ نے کورٹ میرج کر کے ان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی تھی اور زبیدہ جو پہلے تھوڑا بہت حرکت کرنے کی کوشش کر رہی تھیں وہ بھی چھوڑ کر بالکل بستر سے لگ گئی تھیں۔ ان کے منہ سے اکثر ایم ایم جیسا بے معنی لفظ سنائی دیتا ہے مگر یہ تو اللہ جانتا ہے کہ وہ رحم، رحم، رحم کی گردان کر رہی ہیں۔



ماہ نور، فواد کے ساتھ مستقل کینیڈا شفٹ ہو چکی ہے اور مائرہ مسز آفندی کی لاڈلی اور چہیتی بہو ہے جس نے ان کی بیٹیوں سے بڑھ کر خدمت کر کے ان کا دل

جیت لیا ہے۔ وہ اللہ کی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے نہ مائرہ کے گھر والوں کو برا بھلا کہا تھا نہ شایان کو کچھ بتایا تھا ورنہ آج وہ مائرہ جیسی بہو سے محروم ہوتیں۔ فرید کے حقیقت بتانے پر انہوں نے وقت ضائع کیے بغیر مائرہ کا رشتہ مانگ لیا تھا اور آج اپنے انتخاب پر بے حد مطمئن تھیں۔

رابعہ اور عادل دونوں بیٹیوں کو اپنے اپنے گھروں میں ہنستا بستا دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے ان کا مشکل وقت آسان کیا۔ فرید اکثر زبیدہ کے پاس جا کر انہیں ترحم اور افسوس سے دیکھتے رہتے ہیں اور پھر ان کے لیے آسانی کی دعا کر کے اٹھ جاتے ہیں۔ گھر پر بلا شرکت غیرے زوباریہ کی حکمرانی ہے اور اس حکمرانی میں خلل ڈالنے 'جب ماریہ آئے دن اپنے شوہر سے جھگڑ کر میکے آکر بیٹھتی ہے تو اس کے اور زوباریہ کے درمیان زبردست معرکے ہوتے ہیں۔ اس محل نما گھر میں دولت کے انبار ہیں مگر سکون اور خوشی مفقود ہے۔



جوگی کی ریاضت کو مزید سو سال گزر گئے۔ موسموں کے تغیر و ثبات اسے تو جیسے چھوئے بغیر گزرتے چلے گئے مگر معدوم ہوتی جنگلی حیات بالکل ہی غائب ہو گئی اور سبز پہاڑ کسی بانجھ عورت کی طرح سبزے سے خالی ہو گیا۔ لہلہاتے پھول' بہتے جھرنے' کوکتی کوئلیں' دوڑتے ہرن' رم جھم بارشیں' قوس قزح' سب جیسے قصہ پارینہ بن گئے۔ ہر طرف تڑختی چٹختی ریت سے اٹی بنجر زمین نظر آتی یا دو شاخہ زبان لپکاتے سانپ اور سیاہ زہریلے بچھو۔ زمین جیسے عروج سے زوال کی طرف گامزن تھی۔ جوگی کی تپسیا کو سو سال مکمل ہو گئے اور

ایک بار پھر فرشتہ جوگی کے سامنے نمودار ہوا' اماوس کی رات تھی' کالی گھور سیاہ' ایسی رات جس کے چھا جانے پر پناہ مانگی جاتی ہے' ایسی رات کہ جس میں ابرق کی طرح چمکتے ستارے بھی نظر نہ آتے تھے۔ ایسی رات جو فیصلے کی رات ہو جس کی صبح شاید پتھروں کی بارش لے کر آئے اور ہر پتھر نشان زدہ ہو۔ ایسی رات میں فرشتہ پھر نمودار ہوا۔ وہ بھی سیاہ رات کا ہی حصہ نظر آتا تھا اور اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ دل دہلاتی تھی۔ کہیں کہیں بجلی چمکتی تو نظر آتا کہ اس کے سیاہ پر دائیں بائیں تاحد نگاہ پھیلے ہوئے ہیں اور جو برق کوندرہی ہے وہ اسی کے پروں میں کڑک رہی ہے۔ اس کے پروں سے پیدا ہو کر نیچے زمین تک جا رہی ہے۔ فرشتہ جوگی کے سامنے معلق ہوا اور اپنے پر پھڑپھڑائے پھر جیسے ساکت ہو کر ہوا میں ٹھہر گیا۔

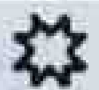
"بول کیا مانگتا ہے؟ یہ آخری موقع ہے۔ جو تو چاہے وہ مل جائے گا؟" بجلی کڑکی اور کہیں دور جا کر گری۔

جوگی نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھیں کالی گھور رات میں سرخ دہکتا انگارہ تھیں۔ سرخ آنکھیں فرشتے پر گاڑ کر وہ بولا۔

"میرا سوال وہی ہے۔ مجھے انصاف چاہیے' بس انصاف چاہیے۔" فرشتہ پروں کی تیز پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ بلند ہوا۔ کئی بجلیاں بیک وقت کڑکیں اور فرشتے کی گونج دار آواز سنائی دی۔

"بدبخت! اللہ سے انصاف نہیں رحم مانگا جاتا ہے۔ جب وہ انصاف کرے گا تو پھر تیرے عیب بھی تو وہ دیکھے گا اور تیری غلطیوں پر بھی انصاف کرے گا تو انصاف یہ ہے کہ تو نے تین سو سال اس پہاڑ پر سواری کی اب تین سو سال یہ تجھ پر سواری کرے گا۔"

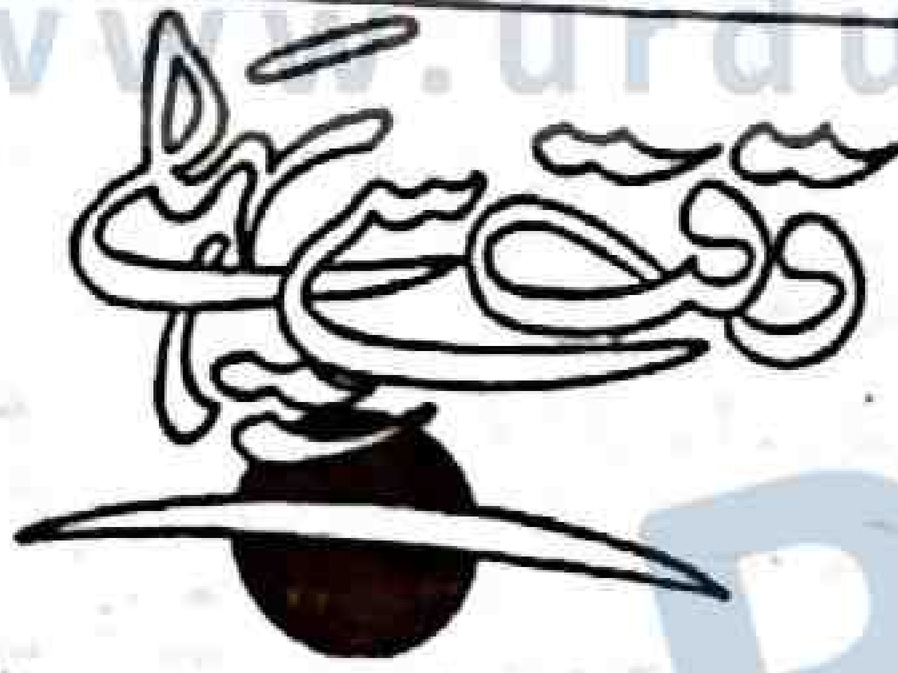
فرشتے نے اپنا پر پہاڑ پر مارا' پہاڑ پلٹا اور جوگی اس پہاڑ کے نیچے دھنس گیا۔ فرشتے نے اپنے پر پھڑپھڑائے اور بجلی کے کڑاکے کے ساتھ غائب ہو گیا۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل	انمول
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

شائلہ ولعباد



شاندار سے لنچ کے نشے میں سرشار ابھی وہ فیملی کیبن سے نکل ہی رہی تھی کہ واپس اندر گھسنا پڑا' مانی اس کے انداز پر گھبرا گیا۔

"میری جان کے ٹوٹے! کیا مجھ سے دور ہونے کا دل نہیں کرتا جو پھر سے آ گئی ہو۔"

"یہ مذاق کا وقت نہیں ہے مانی! مجھے لگتا ہے برہان بھائی باہر ہیں۔"

"کیا کہا تم نے؟" مانی نے پھر سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سرہلایا۔

"ایک تو تمہارے اس مولوی کزن کو چین نہیں' ویلا' نکھٹو' چغد۔" وہ جانے کیا کیا بول رہا تھا۔ عاشی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب ایک دفعہ پہلے وہ مانی کے ساتھ پکڑی گئی تو تب بھی انہوں نے تنبیہہ کی تھی کہ دوبارہ ایسا گھٹیا کام وہ نہیں کرے گی' مانی منگیتر ہے' شوہر نہیں جس کے ساتھ سارے شہر میں آوارہ گردی کی جائے۔ آج تو لگتا ہے ابو اور بھیا کو بتا ہی دیں گے۔

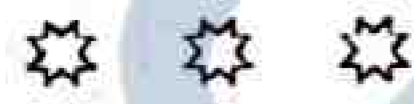
پندرہ منٹ قید رہ کر پھر سے اس نے باہر جھانکا کہ وہ ضرورت سے زیادہ لیٹ ہو چکی تھی۔

"یہ تو تم ہو جو اس جیسے داڑھی والے نمونے سے ڈرتی ہو' میں تو منٹ میں اس کا حلیہ برابر کر دوں' تم ہی نہیں کرنے دیتی ہو۔" مانی اپنے رنج کا اظہار کر رہا تھا۔

"پلیز مانی! تھوڑا حوصلے سے کام لیں' مجھے بدنام نہیں ہونا سارے خاندان میں' آپ تو بہت جذباتی

ہیں۔"

"ارے نہیں جان! میں تو بہت ٹھنڈے مزاج کا بندہ ہوں بس ایک تمہارے لیے جذباتی ہوں۔" عاشی کو خود پر فخر محسوس ہوا۔ ہمیشہ کی طرح پھرمانی کے دیکھنے کے بعد وہ لوگ باہر نکلے تھے ' ابھی وہ گاڑی میں بیٹھی نہیں تھی کہ برہان بھائی قریبی شاپ سے ہاتھ میں شاپر پکڑے نکلے تھے۔ وہ کس کے لیے ہوئے نقاب میں بھی مگر اسے پتا چل چکا تھا کہ برہان بھائی انہیں پہچان چکے ہیں۔



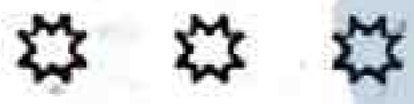
اشرف صاحب کی چار اولادیں تھیں۔ دو بیٹے ' دو بیٹیاں' بڑا بیٹا جاب کر رہا تھا جب کہ باقی تینوں پڑھ رہے تھے۔ عاشی بی 'اے فائنل میں تھی ' عمار ایف ایس سی پھر ثناء ابھی میٹرک میں تھی۔

عاشی کی شادی وہ بی 'اے کے فوراً" بعد کرنے کے متمنی تھے۔ اس لیے رشتے والی کو لگایا گیا مانی کے گھر والے رشتہ لے کر آئے تو رشتہ قبول کرلیا گیا ان کی مالی حالت مضبوط تھی۔ اشرف صاحب پر بھی اللہ کا کرم تھا مگر مانی لوگ ان سے تھوڑا آگے تھے۔ رشتہ پکا ہو گیا۔ شہناز بیگم پہلے دن ہی ان سے مرعوب ہو گئیں۔ رہی سہی کسر رشتہ کرانے والی نے نکال دی۔

"ارے بہن! آج کل اچھے رشتے ملتے کہاں ہیں۔ اب ذرا سنبھل کر چلنا' کوئی بات بری نہ لگ جائے ' ان کو رشتوں کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔"

شہناز بیگم خاندان کی دوسری بچیوں اور گلی محلے کی دوسری ماؤں کو رشتے کا انتظار کرتے دیکھتی رہتی تھیں سو سنبھل کر چلنے کے چکر میں فون پر بات کرنے کی اجازت دے دی ' ملنے ملانے کا راستہ عاشی اور مانی نے فون پر خود بنالیا تھا۔ اب تو خیر وہ لوگ شادی کی تاریخ طے کرنے آنے والے تھے ' مانی کے بے حد اصرار پر وہ شادی سے پہلے ایک بار پھر ملنے پر تیار ہو گئی تھی۔ ایک اچھی اور رومانٹک ملاقات (عاشی کی دانست میں) کے بعد برہان بھائی کا دیکھ لینا' سارا نشہ ہرن کر گیا تھا۔

اب اسے یہی فکر لھائے جارہی تھی اگر ابو یا بھیا کو بتا دیا تو وہ یقیناً" اسے اچھا نہیں سمجھیں گے اور اعتبار ٹوٹنے کے بعد وہ لوگ اس کی رخصتی پر بجائے غم زدہ ہونے کے اسے دفع کر کے خوش ہی ہوں گے۔ وہ گھر آکر بھی بولائی بولائی پھرتی رہی۔



"ابو جی! میں سارے معاملے کا بہت باریک بینی سے کھوج لگا کر آیا ہوں حتیٰ کہ پولیس اسٹیشن جاکر بھی کنفرم کیا ہے۔"

"مجھے تفصیل سے بتاؤ' تم باپ بیٹا کیا بات کر رہے ہو۔ میری تو جان نکلی جارہی ہے۔" شہناز بیگم نم آواز میں پوچھ رہی تھیں۔

"مجھے حامد نے بتایا تھا' حامد کو تو آپ جانتی ہیں نا؟"

"ہاں ہاں تمہارا دوست۔"

"جی امی! اس نے مانی کو ایک غلط عورت کے گھر جاتے ہوئے دیکھا تھا تو اس کے بہنوئی نے بتایا کہ وہ بندہ تو بڑی پہنچی ہوئی چیز ہے' شہر کے چوروں ڈکیتوں سے اس کے رابطے ہیں' خود بھی چھوٹی موٹی واردات کرتا رہتا ہے۔"

"ہائے میں مر گئی۔ اب کیا ہو گا۔ تم نے خود تصدیق کی یا سنی سنائی بات پر یقین کرلیا۔"

"نہیں میں خود اس کے بہنوئی سے ملا تھا۔ وہ عورت ان ہی کے محلے میں رہتی ہے اور مانی بھی کافی عرصے سے اس کے پاس جارہا ہے پھر حامد کی آپا نے بھی تصویر دیکھ کر مجھے بتایا کہ یہی لڑکا ہے۔ پھر حامد کا بہنوئی ہمیں قریبی تھانے بھی لے کر گیا تھا' وہاں سے سب باتوں کی تصدیق ہوئی پر پولیس کے پاس اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے' شک کی بنا پر ایک دوبار اریسٹ کر کے ضمانت پر چھوڑ دیا گیا تھا۔"

شہناز بیگم دہل گئی تھیں پھر سب کے مشترکہ فیصلے کے مطابق ان کو انگوٹھی و دیگر اشیاء واپس کر کے رشتہ توڑ دیا گیا۔ حقیقت جان کر عاشی نے بھی یہ ساری چیزیں خوشی خوشی لوٹا دیں مگر اس کی یہ خوشی نہایت

عارضی ثابت ہوئی۔



عاشی کی ٹھیک ٹھاک دھلائی کے بعد' اب شہناز بیگم اپنا سر پیٹ کر رو رہی تھیں۔

"بدذات' بے شرم' تجھے ذرا شرم نہ آئی ہوٹلوں میں جاتے فوٹو بنواتے۔ کمبخت کسی اور کا نہیں تو اپنا سوچ لیتی کہ کل کو طعنہ دے گا' تو میرے ساتھ ہوٹل بازی کرتی رہی ہے۔"

"امی! اس میں آپ کا بھی قصور ہے' آپ ان لوگوں کو میرا فون نمبر دیتیں نہ مجھے بات کرنے کی اجازت دیتیں تو آج یہ تو نہ ہوتا۔" عاشی بھی خاصی بدلحاظ تھی صاف صاف جتا دیا۔

موبائل بیپ پر ان کی مکالمہ بازی کو بریک لگی۔ ایک اور سیلفی ریسیو ہوئی تھی جو پہلی دو سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔

مانی اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اس کے چہرے کے ساتھ چہرہ لگائے بیٹھا تھا' منظر یہ بھی کسی ہوٹل کے فیملی کیبن ہی کا تھا۔ فوراً" ہی میسج بھی آیا تھا۔

"کس دن شادی کی ڈیٹ لینے آئیں پھر...؟ تا کا تو سوچنا بھی مت' ورنہ یہ ساری پکس گلیوں بازاروں کی زینت کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا کی بھی رونق بڑھا دیں گی۔"

معاملہ اتنا حساس تھا کہ گھر کے مردوں کے علم بھی فوراً" ہی لایا گیا' سارا خاندان اکٹھا تھا۔ سب کو مانی کی حقیقت بھی پتا چل چکی تھی۔ اب یہ نیا چکر بھی بتا دیا گیا مگر کچھ رد و بدل کے ساتھ کہ ان کے گھر عاشی کی کچھ تصویریں ہیں جن کا ماتی غلط استعمال کرنے کی دھمکی دے رہا ہے۔ ایسے حالات میں کوئی رشتہ کہاں سے ملے گا۔ سب کی رائے یہی تھی کہ پھر مانی کو ہی ہاں کر دی جائے۔ بدنامی سے بہتر ہے' عاشی کی قربانی دے دی جائے فقط عاشی کے امی' ابو تھے جو اس بات کی مخالفت کر رہے تھے۔ اس سب میں عاشی کو ماں کی بے بس ملامتی نظریں چین نہ لینے دیتی تھیں۔ وہ تو جیسے آنکھوں آنکھوں میں سنا رہی تھیں کہ دیکھو' سنو اور بھگتو کہ کم عقل لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے جو اپنے نسوانی پندار کی حفاظت نہ کر سکیں' وہ ایک خاندان کو کیسے سنبھال سکتی ہیں؟

وہ پچھتاووں کی بھٹی میں جل جل کر نکلتے ہوئے آنسو بے دردی سے رگڑے جا رہی تھی جب خالہ نے اپنا مہربان ہاتھ اس کے سر پر رکھا تھا۔

"میں عاشی کو اپنے برہان کے لیے مانگتی ہوں' بھائی صاحب انکار مت کرنا' آپ سب میرے برہان کو جانتے ہو' بچپن سے ہی نماز روزے کا پابند ہے اور اب تو سعودیہ جا رہا ہے' وہیں نوکری لگی ہے' ڈیڑھ لاکھ تنخواہ مقرر کی ہے کمپنی نے' میں یہ مٹھائی اسی لیے دینے آئی تھی۔"

انہوں نے نوکری سامنے کی تو عاشی نے بے اختیار نظریں اٹھا کر برہان کو دیکھا۔ اس نے سر اثبات میں ہلا کر دھیمی مہربان مسکراہٹ سے اسے تسلی دی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ دلہن بنی بیٹھی مسلسل برہان کو سوچے جا رہی تھی۔ ہاں یہ وہی برہان تھا جو مولوی تھا' جو اسے شروع سے ناپسند تھا' جو اپنی بہنوں کو زیادہ ان کے گھر بھی نہ آنے دیتا تھا' بنا چادر کے باہر نہ نکلنے دیتا تھا اور نامحرم سے بے جا بے تکلف نہ ہونے دیتا تھا۔ عاشی کو پرانے خیالات کا یہ بندہ زہر لگتا تھا اور مانی بہت ہی لبرل اور کھلے دل و دماغ کا مگر یہ کیا؟ حقیقت کتنی مختلف نکلی تھی افسانوں سے۔ اسی برہان نے اس کے سر پر سائبان کیا تھا ورنہ مانی تو سر کی چادر کے ساتھ ساتھ بدن کا لباس بھی تصویروں کی صورت کھینچنے لگا تھا۔

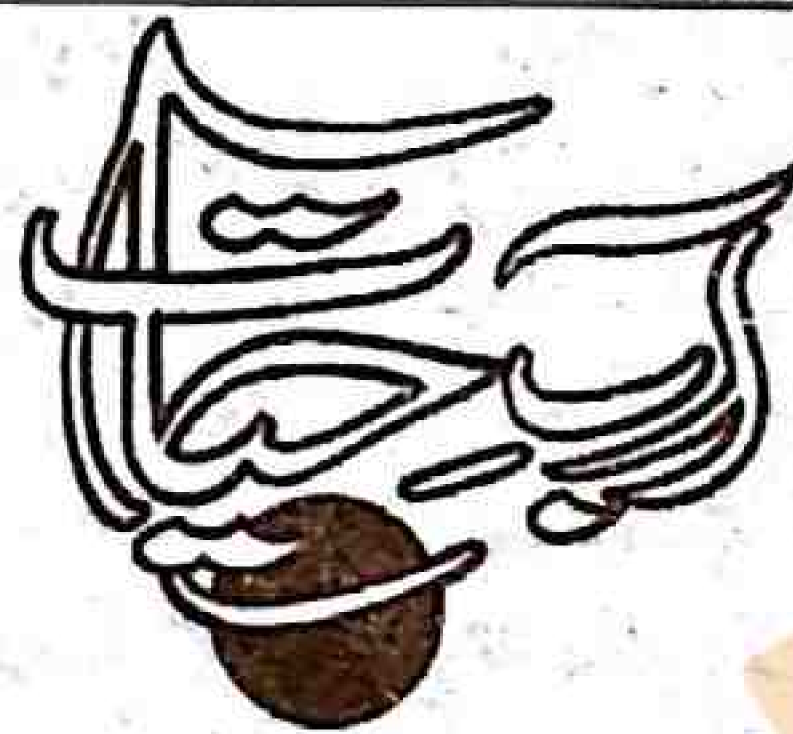
وہ مسلسل سوچے جا رہی تھی۔

"ہم لڑکیاں بھی کتنی نادان ہوتی ہیں' کچے خوابوں کو وقت سے پہلے پانے کے لیے کانچ کانچ راہوں پر چل کر اپنا آپ زخمی کر لیتی ہیں' زخموں کے داغ لیے ہوئے لڑکیوں کی جگہ کہاں ہے بھلا...؟

ہر جگہ برہان تو نہیں ہوتا نا' مانی تو ہزار ہیں۔

☆

عمیرہ احمد

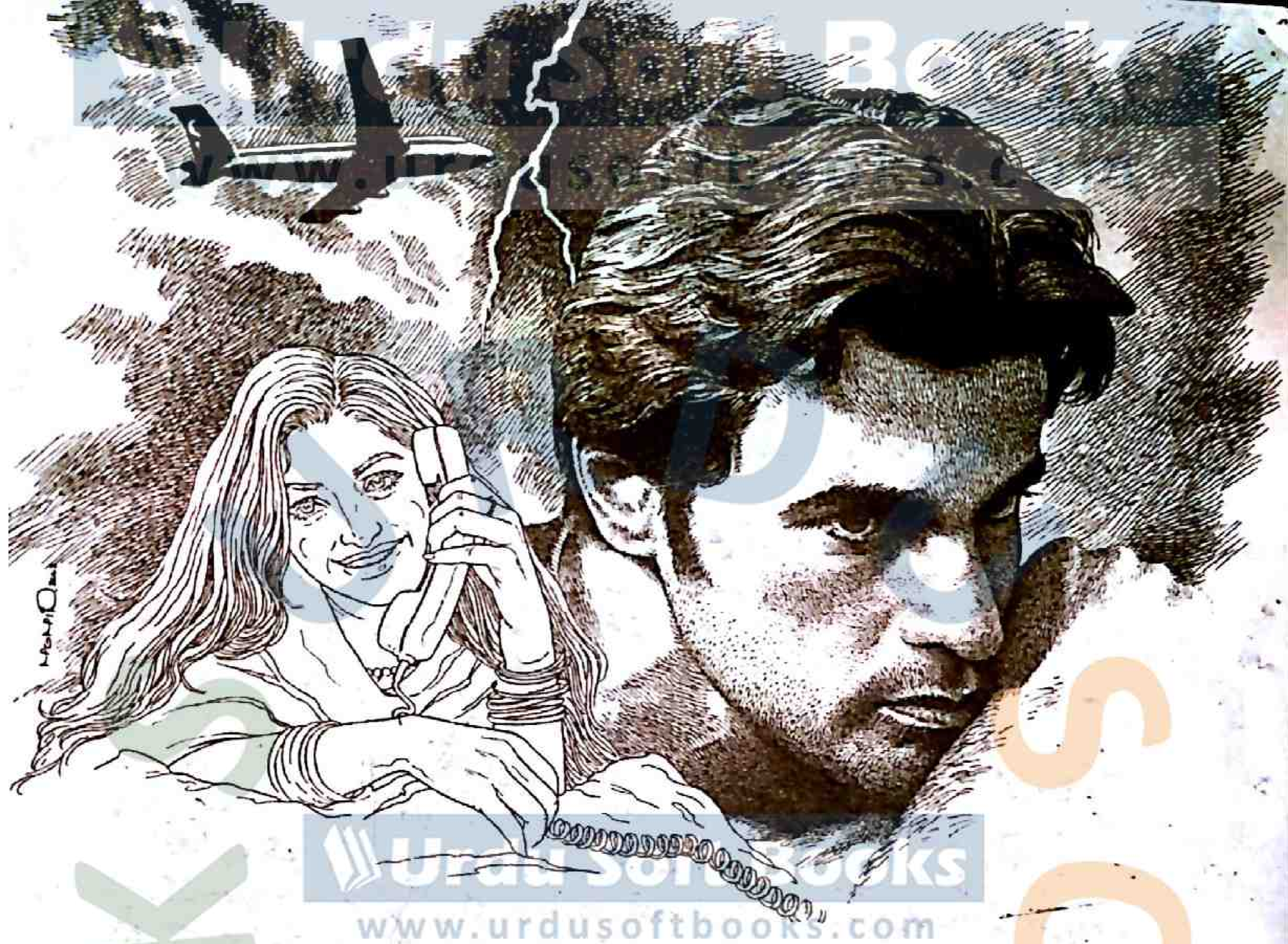


آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔

J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پارہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال



کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

انیسویں قسط

رئیسہ نے پوچھا جانے والا لفظ بے حد غور سے سنا تھا۔ وہ لفظ غیر مانوس نہیں تھا۔ وہ ان ہی الفاظ میں شامل تھا جس کی اس نے تیاری کی تھی۔ " Crustaceology "اس نے زیر لب اس لفظ کو دہرایا، پھر بنا آواز اس کے ہجے کیے اور پھر بالآخر اس نے اس لفظ کو ہجے کرنا شروع کیا تھا۔

" C-r-u-s-t-a-c-o-l-o-g-y " رئیسہ نے بے یقینی کے عالم میں اس گھنٹی کو سنا تھا جو لفظ غلط ہونے پر بجی تھی۔ اس کا رنگ فق ہوا، لیکن اس سے زیادہ فائنلسٹ میں شامل حمین سکندر کا، جسے اس کے بولنے کے دوران ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے کیا غلطی کی تھی۔ ہال میں امامہ اور سالار جبریل اور عنایہ کے ساتھ عجیب سی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ یہ غیر متوقع نہیں تھا، وہ اس کی توقع بہت پہلے سے کر رہے تھے۔

رئیسہ کا فائنل راؤنڈ تک پہنچنا بھی ان کے لیے ناقابل یقین ہی تھا۔ اس نے اپنی صلاحیتوں سے بڑھ کر پرفارمنس دکھائی تھی۔۔۔ لیکن کسی بھی مرحلے پر اس کے باہر ہونے کا خدشہ دل میں لے کر بیٹھے رہنے کے باوجود اب جب ان کے خدشات حقیقت کا روپ دھار رہے تھے تو انہیں تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ ابھی مقابلے سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ واپس آسکتی تھی، مگر وہ پہلا مکا تھا جو رئیسہ نے سیدھا منہ پر کھایا تھا اور اب اس کے اثرات سے باہر نکلنے کے لیے اسے کچھ وقت چاہیے تھا۔

حمین اس سے کچھ کرسیوں کے فاصلے پر تھا۔ ان دونوں کے درمیان کچھ اور فائنلسٹس تھے، لیکن اس کے باوجود اس نے اٹھ کر رئیسہ کی کرسی پر آکر اس کا کندھا تھپکا تھا۔ اسے چیئر اپ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"مجھے اسپیلنگ آتی تھی۔" رئیسہ نے بے حد مدھم اور بے حد کمزور آواز میں جیسے حمین پر واضح کیا تھا اور ایک جملے سے زیادہ وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے پتا تھا۔ کسی وضاحت کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ جب واپس آکر بیٹھی، تو اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ دوسرے فائنلسٹس کے ساتھ بیٹھے اپنے ماں باپ اور بہن بھائی کو نظر اٹھا کر دیکھ سکتی۔ یہ احساس رکھنے کے باوجود کہ وہ بیک وقت اسے ہی دیکھ رہے ہوں گے۔

"یہ ایک کھیل ہے رئیسہ اور اسے کھیل کی اسپرٹ کی طرح لینا ہے۔" مقابلے سے ایک دن پہلے سالار نے اسے سمجھایا تھا۔

وہ جیسے ذہنی طور پر اسے "گرنے" کے لیے نہیں گر کر اٹھنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ رئیسہ نے ہمیشہ کی طرح بے حد توجہ سے باپ کی بات سنی تھی۔ لیکن جو بھی تھا وہ، آٹھ سال کی بچی تھی، جس کے تین بہن بھائی وہ ٹرافی جیت چکے تھے۔ جیسے جیتنے کے لیے وہ اب کو دی تھی۔ اسے توقع تھی وہ بھی "جیت" جائے گی۔

آٹھ سال کی عمر میں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہار اور جیت ہوتی کیوں ہے۔۔۔ وہ جبریل، عنایہ اور حمین نہیں تھی کہ غیر معمولی ذہانت رکھتی اور غیر معمولی انداز میں صورت حال کا تجزیہ کر لیتی، وہ عام بچوں کی طرح تھی اور اسے لگتا تھا اگر دوسرے آسمان سے تارے توڑ کر لاسکتے ہیں، تو وہ بھی لاسکتی ہے۔ اسے "اپنا" اور "دوسروں" کا فرق سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

حمین سکندر اب اسٹیج پر اپنے پہلے لفظ کے لیے کھڑا تھا اور اس کا استقبال تالیوں کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اگر پچھلے سال کا ڈارلنگ آف دا کراؤڈ تھا تو اس سال بھی وہ ہاٹ فیورٹ کے طور پر مقابلے میں کھڑا تھا۔ پچھلے سارے راؤنڈز میں اس نے مشکل ترین الفاظ کو حلوے کی طرح بوجھا تھا اور اس سے ایسی ہی توقع اس راؤنڈ میں بھی کی جارہی تھی۔ وہ پچھلے سال کا چیمپئن تھا۔ اپنے ٹائٹل کا دفاع کر رہا تھا اور فائنلسٹس کی نظروں میں اس کے لیے احترام نہیں مرعوبیت تھی۔

" vignette "اس کا لفظ بولا جا رہا تھا۔ وہ حمین سکندر کے لیے ایک اور "حلوہ" تھا۔ وہ اس سے زیادہ مشکل اور لمبے الفاظ کے ہجے کر چکا تھا۔ رئیسہ نے بھی زیر لب کئی دوسرے فائنلسٹس کی طرح وہ لفظ ہجوں کی طرح درست طور پر ادا کیا۔

" v-i-g-n-r-t-t-e " رئیسہ نے اسٹیج پر کھڑے حمین کو رکتے دیکھا۔ اس کا خیال تھا وہ آخری حرف سے پہلے سوچنے کے لیے رکا تھا اور یہ صرف اسی کا نہیں پینل کا بھی خیال تھا، جو فائنلسٹس کے لیے الفاظ بول رہے تھے۔ سب جیسے اسے سوچنے کے لیے ٹائم دے رہے تھے۔ حمین نے ایک لمحہ رکنے کے بعد اس لفظ کو ان اسپیلنگ کے ساتھ اسی طرح ادا کیا۔ بیل بجی۔۔۔ ہال میں پہلے سکتہ ہوا، پھر سرگوشیاں ابھریں۔ پھر پروناؤنسر نے صحیح اسپیلنگ ادا کیے۔ حمین نے سر جھکا کر جیسے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اپنی کرسی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

وہ اس مقابلے کا پہلا اپ سیٹ تھا۔ پچھلے سال کا چیمپئن اپنے پہلے ہی لفظ کے ہجے کرنے میں ناکام رہا تھا۔

ہال میں بیٹھے سالار، امامہ، جبریل اور عنایہ بیک وقت اطمینان اور پریشانی کی ایک عجیب کیفیت سے گزرے تھے۔ وہ ایک ہی راؤنڈ میں رئیسہ کی ناکامی دیکھ کر حمین کی کامیابی پر تالیاں نہیں بجانا چاہتے تھے اور انہیں یہ بجانی بھی نہیں پڑی تھیں، لیکن حمین سے لفظ نہ بوجھنا غیر متوقع تھا۔ غیر متوقع سے زیادہ یہ صورت حال ان کے لیے غیر یقینی تھی، لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا۔ اس دن انہیں وہاں بیٹھے مقابلے کے آخر تک اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

رئیسہ اگلے دو لفظ بھی نہیں بوجھ سکی تھی اور حمین سکندر بھی۔۔۔ وہ دونوں فائنل مقابلے کے ابتدائی مرحلے میں ہی مقابلے سے آؤٹ ہو گئے تھے۔

رئیسہ کی یہ پرفارمنس غیر متوقع نہیں تھی، لیکن حمین سکندر کی ایسی پرفارمنس اس رات ایک بریکنگ نیوز تھی۔۔۔ پچھلے سال کا چیمپئن مقابلے سے آؤٹ ہو گیا تھا اور حمین سکندر کے چہرے کا اطمینان ویسے کا ویسا تھا یوں جیسے اسے فرق ہی نہیں پڑا ہو۔ رئیسہ کے پیچھے پیچھے وہ بھی، مقابلے سے باہر ہونے کے بعد اپنے ماں باپ کے پاس آ کر بیٹھ گئے تھے۔

دونوں نے ان دونوں کو تھپکا تھا۔ تسلی دی تھی۔ یہ ہی کام جبریل اور عنایہ نے بھی کیا تھا۔

"بہت اچھے!" انہوں نے اپنے چھوٹے بہن بھائی کا حوصلہ بندھایا تھا۔

ان دونوں نے خود پہلے سال کے بعد دوبارہ "اسپیلنگ بی" کے مقابلے میں حصہ لے کر اپنا ٹائٹل ڈیفنڈ نہیں کیا تھا۔ اس لیے آج ٹائٹل کھو دینے کی حمین کی کیفیت سے نہ گزرنے کے باوجود وہ اسے تسلی دے رہے تھے۔

رئیسہ یک دم ہی جیسے بیک گراؤنڈ میں چلی گئی تھی۔ وہ خاموشی سے یہ سب کچھ بیٹھی دیکھتی رہی تھی۔

ان لوگوں نے اس سال کے نئے چیمپئن کو بھی دیکھا تھا اور ان انعامات کے ڈھیر کو بھی جو اس سال اس پر نچھاور کیے جا رہے تھے اور پچھلے سال وہ حمین سکندر گھر لایا تھا۔ رئیسہ کا غم جیسے کچھ اور بڑھا تھا۔ وہ سالار سکندر کے خاندان کا کا نام روشن نہیں کر سکی تھی۔ جیسے اس کے بڑے بہن بھائی کرتے تھے۔۔۔ وہ ان جیسی نہیں تھی۔۔۔ وہ پہلا موقع تھا جب رئیسہ کو احساس کمتری ہوا تھا اور شدید قسم کا۔۔۔ آٹھ سال کی عمر میں بھی وہ یہ جانتی تھی کہ وہ لے پالک تھی۔ سالار سکندر کے ایک دوست اور اس کی بیوی کے ایک حادثے میں مارے جانے کے بعد سالار اور امامہ نے اسے گود لیا تھا۔ یہ وہ بیک گراؤنڈ تھا جو رئیسہ سالار کو دیا گیا تھا اور اس چیز نے اسے کبھی پریشان نہیں کیا تھا، نہ ان سوالوں پر اس نے غور کیا تھا۔ وہ ایک ایسے ملک اور معاشرے میں پرورش پا رہی تھی جہاں اس کے اسکول میں ہر تیسرا، چوتھا بچہ اڈاپٹڈ ہوتا تھا یا سنگل پیرنٹ کی اولاد ہوتا تھا۔ معاشرہ اسے کمپلیکس میں مبتلا نہیں

کر سکا تھا اور گھر میں غیریت کا احساس اسے کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔
مگر وہ پہلا موقع تھا جب رئیسہ نے اپنے آپ کو ان سب سے کمتر سمجھا تھا۔ وہ سب اس سے بہتر شکل و صورت کے تھے۔ اس سے بہترین ذہنی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ کسی بھی طرح ان کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، لیکن وہ ان کی طرح دنیا کے ساتھ بھی مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔
ان کے گھر میں لانے والی ٹرافیز، میڈلز، سرٹیفکیٹ اور نیک نامی میں اس کا بہت تھوڑا حصہ تھا۔ یہ اسے پہلے بھی محسوس ہوتا تھا، لیکن آج وہ پہلی بار اس پر رنجیدہ ہوئی تھی اور اس رنجیدگی میں اس نے حمین سکندر کی ناکامی کے بارے میں غور نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے گاڑی میں ہونے والی گفتگو پر غور کیا تھا۔ جو واپس گھر جاتے ہوئے ہو رہی تھی۔
"تم اداس ہو؟" یہ حمین کی سرگوشی تھی جو اس نے گاڑی میں سب کی ہونے والی گفتگو کے درمیان رئیسہ کے کان میں کی تھی۔
"نہیں" رئیسہ نے اسی انداز میں جواب دیا۔
"مجھے پتا ہے تم اداس ہو" حمین نے ایک اور سرگوشی کی۔ رئیسہ کو پتا تھا وہ اس کے جھوٹ کو سچ نہیں مانے گا۔
"تم نیکسٹ ایئر جیت سکتی ہو۔" اس نے جیسے رئیسہ کو ایک آس دلائی۔
"مجھے پتا ہے... لیکن اگلا سال بہت دور ہے۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔
حمین نے اس کی کمر میں گدگدی کرنے کی کوشش کی۔ وہ سکڑ کر پیچھے ہٹی۔ اسے ہنسی نہیں آئی تھی اور وہ ہنسنا چاہتی بھی نہیں تھی۔

"میں بھی تو ہارا ہوں۔" حمین کو اس کے موڈ کا اندازہ ہو گیا تھا۔

"تم جیتے بھی تو تھے نا۔" اس نے جواباً کہا۔ چند لمحوں کے لیے حمین سے جیسے کوئی جواب نہیں بن پڑا، پھر اس نے کہا۔
"وہ تو یونہی تکا لگ گیا تھا۔" اس نے جیسے اپنا ہی مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔
رئیسہ جواب دینے کے بجائے گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ یہ جیسے اعلان تھا کہ وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔



ایرک ان کے گھر کے باہر ٹہل رہا تھا۔ جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تھے۔ گاڑی سے باہر نکلتے ہی جبریل نے اس سے کہا تھا۔
"ایرک! تمہیں اس وقت یہاں نہیں ہونا چاہیے۔" رات واقعی خاصی ڈھل چکی تھی۔
"مجھے نیند نہیں آرہی تھی اور پھر میں حمین سے افسوس بھی کرنا چاہتا تھا۔ ٹائٹل گنوانے کے لیے..." ایرک نے جبریل کی بات کے جواب میں کہا۔
"آپ نے ہی تو کہا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہیے اور ہمدردی کرنی چاہیے۔" اس نے جیسے جبریل کو وضاحت دی۔ حمین جیسے اپنی آنکھیں گھما کر رہ گیا تھا۔
"اب اس میں ہمدردی والی کیا بات ہے۔ اٹس اوکے۔" اس نے ایرک سے کہا جو اس سے ہاتھ ملا کر اسے تھپک رہا تھا۔

"تم نے بہت اچھا کھیلا رئیسہ!" ایرک نے رئیسہ سے کہا۔ اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ رئیسہ کے چہرے پر جیسے ایک اور رنگ آکر گزرا تھا۔

"ویسے وہ لفظ بہت آسان تھے جو تمہیں اسپیل کرنے تھے۔ میں حیران ہوں تمہیں کیسے وہ لفظ نہیں آئے۔" رئیسہ سے رسمی سے جملوں کے تبادلے کے بعد ایرک ایک بار پھر حمین سے مخاطب ہوا تھا۔

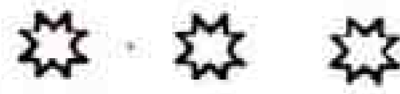
باقی سب لوگ گھر کے اندر جا چکے تھے۔ صرف وہ 'حمین اور رئیسہ ہی باہر تھے۔

"اگلی بار تم اسپیلنگ بی میں حصہ لے لینا۔ اگر تمہیں وہ لفظ اتنے ہی آسان لگے ہیں تو۔" حمین نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔

ایرک نے یقیناً "ٹی وی پر لائیو کوریج دیکھی تھی۔

"یہ برا آئیڈیا نہیں ہے۔" ایرک نے اندر جاتے ہوئے حمین اور رئیسہ کے عقب میں چڑانے والے انداز میں کہا۔ حمین اور اس کے درمیان اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

"بیسٹ آف لک" حمین نے بھی دروازہ کھول کر اندر جانے سے پہلے لحظہ بھر کے لیے پلٹ کر کہا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایرک کو جواب دیے بغیر چلا جاتا۔



"رئیسہ بہت اپ سیٹ ہے۔" اس رات سالار نے امامہ سے سونے سے پہلے کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں اور میں اسی لیے نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس مقابلے میں حصہ لیتی جن میں وہ تینوں ٹرافیز جیت چکے تھے 'لیکن تم نے منع نہیں کیا اسے۔" امامہ نے جواباً "اس سے کہا۔

"میں کیسے اسے منع کرتا؟ یہ کہتا کہ تم نہیں جیت سکتیں 'اس لیے مت حصہ لو اور پھر وہ فائنل راؤنڈ تک پہنچی۔ بہت اچھا کھیلی ہے۔ یہ زیادہ اہم چیز ہے۔" سالار نے اپنے ہاتھ سے گھڑی اتارتے ہوئے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

"وہ بہت سمجھ دار ہے 'ایک دو دن تک ٹھیک ہو جائے گی 'جب میں اسے سمجھاؤں گی کہ حمین بھی تو ہارا ہے 'لیکن اسے پروا تک نہیں... اسے اپنے سے زیادہ فکر رئیسہ ہی کی تھی۔" امامہ نے کہا۔ وہ ایک کتاب کے چند آخری رہ جانے والے صفحے پلٹ رہی تھی۔

"اسے فکر کیوں ہوگی؟ وہ تو اپنی مرضی سے ہارا ہے۔" سالار نے بے حد اطمینان سے کہا۔

صفحے پلٹتی امامہ ٹھٹک گئی۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔ "تمہیں اندازہ نہیں ہوا؟"

"کس بات کا؟ کہ وہ جان بوجھ کر ہارا ہے؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔" امامہ نے خود سوال پوچھا خود جواب دیا 'پھر خود جواب کی تردید کی۔

"تم پوچھ لینا اس سے کہ ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں۔" سالار نے بحث کیے بغیر اس سے کہا۔ وہ اب سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ امامہ ہکا بکا اس کا چہرہ دیکھتی رہی 'پھر جیسے اس نے جھلا کر کہا۔

"تم باپ بیٹا عجیب ہو۔ بلکہ عجیب ایک مہذب لفظ ہے۔"

"تم جبریل کو مائنس کیوں کر جاتی ہو ہر بار؟" سالار نے اسے چھیڑا۔

"شکر ہے وہ حمین اور تمہاری طرح نہیں ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا 'حمین... وہ کیوں اس طرح کرے گا۔" وہ اب بھی الجھی ہوئی تھی۔

"پوچھ لینا اس سے کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے، یہ کوئی فلاسفی کا سوال تو نہیں ہے کہ جواب نہیں مل سکتا۔" سالار نے اب بھی اطمینان سے ہی کہا تھا۔

"جب تم نے یہ راز کھول دیا ہے تو یہ بھی بتادو کہ کیوں کیا ہے اس نے یہ سب۔۔۔؟" امامہ کریدے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"رئیسہ کے لیے۔۔۔" سالار نے جواباً "اس سے کہا تھا۔

"اور مجھے اس پر فخر ہے" اس نے آنکھیں بند کر کے کروٹ لی اور سائڈ ٹیبل لیمپ آف کردیا۔

وہ اندھیرے میں اس کی پشت کو گھور کر رہ گئی تھی۔

وہ غلط نہیں کہتی تھی' وہ دونوں باپ بیٹا ہی عجیب تھے' بلکہ عجیب ایک مہذب لفظ تھا ان کے لیے۔۔۔



"رئیسہ تم سو کیوں نہیں رہیں؟" عنایہ نے اسے ایک کتاب کھولے اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"میں وہ الفاظ دیکھنا چاہتی ہوں اور یاد کرنا چاہتی ہوں جو مجھے نہیں آتے۔" اس نے مڑے بغیر عنایہ کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ عنایہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

انہیں ابھی گھر واپس آئے ایک گھنٹہ ہی ہوا ہوگا اور وہ ایک بار پھر سے کتاب لے کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ عنایہ کے کمرے میں ہی سوتی تھی اور جبریل کے گھر سے جانے کے بعد اسٹڈیز میں ہیلپ کی بنیادی ذمہ داری اب عنایہ پر ہی آگئی تھی۔

"تم نے پہلے ہی بہت محنت کی ہے رئیسہ! "یہ صرف تمہاری بدقسمتی تھی۔" عنایہ کو اندازہ نہیں ہوا' وہ اسے تسلی دینے کے لیے جن الفاظ کا انتخاب کررہی تھی وہ بڑے غلط تھے۔ وہ الفاظ رئیسہ کے دماغ میں جیسے کھُب گئے تھے۔

"اب سوجاؤ۔ There's always a next time" عنایہ نے کسی بڑے کی طرح اس کی پشت کو تھپکا تھا۔

"نہیں نہیں سو سکتی" مدھم آواز میں رئیسہ نے جیسے عنایہ سے کہا۔ وہ ابھی تک ویسے ہی بیٹھی تھی' عنایہ کی طرف پشت کیے۔ کتاب اسٹڈی ٹیبل پر کھول کر ٹکائے' جہاں ایک صفحے پر وہ لفظ چمک رہا تھا جس کے ہجے نہ کرسکنے کی وجہ سے وہ مقابلے سے آؤٹ ہوئی تھی۔

عنایہ کو یوں لگا جیسے رئیسہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اسے لگا اسے غلط فہمی ہوئی ہے' لیکن وہ غلط فہمی نہیں تھی۔ رئیسہ نے کتاب بند کرکے ٹیبل پر رکھی اور پھر وہاں سے اٹھ کر وہ بستر پر آئی اور اوندھے منہ لیٹ کر اس نے بلک بلک کر رونا شروع کردیا۔

"رئیسہ۔۔۔! رئیسہ۔۔۔ پلیز۔۔۔" عنایہ خود بھی روہانسی ہوگئی تھی۔ رئیسہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونے والی بچی نہیں تھی اور وہ مقابلے میں ہارنے کے بعد' اسٹیج سے ہٹنے پر بھی دوسروں کی طرح نہیں روئی تھی۔ پھر اب اس وقت۔۔۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ رئیسہ اپنے بدقسمت ہونے پر رورہی تھی۔

"تم کیا کررہے ہو اس وقت؟" امامہ لاؤنج میں ہونے والی کھڑکھڑاہٹوں کو سن کر رات کے اس وقت باہر نکل آئی تھی۔ وہ اس وقت تہجد کے لیے اٹھی تھی۔

جبریل اس ویک اینڈ پر گھر آیا ہوا تھا اور کئی بار وہ بھی رات کے اس پہر پڑھنے کے لیے جاگتا اور پھر کچھ نہ کچھ

کھانے کے لیے کچن جاتا۔ مگر اس بار اس کا سامنا حمین سے ہوا تھا۔ وہ کچن کاؤنٹر کے سامنے پڑے ایک اسٹول پر بیٹھا سلیپنگ سوٹ میں ملبوس، آئس کریم کا ایک لیٹر والا کین کھولے اسی میں سے آئس کریم کھا رہا تھا۔

امامہ کو سوال کرنے کے ساتھ ہی جواب مل گیا تھا اور اس نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بے حد خفگی کے عالم میں کاؤنٹر کے سامنے آتے ہوئے اس سے کہا۔

"حمین! یہ وقت ہے آئس کریم کھانے کا اور وہ بھی اس طرح۔۔۔" اس کا اشارہ اس کے کین کے اندر ہی آئس کریم کھانے کی طرف تھا۔

"میں نے صرف ایک سکوپ کھائی تھی۔" وہ ماں کے یک دم نمودار ہونے اور اپنے اس طرح پکڑے جانے پر گڑبڑا یا تھا۔

"لیکن یہ کھانے کا کوئی وقت نہیں ہے۔" امامہ نے اس کے ہاتھ سے چمچہ لیا اور ڈھکن سے کین بند کرنے لگی۔

"ابھی تو واقعی ایک چمچہ ہی کھائی ہے میں نے۔" وہ بے اختیار کراہا۔

"دانت صاف کر کے سونا۔" امامہ نے اس کے جملے کو نظرانداز کرتے ہوئے کین کو واپس فریزر میں رکھ دیا۔

حمین جیسے احتجاجاً "اسی انداز میں اسٹول پر بیٹھا رہا۔

"ایک تو میں آج ہارا اور میں نے اپنا ٹائٹل کھو دیا۔ دوسرا آپ مجھے آئس کریم کے دو اسکوپس تک نہیں لینے دے رہیں۔" اس نے جیسے ماں سے احتجاجاً" کہا۔

وہ چند لمحوں کے لیے کاؤنٹر کے دوسری طرف کھڑی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے دیکھتی رہی، پھر اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"ٹائٹل تم نے اپنی مرضی سے کھویا ہے، تمہاری اپنی چوائس تھی یہ۔" حمین کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ ماں کو دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا۔

"آپ کو کس نے بتایا یہ؟"

"تمہارے لیے یہ جاننا ضروری نہیں۔" امامہ نے کہا۔

"آل رائٹ۔۔۔ مجھے پتا ہے۔" اس نے ماں سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"کس نے؟" امامہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"بابا نے۔۔۔" اس کا جواب کھٹاک سے آیا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کو ہاتھ کی پشت کی طرح جانتے تھے۔

"بہت غلط کام تھا۔۔۔ تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔" امامہ نے جیسے اسے ملامت کرنے کی کوشش کی۔ "تم نے یہ کیوں کیا؟"

"آپ جانتی ہیں ممی۔۔۔" وہ اسٹول سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

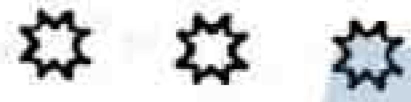
"رئیسہ کے لیے؟" امامہ نے وہ جواب دیا جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔

"فیملی کے لیے۔۔۔" جواب کھٹاک سے آیا تھا۔ "آپ نے سکھایا تھا اپنے بہن بھائیوں سے مقابلہ نہیں ہوتا۔ میں جیت جاتا تو اسے ہرا کر ہی جیتتا نا۔۔۔ اسے بہت دکھ ہوتا۔" امامہ بول نہیں سکی۔

وہ دس سال کا تھا، لیکن بعض دفعہ وہ سو سال کی عمر والوں جیسی باتیں کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ اس سے کیا کہتی۔ ڈانٹتی؟ داد دیتی؟ نصیحت کرتی؟ حمین سکندر لاجواب نہیں کرتا تھا، بے بس کر دیتا تھا۔

"گڈ نائٹ۔۔۔" وہ اب وہاں سے چلا گیا تھا۔ امامہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

ان سب کا حمین کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ صرف اپنے بارے میں سوچتا تھا۔ وہ لاپروا تھا۔ حساس نہیں تھا، نہ ہی وہ دوسروں کا زیادہ احساس کرتا تھا۔
بڑوں کے بعض خیالات اور بعض اندازے یہ بچے بڑے بڑے غلط موقع پر غلط ثابت کرتے ہیں۔ امامہ چپ چاپ کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ سالار نے ٹھیک کہا تھا۔ اُسے اپنی اولاد پر فخر ہوا تھا۔



"بابا! آپ رئیسہ سے بات کرسکتے ہیں؟" عنایہ نے ایک دو دن بعد سالار سے کہا۔ وہ اس وقت ابھی آفس سے واپس آیا تھا اور کچھ دیر میں اسے کہیں جانے کے لیے نکلنا تھا۔ جب عنایہ اس کے پاس آئی تھی اور اس نے بنا تمہید اس سے کہا تھا۔
"کس بارے میں۔۔۔؟" سالار نے جیسے کچھ حیران ہو کر پوچھا۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی جس پر اسے رئیسہ سے بات کرنی پڑتی۔
"وہ اپ سیٹ ہے۔۔۔ وہی اسپیلنگ بی کی وجہ سے۔۔۔" عنایہ نے اس کو بتانا شروع کیا۔
"میں اس کو سمجھا رہی ہوں، لیکن مجھے لگتا ہے۔ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی، وہ دوبارہ اسپیلنگ بی میں حصہ لینا چاہتی ہے۔ اور وہ ہر روز رات کو بیٹھ کر تیاری کرتی ہے اور مجھے بھی کہتی ہے کہ میں اسے تیاری کرواؤں۔" عنایہ اب اس تفصیل سے مسئلہ سمجھا رہی تھی۔

"پہلے تو حمین تیاری کروا رہا تھا اسے۔۔۔" سالار کو یاد آیا۔
"ہاں حمین اور میں نے، دونوں نے کروائی تھی، لیکن اب وہ حمین سے کچھ بھی سیکھنا نہیں چاہتی وہ مجھ سے کہتی ہے کہ میں اسے تیاری کرواؤں۔"
"مجھے تیاری کرانے پر اعتراض نہیں ہے لیکن مجھے نہیں پتا کہ اسے دوبارہ حصہ لینا چاہیے یا نہیں۔۔۔ پھر ابھی تو ایک سال پڑا ہے اس مقابلے میں۔۔۔ اسے اپنی اسٹڈیز پر زیادہ دھیان دینا چاہیے۔" عنایہ دھیمے لہجے میں باپ کو سب بتاتی گئی تھی۔
سالار کو غلطی کا احساس ہوا۔ اسے رئیسہ سے فوری طور پر بات کرنی چاہیے تھی۔ یہ اس کی غلط فہمی تھی کہ وہ ایک آدھ دن میں ٹھیک ہو جاتی۔
"اسے بھیجو۔۔۔" اس نے عنایہ سے کہا۔ وہ چلی گئی۔ سالار نے اپنی گھڑی دیکھی۔ اس کے پاس بیس منٹ تھے گھر سے نکلنے کے لیے۔ وہ کپڑے پہلے ہی تبدیل کر چکا تھا اور اب کچھ فائلیں دیکھ رہا تھا۔ رئیسہ اور عنایہ امامہ کی نسبت اس سے زیادہ قریب تھیں۔ انہیں جو بھی اہم بات کرنی ہوتی تھی وہ امامہ سے بھی پہلے سالار سے کرتی تھیں۔
"بابا۔۔۔" دروازے پر دستک دے کر رئیسہ اندر داخل ہوئی تھی۔
"آؤ بیٹا۔۔۔" صوفے پر بیٹھے ہوئے سالار نے استقبالیہ انداز میں اپنا ایک بازو پھیلایا تھا۔ وہ اس کے قریب صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔
سالار نے اسے صوفے سے اٹھا کر سامنے پڑی سینٹر ٹیبل پر بٹھا دیا۔ وہ کچھ جزبز ہوئی تھی، لیکن اس نے احتجاج نہیں کیا۔ وہ دونوں اب بالکل آمنے سامنے تھے۔ سالار کچھ دیر کے لیے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ گول شیشوں والی عینک سے اسے دیکھتے ہوئے، وہ ہمیشہ کی طرح بے حد توجہ سے اس کی بات سننے کی منتظر تھی۔

اس کے گھنے سیاہ بالوں میں بندھا ہوا ربن تھوڑا ڈھیلا تھا' جو اس کے کندھوں سے کچھ نیچے جانے والے بالوں کو گدی سے لے کر سر کے بالکل درمیان تک باندھے ہوئے تھا' لیکن ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ ماتھے پر آنے والے بالوں کو روکنے کے لیے رنگ برنگی ہیئر پنز سے اس کا سر بھرا ہوا تھا' یہ عنایہ کا کارنامہ تھا۔

رئیسہ کو ہیئر پنز پسند تھے۔ سالار کو یاد بھی نہیں تھا وہ اس کے لیے کتنے ہیئر پنز خرید چکا تھا' لیکن ہر روز نئے بدلے جانے والے کپڑوں کے ساتھ میچنگ پنز دیکھ کر اسے اندازہ ہوتا تھا کہ رئیسہ اس معاملے میں خود کفیل تھی۔

سالار نے اس کے بالوں کے ربن کی گرہ ٹھیک کی اور ہاتھ سے اس کے بالوں کو سنوارا۔

"عنایہ نے مجھے بتایا تم اپ سیٹ ہو۔" سالار نے بالآخر بات کا آغاز کیا۔

وہ یک دم نادم ہوئی۔ "نہیں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔" اس نے گڑبڑا کر سالار سے کہا۔

سالار اسے دیکھتا رہا' رئیسہ نے کچھ لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی' پھر نظریں چرالیں' پھر جیسے کچھ مدافعانہ انداز میں' ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں اپ سیٹ نہیں یہ تو چھوٹی سی بات ہے" اس نے اب سر جھکالیا تھا۔

"پھر اپ سیٹ کیوں ہو؟" سالار نے جواباً" پوچھا۔

"کیونکہ میں بد قسمت ہوں۔" اس نے بے حد ہلکی آواز میں کہا۔

سالار بول ہی نہ سکا اسے' اس سے اس جملے کی توقع نہیں تھی۔

"ایسا نہیں کہتے رئیسہ!"

سالار سیدھا بیٹھے بیٹھے آگے کو جھک آیا۔ وہ اب کہنیاں اپنے گھٹنوں پر ٹکائے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔

اس کے ہاتھوں پر آنسوؤں کے قطرے گرے تھے۔ وہ سر جھکائے۔ باپ کے سامنے بیٹھی اب رو رہی تھی۔ اس کے گلاسز دھندلا گئے تھے۔ سالار کو تکلیف ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا۔ اس نے رئیسہ کو اس طرح روتے دیکھا تھا۔ عنایہ بات بات پر رو پڑنے والی تھی' رئیسہ نہیں۔

"میں ہوں۔" وہ ہچکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔

"نہیں' تم بد قسمت نہیں ہو۔" سالار نے اس کے گلاسز اتارتے ہوئے انہیں میز پر رکھا اور رئیسہ کو اٹھا کر گود میں بٹھالیا۔

وہ باپ کی گردن میں بازو ڈالے اس کے ساتھ لپٹی ہوئی رو رہی تھی' جیسے وہ اسپیلنگ بی آج ہی ہاری تھی۔ سالار کچھ کہے بغیر تشفی کرنے والے انداز میں اسے تھپکتا رہا۔

"میں نے آپ کو شرمندہ کیا بابا!" ہچکیوں کے درمیان اس نے رئیسہ کو کہتے سنا۔

"بالکل بھی نہیں رئیسہ۔۔۔ مجھے تم پر فخر ہے" سالار نے کہا۔

امامہ بالکل اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئی تھی اور وہیں ٹھٹک گئی تھی۔ سالار نے ہونٹوں پر انگلی کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کا کہا تھا۔

"میں نے اتنی محنت کی تھی' لیکن میں کبھی حمین' جبریل بھائی اور عنایہ آپی کی طرح کچھ بھی جیت نہیں سکتی' کیونکہ میں لکی نہیں ہوں۔" وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

سالار کی طرح امامہ کو بھی عجیب تکلیف ہوئی تھی اس کی اس بات سے۔ وہ صوفے پر آکر سالار کے برابر بیٹھ گئی تھی۔ کافی کا وہ مگ اس نے ٹیبل پر رکھ دیا جو وہ سالار کو دینے آئی تھی۔

یہ سالار نہیں تھا' امامہ تھی۔ جس نے رئیسہ پر جان ماری تھی ۔۔۔۔۔ اسے بولنا اور درست بولنا سکھانے

کے لیے... اسے پڑھنا لکھنا سکھانے کے لیے...

سالار نے اسے صرف ۔ گود لیا تھا۔ امامہ نے اس کی زندگی بدل دی تھی اور اس کا خیال تھا اب سب کچھ ٹھیک تھا... لیکن وہ فرق جو وہ اپنے آپ میں اور ان تینوں میں دیکھ رہی تھی اس نے ان دونوں کو ہی پریشان کیا تھا۔

وہ رونے دھونے کے بعد اب خاموش ہو گئی تھی۔ سالار نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"اب بس۔" رئیسہ نے گیلے چہرے کے ساتھ سر ہلایا۔

اس کے بال ایک بار پھر بے ترتیب تھے۔ ربن ایک بار پھر ڈھیلا ہو چکا تھا۔ سالار سے الگ ہوتے ہوئے اس نے امامہ کو دیکھا تھا اور جیسے کچھ اور نادم ہوئی۔ سالار نے اسے ایک بار پھر ٹیبل پر بٹھا دیا۔

"تمہیں کیوں لگتا ہے وہ تینوں لکی ہیں اور تم نہیں؟" سالار نے اسے بٹھانے کے بعد اس کے گلاسز اٹھا کر ٹشو سے ان کے گیلے شیشے رگڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کیونکہ وہ جس چیز میں حصہ لیتے ہیں جیت جاتے ہیں، میں نہیں جیتتی۔" وہ ایک بار پھر رنجیدہ ہوئی۔ "وہ اگیزامز میں مجھ سے زیادہ اچھے گریڈز لیتے ہیں۔ میں کبھی اے پلس نہیں لے سکتی۔ میں کوئی بھی ایسا کام نہیں کر سکتی جو وہ نہیں کر سکتے، لیکن وہ بہت سے ایسے کام کر سکتے ہیں جو میں نہیں کر سکتی۔" آٹھ سال کی وہ بچی اوسط درجہ کی ذہانت رکھتی تھی، لیکن اس کا تجزیہ بہت عمدہ تھا۔

"دنیا میں صرف ہر مقابلہ جیتنے والے لکی نہیں ہوتے۔ سب کچھ کر پانے والے لکی نہیں ہوتے۔ لکی وہ ہوتے ہیں جنہیں یہ پتا چل جائے کہ وہ کس کام میں اچھے ہو سکتے ہیں اور پھر وہ اس کام میں کوشش کریں اور فالتو کاموں میں اپنی انرجی ضائع نہ کریں۔" اب اب اسے سمجھا رہا تھا۔ رئیسہ کے آنسو تھم چکے تھے۔ وہ اب باپ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"تم نے بہت اچھی کوشش کی لیکن بس تم اسپیلنگ بی میں اتنا ہی اچھا پرفارم کر سکتی تھیں۔ وہاں کچھ بچے ایسے ہوں گے جو تم سے زیادہ اچھے تھے اور انہوں نے تمہیں ہرا دیا... لیکن ان درجنوں بچوں کا سوچو جنہیں تم ہرا کر فائنل راؤنڈ میں پہنچی تھیں۔ کیا وہ بھی بد قسمت ہیں... وہ کیا یہ سوچ لیں کہ وہ ہمیشہ ہاریں گے؟" سالار اس سے پوچھ رہا تھا۔ رئیسہ نے بے ساختہ سر نفی میں ہلایا۔

"حمین، جبریل اور عنایہ کبھی اسپورٹس میں اتنے نمایاں نہیں رہے جتنے بہت سے دوسرے بچے ہیں۔ اس لیے یہ مت کہو وہ سب کر سکتے ہیں۔" اس بار امامہ نے اسے سمجھایا۔ رئیسہ نے سر ہلایا۔ بات ٹھیک تھی۔ وہ اسپورٹس میں اچھے تھے۔ لیکن وہ اسپورٹس میں اپنے اسکولز کے سب سے نمایاں اسٹوڈنٹس نہیں تھے۔

"تمہیں اب یہ دیکھنا ہے کہ تم کس چیز میں بہت اچھا کر سکتی ہو اور پھر تمہیں اسی چیز میں دل لگا کر کام کرنا ہے۔ کوئی بھی کام اس لیے نہیں کرنا کہ وہ جبریل، حمین اور عنایہ کر رہے ہیں۔" سالار نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

"یہ ضروری نہیں ہوتا کہ صرف اے پلس والا ہی زندگی میں بڑے کام کرے گا۔ بڑا کام اور کامیابی تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ تم دعا کیا کرو کہ اللہ تم سے بہت بڑے کام کروائے اور تمہیں بہت کامیابی دے۔" رئیسہ نے ان گلاسز کو ٹھیک کیا جو سالار نے اسے لگائے تھے۔

"تم رئیسہ ہو، تم حمین، جبریل اور عنایہ نہیں ہو اور ہاں تم ان سے الگ ہو۔ اور یہی سب سے اچھی چیز ہے الگ ہونا بہت اچھی چیز ہوتا ہے رئیسہ... اور زندگی اسپیلنگ بی کا ایک مقابلہ نہیں ہوتا، جس میں کچھ الفاظ کے ہجے کر کے ٹائٹل جیتنے کے بعد ہم خود کو لکی اور نہ جیتنے پر بد قسمت سمجھیں۔" وہ اب اس کے بال ٹھیک کرتے ہوئے اس کا ربن دوبارہ باندھ رہا تھا۔

"زندگی میں الفاظ کے ہجے کرنے کے علاوہ بھی بہت ساری صلاحیتیں چاہئیں۔ ایک دو نہیں... اور تمہارے

پاس بہت ساری صلاحیتیں ہیں اور بھی آئیں گی۔ تم ایک اسٹار کی طرح روشن ہو گی۔ جس بھی جگہ جاؤ گی جو بھی کرو گی۔" رئیسہ کی آنکھیں، چہرہ اور ہونٹ بیک وقت چمکے تھے۔

"اور پتا ہے صحیح معنوں میں لکی کون ہوتا ہے؟ وہ جس کی اچھائی اور اخلاق لوگوں کو اسے یاد رکھنے پر مجبور کر دے اور تم میری بہت اچھی اور بہت اخلاق والی لکی بیٹی ہو۔" وہ اب ٹیبل سے اتر کر باپ کے گلے لگی تھی۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ اسے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا۔

"ہاں میں ہوں۔" اس نے بڑی گرم جوشی سے سالار سے کہا۔ اس سے الگ ہو کر وہ امامہ کے گلے لگی۔ امامہ نے اس کی ہیئر پنز نکال کر ایک بار پھر ٹھیک کیں۔

سالار نے کافی کے دو گھونٹ بھرے پھر اسے ادھورا چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ اسے تاخیر ہو رہی تھی۔

"بابا مجھ سے خفا تو نہیں ہوئے نا؟" سالار کے جانے کے بعد رئیسہ نے امامہ سے پوچھا۔

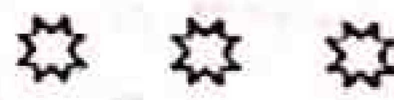
"نہیں خفا نہیں ہوئے، لیکن تمہارے رونے سے ہمارا دل دکھا۔" امامہ نے جواباً کہا۔

"آئی ایم سوری ممی! میں دوبارہ کبھی نہیں روؤں گی۔" اس نے امامہ سے وعدہ کیا۔ امامہ نے اسے تھپکا۔

"تم میری بہادر بیٹی ہو۔ عنایہ آپی کی طرح بات بات پر رونے والی تو نہیں۔" رئیسہ نے پرجوش انداز میں سر ہلایا۔

اس کے ماں باپ اسے سب سے زیادہ بہادر اور اخلاق والا سمجھتے تھے اور یہ اسے پتا ہی نہیں تھا۔ وہ بات چیت آٹھ سالہ رئیسہ کے ذہن پر نقش ہو گئی تھی۔

امامہ اور سالار کو دوبارہ کبھی اس کو ایسی کسی بات پر سمجھانا نہیں پڑا تھا۔ اسے اب یہ طے کرنا تھا کہ وہ کس کام میں اچھی تھی۔ کس کام میں آگے بڑھ سکتی تھی۔ اس کے باپ نے اسے کہا تھا۔ خوش قسمت وہ تھا جو یہ بوجھ لیتا اور پھر اپنی انرجی کسی اور چیز میں ضائع کرنے کے بجائے اسی ایک کام میں لگاتا۔ رئیسہ بھی لکی کی اس نئی تعریف پر پورا اترنے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔



حمین سکندر کا انتخاب MIT کے SPLASH پروگرام میں ہو گیا تھا۔ وہ اپنے اسکول سے اس پروگرام کے لیے منتخب ہونے والا پہلا اور واحد بچہ تھا۔ اس پروگرام کے تحت MIT ہر سال غیر معمولی ذہانت کے حامل کچھ بچوں کو دنیا کی اس ممتاز ترین یونی ورسٹی میں چند ہفتے گزارنے اور وہاں پڑھانے والے دنیا کے قابل ترین اساتذہ سے سیکھنے کا موقع دیتی۔ یہ بہترین دماغوں کو بے حد کم عمری میں ہی کھوجنے، پرکھنے اور چننے کا MIT کا اپنا ایک عمل تھا۔

امامہ اور سالار کے لیے، حمین سکندر کے اسکول کی طرح یہ بے حد اعزاز کی بات تھی، لیکن اس کے باوجود وہ یہ جاننے پر کہ حمین سکندر کا انتخاب ہو گیا تھا، فکرمند ہوئے تھے۔ وہ جبریل سکندر کو تن تنہا کہیں بھی بھیج سکتے تھے، لیکن حمین کو اکیلے اس عمر میں اتنے ہفتوں کے لیے کہیں بھیجنا ان کے لیے بے حد مشکل فیصلہ تھا۔ خاص طور پر امامہ کے لیے جو اس دس سال کے بچے کو خود سے الگ کر کے اس طرح اکیلے بھیجنے پر بالکل تیار نہیں تھی، لیکن یہ اسکول کا اصرار اور حمین کی ضد تھی جس نے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ہم ان کی قسمت کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔۔۔ کل کیا ہونا ہے۔۔۔ کس طرح ہونا ہے۔۔۔ کوئی چیز ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے تو میں مستقبل کے خوف کی وجہ سے انہیں گھر میں قید نہیں کروں گا کہ دنیا انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔" سالار نے واضح طور پر اس سے کہا تھا۔

"اسے جانے دو۔۔۔ دیکھنے اور کھوجنے دو دنیا کو۔۔۔ ہماری تربیت اچھی ہوگی تو کچھ نہیں ہوگا اسے۔۔۔" اس نے امامہ کو تسلی دی تھی اور وہ بھاری دل سے مان گئی تھی۔

حمین سکندر ساڑھے دس سال کی عمر میں پہلی بار MIT کی دنیا کھوجنے گیا تھا۔ ایک عجیب تجسس اور جوش و خروش کے ساتھ۔۔۔ MIT سے زیادہ اسے اس بات پر ایکسائٹمنٹ ہو رہی تھی کہ وہ کہیں اکیلا جا رہا تھا۔۔۔ کسی بڑے کی طرح۔۔۔

اسے گھر سے بھیجتے ہوئے ان سب کا خیال تھا۔ وہ وہاں چند دن سے زیادہ نہیں رہ پائے گا۔ ایڈجسٹ نہیں ہوگا۔ ہوم سک ہو جائے گا۔ اور واپس آنے کی ضد کرے گا۔ ان کی توقعات بالکل غلط ثابت ہوئی تھیں۔ ایسا بالکل نہیں ہوا تھا۔ حمین سکندر وقتی طور پر ہی سہی لیکن وہاں جا کر وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ وہ "دنیا" تھی اور "دنیا" نے اس ساڑھے دس سال کے بچے کو بری طرح فینسی نیٹ (متاثر) کیا تھا۔

اس دنیا میں ذہانت 'واحد شناختی علامت تھی اور وہ بے حد ذہین تھا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے وہ اپنے ماں باپ کے لیے یہ خوش خبری بھی لایا تھا کہ وہ SPLASH میں آنے والا دنیا کا ذہین ترین دماغ قرار دیا گیا تھا۔ 150 کی ذہانت رکھنے والے صرف چند بچوں میں سے ایک۔۔۔ جنہوں نے اس پروگرام کو اس شناخت کے ساتھ اٹینڈ کیا تھا اور اپنی صلاحیتوں کے حساب سے ان بچوں میں سرفہرست۔۔۔ حمین سکندر کو نہ صرف اس کی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے سنگل آؤٹ کیا گیا تھا' بلکہ MIT نے اسے ان بچوں میں بھی سرفہرست رکھا تھا جن کی پرورش MIT مستقبل کے ذہین ترین دماغوں کی کھوج کے پروگرام کے تحت کرنا چاہتی تھی۔

اور حمین بے حد خوش تھا۔ اس سب کے اغراض و مقاصد سے پوری طرح باخبر نہ ہونے کے باوجود وہ صرف اسی بات پر خوش تھا کہ اسے اب بار بار MIT میں جانے کے مواقع ملنے والے تھے۔ کیوں اس ادارے نے کچھ منتخب بچوں کے لیے ہر سال MIT کے کچھ پروگرامز میں شرکت اوپن کر دی تھی' یہ ان بچوں کی ذہانت کو ایک خراج تحسین اور مراعت تھی۔

"مجھے ہر سال وہاں جانا ہے۔" اس نے گھر آتے ہی کھانے پر ماں باپ کو اطلاع دی تھی جنہوں نے اس کی بات کو زیادہ توجہ سے نہیں سنا تھا۔ اگر کسی چیز پر سالار سکندر نے غور کیا تھا' تو وہ یہ تھی کہ وہ اتنے دن ان سے الگ رہنے کے باوجود بے حد خوش اور مطمئن تھا۔

"نہیں میں نے کسی کو مس نہیں کیا۔ میں نے وہاں بہت انجوائے کیا۔" اس نے اپنی ازلی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے امامہ کی ایک بات کے جواب میں اعلان کیا تھا اور وہ دونوں اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔

وہ بڑا ہوتا اور ایسی بات کرتا تو وہ زیادہ غور نہ کرتے' لیکن وہ ایک بچہ تھا اور اگر کسی جگہ کے ماحول میں اس قدر مگن ہو گیا تھا کہ اسے اپنی فیملی بھی بھول گئی تھی اور وہ اپنے گھر اور گھر والوں سے مضبوط روابط ہونے کے باوجود انہیں بھول گیا تھا تو یہ کوئی بڑی حوصلہ افزا بات نہیں تھی ان دونوں کے لیے۔

"آپ کو پتا ہے بابا مجھے اگلے سال ڈھیر ساری مراعات ملیں گی' جب میں وہاں جاؤں گا پھر اس سے اگلے سال اس سے بھی زیادہ۔۔۔ پھر اس سے اگلے سال اس سے بھی زیادہ۔۔۔ پھر اس سے اگلے سال اس سے بھی زیادہ۔۔۔" وہ بے حد ایکسائٹمنٹ سے ان دونوں کو بتا رہا تھا۔ یوں جیسے وہ یہ پلان خود ہی کر کے آیا تھا کہ اسے اب وہاں ہر سال جانا تھا۔

"آپ کو پتا ہے میں MIT کے کسی بھی سمر پروگرام کے لیے اپلائی کروں تو مجھے داخل کر لیں گے وہ اور مجھ سے کوئی فیس نہیں لیں گے۔ بلکہ مجھے وہاں سب کچھ فری ملے گا۔" اس کا خیال تھا اس کے ماں باپ اس خبر پر اسی کی طرح ایکسائیٹڈ ہو جائیں گے۔ وہ ایکسائیٹڈ نہیں ہوئے تھے' وہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔

"تو بابا آپ مجھے ہر سال وہاں بھیجا کریں گے نا؟" اس نے بالآخر سالار سے کہا۔ وہ جیسے آتے ہی جانے کی یقین دہانی چاہتا تھا۔

"اگلا سال بہت دور ہے حمین۔۔۔ جب اگلا سال آئے گا تو دیکھا جائے گا۔" سالار نے گول مول انداز میں اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

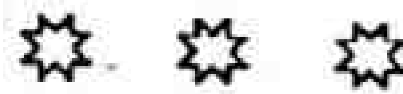
"ولیکن ہمیں پلاننگ تو ابھی سے کرنی چاہیے نا۔" وہ حمین کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔ وہ پہلی بار کسی کام کو پلان کرنے بات کر رہا تھا۔ یہ اس ننھے ذہن پر MIT کا پہلا اثر تھا۔

"میں نے سوچا ہے میں MIT سے ہی پڑھوں گا۔" اس نے جیسے باپ کو بتایا تھا۔

وہ دونوں اس کی بات سے محظوظ ہوئے۔ وہاں جانے سے پہلے تک وہ تعلیم میں دلچسپی نہ رکھنے کا اعلان کرتا رہتا تھا اور اس کو یقین تھا' دنیا کا بڑا انسان وہ ہوتا ہے' جو صرف ہائی اسکول تک پڑھے اور بس۔۔۔ اور وہ چونکہ خود بھی ایک بڑا انسان بننا چاہتا تھا تو وہ بھی صرف ہائی اسکول تک ہی پڑھنا چاہتا تھا۔

"اور اس کے بعد؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"اس کے بعد میں نوبل جیتوں گا۔" اس نے بے حد اطمینان سے کہا تھا۔ یوں جیسے وہ اسپیلنگ بی کی بات کر رہا ہو۔ وہ دونوں اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئے۔



"آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں بابا؟" سالار نے بے حد نرمی سے سکندر عثمان سے پوچھا تھا۔

وہ دو گھنٹے سے ان کے پاس بیٹھا باتیں کرنے سے زیادہ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کی گفتگو میں اب الزائمر جھلکنے لگا تھا۔ وہ جملوں کے درمیان رک کر کسی لفظ کو یاد نہ آنے پر گڑبڑاتے' الجھتے' جھنجلاتے۔۔۔ اور بھول جاتے۔۔۔ اور پھر وہ بات کرتے کرتے اٹھ کر کمرے میں ادھر ادھر جاتے ہوئے چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگتے تھے۔ یوں جیسے انہیں کسی چیز کی تلاش تھی۔ سالار نے انہیں بالآخر ٹوک کر پوچھ ہی لیا تھا۔

"یہیں رکھا تھا۔" انہوں نے سالار کی بات کے جواب میں کہا۔ وہ اپنے بیڈ کے سائڈ ٹیبل کے پاس کھڑے تھے۔ سالار بہت دور صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا؟" سالار نے کریدا۔۔۔

"ایک سگار باکس کامران نے بھیجا تھا' وہی دکھانا چاہتا تھا تمہیں۔" انہوں نے بے حد جوش سے کہا اور ایک بار پھر تلاش شروع کر دی۔

سگار باکس چھوٹی چیز نہیں تھا۔ وہ اس کے باوجود اسے تکیے اٹھا اٹھا کر ڈھونڈ رہے تھے۔ پتا نہیں اس وقت ان کے ذہن میں ڈھونڈنے والی چیز کی کوئی شکل بھی تھی یا نہیں۔ وہ الزائمر کے اس مریض کو پہلی بار اس حالت میں مرض کے اثرات کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ جو اس کا باپ تھا۔

"شاید ملازم نے کہیں رکھا ہے۔ میں اسے بلاتا ہوں۔" انہوں نے بالآخر تھک کے کہا تھا۔ وہ اب واپس سالار کے پاس آ کر بیٹھ گئے تھے اور انہوں نے اسے آوازیں دینی شروع کر دیں۔ سالار نے انہیں ٹوکا۔

"پاپا انٹرکام ہے' اس کے ذریعے بلائیں۔" سالار نے سائڈ ٹیبل پر پڑے انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے باپ سے کہا۔

"اس سے وہ نہیں آتا۔" انہوں نے جواباً" کہا اور دوبارہ اسے آوازیں لگانے لگے۔

وہ ایک ہی سانس میں جسے آوازیں دے رہے تھے' ان کے گھر اس وقت وہ ملازم موجود نہیں تھا' وہ چھٹی پر تھا

اور سالار یہ جانتا تھا۔ وہ ان کا پرانا ملازم تھا۔ اسے لگا اسے باپ کی مدد کرنی چاہیے۔ ملازم کو خود بلانا چاہیے۔
"نمبر بتا دیں میں بلا تا ہوں اسے۔" سالار نے سکندر عثمان کو ایک بار پھر ٹوکا تھا۔
"نمبر نہیں پتا، ٹھہرو میں فون سے دیتا ہوں تمہیں۔" انہوں نے اس کی بات کے جواب میں کہا تھا اور پھر رکے بغیر اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے۔

سالار عجیب کیفیت میں انٹر کام کا ریسیور ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ وہ سیل فون جسے اس کا باپ تلاش کر رہا تھا۔ وہ سامنے میز پر پڑا تھا۔ وہ اس انٹر کام کے نمبر کو اپنے سیل فون کی یادداشت میں ڈھونڈنا چاہتے تھے۔ اور وہ انٹر کام پر اس ملازم کا ایک حرفی نمبر یاد نہیں رکھ پاتے تھے۔ وہ الزائمر کے جن کے ہاتھوں اپنے باپ کو زیر ہوتے دیکھ رہا تھا۔ تکلیف بڑا چھوٹا لفظ تھا اس کیفیت کے لیے۔ جو اس نے محسوس کی تھی۔

وہ بہت عرصے کے بعد امامہ اور بچوں کے ساتھ دو ہفتے کے لیے پاکستان آیا تھا۔ طیبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور سالار اور ان کی ملاقات کئی مہینوں سے نہیں ہوئی تھی اور اب وہ طیبہ کے ہی بے حد اصرار پر بالاخر پاکستان آیا تھا اپنی فیملی کے ساتھ، تو اپنے والدین کی حالت کو دیکھ کر بہت اپ سیٹ ہوا تھا۔ خاص طور پر سکندر عثمان کو دیکھ کر۔

اس نے انہیں ہمیشہ بے حد صحت مند اور چاق و چوبند دیکھا تھا۔ وہ ایک مشین کی طرح کام کرتے رہے تھے ساری زندگی۔ اور کام ان کی زندگی کی سب سے پسندیدہ تفریح تھی اور اب وہ بڑی حد تک گھر تک محدود ہو گئے تھے۔ گھر میں سکندر عثمان اور نوکروں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

اسلام آباد میں ہی مقیم سالار کا بڑا بھائی اپنی فیملی کے ساتھ اپنے گھر میں رہتا تھا۔ وہ سکندر عثمان اور طیبہ کو اپنے ساتھ تو رکھنے پر تیار تھا، لیکن وہ اس کے بیوی بچے، سکندر عثمان کے اس پرانے گھر میں شفٹ ہونے پر تیار نہیں تھے اور طیبہ اور سکندر عثمان اپنا گھر چھوڑ کر بیٹے کے گھر نہیں جانا چاہتے تھے۔ سالار سمیت سکندر کے تینوں بیٹے بیرون ملک تھے۔ بیٹی کراچی۔۔۔ وہ گھر جو کسی زمانے میں افراد خانہ کی چہل پہل سے گونجتا تھا، اب خالی ہو چکا تھا۔

سالار پہلی بار سکندر عثمان کی بیماری کے انکشاف پر بھی بے حد اپ سیٹ ہوا تھا۔ وہ انکشاف اس پر اس کی سرجری کے کئی مہینوں بعد ہوا تھا اور وہ بھی بے حد اتفاقی انداز میں جب سکندر عثمان اپنے ایک طبی معائنہ کے لیے امریکہ گئے تھے اور سالار کو ان کی بیماری کی تفصیلات کا پتا چلا تھا۔
"آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" اس نے سکندر عثمان سے شکایت کی تھی۔ انہوں نے جواباً "بے حد لاپروا انداز میں ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"کیا بتاتا یار۔۔۔ مجھے اپنی بیماری سے زیادہ تمہاری بیماری کا دکھ ہے۔۔۔ میں ستر کا ہو چکا ہوں۔۔۔ کوئی بیماری ہو نہ ہو، کتنا جیوں گا میں؟ اور اس عمر میں الزائمر کے بغیر بھی کچھ یاد نہیں رہتا انسان کو۔۔۔" وہ اپنی بیماری کو معمولی بنا کر پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسے جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں۔

اور اب وہی بیماری اس کے سامنے اس کے باپ کی یادداشت کو گھن کی طرح کھانے لگی تھی۔ زندگی عجیب شے ہے، انسان اس کے طویل ہونے کی دعا بھی کرتا ہے اور اس کی طوالت کے اثرات سے ڈرتا بھی ہے۔ سکندر عثمان ابھی تک سیل فون ڈھونڈے جا رہے تھے۔ سالار نے فون اٹھا کر باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔
"اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ رہا۔" انہوں نے فون ہاتھ میں لیا، پھر سوچنے لگے تھے، کس لیے لیا تھا۔
"یہ فون کس لیے دیا ہے تم نے۔۔۔؟ میں نے مانگا تھا کیا؟" وہ اب اس سے پوچھ رہے تھے۔ کوئی چیز سالار کے حلق میں گولہ بن کر پھنسی۔

"نہیں... بس میں دینا چاہ رہا تھا آپ کو..." وہ کہتے ہوئے یک دم اٹھ گیا۔ وہ باپ کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔

"تم اتنی جلدی جا رہے ہو... کیا اور نہیں بیٹھو گے؟" وہ جیسے مایوس ہوئے تھے۔

"بیٹھوں گا... تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔" وہ ان سے نظریں چراتا' بھرائی آواز میں کہتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا۔

اپنے بیڈ روم سے متصل باتھ روم میں' باتھ ٹب کے کنارے بیٹھا وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ سکندر عثمان سے بے حد قریب تھا اور یہ قربت آج عجیب طرح سے اذیت دے رہی تھی اسے' وہ اپنی زندگی کے ہنگاموں میں اتنا مصروف رہا تھا کہ اس نے سکندر عثمان کی بگڑتی ہوئی ذہنی حالت کو نوٹس ہی نہیں کیا تھا۔ نوٹس تو تب کرتا جب وہ ان سے باقاعدگی سے مل پاتا۔

SIF اسے گرداب کی طرح الجھائے ہوئے تھا۔ اس کے پروجیکٹس نے اب اس کے پیروں کو پروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ سفر میں رہتا تھا۔ چار پانچ سال میں SIF دنیا کی بڑی فنانشنل مارکیٹس میں ایک شناخت بنا رہا تھا۔ بے حد منفرد' تیز رفتار ترقی کے ساتھ... اور کام کی اس رفتار نے اسے بہت سی چیزوں سے بے خبر بھی کیا تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے اس نے اعتراف کیا تھا اور اب وہ حل ڈھونڈ رہا تھا اور حل ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہا تھا۔

وہ دونوں ان کے ساتھ مستقل امریکہ شفٹ ہونے پر کبھی تیار نہیں ہوتے' سالار کو اس کا اندازہ تھا اور امریکہ چھوڑ کر ان کے پاس مستقل آ جانا سالار کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کے باوجود حل سامنے تھا۔ بے حد مشکل تھا' لیکن موجود تھا۔

☆ ☆ ☆

"امامہ! تم بچوں کے ساتھ پاکستان شفٹ ہو جاؤ۔" اس رات اس نے بالآخر انتظار کیے بغیر وہ حل امامہ کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ امامہ کو اس کی بات سمجھ میں ہی نہیں آئی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"میں چاہتا ہوں تم حمین' عنایہ اور رئیسہ کے ساتھ پاکستان آ جاؤ... میرے پیرنٹس کو میری ضرورت ہے' میں ان کے پاس نہیں ٹھہر سکتا' لیکن میں انہیں اس حالت میں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تم نے دیکھا ہے پاپا کو..." وہ بے حد رنجیدہ تھا۔

"ہم انہیں اپنے پاس رکھ سکتے ہیں' وہاں امریکہ میں..." امامہ نے جیسے ایک تجویز پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

"وہ یہ گھر نہیں چھوڑیں گے اور میں اس عمر میں انہیں اپ سیٹ کرنا نہیں چاہتا۔ تم لوگ یہاں شفٹ ہو جاؤ... میں آتا جاتا رہوں گا۔ جبریل ویسے بھی یونیورسٹی میں ہے' اسے گھر کی ضرورت نہیں ہے اور میں تو امریکہ میں بھی سفر ہی کرتا رہتا ہوں زیادہ... مجھے وہاں فیملی ہونے نہ ہونے سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔" وہ اس سے نظریں ملائے بغیر کہہ رہا تھا۔

امامہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی' وہ سب کچھ اس طرح آسان بنا کر پیش کر رہا تھا جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ وہ منٹوں کا کام تھا جو کیا جا سکتا تھا۔

"تمہارے اپنے پیرنٹس بھی ہیں یہاں... وہ بھی بہت بوڑھے ہیں... تم یہاں رہو گی تو ان سب کی دیکھ بھال

کرسکوگی۔" وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ امامہ نے کچھ خفگی سے اس سے کہا۔
"تم یہ سب میرے پیرنٹس کے لیے نہیں کررہے سالار..... اس لیے ان کا حوالہ نہ دو۔"
"تم ان کے پاس رہنا نہیں چاہتیں کیا؟" سالار نے جیسے ایموشنلی بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ "تم ان کے بارے میں فکرمند نہیں ہوتیں کیا؟ انہیں اس عمر میں دیکھ بھال کی ضرورت ہوگی۔ کوئی چوبیس گھنٹے ساتھ نہ رہے، چند گھنٹے ہی رہے، لیکن حال چال پوچھنے والا ہو۔" وہ کہہ رہا تھا۔ اپنے والدین کی بات کرنے سے زیادہ اس کے والدین کی بات کررہا تھا۔
امامہ کو بُرا لگا۔ اسے اس جذباتی بلیک میلنگ کی ضرورت نہیں تھی۔
"سالار! اتنے سالوں میں کبھی پہلے تم نے میرے پیرنٹس کی دیکھ بھال کو ایشو بنا کر مجھے پاکستان میں رکھنے کی بات نہیں کی۔ آج بھی ان کو ایشو نہ بناؤ۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔
"ہاں نہیں کی تھی، کیونکہ آج سے پہلے میں نے کبھی اپنے پیرنٹس کا یہ حال بھی نہیں دیکھا تھا۔" اس نے جواباً کہا، وہ قائل نہیں ہوئی۔
"مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اسی انداز میں کہا تھا۔
"تم ان کے پاس رہنا نہیں چاہتیں؟ یہاں گھر پر....." سالار نے دوٹوک انداز میں اس سے پوچھا۔
"میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے جواباً کہا۔ سالار نے اس سے نظریں چُرالیں۔
"ان سب کو تمہاری ضرورت ہے امامہ....."
"اور تم؟ تمہیں میری ضرورت نہیں ہے؟" امامہ نے گلہ کیا تھا۔
"ان سب کے پاس زندگی کے زیادہ سال نہیں ہیں۔ میں یہ بوجھ اپنے ضمیر پر نہیں لینا چاہتا کہ میں نے زندگی کے آخری سالوں میں اپنے ماں باپ کی پروا نہیں کی۔" وہ اس سے کہہ نہیں سکی، وہ اس کے ساتھ بھی تو اسی لیے چپکی رہنا چاہتی تھی، اسے بھی تو اس کی زندگی کا پتا نہیں تھا۔
ڈاکٹرز نے کہا تھا پانچ سات سال..... زیادہ سے زیادہ دس سال..... اور وہ اسے اس سے بھی پہلے اپنے سے الگ کررہا تھا۔ وہ یہ ساری باتیں زبان پر نہیں لاسکتی تھی، کیونکہ وہ یہ ساری باتیں سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ زندگی کے کسی بھیانک خواب کے بارے میں..... مستقبل کے بُرے دنوں کے بارے میں..... وہ فی الحال صرف حال کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔ جو سامنے تھا۔ جو آج تھا وہ اسی میں جینا چاہتی تھی۔
"تمہیں میری ضرورت ہے سالار..... اکیلے تم کیسے رہوگے؟" وہ اس سے کہہ رہی تھی۔
"میں رہ لوں گا امامہ..... تم جانتی ہو میں کام میں مصروف ہوں تو مجھے سب کچھ بھول جاتا ہے۔" یہ سچ تھا، لیکن اس کو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ امامہ ہرٹ ہوئی تھی۔
وہ کچھ بول نہیں سکی، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے پل میں بھرگئی تھیں۔ سالار اس کے برابر صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے امامہ سے نظریں چرانے کی کوشش کی تھی، نہیں چرا سکا۔
"زندگی میں انسان صرف اپنی ضرورتوں کے بارے میں سوچتا ہے تو خودغرض ہوجاتا ہے۔" اس نے امامہ کو وضاحت ایک فلاسفی میں لپیٹ کر پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ امامہ قائل نہیں ہوئی۔
"مجھے پتا ہے تمہیں ضرورت نہیں ہے..... نہ میری، نہ بچوں کی..... تمہارے لیے کام کافی ہے..... کام تمہاری فیملی ہے، تمہاری تفریح بھی..... لیکن میری زندگی میں تمہارے اور بچوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے..... میرا کام اور تفریح صرف تم لوگ ہو۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں گلہ بھی کیا۔ اس کی بے حسی بھی جتائی، اپنی مجبوری بھی سنائی۔

"تم یہ نہیں سوچتے کہ تم بھی انڈر ٹریٹمنٹ ہو، تمہیں بھی کسی خیال رکھنے والے کی ضرورت ہے۔" وہ جیسے اسے یاد دلا رہی تھی، بیماری کا نام لیے بغیر کہ اسے بھی کسی تیمار دار کی ضرورت تھی۔

"پرانی بات ہو گئی امامہ... میں ٹھیک ہوں، پانچ سال سے اس بیماری کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا مجھے..." اس نے جیسے امامہ کے خدشات دیوار پر پڑھ کر بھی پھونک سے انہیں اڑایا تھا۔

"میں پاپا کو اس حال میں یہاں اس طرح نہیں چھوڑ سکتا، نوکروں کے اوپر... میں حمین کو ان کے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں حمین کو اکیلا یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لیے تمہاری ضرورت ہے اس گھر کو... تم اسے ریکویسٹ سمجھو۔ خود غرضی یا پھر اصرار... لیکن میں چاہتا ہوں تم پاکستان آجاؤ۔ یہاں اس گھر میں..." اس نے سالار کی آواز اور آنکھوں میں رنجیدگی دیکھی تھی۔

"میرے لیے تمہارے بغیر رہنا بے حد مشکل ہے... میں عادی ہو گیا ہوں تمہارا، بچوں کا... گھر کے آرام کا... لیکن میرے باپ کے بے حد احسانات ہیں ہم پر... صرف مجھ پر ہی نہیں، ہم دونوں پر... میں اپنے آرام کو ان کے آرام کے لیے چھوڑنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ یہ فرض ہے مجھ پر..." وہ جو کچھ اس سے کہہ رہا تھا وہ مشورہ اور رائے نہیں تھی، نہ ہی درخواست... وہ فیصلہ تھا، جو وہ کر چکا تھا اور اب صرف اسے سنا رہا تھا۔

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی، وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا، لیکن غلط وقت پر کہہ رہا تھا۔ وہ اس سے قربانی مانگ رہا تھا، لیکن بہت بڑی مانگ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔ وہ فرشتہ نہیں تھی، لیکن یہ بات سالار کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

دو ہفتوں کے بعد امریکہ واپس جاتے ہوئے سالار نے سکندر عثمان کو اپنے فیصلے کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ خوش نہیں ہوئے تھے۔

"نہیں، بے وقوفی کی بات ہے یہ... امامہ اور بچوں کو یہاں شفٹ کرنا۔" انہوں نے فوری طور پر کہا تھا۔ "ان کی اسٹڈیز کا حرج ہوگا اور یہاں لڑکیوں رہے ہوا انہیں، تک کیا بنتی ہے؟" سالار نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ان کے لیے کر رہا تھا یہ سب...

"بس پاپا... وہاں مشکل ہو رہا ہے سب کچھ مینیج کرنا... مالی طور پر..." اس نے باپ سے جھوٹ بولا، وہ انہیں زیر احسان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"بہت زیادہ ہوتے جا رہے ہیں وہاں اخراجات... سیونگ بالکل نہیں ہو رہی... یہاں کچھ عرصہ رہیں گے، تو تھوڑی بہت بچت کر لیں گے ہم۔" اس نے بے حد روانی سے سکندر عثمان سے کہا۔

"لیکن تم تو کہہ رہے تھے SIF بہت کامیاب ہے۔ تمہارا پیکج بہت اچھا ہے۔" وہ کچھ متوحش ہوئے۔

"ہاں... وہ تو بہت اچھا جا رہا ہے... اس کے حوالے سے مسائل نہیں ہیں مجھے... لیکن بس... سیونگ نہیں ہو پا رہی، پھر بچیاں بڑی ہو رہی ہیں، میں چاہ رہا ہوں کچھ سال پاکستان میں رہیں، اپنی ویلیوز کا پتا ہو، پھر لے جاؤں انہیں۔" اس نے اپنے بہانے کو کچھ اضافی سہارے دیے۔

سکندر عثمان ابھی بھی پوری طرح قائل نہیں ہوئے تھے۔

"تم اکیلے کیسے رہو گے سالار... تمہارا ابھی علاج ہو رہا ہے۔ بیوی بچوں کے بغیر وہاں کون خیال رکھے گا تمہارا..." وہ اپنی تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ "میں سوچ رہا ہوں میرے پاس جو اکاؤنٹ میں کچھ رقم ہے وہ تمہیں دے دوں، تاکہ تمہیں اگر کوئی فنانشل مسئلہ ہے تو..." سالار نے ان کی بات کاٹ دی۔

"بس بابا اب نہیں۔" اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ "اب اور کچھ نہیں۔ کتنا کریں گے آپ میرے لیے؟ مجھے بھی کچھ کرنے دیں۔ احسان نہیں کر سکتا تو حق ہی ادا کرنے دیں مجھے۔" اس نے عجیب بے بسی سے باپ سے کہا۔

"مجھے تمہاری فکر رہے گی۔"

سالار نے ایک بار پھر ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی آپ کی فکر رہتی ہے پاپا۔"

"اس لیے رکھنا چاہتے ہو ان سب کو یہاں؟" سکندر عثمان جیسے بوجھ گئے تھے۔

"آپ جو چاہے سمجھ لیں۔"

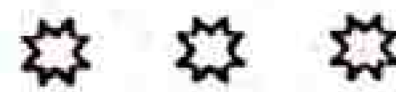
"میں اور طیبہ بالکل ٹھیک ہیں۔ پرانے ملازم ہیں ہمارے پاس' وفادار۔ سب ٹھیک ہے' تم میری وجہ سے یہ مت کرو۔" وہ اب بھی تیار نہیں تھے۔

اولاد پر انہوں نے ہمیشہ احسان کیا تھا۔ احسان لینے کی عادت ہی نہیں تھی انہیں اور وہ بھی عمر کے اس حصے میں۔ بے حد خواہش ہونے کے باوجود۔ مجبور ہو جانے کے باوجود۔ سکندر عثمان اولاد کو اپنی وجہ سے تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

"نہیں ویسے بھی سوچتا ہوں' فیکٹری جایا کروں کبھی کبھار۔ کام مکمل طور پر چھوڑ دیا ہے' اس لیے۔ زیادہ بھولنے لگا ہوں میں۔" وہ اپنے الزائمر کی شکل بدل رہے تھے۔

"تمہارے بچوں اور بیوی کو تمہارے پاس رہنا چاہیے سالار۔ تم زبردستی انہیں یہاں مت رکھو۔ میرے اور طیبہ کے لیے بس۔" انہوں نے جیسے سالار کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"زبردستی نہیں رکھ رہا' بابا ان کی مرضی سے ہی رکھ رہا ہوں۔ وہ یہاں آکر ہمیشہ خوش ہوتے رہے ہیں' اب بھی خوش ہوں گے۔" اس نے باپ کو تسلی دی تھی' اسے اندازہ نہیں تھا' باپ کا تجزیہ کتنا درست ہونے والا تھا۔



"میں پاکستان نہیں جاؤں گا۔" پاکستان شفٹ ہونے کی سب سے زیادہ مخالفت حمین سکندر کی طرف سے آئی تھی اور یہ مخالفت صرف سالار کے لیے ہی نہیں امامہ کے لیے بھی خلاف توقع تھی۔ وہ پاکستان جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ دادا کے ساتھ اس کی بنتی بھی بہت تھی اور وہ دادی کا لاڈلا بھی تھا۔ پاکستان میں اسے بڑی اٹریکشنز دکھتی تھیں اور اب یک بیک مستقل طور پر پاکستان جا کر رہنے پر سب سے زیادہ اعتراضات اسی نے کیے تھے۔

"بیٹا! دادا اور دادی بوڑھے ہو گئے ہیں۔ تم نے دیکھا وہ بیمار بھی تھے۔ انہیں کیئر کی ضرورت ہے۔" امامہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"ان کے پاس سرونٹ ہیں' وہ ان کا اچھی طرح خیال رکھ سکتے ہیں۔" بالکل قائل ہوئے بغیر بولا۔

"سرونٹ ان کی اچھی کیئر نہیں کر سکتے۔" امامہ نے جواباً کہا۔

"آپ انہیں اولڈ ہوم بھیج دیں۔" وہ اس معاشرے کا بچہ تھا' اسی معاشرے کا بے رحم' لیکن عملی حل بتا رہا تھا۔

"کل کو ہم بھی بوڑھے ہو جائیں گے' تو تم ہمیں بھی اولڈ ہوم میں بھیج دو گے۔" امامہ نے کچھ ناخوش ہوتے ہوئے اس سے کہا۔

"آپ انہیں یہاں لے آئیں۔" حمین نے ماں کی خفگی کو محسوس کیا۔
"وہ یہاں نہیں آنا چاہتے' وہ اپنا گھر نہیں چھوڑنا چاہتے۔" امامہ نے اس سے کہا۔
"پھر ہم بھی اپنا گھر کیوں چھوڑیں؟ میں اپنا اسکول کیوں چھوڑوں؟" وہ دنیا کے ذہین ترین دماغوں میں سے ایک تھا۔ غلط بات نہیں کہہ رہا تھا۔ منطقی بات کر رہا تھا۔ دماغ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہی ہوتا ہے۔ وہ عقل سے سوچتا ہے' دل سے نہیں۔
"یہ ہمارا گھر نہیں ہے حمین.... کرائے کا ہے' ہم صرف یہاں رہ رہے ہیں اور جب ہم سب پاکستان چلے جائیں گے تو بابا اور جبریل اس گھر کو چھوڑ دیں گے' کیونکہ انہیں اتنے بڑے گھر کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جبریل ویسے بھی یونی ورسٹی میں ہے.... تمہارے پاپا نیویارک شفٹ ہونا چاہتے ہیں۔" امامہ اسے کہتی چلی گئی تھی۔
"جبریل پاکستان نہیں جائے گا؟" حمین نے پوچھا۔
"نہیں تمہارے بابا اسے اس لیے پاکستان بھیجنا نہیں چاہتے' کیونکہ وہ یونی ورسٹی میں ہے' اس کی اسٹڈیز متاثر ہوں گی۔" امامہ نے اسے سمجھایا۔
"میری بھی تو ہوں گی' مجھے بھی ہر سال MIT جانا ہے۔ میں کیسے جاؤں گا۔" وہ خفا ہوا تھا اور بے چین بھی اسے اپنا سمر پروگرام خطرے میں پڑتا دکھا تھا۔
"تم ابھی اسکول میں ہو.... جبریل یونی ورسٹی میں ہے.... اور پاکستان میں بہت اچھے اسکولز ہیں۔ تم کور کرلو گے سب کچھ.... جبریل نہیں کرسکے گا' اسے آگے میڈیسن پڑھنی ہے۔" امامہ اسے وضاحت دینے کی کوشش کر رہی تھی' جو حمین کے دماغ میں نہیں بیٹھ رہی تھی۔
"یہ فیئر نہیں ہے ممی!" حمین نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "اگر جبریل پاکستان نہیں جائے گا تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔ مجھے MIT جانا ہے۔" وہ واضح طور پر بغاوت کر رہا تھا۔
"ٹھیک ہے' تم مت جاؤ۔ میں' عنایہ اور رئیسہ چلے جاتے ہیں' تم یہاں رہنا اپنے بابا کے پاس....." امامہ نے ایک دم اس سے بحث کرنی بند کردی تھی۔ وہ کچھ مزید بے چین ہوا۔
"یہ تمہارے بابا کا حکم ہے اور ہم سب اس کو مانیں گے.... تم نافرمانی کرنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی' میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔" امامہ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ دنیا کے وہ دو بہترین دماغ ایک دوسرے کے مقابل آگئے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

سائرہ رضا



"جوڑوں کا درد، گھٹنوں، پٹھوں کا درد تو اتنا پرانا ہوگیا تھا کہ اب تو ہائے ہائے کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا، مگر یہ جو نئی تکلیف ایڑیوں میں اٹھی تھی۔ اس نے مانو جان عذاب کردی تھی۔ ہر قدم پر آہ نکل جاتی، لگتا کیل گڑے ہیں۔ اب بھی نماز کے وقت کی تنگی کا خیال نہ ہوتا تو کبھی اٹھ کر نہ آتیں۔ سارے گھر میں اٹیچ باتھ رومز تھے۔ بس وہی پیچھے بنی لانڈری والا واش روم استعمال کرتی تھیں۔ سو اس درد کی وجہ سے اب وہاں تک آنا جانا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف

ناولٹ

لگنے لگا تھا۔

جون کی دھوپ ڈھل چکی تھی۔ وضو کرکے گدلے سایوں کو دیکھتے ہوئے نماز کی ادائی کے لیے تخت پر ہی بیٹھ گئیں۔ صبح کی نماز اپنے کمرے میں اور رات کی نماز یہاں پڑھنے میں انہیں سکون ملتا تھا۔ جب سے ثمر نے سبز جالی کا شیڈ تان دیا تھا تب سے ایک نرم سی ٹھنڈک محسوس ہونے لگی تھی۔

نماز پڑھنے کے دوران ہی انہیں گھر میں چہل پہل کا احساس ہونے لگا تھا۔ دوپہر کی ڈیڑھ دو گھنٹے کی نیند پوری کرکے سب اٹھتے تو تازہ دم ہوتے۔ اور اب شام کی چائے کی تیاری ہو رہی تھی۔

وہی روز کا معمول..... وہ ہر بار اپنا دھیان نماز میں لگانا چاہتیں، مگر آوازوں سے دھیان بٹنے لگتا۔

"گڑیا پیمپر لادو..... ارے گڑیا بیٹا!..... ایک آواز بس سن لیا کرو۔"

یہ ثمر کی بیوی کی آواز تھی۔ اسے کام کرنے کے دوران بولنے کی عادت تھی۔ سارے گھر کو خبر رہتی وہ کس وقت کہاں ہے کیا کر رہی ہے۔

کپڑے دھوتی تو دو نمبر سرف سے لے کر بلیچ تک کے نقصانات پر لیکچر دیتی۔ استری کرتی تو کوئلے کی استری..... اسپرے والی استری اور سادہ استری کا فرق بتانے لگتی۔

سبزی بناتی تو اس کی غذائیت پر لیکچر دیتی یا پھر گٹر کے پانی والی سبزیوں کی پہچان اور نقصان پر بولنے لگتی۔

بچوں کو اسکول جانے کے لیے تیار کرتی، تو ناشتے



کے فوائد پر اس وقت تک بولتی جب تک گھر کا آخری بندہ بھی کھاپی کر فارغ نہ ہو جاتا۔

اسکول سے واپس آنے پر لنچ بکس جوں کا توں دیکھتی تو تقریر شروع۔۔۔ لنچ بکس خالی ہوتا تب بھی شامت۔۔۔

"آج کیسے کھالیا۔۔۔؟ خود ہی کھایا یا کسی دوست کو کھلا دیا یا کہیں پھینک پھانک آئے۔" غرض ثمر کی بیوی کا کام بولنا تھا۔

وہ تشہد میں بیٹھی تھیں۔ اللہ جانے کیا پڑھا۔ سارا دھیان تو اس لیکچر کی طرف چلا گیا تھا جو ثمر کی بیوی نے بیٹی کو دینا تھا۔

زیادہ دیر تک پیمپر لگا رہے تو جلد پر کیسے کیسے نقصانات ہوتے ہیں۔ ریشز الرجی۔ بیماریاں۔۔۔ (بے چاری کو پیمپر لانے میں دیر ہو گئی ہو گی۔۔۔)

آنکھ کھلتے ہی ٹی وی جو لگا لیا جاتا تھا۔ اس پر بھی جھگڑا۔۔۔ یہ چینل اور وہ چینل۔۔۔

سلام پھیر کے ہاتھ دعا کو اٹھائے، تب ہی منجھلی بہو کی للکار نے سب بھلا دیا۔ کیا مانگنا تھا۔ معافی، بخشش، مغفرت یا پھر دنیا کی وہ ضرورتیں جو مغفرت سے بھی زیادہ ضروری لگتی تھیں۔ وہ دعائیں جو چلتے پھرتے نوک زبان پر رہتی تھیں۔

"اللہ! اظہر کو صاحب اولاد کر۔۔۔ اللہ ثمر کی ترقی کر۔۔۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، مہنگائی کا زمانہ۔ مہنگی تعلیم ہے۔"

(پھر تھک ہار کر) "اللہ تو سب کو ہدایت دے۔ ثمر کے آفس والوں کو تنخواہ نہیں بڑھاتے۔"

بڑی بیٹیوں کے لیے دعا کرتیں جو اپنے بچوں کے رشتے کے لیے پریشان تھیں۔

اور آخر میں اپنے دونوں چھوٹے بچوں کے لیے۔۔۔ جو اتنے چھوٹے بھی نہیں تھے، مگر چھوٹا ہونا ان کی ایسی نشانی تھی، جو بڑھے ہونے پر بھی ساتھ رہتی تھی۔

مگر۔۔۔ یہ منجھلی بہو۔۔۔ اس کی دھاڑیں۔۔۔ اف۔ کہاں تھا سکون۔ کہیں بھی نہیں۔۔۔ کہنے کو وہ سارے گھر سے کٹ کر نماز ادا کرنے آئی تھیں۔

"ہزار بار کہا ہے، سارا دن ٹی وی دیکھو، مگر نیوز ہیڈ لائنز کے وقت ریموٹ روک دو۔ شہر کے حالات پتا ہیں نا بلکہ پورے ملک کے۔"

"آئے دن کے ہنگامے، دھماکے، فساد۔۔۔ بندہ بے خبری میں تو نہ مارا جائے۔"

منجھلی کو باخبر رہنے کا شوق تھا۔ بڑے مدبرانہ انداز سے خبریں اور تبصرے سنتی تھی۔

"کیا فائدہ باخبر رہنے سے۔۔۔ جو فساد ہونا ہوتا ہے، وہ تو ہو چکا ہوتا ہے۔ ہم گھر بیٹھ کر کیا کر لیں گے۔" یہ آواز منجھلی ہی کے بڑے بیٹے کی تھی۔

"اوں ہوں خاموش۔۔۔" نیوز شروع ہوا چاہتی تھیں لہٰذا منجھلی نے تین حرف کہے۔ ورنہ وہ بیٹے کی طبیعت بھی صاف کر سکتی تھی۔ (بعد میں ضرور کرتی)

"سب سے پہلے ہیڈ لائنز۔۔۔"

انہوں نے منہ پر ہاتھ پھیر لیا۔ منجھلی کو خبریں سننے کا ہی نہیں سنوانے کا بھی شوق تھا۔ لہٰذا آواز بڑھا چکی تھی۔

"امریکی صدارتی انتخابات۔۔۔" "ہنہ کالا جائے یا گورا آئے، کیا فرق پڑتا ہے۔ انہوں نے سر جھٹکا۔

"کراچی میں امن و امان۔۔۔ ہاں اللہ کرے۔" ان کا دل بولا۔

پانامہ لیکس پر۔۔۔ اوہ۔۔۔ ان کا سر بے ساختہ اوپر اٹھا۔۔۔ کان کھل گئے۔ اللہ جانے نیوز اینکر کیا کیا تفصیلات دیتی جارہی تھی۔

انہیں بڑی مشکل سے بھولی کہانی پھر سے یاد آگئی۔ کتنی دقتوں سے دھیان بٹایا تھا۔ خود کو سمجھانے کا مرحلہ تو ابھی باقی تھا کہ پوری بات سمجھ میں ہی نہ آئی تھی بلکہ سمجھنے سے پہلے یقین کی منزل۔۔۔ پُرپیچ راستہ، ڈگمگاتے قدم۔۔۔ اور آنکھوں کے آگے آتا جالا۔۔۔

نیوز اینکر نجانے کہاں کہاں سے خبر جوڑ رہا تھا۔۔۔ وہی پانامہ لیکس۔

اور یہ بین الاقوامی خبر تھی۔۔۔ جس نے قوم کے اندر بھونچال پیدا کر دیا تھا۔ پانامہ لیکس اور وہ جو شاہانہ نے سنائی تھی۔

اور جسے ثمین نے شاہانہ لیکس کا نام دیا تھا۔

اور بعد میں خود ہی اپنے بیان کی نفی کرتے ہوئے نام بدل کر "ثمامہ لیکس" رکھ کر وہ کتنی دیر تک ہنستی رہی تھی۔
اور جہنم میں جائے، شاہانہ۔۔۔ پانامہ یا پھر ثمامہ لیک۔ بات تو یہ تھی کہ ان کے دل پر بڑا قہر ڈھایا تھا۔
اور ثمین ہنس ہنس کر بے حال تھی۔
اور ثمامہ اس نے کھول کھول کر سارا قصہ سنایا۔ نجانے کہاں سے بھیدی ڈھونڈ لایا تھا۔ جس نے لنکا ڈھانے کی قسم کھائی تھی۔ اور بعد میں یوں ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔۔۔ لاپروا تھا وہ فطرتاً"۔۔۔ اپنے آپ میں گم رہتا یا پھر ثمین کے پلو سے بندھ جاتا۔۔۔ دونوں کے شوق، پسند ناپسند سب ایک سی تھیں۔ جب دونوں ساتھ ہوتے تو پھر کوئی اور ہو نہ ہو قطعاً" فرق نہ پڑتا۔
شاید انہیں اندازہ بھی نہیں تھا کہ ماں کتنی حیران اور دل برداشتہ تھی یا پھر یہ جوانی مستانی ہے۔ جس پر سرد و گرم کا بھی اثر نہیں پڑتا اور ادھر وہ بڑھاپے کی دہلیز پار کر چکی تھیں۔
ساٹھ سال کی عمر کم نہیں ہوتی۔ اس پر بیوگی اس پر فکریں۔۔۔ غم دوراں۔۔۔ ہر فکر پہلے سے بڑھ کر۔۔۔ ہر غم پچھلے سے بھاری۔
انفرادی غم۔۔۔ اجتماعی غم۔۔۔ ساری قوم اور قوم کے نام نہاد رہنما پانامہ لیکس کی ریتی پر اپنے اپنے چھرے تیز کرنے کو تیار کھڑے تھے۔ ایسا موقع پھر کہاں۔۔۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے، گریبان پکڑنے کا نیا موقع۔
وہ خود سے نادم تھیں مگر انہیں اجتماعی غم سے بڑھ کر انفرادی صدمے نے توڑا تھا۔ وہی انفرادی دھچکا۔
شاہانہ لیکس یا پتا نہیں ثمامہ لیکس۔۔۔
وہ سر سے دوپٹا اتار کر چھوٹی سی جوڑی کو کسنے لگیں۔ تب ہی ثمر کی بیوی مسکراتے چہرے کے ساتھ چائے کا کپ چھوٹی سی ٹرے میں سلیقے سے رکھ کر لے آئی۔
"پنکھا چلا لیتیں آپ امی۔۔۔!" اس نے کہنے کے ساتھ پیڈسٹل فین گھسیٹ کر عین ان کے سامنے کر دیا۔
"خواب ہوئے وہ زمانے جب سہ پہر کی چائے ٹھنڈی ہوا میں پی جاتی تھی۔ اب تو گرمی کا یہ عالم ہے کہ شام سات بجے بھی کڑاکے کی دوپہر یاد آ جاتی ہے۔ ویسے یہ گرین جالی لگوانے سے بڑا سکون ہو گیا ہے۔"
"خبروں میں بتا رہے تھے۔ گرمی ابھی اور بڑھے گی۔ چند روز میں روزے آ جائیں گے۔ اہل ایمان ہی رکھیں گے روزے۔۔۔"
"اور اللہ رحم رکھے گا تو کھولیں گے کیسے۔۔۔ آپ نے سنا، چنے کی دال ایک سو ساٹھ روپے کلو ہو گئی ہے۔ بیسن کا حال دیکھیے گا آپ۔"
ثمر کی بیوی بولتی بھی جا رہی تھی، ساتھ ساتھ اس نے تار سے ڈھلے کپڑے بھی اتار لیے تھے۔
"اور ہاں! آپ نے سبزی کا تو بتایا ہی نہیں۔ آج کیا پکے گا؟"
یہ بھی نری مصیبت۔۔۔ ہر بندے کی پسند الگ۔ کتنی ہانڈیاں چڑھائی جائیں آخر۔
"آپ کچھ بول نہیں رہیں امی!" اسے دھیان آیا۔
"کیا بولوں؟" وہ اتنا ہی کہہ سکیں۔
"کڑھی بنا لیتی ہوں۔ پکوڑے کے لالچ میں کھا لیں گے بچے، پھر رمضان میں تو کڑھی بنے گی نہیں، ٹھیک ہے ناں۔۔۔؟ اور یہ منجھلی ٹی وی کتنا اونچا لگا لیتی ہے۔ وہی گھسی پٹی خبریں۔ میرے تو کان پک گئے ہنہہ۔۔۔" کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے وہ نکل بھی گئی۔ زبان ابھی بھی چل رہی تھی۔
انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کے چائے لبوں سے لگالی۔
"بہت بولتی ہے یہ مگر صحیح بولتی ہے۔ اور یہ خبریں۔!"

نیوز اینکر کی سوئی پانامہ لیکس پر اٹکی ہوئی تھی۔
چائے کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے ان کی سوچیں منتشر تھیں۔ دل میں پھر وہی بے یقینی آمیز افسردگی چھانے لگی۔ ٹی وی بند ہو چکا تھا۔ منجھلی نے

حسب عادت ہیڈلائنز کا کہہ کر سارا بلیٹن سناتھا۔ بچے ٹیوشن پر چلے گئے تھے۔ گھر میں خاموشی کا راج ہوگیا۔
پر اندر کا شور ان کی سماعتوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

☆ ☆ ☆

"اللہ!" ثمین کا ہاتھ کھلے منہ پر جاکر ٹھہر گیا۔ یہ اس کے حیران رہ جانے کا مخصوص انداز تھا۔ "ساری دنیا جانتی ہے۔ امیتابھ بچن کے پاس دولت کے انبار ہیں اور بہو رانی کے پاس بھی۔۔۔ ان کا نام بھی آگیا پاناما لیکس میں امی۔۔۔"

"یہ سوچو' کن کن کا نہیں آیا۔۔۔"

"اللہ۔۔۔ لوگ اتنی دولت کا کریں گے کیا۔۔۔؟ پیٹ تو بڑا نہیں ہوجائے گا۔ اس میں تو وہی ایک روٹی جائے گی۔"

"حرص کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔" وہ خود متاسف تھیں۔

"کس کے نام ہوگی یہ ساری جائیداد۔۔۔ ایک ہی تو بیٹی پیدا کی ہے ابھی اس ایشوریہ نے۔۔۔" ثمین کی نگاہ ہر پہلو پر تھی۔

"ایسا کرتے ہیں فیس بک پر اسٹیٹس ڈال دیتے ہیں۔ درجن بھر بچے تو پیدا کرنے ہی چاہئیں اس کو۔" ثمر کی بیوی نے ٹکڑا لگایا۔ سب ہنس دیے۔

"ہاں جی وہ تو جیسے اسی مشورے کے انتظار میں ہے۔"

منجھلی بہو نے ریموٹ ہاتھ میں پکڑ کر کمانڈ سنبھال لی۔ اسے چینل سرفنگ کا بھی شوق تھا۔ ایک ہی وقت میں سارے ٹاک شو بھگتا لیا کرتی تھی۔ سب کی توجہ باتوں سے ہٹ کر خبروں کی جانب مبذول ہوگئی۔

ہر جگہ یہی خبر۔۔۔ چینلز کی تو مانو وہ مثال ہوگئی کہ سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا۔ ٹی وی پر اینکرز تبصرے تجزیے کرنے لگے۔ ادھر گھر میں بھی سب اپنی اپنی رائے پیش کرتے۔

اظہر کے مزاج میں انتہا پسندی اور سختی کا عنصر غالب تھا۔ اس نے سیاست دانوں کے حوالے سے فوری فیصلہ دیا کہ "انہیں سیدھا سیدھا پھانسی دے دی جائے۔" اسے ملک کے پیسے کا غم کھا رہا تھا۔

ثمر ان اعداد و شمار کو گنوانے لگا جو باہر کرنسی رکھنے سے ملک کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

ثمر کی بیوی کو نیا موضوع مل گیا تھا۔ اس نے دنیا سے بات شروع کی اور دین پر لاکر ختم کردی۔ "دیکھ لینا! قیامت کے دن کیسے پکڑ ہوگی۔"

ثمین ہنس دی۔ "ہاں جی! بے بسوں کا آخری حربہ دے بددعائیں پر بددعائیں' لے کوسنے پر کوسنا۔"

"ہاں تو ہیں ناں بے بس۔۔۔ ہوئے جو با اختیار چوک پر لٹکوا کر۔" آگے کے الفاظ احاطۂ تحریر میں لانے کے قابل نہیں تھے۔ جبکہ ادھر قوم کے درد پر اس کی آواز بھرآگئی تھی۔

"یہ آف شور کمپنیوں کا کیا مطلب ہوتا ہے؟" وہ سب کی رائے سن رہی تھیں۔ اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔ سارے ہی اتنے عالم فاضل وعاقل موجود تھے۔

منجھلی بہو آگے آئی۔ گھر والوں کی قسمت کہ اس کے پاس ایم اے پولیٹیکل سائنس کی ڈگری تھی۔ کچھ اخبار بینی کا شوق۔۔۔ اور ٹی وی پر نیوز چینل۔۔۔

"تم کچھ نہیں بول رہے ثمامہ؟" ثمین ہی کو دھیان آیا کہ ثمامہ بڑی دیر سے چپ ہے۔ سب ہی کی نظر اس پر اٹھ گئی۔ جو پیالہ بھر کے کٹے ہوئے تربوز لیے بیٹھا تھا۔ منہ بھرا ہوا تھا لہٰذا جواب دینے میں کچھ وقت لگا۔

"کیا بولوں' میں تو سننے والا ہوں۔"

"پھر بھی کوئی رائے تو ہوتی ہے۔" منجھلی بھابھی نے کہا۔

"بھئی۔ آپ سب جو کہہ رہے ہیں' میں اس سے صد فی صد متفق ہوں۔"

"یہی کہ پھانسی دینی چاہیے؟" اظہر نے پوچھا۔

"یا ساری انویسٹمنٹ وطن واپس لانی چاہیے۔" ثمر بھائی نے کہا۔

"سب کا احتساب ضروری ہے بھئی۔" ثمر کی بیوی

نے مدبرانہ انداز اختیار کیا۔
"اونہوں۔" ثمامہ نے پیالہ رکھ دیا۔ "میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ابھی تو آغاز ہے۔ کچھ وقت گزر جانے دیجیے ابھی اس پنڈورا بکس میں بہت کچھ باقی ہے۔ آپ سب تو ایک جھلک پر جلتے توے پر جا پہنچے ہیں۔ اس دہی کی لسی اب بڑی دیر تک بنے گی۔ سب کو حصہ ملے گا۔" وہ جیسے لطف اٹھا رہا تھا۔
"کیا مطلب...؟" اظہر کی بیوی نے پہلی بار لب کشائی کی کوئی سو جملے بولے تو اس کے منہ سے دو لفظ نکلا کرتے تھے۔
"مطلب یہ کہ... ہمیں تو آپ چپ ہی رہنے دیں۔ ورنہ... ذکر چھڑ گیا تو کئی پردہ نشینوں کے نام آئیں گے۔"
وہ کھڑا ہو گیا۔
"پردہ نشین... کون پردہ نشین؟ ہم کیا بات کر رہے ہیں اور تم کیا..." ثمین بولی۔
"اسی لیے... کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا ناں' اسی لیے کہہ رہا تھا مجھ سے تو کوئی پوچھے ہی نہ۔"
"او بھائی! کسی ٹاک شو میں نہیں بیٹھے' جو بولنا ہے بول دو۔" ثمر بھائی نے لاپروائی سے دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے لے جا کر انگڑائی لی۔
"بول دوں؟" ثمامہ کی نگاہوں سے چھلکتی معنی خیزی نے سب کو چونکایا۔
"جانے دیں اسے آپ سب... یوں ہی سسپنس کری ایٹ کرنے کے لیے آنکھیں مٹکا رہا ہے۔" ثمر کی بیوی نے ہاتھ لہرایا۔
"میں تو آنکھیں مٹکا رہا ہوں... بول پڑا تو کئی لوگ تگنی کا ناچ ناچنے لگیں گے۔ آپ کی قسم..." وہ بڑی ادا سے خمیدہ ہوا۔
"ہٹو بھی تم اور تمہاری قسمیں۔" ثمر کی بیوی نے لاپروائی سے پیر پسارے۔
"اسی لیے تو چپ ہوں بھابھی حضور... اگر بول پڑا تو سب بولیں گے کہ بولتا ہے۔" وہ گنگنایا۔
"مجھے تو بھئی نیند آنے لگی ہے۔" اظہر کی بیوی نے بتایا سب کو' دیکھا صرف اظہر کو... اور اظہر' بیوی کی آنکھ کا اشارہ سمجھنے والوں میں سرفہرست تھا۔ اسے منہ پر ہاتھ رکھ کے جمائیاں روکنی مشکل ہو گئیں۔
ثمامہ نے شانے اچکائے۔
"بات یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی دودھ کا دھلا نہیں ہے۔ اس حمام میں سب کے سب... (اس نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑا) کیا چھوٹا کیا بڑا..."
"جو بہت بڑے ہیں' وہ بڑے ہاتھ مارتے ہیں' جو چھوٹے ہیں وہ اپنے قد کی مناسبت سے... پیچھے کوئی نہیں رہتا۔ موقع پرستی برائی نہیں خوبی ہوتی ہے۔ آپ نے صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کیا... مال بنانے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے اور مال بچانے کا بھی وہی وقت..."
"اتنی لمبی تقریر ثمامہ! تم تو بہت اچھا بولتے ہو۔" اظہر کی بیوی اس کے چپ ہونے پر بولی۔
"صرف اچھا نہیں بھابھی' سچا بھی!"
"تمہیں کسی چینل پر نیوز اینکر ہونا چاہیے۔" منجھلی بھابھی نے رائے دی۔
"نہیں... مارننگ شو ہوسٹ بن جائے' اسے ناچنا بھی آتا ہے۔" ثمر کی بیوی نے اس کے ملٹی ٹیلنٹڈ ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن وہ برا مان گیا۔ نفی میں سر ہلایا۔
"نہیں... میں منافق نہیں ہوں۔"
"کیوں؟ وہ سب منافق ہیں جو روز صبح..." ثمر کی بیوی نے پوچھا۔
"اوہ..." ثمر سوچ میں ڈوبا۔ "سب تو نہیں... مگر... چند ایک تو... ہاہاہا۔" وہ ہنس دیا۔ "دیکھتے ہیں اس پاناما لیکس کا کیا ہو گا... اس سے پہلے وکی لیکس تھیں اور اس سے پہلے کوئی اور... دراڑیں تو ہر دیوار میں ہوتی ہیں۔ کچھ نہ کچھ لیک ہو ہی جاتا ہے۔" اظہر کی بیوی نے نکلتے نکلتے آج کے دن کا سب سے خاص جملہ کہا۔ سب اش اش کر اٹھے۔
"واہ بھابھی!" ثمامہ نے سراہنے میں تنگ دلی کا مظاہرہ نہ کیا۔ "بہت اعلا... لیکن ابھی آپ نے ثمامہ

لیکسس کے بارے میں نہیں سنا۔ ایک بار اگر ادھر سے کچھ لیک ہوگیا۔ تو کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔"

"کیوں تمہارے پاس کیا ہے؟" منجھلی بھابھی کے کان کھڑے ہوئے۔ باقی بھی چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"یہ پوچھیے کیا نہیں ہے۔"

چلو بتادو..... کیا نہیں ہے۔" اظہر کو دلچسپی محسوس ہوئی۔

"پھر کبھی سہی....."

"ابھی کیوں نہیں؟" ثمر کے لب بھی کھلے۔

"وہی ڈر کے مارے۔ ہنگامہ مچ جائے گا ناں۔"

اس نے آنکھ ماری۔

"سمجھا کریں یار۔"

اور اس کا انداز کچھ چونکاتا ہوا سا تھا۔ دل چاہنے کے باوجود موضوع بدلنے کی خواہش ہونے لگی۔ اظہر، بیوی کے ہمراہ کمرے سے نکل گیا۔ ثمر کی بیوی صوفے کے بے ترتیب کشن ٹھیک کرنے لگی۔ منجھلی چائے کے برتن اٹھالے گئی۔ ثمامہ جھک کر اپنے جوتے کی لیس باندھنے لگا۔ یوں ہی دوستوں کے ساتھ پان کھانے جانے کی عیاشی۔ بس ایک ثمین تھی جو اسے اندر تک جانتی تھی۔ کچھ تو تھا جس کی پردہ داری تھی۔ ثمامہ فضول نہیں بولتا تھا۔ ایک وہ تھیں جو ملکی حالات پر افسردہ ہو چکی تھیں۔ اور سب سے بڑے ثمر بھائی..... جو بہت عجیب سی نگاہوں سے ثمامہ کو دیکھتے جاتے تھے۔



"تم کچھ بتا رہے تھے ثمامہ۔ بہتر ہے کہ اب منہ کھول دو۔" یہ ثمین کی آواز تھی۔ "منہ کھول دوں، تم نے میرے دانت گننے ہیں۔"

وہ واقعی اسے گھما رہا تھا۔ اپنے کمرے کے باہر تخت پر دراز فرحت آرا کو دونوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

کچھ دیر پہلے وہ ثمر کی بیوی اور منجھلی کے ساتھ نزدیکی مارکیٹ جانے کے لیے نکلی تھیں۔ مگر آدھی گلی تک پہنچتے ہی جانے سے منع کردیا کہ گرمی بہت زیادہ تھی اور گھٹنوں کا درد زیادہ محسوس ہونے لگا تھا۔ انہیں گھر میں پہننے کے لیے سوفٹی درکار تھی۔

"تم لوگ ہی لے آنا....." وہ واپس آگئیں اور اسی میں ہانپ گئیں۔ برآمدے کے تخت پر پڑ گئیں۔ اندر کمرے میں ثمین اور ثمامہ ایک ہی گول تکیے پر سر ٹکائے نیم دراز تھے۔ درمیان میں جامن کی پلیٹ رکھی تھی۔

دونوں مقابلے پر تلے تھے۔ بچپن کی عادتیں..... اتنے بھرے پرے گھر میں بھی ان دونوں کا اپنا ہی اکیلا ساتھ تھا۔ جس میں وہ کم ہی کسی کو شریک کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے دوست 'رازدار'۔

تو وہ جو انہیں محسوس ہوا تھا کہ ثمامہ کچھ چھپا رہا ہے یا بتانے سے ہچکچا رہا ہے تو ویسا حقیقت میں تھا بھی..... جب ہی تو ثمین پوچھ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے دل کی باتیں بنا کہے جان لیتے تھے۔

"بتاؤ ثمامہ..... کیا ہے یہ ثمامہ لیکسس؟" ثمین کا لہجہ ملتجیانہ ہوگیا۔

"کیا کرو گی جان کر.....؟" ثمامہ کی بھی بس ہو چکی تھی۔ یوں بھی ثمین سے کب تک چھپا سکتا تھا جبکہ دل کہتا تھا۔ رحم کرو، تھوڑا بوجھ کم کرو۔

"یہ ثمامہ لیکسس نہیں ہے بیسیکلی (بنیادی طور پر) یہ شاہانہ لیکسس ہیں..... البتہ کنفرمیشن اور تحقیق میں نے بعد میں خود کی ہے۔"

"پر لیک کیا ہے؟" اس نے اصل سوال کیا۔

"لئیق بھائی کے بڑے بھائی جنہوں نے ابھی اپنا گھر توڑ کر چار منزلہ بلڈنگ بنائی ہے۔" ثمامہ نے بولنا شروع کیا۔ وہ شاہانہ باجی کے شوہر کے حوالے سے بات کر رہا تھا یعنی شاہانہ لئیق کے جیٹھ.....

"ہوں!" ثمین نے سرہلایا۔ "فرش پر ماربل لگوانے کے لیے ماربل مارکیٹ گئے تو..... جس دکان سے سودا ہوا، اس کے دو مالک تھے۔ پارٹنرشپ پر کام ہو رہا تھا وہاں۔" ثمامہ کا لہجہ دھیما ہوگیا۔ دو میں سے

ایک پارٹنر ثمر بھائی تھے۔

"ثمر بھائی۔!" ثمین کے حلق میں جامن کی گٹھلی پھنسی۔ آنکھیں ابل پڑیں۔ ثمامہ اچھل کر سیدھا ہوا۔ دو تین مکے اس کی کمر پر برسائے۔

"تم لڑکیوں کو ذرا ذرا سی بات پر اوور ری ایکٹ کرنے کی عادت ہوتی ہے۔"

"یہ ذرا سی بات ہے ثمامہ؟" ثمین کی آواز بلغم زدہ تھی۔

"میں نے بھی سنی تھی، صبر سے اندر اتارلی۔"

"لئیق بھائی کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" ثمین کیسے یقین کرلیتی۔

"مجھے بھی یہی لگا تھا مگر میں نے گٹھلی پھنسانے کے بجائے تحقیق مناسب سمجھی۔"

"اچھا۔ پھر۔" یوں ہی بکواس ہوگی، بلاوجہ کی شرمندگی، ثمین پر یقین تھی۔ "ثمر بھائی اور مارنل۔ پارٹنر شپ پر ملکیت۔ کہاں جی۔"

مگر ثمامہ کہہ رہا تھا۔ "ہاں جی۔"

"یہ کب ہوا؟"

"تین سال ہونے کو ہیں۔"

"مگر ان کے پاس کہاں سے آگئے بزنس کے لیے پیسے۔" ثمین کی پکار عین فطری تھی۔

ثمامہ نے لاعلمی سے کندھے اچکائے۔ ثمین نے یک دم ثمامہ کا بازو دبوچا۔ وہ بمشکل سجدہ ریز ہونے سے بچا۔

"ثمر بھائی نے ہمیں کیوں نہیں بتایا ثمامہ۔؟"

اس کا لہجہ مدھم ہوگیا۔

بے یقینی، استعجاب، لاعلمی، صدمہ کیا کیا نہیں تھا اس کے لہجے میں، ثمامہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"بولتے کیوں نہیں۔"

"ابھی ثمامہ لیکسس میں بہت کچھ باقی ہے۔ تھوڑا صبر تو کرو۔" اس کا لہجہ پراسرار تھا۔



اور ثمر نے کیوں نہیں بتایا تھا۔ تین سال کوئی کم مدت تو نہیں ہوتی۔ ہزار سے بھی زیادہ ایک بار بھی ثمر کو خیال نہ آیا کہ وہ ماں کو بتائے کہ۔

اور وہ ثمر۔ کون ثمر جو ہر کام شروع کرنے سے پہلے فرحت آرا سے استخارہ کرنے کو کہتا تھا۔ اچھا امی دعا کیجئے گا۔ ان کے پاس اکڑوں بیٹھ کر خود پر پھونکیں مروانے والے ثمر نے انہیں بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ پر کیوں۔؟

سوئی اٹک گئی تھی۔ وہ گھنٹوں سجدہ ریز ہو کر گڑگڑا کر اللہ سے ڈھیروں دعائیں کرتیں اور سب اولادوں میں برابر بانٹ دیتیں۔ نہ کم نہ زیادہ۔

اظہر کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ وہ وظیفے کرتیں۔ تہجد میں جاگ جاگ کر اللہ سے اس کے لیے اولاد مانگتیں۔ کہیں سے کوئی تسبیح سن لیتیں کہ محبوب ہے وہ تسبیح پکڑ کر گوشہ نشین ہوجاتیں۔ کوئی وظیفہ، کوئی سورۃ کوئی آیت۔ کوئی طریقہ۔

اظہر سے فارغ ہوتیں تو شاہانہ کے لیے دعا مانگتیں۔ اس کی اوپر تلے کی تین بیٹیاں تھیں۔ وہ ان کے رشتوں کے لیے ہلکان۔ کسی نے نصیب باندھ دیے میری بچیوں کے۔ امی آپ دعا کیجئے۔" شاہانہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتیں۔

"نصیب تو اللہ اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے۔ اللہ کے لکھے کو کوئی کاٹ نہیں سکتا۔ اور وقت بھی اللہ ہی طے کرتا ہے۔ صبر کرو۔"

"آپ دعا کریں بس۔"

"کرتی ہوں بیٹا۔" وہ اپنی وظیفوں کی کتاب کے صفحے پلٹنے لگتیں۔

منجھلا بیٹا اشعر ملک سے باہر تھا۔ پردیس کا دکھ۔ نجانے کیسے رہتا ہوگا خود پکاتا کھاتا ہوگا۔ تھکا ہارا لوٹتا ہوگا تو پانی کا گلاس تک دینے والا کوئی نہیں۔ اوپر سے وہاں کے خراب حالات۔ کبھی کام لگ جاتا۔ کبھی چھٹ جاتا۔ کیسی ناآسودہ زندگی جی رہا تھا وہ۔ نہ وطن کا سکھ۔ نہ بیوی بچوں کی سنگت کا سکون نہ ماں کی میٹھی نظر کی چاشنی نہ رشتے نہ دوست۔

گرم نوالہ منہ میں رکھتیں تو چبانا بھول جاتیں۔

اشعر ٹھنڈی اکڑی روٹی کھاتا ہوگا۔ کہنے کو کہہ دیتیں کہ آگ لگاؤ ان نوٹوں کو جن کی قیمت پر دل ہر وقت دکھا رہتا ہو۔ مگر کیسے کہتیں۔ کتنے سال پہلے وہ ملک سے نکلا تھا۔ اب تو یاد بھی نہیں۔ کہاں مل رہی تھی اسے یہاں ملازمت وہی جوتیاں چٹخاتا نوجوان.... ثمر کو سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ مگر وہ تو بہت کم درجہ کی تھی۔ اشعر کا سبب بن گیا۔ وہ جاتے ہی سیٹ بھی ہو گیا۔

باپ کے اکاؤنٹ میں پیسے بھیجتا تھا۔ ثمر کی شادی کی۔ پھر نعمانہ کی شادی پھر گھر بنانے لگے تب بھی اشعر نے پیسے بھیجے۔ اور وہ بہت پیسے بھیجتا تھا۔ مگر انہوں نے کبھی بھی "مال مفت دل بے رحم" والا معاملہ نہیں کیا۔ انہیں معلوم تھا۔ کتنے ہجر کاٹ کر خوشیوں سے وصال ہوتا تھا۔ پھر اب کچھ سالوں سے اشعر نے پیسے کم کرتے کرتے تقریباً "بند کر دیے تھے۔

"حالات درست نہیں۔ اب سختی بہت ہے۔ کوئی جمع جتھا نہیں ہے۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ ان کی تعلیم پھر شادیاں اور پھر مستقبل کے لیے کوئی منصوبہ۔ اب میں اتنا نہیں کر سکتا امی....

آپ اسی میں گزارا کریں اور یوں بھی آپ کا خرچا ہی کیا ہے۔"

وہ اس کی ساری باتیں دردمندی سے سن رہی تھیں۔ مگر آخری جملہ بری طرح چبھا.... زندگی بھر گزارا ہی کیا تھا۔ شکر گزاری کے ساتھ.... مگر یہ کیوں کہا کہ ان کا خرچا نہیں تھا۔ زندہ انسان کا خرچا ہوتا ہے اور ان پر تو ابھی دو بچوں کی ذمہ داری بھی تھی۔ وہی تعلیم، شادی اور ان دو خواہشوں سے پہلے زندہ رہنے کا سامان بھی تو چاہیے۔ اس زمانے میں زندہ رہنا کوئی آسان ہے۔"

"اوہ....!" وہ چونکیں۔ یہ تو ثمر کی بیوی کا جملہ تھا جسے دن میں دو بار تو وہ لازمی دہرایا کرتی تھی۔

جب بچوں کا لنچ بنا رہی ہوتی۔ جب سبزی گوشت لاتی۔ جب اپنے بٹوے میں سے بچوں کو پنسل ربر کاپی یا پھر جیب خرچ دے رہی ہوتی۔

بولنا اسے بہت پسند تھا۔ اور ہر چیز پر، ہر بات میں اپنی رائے دینا پسندیدہ ترین۔

وہ دودھ کی بڑھتی قیمت پر آنسوؤں سے رو پڑتی تھی۔ بچے کپڑوں پر کوئی کھونچا وغیرہ لگا آتے تب لگتا بین ڈالنے لگے گی۔ بچوں کی کاپی پنسل کی فرمائش پر انہیں یوں دیکھتی جیسے وہ اس کا گردہ مانگ رہے ہوں۔

چھوٹی چھوٹی بات پر اسے پیسے کی تنگی یاد آتی اور۔ "کہاں سے کروں میں یہ سب پورا۔" جیسا جملہ بول کر سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ فرحت آرا کو بہت ترس آتا۔

وجہ، ثمر کی کم آمدنی.... کتنے سال سے اس کا رکا پروموشن، تھی۔ پانچ بچوں کے ساتھ اس دور کی زندگی کو متوسط انداز سے جینے میں بھی اسے دانتوں پسینہ آتا تھا۔ تنخواہ کم تھی اس پر ستم بڑھتی بھی نہیں تھی۔ پھر دیر سے ملتی تھی۔ آدھی ادھوری ملتی تھی۔ نہ بونس نہ اوور ٹائم۔

اس پر ثمر کا پیارا سا دل.... اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود وہ ان کی دوائیں خود لاتا.... وقت پر لاتا بنا ماتھے پر شکن لائے۔

وہ اسے منع کرنا چاہتی تھیں۔ تب وہ منہ پر ہاتھ رکھ دیتا۔ اس بارے میں وہ کچھ نہ بولیں گی۔ تب وہ اس محبت و فرماں برداری و ایثار پر سرشار ہو جاتیں۔ کیسے اتنی مشکلوں کے بیچ اس نے ماں کی دواؤں کو سب سے پہلے یاد رکھا ہوا تھا۔ کاش وہ کچھ کر سکتیں۔

ہاں۔ بس ایک وہ دعا کا نسخہ تھا۔

دعا.... بس خالی ہاتھ پھیلا کر خالی ذہن و دل سے بھی اللہ کہہ دیا جائے تو سات آسمانوں سے اوپر پکار چلی جاتی ہے۔ اللہ کو کہانیاں سنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر وہ کھول کھول کر جزئیات سے بتاتیں۔

"اے اللہ.... ثمر کی آمدنی بہت کم ہے۔ اور اس کے دفتر والے ذلیل ترین.... تجھ کو تو پتا ہے، دودھ کتنا مہنگا ہو گیا۔ ہزار روپے کا ڈبا سات دن نہیں چلتا۔ اوپر سے اسکول کے خرچے.... چار بچے اسکول جاتے ہیں۔ آگے کیا کہوں۔ تجھ کو سب پتا ہے میرے

مالک..... میرے بچے کی ترقی کردیجیے۔
رزق میں کشادگی کی دعائیں پڑھتیں۔ وظیفوں کا ایک صفحہ مستقل زیر مطالعہ رہتا۔ نماز حاجت پڑھ کر گڑگڑاتیں۔ پرندوں کے لیے باجرہ رکھتیں آب خوروں کا پانی بدلتیں۔ صدقہ دیتیں۔ بس کسی طرح ثمر کی زندگی میں آسانی آجائے یا اسے اور کوئی اچھی نوکری ہی مل جائے۔

دعا لمبی سے لمبی ہوجاتی.....

مگر پھر ہار جاتیں۔ آخر کیا ہے، جوان کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

انہیں اپنے صغیرہ، کبیرہ..... کردہ، ناکردہ گناہ یاد آنے لگتے۔ چھوٹے چھوٹے بے ضرر سے..... اور بڑے بھی..... وہ گھنٹوں سوچتیں۔ معافی طلب کرتیں اور نئے سرے سے جملے بناتیں۔

مگر یہ تو اب پتا چلا۔ ثمر کے معاملے میں ان کی دعائیں نجانے کب سے قبول ہوچکی تھیں۔ اور وہ بھی شان دار طریقے سے..... وہ اپنا خود کا بزنس چلا رہا تھا۔ ہاں وہ گھر میں خرچ کی مد میں وہی مخصوص طے شدہ رقم دیتا تھا۔ مگر ایک بے نیاز سی پرسکون کیفیت اس کی شخصیت میں نظر آنے لگی تھی۔ وہ اسے اپنی قبول ہوتی دعا سمجھیں۔ ہاں اے اللہ تو جس حال میں رکھ مگر سکون کے ساتھ۔ طمانیت کی نعمت سے مالا مال رکھ۔

بچے اچھے لباس پہننے لگے تھے۔ ثمر کی بیوی کے تن پر اچھے کپڑے دیکھ کر وہ ماشاء اللہ کہتے ہوئے نگاہ چراتیں۔ نجانے کہاں سے پورا کرتا ہوگا وہ..... ایک دو بار ثمین کے متوجہ کرنے پر پوچھ بیٹھیں تو گھڑا گھڑایا جواب مل گیا۔ "بھائی نے بنا کردیا..... امی نے لے کر دیا۔"

اور ماننے میں حرج نہیں تھا۔ ثمر کے سسرال والے پیسے والے لوگ تھے۔ انہیں بھی ثمر کے حالات کی تنگی کا اندازہ تھا۔

"لیکن....." فرحت آرا نے آنکھ سے بہتے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کیا۔ "ثمر نے انہیں کیوں نہیں بتایا۔ اگر وہ بتادیتا تو خدا کی قسم' وہ اس پوری دنیا کا واحد شخص ہوتیں جو سب سے زیادہ خوش ہوتا۔ تو ثمر نے ان ہی کو نہیں بتایا..... بلکہ چھپا کر رکھا۔ آخر کیوں؟" ان کا دل مسلا گیا۔

"کیوں؟ وہ اس سے پوچھیں گی۔ ضرور ہی پوچھیں گی۔"

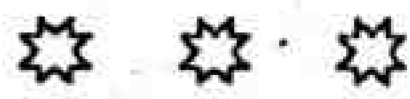
"آپ کچھ نہیں پوچھیں گی امی!" ثمامہ نے کہا۔

"مگر کیوں؟" ان کی احتجاجی پکار۔ بھرائی ہوئی۔

"اس لیے کہ میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ کیوں؟"

"تم.....؟"

"ہاں میں....." وہ بہت پرسکون اور بے فکر تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔



اور ثمامہ لیکسی میں صرف ثمر کے حوالے سے ہوش ربا انکشافات نہیں تھے اس نے تو سب کا کچا چٹھا کھول دیا۔

"ثمر بھائی کے سالے اور سسر نے رقم دی۔ دوسرا پارٹنر سالے صاحب کا دوست ہے۔ شروع میں منافع کی شرح بہت کم تھی۔ لیکن اب گاڑی چھکا چھک چل پڑی ہے امید ہے کچھ عرصے میں پارٹنر کا ٹنٹنا بھی ختم ہوجائے۔"

"پر مجھے بتانے میں کیا حرج تھا؟" ان کا سوال وہیں اٹکا تھا۔

"صرف ثمر ہی نے منہ نہیں سی رکھا..... اظہر بھائی بھی پیچھے نہیں ہیں۔"

"اظہر..... مگر اظہر تو ماشاء اللہ اچھا کمارہا ہے پھر اس کا خرچا بھی کیا ہے۔" وہ سادگی سے بولیں۔

ثمامہ نے سر جھٹکا۔ وہ ماں کے سوالات کو نظرانداز کرتا بس واقعات سنانے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

"یہی تو بات ہے' وہ نہیں چاہتے کہ ان کی آمدنی جو سب کو یوں ہی فالتو کی لگتی ہے' اسے ضائع کیا جائے۔ اپنی بیوی کے نام پر یونی ورسٹی روڈ پر فلیٹ خریدا ہے۔"

"بیوی کے نام پر....." ان کو ذرا یقین نہ آیا۔

"ہاں..... بھابھی کا موقف ہے' ان کی کون سی کوئی

اولاد ہے۔ کل کلاں کو اظہر بھائی کو کچھ ہو جاتا ہے تو انہیں کس برتے پر اس گھر سے حصہ ملے گا۔ وہ کہاں دردر کی خاک چھانتیں گی۔ ان کے میکے میں کون ہے جو پیر کے نیچے زمین اور سر پر چادر ڈالے گا۔ لہٰذا عقل کا تقاضا ہے وہ کچھ نہ کچھ سبب جوڑ کر رکھیں۔"

(اللہ نہ کرے، جو اظہر کو کچھ ہو) ان کی ماںتا کرلائی۔

"لیکن ثمامہ' وہ ہمیں بتاتا تو کیا ہم فلیٹ پر قبضہ جمالیتے؟" ان کی سوئی گھوم پھر کے یہیں آرکی تھی۔

"آپ سوال بہت کرتی ہیں امی۔" ثمین اس بے حد گمبھیر صورت حال میں بھی بے فکری سے فالسے کھانے میں مصروف تھی۔ "ابھی منجھلے بھائی کی کارکردگی باقی ہے۔"

"اس نے کیا کیا ہے؟" وہ پوری کی پوری ثمین کی جانب گھوم گئیں۔

"مسعود کی نیکسٹ کلاس میں ایڈمیشن کے لیے جہاں رجسٹریشن کروائی ہے وہاں منتھلی فیس چوبیس ہزار ہے اور ایڈمیشن کا سارا خرچا لاکھوں کی مد میں ہے۔ اگلے سال سمیعہ بھی اس اسکول میں جائے گی۔" ثمامہ نے پلیٹ سے فالسے چنتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

"لیکن اس کا تو ہاتھ تنگ ہے۔ آج کل کام ٹھیک نہیں۔ بیوی کو بھی کم خرچا بھیج رہا ہے اور میرے خرچ میں سے بھی کٹوتی کی ہے۔" میں تو دن رات اس کے لیے دعا مانگ رہی ہوں کہ اس کی مشکل دور ہو۔ وہ بمشکل آواز کو بلند رکھنے سے باز رہیں۔

"صرف یہی نہیں امی۔۔۔ منجھلے بھائی نے بحریہ ٹاؤن میں پلاٹ بک کروایا تھا۔ (پانچ سو گز کا۔۔۔ آدھے سے زیادہ تعمیر ہو چکا ہے۔ رہائش کے لیے سب سے پہلے جانے والوں میں ان کا نام ہو گا۔ وہ کہتے ہیں اتنے سال ملک سے باہر رہ کر تھک چکے ہیں' اب پرسکون زندگی گزارنے کے لیے پرسکون جگہ درکار ہو گی۔"

"تو کام کیا کرے گا ادھر آکر۔۔۔ نوکری نہ ملنے کی وجہ سے تو سالوں پہلے ملک چھوڑ کر گیا تھا۔ اب تو اور بے روزگاری ہے۔" وہ حیران تھیں۔

"نوکری کریں ان کے دشمن۔۔۔ وہ تو کاروبار کریں گے۔"

"کاروبار۔۔۔ تو اس کے لیے تو سرمایہ۔۔۔"

"ہے ناں۔۔۔ بہت ہے۔"

"مگر وہ تو کہہ رہا تھا کہ کوئی بچت نہیں۔۔۔ منجھلی بہو بھی اٹھتے بیٹھتے یہی کہتی ہے کہ جوانی کی کمائی تو سب بہن بھائیوں پر لگادی۔ اب خود کے بچے بڑے ہو رہے ہیں تو باپ کے اندر ہمت ختم ہو گئی اور میں مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی منہ چھپالیتی ہوں۔"

وہ زخمی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔ جو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر رہے تھے' اتنا سچ بولنے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ بس کافی ہے۔

"ان سب نے ایسا کیوں کیا ثمامہ۔۔۔؟"

"کچھ بھی نہیں کیا۔۔۔ اسے کہتے ہیں آف شور کمپنی۔۔۔ آف شور اثاثے۔"

ثمامہ نے مزے سے ثمین کو دیکھا۔ اس نے ہاں میں ہاں ملانے کے لیے زور شور سے سر ہلایا پھر ثمامہ کے تالی مارنے کے لیے بڑھاتے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دی۔

"ثمامہ۔۔۔!" فرحت آرا نے صرف نام پکارا تھا' مگر اس پکار میں کسی معصوم بچے کی لاچاری۔۔۔ غم اور خوف نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ دونوں بری طرح چونکے۔

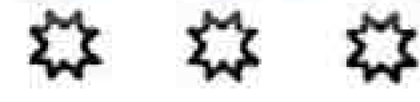
"میں نے ڈھیروں نفل مان رکھے تھے۔ اگر ثمر کے لیے اللہ آسانی کردے۔ روزے بھی مانے تھے۔۔۔ خیرات بھی۔۔۔ مجھے اب وہ منتیں پوری کرنی پڑیں گی نا۔"

"او اماں۔۔۔ ارے امی۔۔۔" دونوں ایک ساتھ ماں سے لپٹ گئے۔

"اماں!" ثمین نے فرحت آرا کے آنسو اپنی پوروں سے پونچھے "اب اتنی اتنی سی باتوں پر روئیں گی۔"

"ایسا تو ہوتا ہے۔۔۔ اب دنیا میں۔۔۔" ثمامہ کی دائیں آنکھ بار بار مچتی تھی۔ فالسے کھٹے تھے۔ فرحت آرا نے سر اٹھایا۔

"ہاں ہوتا ہے... اب..." انہوں نے اب پر زور دیا تھا۔



"تمہاری تمام ضروریات کا خیال رکھنا میرا فرض ہے فرحت بیگم... اگر... مجھ پر میرے بہن بھائیوں اور ماں باپ کی بھاری ذمہ داری ہے... میرے ابا اب اتنی محنت نہیں کر سکتے۔ بڑا بیٹا ہونے کے ناتے میرا فرض ہے کہ میں ان کے کندھے سے کندھا جوڑ دوں۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا۔"

دلہن بنی فرحت کا سر اثبات میں ہلا۔

"میرا ساتھ دو گی نا؟"

فرحت کا سر دوبارہ ہلا۔ ہاں وہ دے گی۔

نہ شرط... نہ معاہدہ... بس دو سوال... دو جواب... اور زندگی کا اگلا لائحہ عمل طے ہو گیا۔

قربانی... ایثار... محبت... فرض اور فیصلہ...

شروع شروع میں پتا ہی نہ چلا... بن کہے ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ باورچی خانہ ساس کی زیر نگرانی تھا۔ فرحت کو کسی بھی چیز کے ختم ہو جانے کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ اسے صرف کہنا ہوتا تھا۔ ساس فراہم کر دیتیں، گھر بھر کی پسند کے لحاظ سے سبزی گوشت آجاتا... فرحت کو صرف پکانا ہوتا تھا۔

تقسیم کا کام بھی ساس کا تھا۔

دو چار سال تک تو بری، جہیز کے سلے کپڑوں ہی نے بازاروں کا رخ کرنے نہیں دیا۔ پھر ان سلے کی باری آئی تو کئی سال گزر گئے۔ نہ ہی ان دنوں میں لباس، حرص و ہوس اور نمود و نمائش کی خواہش کو پورا کرنے کا ذریعہ تھا۔ ایک ضرورت، قناعت اور اعتدال کے ساتھ...

بچے پیدا ہوئے تو ساس، نندیں خود ہی چھوٹے چھوٹے نمونے بنا کر چاؤ سے بھتیجا، بھتیجی کو پہنانے لگیں۔ فرحت کو تو بس سجا بنا بچہ دکھائی دیتا۔

شوہر اپنے بہن، بھائیوں سے خاصے بڑے تھے۔ وہ سب ابھی تعلیم کے مراحل طے کر رہے تھے۔ جب سسر گزر گئے۔ سارا بوجھ شوہر کے کندھوں پر آگیا۔

سسر کم کماتے تھے، مگر وہ تھوڑی سی کمائی کتنی اہم تھی۔ اس کا ادراک سب ہی کو ہونے لگا۔ ادھر اپنے بچے اسکول جانے والے ہو گئے تھے۔ اسکول سرکاری تھا۔ مگر بڑھتی عمر کے بچوں کے مسائل آئے دن، جوتے چھوٹے ہوتے، یونی فارم ٹخنوں سے اوپر چڑھ جاتا۔

اور شوہر جیب خرچ کے نام پر چند روپے بھی دے نہیں پاتے تھے۔ ایک آدھ بار مانگنے کی جسارت پر وہ جس مشکل میں پڑتے دکھائی دیے، اس سے فرحت کا دل اور برا ہوا... شادی کے لیے تیار بہنیں، کالجوں میں جاتے بھائی، بیمار ساس جنہیں جسمانی بیماریوں سے زیادہ سوچوں، فکروں نے نچوڑ دیا تھا۔ کیسے ہو گا یہ سب پورا اور کون کرے گا... فرحت کا شوہر خود بال بچے والا... اس سے چھوٹی دو لڑکیاں اور پھر دو بیٹے جو پڑھ رہے تھے۔ پڑھائی سے وقت ملنے پر کچھ نہ کچھ ہاتھ پیر مار لیتے... مگر اونٹ کے منہ میں زیرہ...

ساس کروشیا کے فن میں طاق تھیں... بہت شوق سے سارا گھر سجا رکھا تھا۔ بیٹیوں کے جہیز بنا کر سنبھالے تھے۔ تحفے تحائف دیتی تھیں۔ اگر اسی ہنر سے چار پیسے کما لیے جائیں۔

ساس کے چلتے ہاتھوں اور چہرے کی طمانیت نے فرحت کو بھی مائل کیا۔ وہ بھی تو سلائی کے ہنر میں طاق ہے۔ مشکل سے مشکل ڈیزائن کو بھی بس ایک بار نظر بھر کے دیکھ لیتی تو اندر کی کم سلائی تک کو بھانپ جاتی۔

تو وہ کیوں ذرا ذرا سی چیز کے لیے شوہر کا منہ دیکھے۔

جب ہاتھ سچے ہیں تو اپنا خود کرے اس نے سلائی مشین سنبھال لی۔

زنانہ کپڑے سینے سے زیادہ مردانہ کپڑے آسان لگتے تھے۔ سیدھا سیدھا ایک ڈیزائن نہ فٹنگ کا ٹنٹنا نہ بیل، پائنچوں کے گھماؤ... یا تو کرتا... بین کالر تو بابا بازو... شرٹ کالر تو ساتھ میں کف۔ گھر کے باہر بورڈ لگا دیا۔

چھوٹے لڑکوں کے لباس تیار کیے جاتے ہیں۔

شروع میں صرف وہی عورتیں آئیں جن کے سال بھر سے دس بارہ برس کے لڑکے تھے اور درزی اول تو

ان کے کپڑے پکڑتے نہیں تھے اور اگر پکڑ لیتے تو سلائی فل مردانہ سوٹ والی مانگتے۔ ایک نے دو کو بتایا اور دو نے چار کو۔ رش ہی لگ گیا۔ ثمر ' شعر اور اظہر کے کپڑے سی سی کے ہاتھ پہلے ہی رواں تھا۔ اب جب باقاعدگی سے کام کیا تو نگاہ ٹکنی مشکل ہو گئی۔ جن بچوں کے کپڑے سل رہے تھے۔ ان کے اباؤں کے سوٹ بھی آ گئے۔

اپنی کمائی... اپنے ذاتی پیسے جن پر کوئی حق نہیں جتا رہا تھا۔ وہ جیسے چاہے اور جہاں چاہے خرچ کر سکتی ہے۔ شروع کے دنوں میں شوہر کو بتا دیا کرتی تھی۔

"روز ایک سوٹ سلائی کروں تو اتنے... اور اگر دو کروں تو اتنے... اور آپ کو پتا ہے' میرے پاس کتنے پیسے جمع ہو گئے ہیں۔" وہ بچوں کے سے انداز میں پوچھتی... شوہر نفی میں سرہلاتے۔

"ارے!" وہ ہنستی... "سمجھ میں نہیں آتا' اتنے سارے پیسوں کا میں کروں گی کیا۔ بہت زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے تو بس تھوڑے سے ہی چاہیے تھے۔"

شوہر اس موہ لینے والی معصوم سادگی پر مسکرا دیتے۔ قناعت پسندی بھی کیا مشکل میں ڈال سکتی ہے؟ یا پھر فرحت جیسے لوگ... سادہ سے... شکر گزار بندے۔

"یہ تمہارے پیسے ہیں فرحت! تمہاری محنت اور ہمت... مجھے یا کسی کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں کہ کتنے کما رہی ہو اور کہاں خرچ کر رہی ہو۔ مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے' بلکہ میں تو شرمندہ ہوں کہ... تم جن تھوڑے سے پیسوں کا ذکر کر رہی ہو کہ تمہیں چاہیے تھے' میں تمہیں مہیا نہیں کر سکا۔"

فرحت تیزی سے نفی میں سرہلاتے ہوئے شوہر کو منع کرنا چاہ رہی تھی' مگر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اور فقط سننے کا کہا۔

"فرض تو میرا ہے نا... مگر کیا کروں' سب کچھ تو تمہارے سامنے ہے نا' مجھ پر بڑی ذمہ داریاں ہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ..." فرحت کے لیے مزید چپ رہنا مشکل تھا۔ "مجھے تو خود پر غصہ ہے' میں نے اتنی دیر کیوں کر دی... بلاوجہ محتاجی رہی' دل مارنا پڑا... مجھے تو آپ کے کندھے سے کندھا ملانا چاہیے تھا۔"

"نہیں... اول تو میں چاہتا ہی نہیں کہ تم اس طرح خود پر بوجھ ڈالو' تمہیں گھر بھی دیکھنا ہے اور بچوں کو بھی سنبھالنا ہے۔ تم تھک جاؤ گی فرحت..."

"یقیناً" تھکوں گی' اگر جو آپ کو احساس نہیں ہو گا تو..."

"مجھے احساس ہے' جب ہی تو... منع کر رہا ہوں' اتنا مت پھیلاؤ کام کو کہ..."

"میں کام نہ کروں؟"

"ضرور کرو... میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو عورتوں کو گھٹن زدہ زندگی دے کر اپنی مردانگی کا علم بلند رکھتے ہیں۔ تم چاہتی ہو تو ضرور کرو... مگر مجھے مت بتاؤ' تم کمانے اور خرچ کرنے میں خود مختار ہو۔ بلکہ اگر صاف کہوں تو میں شرمسار ہونے کے ساتھ ساتھ شکر گزار بھی ہوں۔ تم نے وہ محاذ سنبھال لیا جو سب سے ضروری تھا۔ مگر مسلسل نظر انداز ہو رہا تھا۔ بچوں کی تعلیم' ان کی خواہشات' ضروریات اور خود تمہاری اپنی بھی تو بہت سی خواہشیں ہوں گی۔ منہ سے کہتی نہیں ہو تو کیا مطلب ہے خواہشیں سر اٹھاتی بھی نہیں۔

مجھ پر بہن' بھائیوں کی ذمہ داری ہے۔ اتنی کہ بہنوں کو رخصت کر دوں بھائی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور ماں... ماں کی ذمہ داری ختم ہونے کی ڈیڈ لائن موت ہے۔ ان کی یا میری..."

"او خدا... کیسی باتیں کرتے ہیں۔" فرحت نے شوہر کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا اور شروع میں بہت زیادہ بلکہ یوں ہی فالتو لگنے والے پیسے تو بہت تھوڑے تھے۔ ان ضروریات کے سامنے جو بڑھتے ہوئے بچوں اور گرانی کے ہاتھوں سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔

شوہر کے ساتھ ساتھ فرحت کو ساس کی اجازت بھی درکار تھی۔ ساس نے پیٹھ ٹھونکی' کامیابی کی دعا دی' مگر ساتھ ہی نصیحت بھی کی۔

"جو کرو گی اپنے بچوں کے لیے کرو گی، مگر ایک بات یاد رکھنا، شوہر کی مشکلوں میں شانہ بہ شانہ چلنا اور بات ہے، مگر اتنا ہی بوجھ اٹھانا جتنا برداشت کر سکو، یاد رکھو' مرد کے منہ کو ایک بار عورت کی کمائی کا چسکا لگ جائے.... مانو منہ کو خون لگ گیا۔ خود کفیل ہونا اچھی بات ہے، مگر شوہر کی لگام کو کبھی ڈھیلا نہ چھوڑنا۔"

"یہ آپ اپنے بیٹے کے لیے کہہ رہی ہیں اماں....!" فرحت کی ہنسی بھری آواز میں حیرت کا عنصر غالب تھا۔ ساس نے منہ بنا کر طبیعت صاف کر دی۔

"تو میرا بیٹا تو لاکھوں میں ایک ہے۔ میں تو نصیحت کر رہی ہوں۔ اپنے پلو سے باندھ لو.... وقت پڑنے پر ایک ایک گانٹھ کھولتی جانا اور بیٹیوں، بہوؤں کے پلوؤں پر باندھتی جانا.... ہر نصیحت ہر ایک کے لیے نہیں ہوتی۔ مگر نصیحتیں یاد رکھنی چاہئیں، ہر ایک کو ہمیشہ.... سمجھیں۔"

"سمجھ گئی، بالکل سمجھ گئی۔" فرحت نے تابع داری سے سر ہلایا۔

اور پھر زندگی نے نئے انداز سے آغاز کیا۔ وہ گھر ہی میں رہتی، مگر بالکل ایک ورکنگ وومن کی طرح.... ساس اور نندوں نے اس کی بیشتر ذمہ داریاں آپس میں بانٹ.... بلکہ وقت ملتا تو اس کے سلائی کے کاموں میں بھی مدد کر دیتیں۔ فرحت نے بچے سرکاری اسکول سے ہٹا کر پرائیوٹ انگلش میڈیم میں ڈال دیے.... گھر کے سلے بستوں کی جگہ.... پیارے رنگوں والے بیگز خرید کر وہ کتنی دیر تک انہیں گود میں لے کر دیکھتی رہی.... شلوار قمیص والے یونی فارم کی جگہ پینٹ شرٹ پہن کر تینوں بیٹے پرنس لگتے تھے۔ بچیوں کے لیے ریڈی میڈ کپڑے، کھلونے اپنی وہ ضروریات اور خواہشات جنہیں وہ اندر ہی اندر گھونٹ دیتی تھی۔ انہیں پورا کرنے میں اب وہ بااختیار تھی۔

اس نے قناعت اور اعتدال کا دامن نہ چھوڑا، مگر ایک اعتماد، ایک خوشی اور ایک بے فکری نے زندگی کو آسانی فراہم کر دی تھی۔

انسانی مزاج بھی عجیب ڈھنگ کا ہوتا ہے۔

آپ ایک چیز خریدنا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس مطلوبہ رقم نہیں ہے، آپ اتنے دکھی اور رنجیدہ ہوں گے کہ خود کو ہر پل مرتا محسوس کریں گے۔ آپ کے پاس قوت خرید ہے۔ آپ بے نیازی سے خواہشوں کو نظر انداز کر دیں، تب دکھ نہیں ہوتا۔ نہیں تو نہ سہی....

فرحت نے نئی چیز سیکھی۔

شوہر صاحب نے اس کی آمدنی کو ہاتھ لگانا بھی حرام سمجھا تھا، مگر خرچ تو وہ ان ہی کے گھر میں ہوتی تھی۔ ایک خوش حالی کی چمک نمایاں ہونے لگی۔ انہیں صرف پتا چلتا۔ فلاں چیز آگئی ہے۔ فرحت نے ان سے کہنا چھوڑ دیا تھا۔ جب اللہ نے اسے خود اس قابل بنا دیا تھا تو.... وہ کیوں کہتی، دیکھیں میں کیا کر رہی ہوں.... اور آپ کیا....

کچھ عرصے کی بچکانہ خوشی کے بعد فرحت کو رقم پس انداز کرنے اور کام کو بڑھانے کا خیال آیا۔ شوہر اچھا مشورہ دیتے تھے اور کسی بھی قسم کی مدد کے لیے بھی حاضر تھے۔ دیور بھی مددگار تھے۔ شروع شروع وہ سب سے مشورہ و مدد لے بھی لیتی، پھر یہ ہوا کہ خود فیصلے کرنے لگی۔ چند لڑکیاں اور مشینیں رکھ لیں۔ اسے شہر کی چند بڑی دکانوں سے بچوں کے شلوار سوٹ کے آرڈر ملنے لگے تھے۔ وہ لوگ خود مال پہنچا دیتے، مال اٹھوا لیتے۔

اس نے بچوں کی اعلا تعلیم کا خواب دیکھا تھا اللہ نے اس کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔

ادھر شوہر صاحب کی ذمہ داریاں مہنگائی کے ساتھ بڑھتی جاتی تھیں۔ وہ اپنی جاب کے علاوہ بھی کچھ ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔

فرحت کو وقتاً" فوقتاً" پتا چلتا چھوٹے موٹے کچھ کام.... تمام پیسے ماں کے ہاتھ میں رکھتے۔ بہنوں کو ایسا شان دار جہیز بنا کر دیا کہ دنیا تو دنیا خود فرحت بھی دنگ رہ گئی۔

"وہاں سے لائے آپ اتنے پیسے.... ادھار پکڑا ہے؟"

"پاگل ہوگئی ہو۔۔۔ تم جانتی ہو۔ مجھے ادھار سے کتنا خوف آتا ہے۔"

"پھر۔"

"یار۔۔۔ تم آم کھاؤ' پیڑ کیوں گنتی ہو؟"

"آپ کو بتانا ہوگا۔" وہ بس جان لینا چاہتی تھی۔

"ایسے ہی اندازے لگا لگا کر سر دکھ گیا۔"

شوہر ہنس پڑے۔ "مت کرو اتنی مشقت۔۔۔ ایک دوست کے ساتھ اس کے کاروبار میں شراکت کی۔ سارا کام تو اسی کا ہے۔ میں نے تو بس اس کی مشکل میں اسے رقم فراہم کی۔ ادھار کی مد میں۔۔۔ وہ واپس نہیں کرسکا تو اس نے مجھے آفر کردی' تھوڑا بہت ہوگیا۔

پھر اسی طرح ایک جاننے والا سرکاری ٹھیکوں پر کام لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہفتہ اتوار کو ٹائم لگا کر چار پیسے کما لیے۔

ابھی ایک دوست بتا رہا تھا' اسے کباڑ سے اے سی وغیرہ خرید کر بیچنے کا بڑا تجربہ ہے۔ مگر سرمایہ کم ہے۔ سوچ رہا ہوں' اس کے ساتھ مل جاؤں' کچھ رقم ہے میرے پاس۔۔۔ کچھ کا بندوبست وہ کرے گا تو ان شاء اللہ۔"

"اللہ!" فرحت کا منہ اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ "آپ اتنا سب کچھ کر رہے ہیں۔۔۔ جب ہی گھر کو بالکل وقت نہیں دیتے۔ آپ تھک نہیں جائیں گے اتنی مشقت کر کے۔۔۔" وہ مختلف کیفیات کا شکار تھی۔

"نہیں تھکوں گا۔ تم تھکتی ہو کیا؟"

"نہیں' میں نے کیوں تھکنا ہے۔ میرا کام تو آسان ہے۔ دوسرے اپنے بچوں کے لیے کام کرنے سے بھی کوئی تھکتا ہے۔" اس نے الٹا سوال کردیا۔ شوہر مسکرا دیے۔

"درست! اپنے گھر والوں کے لیے کام کرنے سے بھی کوئی تھکتا ہے؟" انہوں نے اسے لاجواب کردیا۔

وقت گزرنے لگا' دونوں اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے انداز سے محنت کرتے رہے۔ شروع میں فرحت کی خواہش بس تھوڑی سی آسانی اور چند چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا حصول تھا۔ مگر پتا ہی نہ چلا کب وہ ہر چیز میں حصے دار بنتی چلی گئی۔

دوسری نند کی شادی آئی تو اس نے بغیر کہے ایک لفافہ ساس کے حوالے کردیا۔ وہ متامل تھیں۔ مگر فرحت بھی ٹھان کر آئی تھی۔

دیور کے ملک سے باہر جانے کے لیے پیسوں کی ضرورت پڑی۔ بات ادھار پر آکر رک گئی۔ فرحت نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے پہلے پوٹلی شوہر کو تھما دی۔ گھر کی بالائی منزل پر کام شروع ہوا۔ فرحت پہنچ گئی۔

شوہر صاحب نے کچن بنا دیا' مگر اسے امریکن شکل دینے کے لیے فرحت نے اپنے اثاثے شو کردیے۔ واش روم میں پسندیدہ ٹائلز۔۔۔

بچوں کا اچھے تعلیمی اداروں میں داخلہ۔۔۔ اشعر کی باہر جانے کی تگ و دو خاندان بالخصوص میکے کا لین دین۔۔۔

"تم اتنے پیسے کما لیتی ہو فرحت؟" شوہر صاحب کے منہ سے ایک روز نکل ہی گیا۔

"ارے!" وہ ہنسی "آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ بھول گئے' مجھے تو زکوۃ دینا واجب ہے۔"

"نہیں' وہ تو یاد رہا' مگر پھر بھی۔۔۔ دراصل میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ۔۔۔"

"اچھا کیا' نہیں سوچا۔۔۔ میں جو کرتی ہوں۔" اپنے بچوں کے لیے کرتی ہوں۔"

"ہاں۔ معلوم ہے' بس دیکھ رہا ہوں۔ ایک سلائی مشین سے تم نے اتنا کمال کیسے کردیا۔" شوہر کے استعجاب میں سادگی و لاعلمی کا رنگ نمایاں تھا۔

فرحت مسکرا دی۔۔۔ "ایک سلائی مشین والی بات تو پرانی ہوگئی۔ جناب اب تو پورے دو کمروں میں پوری آتی ہیں مشینیں۔"

"ہاں۔۔۔ یہ تو مجھے معلوم ہے' مگر بات شروع تو ایک مشین ہی سے ہوئی تھی۔ اس لیے کہ گنتی ہمیشہ ایک سے شروع ہوتی ہے۔"

"اتنے پیسوں کا کیا کرو گی؟" ان کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ تھی۔

"کیا کروں گی، ضرورت مندوں کی مدد کروں گی۔ بس کوئی اچھا سا ضرورت مند مل جائے جس نے سفید لان کا کرتا پہن رکھا ہو کلف لگی شلوار اور مونچھیں گھنی گھنی ہوں۔" وہ شوہر کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"شکل دیکھ کر دو گی؟" وہ سب سمجھ رہے تھے۔

"شکل دیکھ کر ہی ہمیشہ دیا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے دہری ہو گئی۔

اور وقت گزر تا گیا۔ بچے بڑے ہو گئے۔ سب بہن، بھائی بخیر و خوبی اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے۔ ساس دعائیں دیتی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ زمانہ آگے بڑھ گیا تھا۔ وقت کا پہیہ اب زیادہ تیزی سے گھومنے لگا تھا۔ گزرتے وقت نے ضروریات کو لامحدود کر دیا تھا۔

وہ دونوں اب بھی اسی تن دہی سے محنت کرتے تھے۔ اپنی تنخواہ اور چھوٹے موٹے کام۔ گھر گھر چلتی مشینیں۔۔۔ دونوں کے الگ الگ کھاتے تھے۔ الگ حساب کتاب۔۔۔ دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے مانگے نہیں، چھینے نہیں۔۔۔ نگاہ تک نہ رکھی۔۔۔ مگر خرچ اسی ایک گھر پر کرتے رہے۔ وہ اپنے حساب سے۔۔۔ فرحت اپنے حساب سے۔۔۔

ظاہر کر کے کمایا۔۔۔ یا چھپا کر۔۔۔ سب شو ہو جاتا۔ جب گھریلو ضروریات سامنے آ جاتیں۔

ان کی بیٹی شاہانہ کی شادی گھر کی پہلی شادی تھی۔ شاہانہ کا مزاج بھی شاہانہ تھا۔ اسے شادی بھی شاہانہ چاہیے تھی۔ باپ نے فرض سمجھ کر سب نپٹایا، کوئی کسر نہ چھوڑی۔ فرحت نے بیٹی کے دل کے ہر ارمان پورے کیے۔ جہاں باپ کا ہاتھ جیب سے خالی آیا۔ وہاں فرحت نے بٹوے کا منہ کھول دیا۔

پھر اشعر کا باہر جانے کا شوق۔۔۔ شوہر کی ریٹائرمنٹ۔۔۔ فرحت حاضر۔۔۔ کس لیے کمایا تھا اور کس لیے بچایا تھا۔ اسی دن اور ایسے ہی کسی کڑے وقت کے لیے نا۔۔۔

نغمانہ کی شادی میں فرمائشوں کی سیریل نہیں تھی۔ مگر ایک بیٹی کے لیے اتنا سب اور دوسری کے لیے۔۔۔ اوں ہوں۔ ایسی ناانصافی تو مزاج کا حصہ ہی نہ تھی۔

بچے جوان ہو گئے تھے۔ تعلیم مکمل تھی۔۔۔ ایسی کوئی مشکل نظر تو نہیں آتی تھی، ہاں بڑھاپے کی دو اولادیں۔۔۔ دیگ کی کھرچن۔۔۔ ثمامہ اور ثمین۔۔۔ وہ ابھی بہت چھوٹے تھے۔ (شاہانہ کی بیٹیوں سے دو چار برس ہی بڑے تھے۔ یہ جڑواں ماموں خالہ۔۔۔)

مگر شوہر صاحب نے دھوکا دے دیا۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ پر یہ کیا۔۔۔ بیچ راستے میں داغ مفارقت دے گئے۔

یہ فرحت کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ ابھی تو بہت کچھ باقی تھا۔

صرف اشعر بیاہا تھا اور شاہانہ، نغمانہ۔۔۔ وہ سب کچھ کیسے کرے گی۔ کہنے کو وہ گھریلو سطح کی بزنس وومن تھی۔ مگر بزنس کی حد کیا تھی۔ مال آ گیا، مال پہنچا دیا، کہانی ختم۔۔۔ اسے آج بھی نہیں پتا تھا۔ دنیا باہر سے کیسی ہے۔

فرحت کو شوہر کی موت نے مالی مصائب سے دوچار نہیں کیا۔ مگر وہ دھچکا جو ذہن و دل کو اور روح کو پہنچا تھا۔ بھلا ایسے بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی ایسے بھی کرتا ہے۔ وہ کیسے کرے گی بچوں کی زندگی کے فیصلے۔۔۔

ابھی تو کچھ عرصہ ہوا تھا۔ جب اتنے طویل سال کی ازدواجی رفاقت میں باتیں کرنے کا مزہ آنے لگا تھا۔ ورنہ باتوں کے زمانے کو تو رہٹ کے بیل کی طرح پٹی بندھی آنکھوں کے ساتھ جدوجہد کرنے میں گزار دیا تھا۔

اتنے سالوں کا ساتھ یوں تھا جیسے دو شناسا دریا کے دو کناروں پر برابر چلتے ہوں۔ اب یہ ہی تو وہ وقت آیا تھا۔ جب دریا کے دونوں کنارے ایک ہونے لگے تھے۔ اور یہ سب ہو گیا۔

کیوں ہو گیا میرے اللہ۔۔۔ فرحت اس صدمے سے ابھر ہی نہ پا رہی تھی۔ دن بہ دن بدحالی کی جانب مائل۔۔۔ اعصاب جواب دے گئے۔

مگر اس کا مسئلہ بے یقینی تھا۔ نہ جانے کتنا وقت لگنا

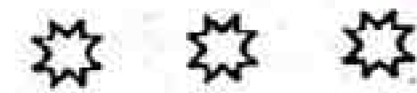
تھا' یقین کی منازل طے کرنے میں۔ ابھی تو دل ہی نہیں لگتا تھا اور دل کا لگنا اہم چیز ہے۔ مشینیں رک گئیں۔ رکے رکے جام ہو گئیں' یہاں تک کہ زنگ لگنے لگا تو لگتا رہے' جب دل ہی نہیں لگ رہا تو۔۔۔

اشعر باہر سے پیسے بھیجنے لگا۔ ثمر کو بھی ملازمت مل گئی۔ بیٹوں ہی نے کہا۔ اب ماں کو مشقت کرنے کی کیا ضرورت ہے اور وہ فوراً" ایمان لے آئی۔

"ہاں نا' کیوں کرے اب وہ محنت۔۔۔ وہ کندھا ہی نہ رہا۔ جس سے کندھا ملانے کے لیے اپنا سکھ' آرام اور جوانی گنوائی تھی۔ وہ قدم ہی پیچھے کہیں رک گئے۔ جن سے ہم قدم ہونے کی خواہش نے دوڑایا تھا۔

جسمانی تھکن کے بہتیرے علاج۔۔۔ فرحت کی روح شل ہو گئی تھی۔

سو زندگی اب فقط ایک جملہ تھی۔۔۔ بس۔۔۔



ثمامہ لیکسس نے تو خیر سب کچھ ہی کھول دیا تھا۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ گھر اور گھر والوں کے خیالات سے اتنی انجان ہوں یا انہیں سمجھ ہی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے' بس یہ ضرور تھا کہ انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ بات کہاں تک پہنچی ہے اور سوچیں کتنی تنگ ہو گئیں۔ دل کتنا سکڑ گئے ہیں۔ رشتے "ہم" کا پیراہن اتار کر "میں" کے چولے اوڑھے' کسی منہ بند غار میں جا کر سو گئے ہیں۔ صور اسرافیل سے ہی اٹھیں تو اٹھیں۔۔۔ ہا۔۔۔

ٹوٹے بھروسے کی زنجیر کی تمام کڑیاں ان کے پاس تھیں۔ مگر انہیں باہم جوڑ کر اب کیا ہوتا۔ بعض صورتیں بگڑ جائیں تو پھر کبھی درست نہیں ہوتیں۔ ان کی تو اولاد کی شکلیں بگڑی تھیں۔ یہ ہی کم ماتم تھا۔

"اور میں اسے ایک روایتی مشترکہ خاندانی نظام کے درمیان پیدا ہونے والی عام سی صورت حال سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی۔"

انہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت سب یاد آنے لگا۔

بیوگی کے بعد اشعر نے سب چیزیں سنبھال لیں۔ انہیں احساس ہی نہ ہوا کہ کوئی مالی تنگی ہے۔ شوہر صاحب کی پنشن اور ان کے چھوٹے موٹے سائڈ بزنس جنہیں ثمامہ' ابا کی آف شور کمپنی کا نام دے کر ہنس رہا تھا۔

سارے گھر کو چلا رہے تھے۔ اشعر نے اور اچھی طرح سے چلایا۔ بہوئیں انہیں اچھی ملی تھیں۔ ایک پرسکون زندگی۔۔۔ اور تینوں بیٹوں کی شادیوں کے بعد مخصوص رقم طے کر دی گئی جو سب کو فرحت آرا کو دینی تھی' تاکہ انتظام بخوبی چلتا رہے۔

ثمر بڑا تھا' مگر شادی پہلے اشعر نے کی تھی۔ اسے پھپھی زاد پسند تھی اور پھپھی کو بیٹی کے رشتے کی جلدی تھی۔ اشعر کے چار بچے تھے۔ پھر ثمر کے پانچ۔ ایک تو بالکل چھوٹا تھا۔ دو برس کا۔۔۔ دوسری طرف اظہر کے ہاں شادی کے بارہ برس بعد بھی اولاد نہیں ہوئی۔ چلو جو حکم ربی۔۔۔ دونوں کو اولاد نہ ہونے کا قلق تھا۔ دن بھر میں کئی جملے اس محرومی کے حوالے سے شعوری یا لاشعوری طور پر نکل ہی جاتے۔

ایسے ہی ایک روز دونوں میاں بیوی نے ایک نیا جملہ کہا۔ کیونکہ وہ بے اولاد ہیں۔ یعنی صرف دو افراد' اس لیے وہ اتنا خرچا نہیں دے سکتے جتنا کہ بچوں والے دے رہے ہیں۔ دونوں کے برابر بچے ہیں۔ بات صحیح تھی۔ فرحت آرا نے فوراً" مان لیا' ٹھیک ہے تم کم دو۔"

"نہیں امی! آپ ہمارا کچن الگ کر دیں۔" اظہر نے وہی کہا جو طے کر کے آیا تھا۔

"کچن۔۔۔ الگ۔۔۔ وہ کیسے میرا مطلب ہے۔۔۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ۔" اظہر نے ان ہی کے لفظ پکڑے۔ "میں چھت پر اپنے لیے پورشن بنوانا چاہ رہا ہوں۔ ہمیں پرائیویسی اور سکون چاہیے۔"

"پرائیویسی اور سکون۔۔۔" وہ بڑبڑا اٹھیں۔ "میں نے تو آج تک سوتی بہوؤں کے بند دروازے نہیں بجائے اور کون سی پرائیویسی اظہر۔۔۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل ادھر بچوں کا شور ڈسٹرب کرتا ہے میرا مطلب......" وہ سب کے حیرت زدہ اور پھر بگڑتے چہرے دیکھ کر گڑبڑایا۔

"ہمارے بچے تمہیں ڈسٹرب کرتے ہیں؟" ثمر کی بیوی اور منجھلی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم آواز ہو کر بولیں۔ اظہر فوراً" سنبھلا۔

"آپ غلط نہ سمجھیں بھابھی..... ہمیں اپنی محرومی کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ بچوں کے لاڈ' ان کی ہنسی' ان کا رونا..... ہمیں اپنے گھر کے خالی پن کا زیادہ احساس کرواتا ہے۔ یہ تو بعض اوقات رو پڑتی ہے۔"

"جی امی! بڑی اذیت ہوتی ہے۔ جب صبح صبح بچے اسکول جانے میں ضدیں کرتے ہیں اور میں بستر پر چت لیٹی سوچتی ہوں کہ کیا کروں۔ میرا بھی کوئی بچہ ہوتا تو....."

اظہر کی بیوی کی آواز رندھ گئی۔ فرحت آرا کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ جملے زیادہ دل گیر تھے یا انداز' ہائے کیسی محرومی.....

"میں نے سوچا..... میں یہ سب نہ سنوں گی نہ دیکھوں گی تو ذرا سکون رہے گا۔ باقی جو آپ کہیں۔" وہ ان کے سینے سے لگی کہہ رہی تھی۔

سب کو حرف حرف سے سچائی کی مہک آنے لگی۔ ہائے جانے انجانے میں کیسے اس کی دل گرفتی کا باعث بن گئے سب..... فیصلہ ہو گیا۔

اب مسئلہ فوری رقم کا تھا۔ فرحت آرا نے اپنے جمع جتھے سے اور اشعر سے رقم منگوا کر اوپر بنے دو کمروں کو سیٹ کروایا۔ کچن' واش روم وغیرہ..... اور تب کے اوپر چڑھے میاں بیوی جب اترتے' جب ناگزیر ہو جاتا۔

اور اسی اظہر نے پورشن بنواتے وقت جس خالی جیب کا ذکر کیا تھا۔ وہ جیب فلیٹ بک کروانے میں خالی ہوئی ہو گی۔

"میں فیصلہ نہیں کر سکا امی!" ثمامہ نے کہا تھا۔

"اظہر بھائی پر رحم کھاؤں یا غصہ کروں۔" تب وہ خاموش رہی تھیں۔

"آئے دن کبھی کسی کی سالگرہ' کبھی کسی کا عقیقہ..... کبھی پیدائش..... امتحان میں پاس ہو جائیں تب بھی جیب ہلکی کرو..... عید' شب برات پر تو شامت ہی آجاتی ہے۔"

فرحت آرا نے یہ جملے اپنے گناہ گار کانوں سے خود سنے تھے۔ جب ثمر کے گھر سب سے چھوٹا بچہ بہت سالوں بعد پیدا ہوا۔ سب بڑوں کے بیچ چھوٹی سی آواز دل خوش کر گئی۔ وہ تو یہ چاہ رہی تھیں کہ ثمر سے بات کر کے اسے اظہر کی گود میں دے دیں۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتیں' ثمامہ اور ثمین ایکا کر کے آگئے۔

"اظہر بھائی اور بھابھی اور طرح کے مزاج کے ہیں۔ انہیں اولاد کی کمی کا احساس تو ہے' مگر اس کمی نے ان کے دل کو گداز کرنے کے بجائے سخت کر دیا ہے۔ آپ یہ بات منہ سے بھی مت نکالنا۔"

اور وہ حیران رہ گئی تھیں' مگر جب بغور سوچا تو بالکل درست لگا۔ ہاں ان دونوں کے انداز میں بچوں کے لیے پیار اور والہانہ پن نہیں تھا۔ عجب سرد مہری اور جبری مسکان.....

"تم صحیح کہہ رہی ہو۔" اظہر حسب عادت بیوی کا ہم خیال ثابت ہوا۔

"ثمر بھائی تو بڑھ چڑھ کر دیں گے تحفے' اشعر کے بچوں کو..... دوسرے ہی دن واپس جو مل جاتے ہیں' وہ بھی باہر ملک کے تحائف..... ہمیں کون سا کوئی کچھ دیتا ہے..... ایک پرفیوم یا گھڑی..... شادی کی سالگرہ پر تحفہ دیا تو دیا..... اسی لیے میں شادی کی سالگرہ مناتی ہوں..... — اور آپ کی بھی" وہ ہنس ہنس کر اپنی عقل مندی بتا رہی تھی اور اظہر سراہ رہا تھا۔ فرحت آرا کے دل میں یہ باتیں اتر گئیں اور اظہر کی بیوی دل سے اتر گئی۔ ایسا حساب کتاب.....

چالاکیاں..... بدگمانیاں' نتیجہ نفرتیں..... کس کس کے عیب گنتیں۔

کس کی صفائیاں سنتیں' کس کو دیتیں صفائیاں.....

شاہانہ نے تو براہ راست ماں کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ

ماں سے بیٹیوں کے رشتوں کے لیے دعا کا کہتی۔ پھر یہ بھی کہتی "کوئی اچھا رشتہ ہو تو بتائیں۔" لیکن بعد میں فرحت آرا نے سنا، وہ ہر ایک سے کہہ چکی تھی۔

"امی کو کوئی اچھا رشتہ ملے گا تو وہ بیٹی کا کریں گی یا نواسی یاد رہے گی۔" فرحت آرا کے منہ پر کہتی تو وہ صاف جواب دیتیں کہ وہ ثمین کا یعنی بیٹی کا کریں گی۔ ان کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ پھر بھائیوں پر پڑ جاتی بچی... اللہ شاہانہ اور لیئق کو زندگی دے، وہ بیٹیوں کے سر پر سلامت تھے۔ مگر اس تلخ حقیقت کے باوجود یہ مقصد تو نہیں کہ وہ چاہتی ہیں کہ نواسیوں کے اچھے رشتے نہ ہوں۔ کاش شاہانہ ان کے منہ پر کہہ دیتی۔

لیکن اب... اب جبکہ سب کی حقیقتیں کھل کر سامنے آگئی تھیں۔ تو وہ ضرور ہی یہ بات شاہانہ سے کہہ دیں گی۔

لیکن کہیں گی تو کیا کیا... اور کس کس سے... اظہر کے خیال و اعمال کو وہ حالات کا مارا کہہ کر معاف کرنے کو تیار تھیں۔ مگر اشعر... اشعر ان کا سب سے پیارا بیٹا، سب سے اچھا بیٹا... اس نے کب سے ان سے جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔ وہ ان سے اپنی آمدنی چھپانے لگا جو راتوں کو فکرمندی سے ٹہلتیں کہ بچہ پردیس کاٹ رہا ہے۔

وہ یہ کہہ دیتا کہ اب ثمر اور اظہر پر ذمہ داری ڈالیں۔ اس نے جھوٹ کیوں کہا؟

اور اسی کیوں؟ کا سارا رونا تھا۔

"آپ نے کوئی ٹھیکا لیا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے، پوری ذمہ داری اٹھانے کی... امی سے کہیں، جہیز تقسیم کر دیں۔ چار بھائی ہیں خیر سے... اکیلے آپ تو نہیں... ثمامہ تو خود امی کا بچہ بن کر رہتا ہے، اس پر تو ڈالنی ہی نہیں ہے، ذمہ داری تو چلو اسے فیڈر بھیج دیں، مگر ثمر اور اظہر... اظہر کی تنخواہ جاتی کدھر ہے؟ کوئی بچہ بھی نہیں ہے۔ طے ہو جائے ثمین کی شادی... یا تو آپ فرنیچر دیں گے یا کھانا۔ زیور تو امی کے اپنے پاس سے ہو جائے گا۔"

اور وہ ثمر... تنخواہ کے رونے میں، ایک سے ایک کپڑا پہنتی ہیں بھابھی... میری سمجھ میں یہ نہیں آتا۔ پیسے پاس ہیں نہیں اور جوڑے پہ جوڑا... ادھر شاہانہ باجی نے خود سے ہی طے کر رکھا ہے۔ بیٹیوں کی شادیوں پر نان چھک کے نام پر کیا کیا اینٹھنا ہے۔

نغمانہ باجی کا طریقہ سب سے جدا... امی کو بیچ میں لانا ہی نہیں ہے۔ ڈائریکٹ ڈائلنگ ہوتی ہے ان کی آپ سے... اوہو زیادہ صفائیاں دینے کی ضرورت نہیں... مجھے سب علم ہے۔"

منجھلی اشعر سے فون پر لگی تھی۔ انہوں نے حرف بہ حرف اپنے کانوں سے سنا تھا۔ کچھ باتوں سے وہ متفق تھیں۔ ثمر والی بدگمانی پر وہ ٹوکنا چاہتی تھیں کہ اس کی بیوی کے گرمی، سردی، عید، شب برات کے کپڑے نانی، نانا دیتے ہیں۔ غریب عورت بھی بیاہی بیٹی کے لیے کچھ رقم پلو سے باندھ کر رکھتی ہے۔ وہ تو پھر اچھے کھاتے پیتے تھے۔ مگر یہ تو اب پتا لگا ناکہ وہ سب ثمر کی اپنی کمائی تھی، بس نام تھا کہ امی کے ہاں سے آئے ہیں۔

اور ثمر کی بیوی... جسے بولتے رہنے کا خبط تھا۔ ثمامہ نے بارہا ثمر سے پوچھا۔ "سچ سچ بتایئے، سوتے میں بھی بھابھی بول رہی ہوتی ہیں نا۔" وہ ہر بات بتایا کرتی تھی، کھایا پیا تک... سچ، جھوٹ، عقل مندی، بے وقوفی سب... فرحت آرا کو وہ بہت پرخلوص لگتی۔ صاف گو، صاف دل جو ہر بات کہہ دیتی ہے۔ تو وہ دراصل ان سب کو لایعنی باتوں میں لگا کر اصل بات چھپائے بیٹھی تھی۔

تو یہ بے اختیاری و سادگی ایک ملمع تھی جو اس نے خود پر چڑھا رکھا تھا۔ ورنہ حقیقت میں تو... اور ثمامہ نے بتایا کہ ثمر بھائی اس لیے لب سیے بیٹھے ہیں کہ ابھی تو آپ ابو کی پنشن اور اشعر بھائی کے پیسے جو وہ آپ کے خرچ کی مد میں بھیجتے ہیں۔ ان پیسوں سے گھر کا بجٹ خسارہ پورا کرتی رہتی ہیں کہ ثمر کہاں سے دے گا۔ وہ جیسے چل رہا ہے۔ ویسے ہی چلنے دینے کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ پھر اگر آپ کو کاروبار کا پتا لگے گا تو لامحالہ آپ مجھے بھی ساتھ لگانے کو کہیں گی کہ باہر کے

لوگ ملازم رکھنے سے بہتر ہے اپنے سگے بھائی کو رکھو' جبکہ ثمر بھائی کے خیالات یہ ہیں کہ وراثت میں تو بھائیوں کی شراکت داری سمجھ میں آتی ہے۔ ہضم ہوجاتی ہے' مگر کاروبار میں رشتے۔۔۔ رشتے کو بھی خراب کرتے ہیں اور کاروبار کو بھی۔۔۔ اور بھابھی کا ایک سنہرا قول یہ بھی ہے کہ۔۔۔ پتا لگ جائے' ایک بار فلاں کے پاس پیسہ ہے۔ سب کو ضرورتیں یاد آنے لگتی ہیں۔"

اتنے قانع' ایثار پسند ماں باپ کی اولادیں اتنی حسابی کتابی' اتنی خود غرض۔۔۔

ان کی تو سمجھ میں نہیں آتا تھا' وہ بہت سارے پیسوں کا کریں گی کیا۔ دونوں میاں بیوی اپنے اپنے حساب اور بساط کے مطابق محنت کرتے تھے اور بے نیازی سے گھر میں کھپا دیتے تھے۔

دونوں کی آف شور سرگرمیاں تھیں۔ مگر وقت آتا تو شوہر جاتیں۔ شوہر اور ساس نے قطعیت سے کہا تھا انہیں ان کے پیسوں کی ضرورت نہیں۔

مگر ضرورت پڑنے پر وہ اپنا حصہ لے کر پہنچ جاتی تھیں۔

"یہ کہاں سے آئے؟" شوہر پوچھتے ضرور۔۔۔

"میں نے کمیٹی ڈال رکھی تھی۔"

"تم نے بتایا نہیں۔"

"پہلے دن طے ہوا تھا' آپ پوچھیں گے نہیں۔۔۔ اور میں بتاؤں گی نہیں' پیسے کہاں سے آرہے ہیں۔ کہاں جارہے ہیں۔"

"دو دکانوں کی جگہ تم تو اب سات دکانوں کو مال سپلائی کررہی ہو فرحت۔۔۔!" شوہر صاحب کے لہجے میں مسرت آمیز استعجاب ہوتا۔

"ہاں نا۔۔۔ کب سے۔۔۔" وہ سادگی سے مان لیتیں۔

"تم نے بتایا نہیں۔۔۔"

"آپ نے بھی تو نہیں بتایا تھا۔ اپنے سائڈ بزنس کا۔۔۔" وہ بغور دیکھتیں۔

"بتایا نہیں تو چھپایا بھی نہیں۔ یوں ہی چھوٹے موٹے ہاتھ مارنے کی کوشش کرتا ہوں فرحت۔۔۔ جو بھی کرتا ہوں اس گھر ہی کے لیے تو کرتا ہوں۔ جو بھی کماؤں' بچاؤں۔۔۔ لاتا تو اسی گھر میں ہوں اور جہاں تک نہ بتانے یا بقول تمہارے چھپانے کی بات ہے تو۔۔۔ میں تو خود سے بھی چھپاتا ہوں۔ یہ سب میری چھوٹی چھوٹی سی کوششیں ہوتی ہیں جنہیں میں اپنے گھر والوں کی خوشیوں اور آرام کی خاطر کرتا ہوں۔ دنیا چلانے کے لیے اللہ ہی نے یہ طریقہ رائج کیا ہے۔ اللہ خود سے کبھی مدد کرنے نہیں آتا۔ وہ ایک انسان کے لیے دوسرا انسان مقرر کردیتا ہے۔ اپنی اپنی باری آنے پر سب اپنا اپنا فرض ادا کردیتے ہیں۔ میرے لیے میرا باپ مددگار تھا۔ میں اپنے باپ کا مددگار بنا اور کل کو میرے بچے بھی اسی نہج پر چلیں گے۔ کائنات کا نظام ایسے ہی چلتا ہے۔"

وہ ان کی ہر بات پر سرہلا رہی تھیں۔ مگر آج۔۔۔ ابھی۔۔۔ پتا نہیں ثمر۔۔۔ اشعر اور اظہر ٹھیک تھے یا غلط۔۔۔ اور ثمامہ نے کہا "لوگ آف شور اکاؤنٹ اس لیے بناتے ہیں کہ انہیں حساب نہ دینا پڑے۔"

ان کے بھی کتنے سارے آف شور کام تھے اور شوہر صاحب کے بھی۔۔۔ یوں جیسے وہ دونوں دور دراز سے پیدل چل کر چلو بھر پانی لاتے ہوں اور گھر کے تالاب کو بھرتا ہو۔

جہاں سے بھی کمایا۔۔۔ تھوڑا یا زیادہ۔۔۔ سب کے سامنے لاکر پوٹلی کھل ہی جاتی تھی۔

پتا نہیں ان آف شور کمپنیوں کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا۔ پانامہ لیکس نے حکومت کے بڑے بڑے ایوانوں۔۔۔ اور سیاست کے بڑے بڑے بتوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پر ان کی جان ناتواں پر جو قہر ثمامہ لیکس نے ڈھایا تھا۔ اس سے ان کے وجود کی عمارت ریزہ ریزہ ہوئی تھی۔

ایک کمیشن ان کے انصاف کے لیے بھی مقرر ہونا چاہیے تھا۔

کاش انہیں بھی بلائے کوئی بڑا نیوز چینل' کسی بڑے سے اینکر کے پروگرام میں وہ اپنا مقدمہ پیش کریں۔ جس میں ان کا دل ٹوٹا تھا۔ آنکھ بھری تھی۔

کچھ سوال ان کے۔۔۔۔ کچھ جواب لازمی۔۔۔۔

دھوکا۔۔۔ دھوکا ہوتا ہے۔ انفرادی یا اجتماعی جیسا بھی ہو۔

مگر نہیں۔ انفرادی میں یہ ہوتا ہے کہ فرحت آرا آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر تکیہ بھگوتی ہیں اور اجتماعی میں قوم ملک ملت سر پکڑ کر روتی ہے' نسلیں روتی ہیں۔

بچپن میں استاد نے بتایا تھا۔ ہر وہ کام جو چھپا کر کیا جائے' وہ غلطی ہوتی ہے۔ گناہ ہوتا ہے۔ یا پھر دھوکا ہوتا ہے۔ (چھپاتے تو وہ دونوں بھی تھے۔۔۔ مگر۔۔۔)

جن کی نیت صاف ہو' ان کا ظاہر باطن عیاں ہوتا ہے اور چھپائے نہیں چھپتا۔

اور کرنے کو تو وہ یہ بھی کر سکتی تھیں کہ سب کو سامنے بٹھا کر بتاتیں' میں جان گئی ہوں تم لوگوں کی اصلیت۔۔۔ مگر اس وقت کیا ہوتا جب وہ مکر جاتے۔ اور چلو مکر جاتے تو خیر تھی۔ اگر وہ کہہ دیتے کہ آپ کو کیا۔۔۔؟ ہم بتائیں یا چھپائیں' تب کیا وقعت رہ جاتی۔

ٹھیک ہے پھر۔۔۔ وہ دھوکا دے کر خوش تھے۔ تو وہ تو پھر ماں تھیں۔ مائیں جو اولاد کی خوشی میں خوش رہتی ہیں۔ وہ یہ دھوکا کھانے کو تیار تھیں۔

انہوں نے ثمامہ اور ثمین دونوں کو منہ بند رکھنے کی تاکید کی۔ اور وہ خود کبھی ایک کمزور عورت نہیں رہی تھیں۔ اس بار بھی گویا ڈوب کر ابھری تھیں۔

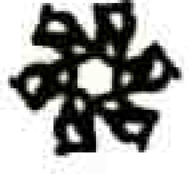
ان کی بڑی اولادوں نے اپنی اولادوں ہی کے لیے تو سارے پلان بنائے تھے' تو وہ بھی اب صرف ثمامہ اور ثمین کو دیکھیں گی۔ وہ نہیں پورا کریں گی' اب بجٹ خسارہ۔۔۔ وہ ان دونوں کو اپنے عزائم بتا رہی تھیں۔

"میں کسی سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔" ثمین کے سوال پر انہوں نے کہا تھا اور ثمامہ لیکس کا انجام۔۔۔ ممتا کے ہاتھوں فقط در گزر رہا

اور بات کریں اگر پاناما لیکس کی تو۔۔۔

یہ دورِ فاروقیؓ نہیں جب مالِ غنیمت میں آنے والے کپڑے میں سے غلط تقسیم کے شبے میں ایک عام آدمی خلیفہ وقت پر انگلی اٹھا کر سوال کر سکے۔ جواب مانگے اور خلیفہ اسے مطمئن کر دے۔

اسی لیے بعض جوابات کے لیے روز محشر کا انتظار کرنا پڑے گا۔ جب زبان نہیں بولے گی' مگر جسم کا رواں رواں زبان بن جائے گا۔



ثمینہ عظمت

میڈا بھی تے کوئی ہووے

"یا ہو..." ادل نے ہمیں دیکھتے ہی ایک نعرہ مستانہ بلند کیا اور فرائی پین میں جو وہ ملغوبہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس کا نام بارہ تو کیا بتیس ممالک کے شیف کے لیے مل کر بھی دنیا کی کسی ریسیپی بک میں تلاش کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

"ارے... " علی کہتے ہی رہ گئے... "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"اب کیا جوان جہان، چاق و چوبند، ہشاش بشاش چست و چالاک، سگھڑ و سلیقہ شعار..."

"اب کہہ بھی چکو یا اردو گرائمر کی مشق ہی کرتے رہو گے۔" میں نے اکتا کر کہا۔

"اور ایم اے اردو فرسٹ کلاس..." اس نے جھوٹی تعریف سے جملہ مکمل کیا اور پرجوش انداز میں بولا... "بہن کے ہوتے ہوئے میں اپنی ہی بنائی یہ بے ہودہ ڈش کھاتے ہوئے اچھا لگوں گا۔" اب اس نے معصومیت اختیار کرلی اور اپنا موٹا گیلو سامنہ اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھتے ہوئے نہایت دردانگیز انداز میں بولا۔

"میڈا بھی تے کوئی ہووے۔" (میرا بھی تو کوئی ہو)

"تم نے پانچ سال میڈیکل میں کیا جھک ماری ہے۔ ایک انڈا تک ڈھنگ سے نہیں تل سکے۔" علی نے میہنڑاں (طعنہ) دیا۔

"یار! میرے لیے ایک شیروانی سی دو گے؟" ادل نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہائیں؟ شیروانی؟ پاگل ہو؟"

"جب تم ایک ایم بی بی ایس سے توقع رکھ سکتے ہو کہ وہ ایک انڈا ڈھنگ سے تل لے تو میں بھی یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ ایک ایم بی اے کو شیروانی سینی بھی آتی ہو اور واضح رہے کہ چانڈ کا میڈیکل کالج میں نہ زبیدہ آپا کی کلاس ہوتی ہے، نہ ناہید انصاری کی، نہ ذاکر، نہ طاہر، نہ گلزار..."

اف ادل ایک بار شروع ہوتا تو اسے چپ کروانا مشکل تھا "شیفس کے نام تو تمہیں ایسے یاد ہیں جیسے



ناولٹ



بیماریوں یا دواؤں کے نام۔۔۔۔۔“

”کیا کروں؟ سارا دن کوکنگ چینل دیکھ کر کبھی دل خوش کرتا ہوں اور کبھی دل جلاتا ہوں اور چائے پاپے کھا کر سو جاتا ہوں۔“ وہ رقت آمیز لہجے میں بولا۔

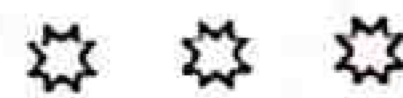
”اچھا‘ اور وہ تمہاری ”ناہید“ کیا ہوئی؟“ میں نے پوچھا۔

”اللہ بھلا کرے ناہید کا‘ جس کی بدولت کراچی کی خواتین کے گھر چل رہے ہیں اور اللہ بھلا کرے منے لاہوری اور بھائی سلو کا‘ جب آتے ہیں تو ”ناہید سپر مارکیٹ“ سے انواع و اقسام کی چیزیں لا کر فریزر بھر جاتے ہیں۔۔۔۔ لیکن آخر وہ چیزیں بندہ کب تک کھا سکتا ہے۔ میں ترستا ہوں‘ دال چاول کے لیے‘ پلاؤ کے لیے‘ سبزی کے لیے‘ چٹنی کے لیے۔ اب اٹھو اور دال چاول بناؤ۔ بہت بھوک لگی ہے اور کیبنٹ میں شکار پور کا مشہور اچار جو دراصل غریب آباد‘ جیکب آباد میں بنتا ہے‘ رکھا ہے۔ وہ نکال لینا اور ہری مرچوں والی چٹنی اور کل بریانی بنانا اور پرسوں۔۔۔۔“

”اب مہینے بھر کا مینو نہ بنانے بیٹھ جانا۔ ہم دو دن کے لیے آئے ہیں۔“

”آں۔۔۔۔ آں۔۔۔۔“ ادل نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ تکیے میں منہ چھپالیا اور سسکتے ہوئے بولا۔

”میڈا ابھی تے کوئی ہووے۔“



اگلے دن بلا مبالغہ بریانی کی چوتھی پلیٹ تیسری مرتبہ کھاتے ہوئے وہ بولا۔ ”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔۔۔۔“ ہم دونوں نے کھانے سے ہاتھ روک کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”کہ آخر اماں امیر‘ آپا منا‘ باجو‘ ممی‘ حنہ‘ زلے‘ ابلی‘ صبورانی‘ انجو‘ نورے اور تم۔۔۔۔“ اس نے ایک سانس میں ماں‘ خالہ‘ بہنوں‘ بھابھی اور خالہ زاد بہنوں سب کے نام گنوادیے۔ ”ایک جیسی بریانی کیسے بنالیتے ہو۔“

”اہم۔۔۔۔ اہم۔۔۔۔“ میں نے کن انکھیوں سے ڈسٹ بن کی طرف دیکھا اور نہایت عالمانہ‘ فاضلانہ‘ خطیبانہ انداز میں کہا۔

”یہ جینٹر ہے بیٹا جی‘ ویسے تو تم بڑا میڈیکل میڈیکل کرتے ہو۔۔۔۔ یہ فن ماں سے بیٹی میں منتقل ہوتا ہے اور ہماری ماؤں کا کمال فن یہ ہے کہ وہ اپنی بہوؤں کو بھی بیٹیاں سمجھتے ہوئے ان میں یہ فن جوں کا توں منتقل کردیتی ہیں اور یہ اللہ کی قدرت بھی ہے‘ فن نسل در نسل منتقل ہوتا ہے اور پھر جو لڑکیاں خاندان میں باہر سے آتی ہیں تو پہلے سے یہ طے ہوتا ہے۔۔۔۔“ خطابت کے وہ سارے گر جن کے بل پر میں نے ادل پر بچپن سے رعب ڈالا ہوا تھا‘ اس وقت آزما رہی تھی اور وہ ہمیشہ کی طرح بریانی کھانا بھول کر منہ پھاڑے میری تقریر سن رہا تھا۔

میں نے اس کی حیرت کا فائدہ اٹھایا اور پانی پینے کے بہانے اٹھ کر سامنے نظر آتے ڈسٹ بن کو کچن کاؤنٹر کے نیچے کھسکا دیا جس میں اس بریانی مسالے کا پیکٹ صاف نظر آرہا تھا جو اماں امیر آپا منا‘ باجو‘ ممی‘ حنہ‘ زلے‘ ابلی‘ صبورانی انجو‘ نورے اور۔۔۔۔ میں استعمال کرتے تھے۔



ادل کا کراچی والا فلیٹ ہمارے لیے ایک ڈریم لینڈ تھا۔ سہولتوں سے آراستہ‘ پرسکون۔ ٹی وی‘ فرج‘ اے سی‘ کمپیوٹر‘ نیٹ کنکشن‘ یو۔ پی۔ ایس۔ اس سے زیادہ بندہ اور کیا چاہ سکتا ہے۔ اور ادل میرا سویٹ سا کزن‘ چٹورا اور پیٹو ہونے کے علاوہ اس میں کوئی خرابی نہیں تھی اور بے چارہ زیادہ تر تو ڈیوٹی پر رہتا یا رات کا کھانا کھاتا یا دوپہر کا اور وہ بنانا میرے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ باقی وقت ہم ادھر ادھر گھومتے یا گھر پر بیٹھ کر فلمیں دیکھتے۔

یوں تو کراچی میں دوسرے بہت سے رشتے داروں کے گھر تھے لیکن بھرے پرے گھروں کے مقابلے میں یہاں کتنا مزا اور سکون تھا۔ بس ڈر اس دن کا تھا جب ادل کی شادی ہوجاتی اور یہاں اس کی بیوی آجاتی۔۔۔۔ ہم ”اماں امیر کی تاکید پر پابندی سے اس کے پاس آتے

رہتے تھے اور اسے اچھے اچھے کھانے کھلانے کے ساتھ ساتھ اس کے کنوارے ہونے پر رشک کرتے ہوئے اُسے شادی کے نقصانات سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

☆ ☆ ☆

"یار مجھ کسی کو میرا خیال ہی نہیں، میرے سارے دوستوں کی شادیاں ہوتی جارہی ہیں ایک ایک کرکے، آصی، کاشی، فدا، سیفی، نازش سب کی شادی ہوگئی۔" ادل نے املی کی چٹنی کے ساتھ پکوڑے کھاتے ہوئے کہا۔

میں نے زبردستی مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ پتا نہیں کیوں ادل کی شادی کا خیال آتے ہی مجھے ایک خرانٹ سی لڑکی ہمیں ہمارے گھر کا راستہ دکھاتی نظر آتی تھی۔

"ہوجائے گی شادی بھی ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔" میں نے مدبرانہ انداز میں کہا۔

"کیا مطلب انیس، تیس سال کا ہونے والا ہوں۔"

"گدھا کہیں کا۔" میں نے غصے میں اسے چٹکی کاٹی اور چپکے سے علی کو دیکھا لیکن وہ ٹی وی کی طرف متوجہ تھے۔

"تم لوگ بھی نا! شادی کے شوق میں اپنی عمریں بڑھائے جاتے ہو۔" میں نے علی کو بتا رکھا تھا کہ ادل پچیس سال کا ہے اور میں اس سے چار سال بڑی ہوں۔ یعنی کہ ابھی میں خود ہی تیس کی نہیں ہوئی اور یہ گدھا۔

"اپنے میاں کو دیکھو، عائشہ خان کو کیسے دیکھ رہا ہے مستقل۔"

"دیکھنے دو۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ ادل بھی اسکرین کی طرف متوجہ ہوگیا اور بولا۔

"گھٹ وچ گھٹ ایٹری تے ہووے۔" (کم از کم ایسی تو ہو۔)

"ہر خوب صورت لڑکی دیکھ کر تم ایسے ہی کہتے ہو۔" میں نے کہا۔

"بڑی بے وفا ہیں یہ لڑکیاں اور ان سے بڑھ کر بے مروت میری بہنیں، سارا دن انٹرنیٹ پر بیٹھی رہتی ہو لیکن یہ معلوم کرکے نہیں دیا کہ عثمان، عنیقہ کا باپ ہے یا شوہر، حتیٰ کہ وہ لاپتا ہوگئی پھر وہ ڈاکٹر مزنہ، ہاؤس جاب میں بھی میرے ساتھ تھی لیکن تم لوگوں نے اس کے پتا نہیں کون کون سے وڈیو سونگ دکھا کر مجھے دلبرداشتہ کردیا۔ عینی سے تو میں خود ہی دستبردار ہوگیا کہ اس کی انگلش کا توڑ میرے پاس نہیں تھا لیکن صنم بلوچ میں بھلا کیا برائی ہے، اتنی خوب صورت ہے، اپنی بلوچ، اپنی سندھن، نیاڑیں نماڑیں۔"

"بھول جاؤ اب وہ پہلے ______ ______ والی صنم نہیں ہے، جسے تم چاند کا سے ای میلز کیا کرتے تھے۔ وہ نور پور کی رانی سے بھی آگے جاچکی ہے۔"

"اف، میرے کانوں میں اب تک وہ آواز آتی ہے جب وہ میرا نام لیتی تھی۔"

"اس وقت KTN اور انٹرنیٹ دونوں نئے تھے اس لیے تمہاری ہر میل پڑھ دی جاتی تھی۔"

"بھلا صنم جنگ۔" اس نے پُرامید نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"اب اٹھ جاؤ مجھے شاپنگ کے لیے جانا ہے ورنہ میں اعلان جنگ کردوں گی۔" وہ چپ چاپ اٹھ گیا اور خوب بن ٹھن کر، پینٹ شرٹ پہن کر کالا چشمہ لگا کر کمرے سے نکلا اور کونے میں کھڑا ہو کر اسٹائل سے پوچھنے لگا۔

"فہد مصطفیٰ لگ رہا ہوں؟"

"فرحان بلوچ لگ رہے ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"ہائے!" وہ ایک دھاڑ مار کر فرش پر گر گیا اور سسکیاں لینے لگا۔ مجھے اپنی شاپنگ خطرے میں نظر آئی تو فوراً اسے منانے لگ گئی۔

"میرے بچے! میں مذاق کررہی تھی اور ویسے فرحان بلوچ اتنا بھی برا نہیں ہے۔"

"اچھے برے کی بات نہیں۔" وہ مصنوعی آنسو

پونچھنے لگا۔ "صنم بلوچ کا بھائی ہے وہ۔" وہ پھٹ پڑا۔

"اوہ۔۔۔"

"میڈا بھی تے کوئی ہووے۔" اس کا واویلا شروع ہوگیا۔



خاندان کے سارے لڑکوں کے دماغ میں شادی کا کیڑا گھسانے کا کام منے لاہوری کا تھا۔ ان ہی کی بدولت بھائی سلو دولہا بننے کی عمر میں نانا' پھپو رشتہ بھجوانے کی عمر میں ابا' کاشی "چھاڑیں بازی" کی عمر میں شوہر نامدار اور آصی اسکول جانے کی عمر میں منگیتر کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ اگر اول اب تک ان کی پلاننگز سے بچا ہوا تھا تو اس کی ایک بڑی وجہ تو اماں امیر اور دوسرے خود اس کے اپنے افعال اور نصیب تھے (کچھ دخل ہماری سیاست کا بھی تھا) اماں امیر کو پرانی پاکستانی فلموں کے ہیروز کی اماؤں کی طرح اول کو ڈاکٹر بنانے کا سودا سوار تھا سو منے لاہوری کے کسی بھی منصوبے کے آڑے ان کا لحیم شحیم وجود آجاتا تھا۔ اول کے کنوارے پن کی دیگر وجوہات کو فی الحال التوا میں ڈال کر ہم منے لاہوری کا تعارف مکمل کرتے ہیں۔

نام تو ان کا منیر تھا لیکن ساری خلائیں اور اماں امیر' پیار سے انہیں منا کہتی تھیں۔ موصوف خود بھی جلد از جلد دولہا بننے کے شوق میں دیوار پر جلی حروف میں "منیر مر چکا ہے" لکھ کر چھ سات بار گولیاں ۔۔۔ پھانکنے کی وارداتیں کر چکے تھے۔ اور ایک بار روٹھ کر لاہور چلے گئے۔ کئی دنوں کی تلاش کے بعد کسی نے اطلاع دی کہ داتا دربار میں ان کی شکل سے ملتا جلتا ایک باریش بزرگ دیکھا گیا ہے۔ مزید تفتیش کرنے کے لیے جیکب آباد سے ان کے دوستوں اور رشتے داروں کا ایک قافلہ بذریعہ شالامار ایکسپریس ۔۔۔ روانہ ہوا اور جب قافلے کے سارے لوگ ہنستے کھیلتے' پکنک مناتے ہر اسٹیشن پر اتر کر شاپنگ کرتے اور کوپے کے اندر سلیم شیخ کی "چیف صاحب" دیکھتے لاہور اور پھر داتا دربار پہنچے تو انہوں نے اس باریش بزرگ کو ایک اخبار کے ٹکڑے جس پر شاید کچھ پکوڑے لے کر کھائے گئے تھے کا بغور معائنہ کرتے ہوئے پایا۔

مزید جائزے پر پتا چلا کہ اخبار میں موجود ایمان علی کی تصویر دیکھتے ہوئے ٹراؤزر کے نئے ڈیزائن پر غور کر رہے تھے اور بڑبڑا رہے تھے "اچھا لاہور میں اب ایسا فیشن ہے۔" اس کے بعد مزید کسی تفتیش کی ضرورت نہ رہی اور سارے قافلے نے بمعہ منا لاہوری کے نہ صرف انار کلی اور لبرٹی سے شاپنگ کی بلکہ عمران خان کے نئے بنتے شاپنگ پلازہ میں جاکر چیزوں کو دور دور سے اور بعض کو چھپ چھپ کر ہاتھ لگا کر دیکھا اور مینار پاکستان پر فوٹو کھنچوا کر اور علامہ اقبال کے مزار پر حاضری دینے کے بعد واپس جیکب آباد بذریعہ شالامار' جاوید شیخ اور نیلی کی "مشکل" دیکھتے ہوئے واپس پہنچا تو سب گھر والوں نے تھال بجا بجا کر ان کا استقبال کیا اور بدی نے ان کو بصد احترام "منا لاہوری" کا خطاب عطا کیا جو زبان زد عام ہوگیا۔

یہ ان ہی کا کارنامہ تھا کہ بقول کاشو "لڑکوں کو اپنی باتوں کے جال میں پھنسا کر ایک ایسی کھڑکی کھول دیتے جہاں سے ایک جنت نظیر مقام بمثال گھر' دریچہ' معصوم سا بچہ اور خوبصورت' خوب سیرت شریک حیات نظر آتی اور لڑکے باقی سارے مقصد حیات بھلا کر گھر بنانے کی جستجو میں مبتلا ہو جاتے۔"

کسی بھی تقریب میں موجود ہوتے تو سارے لڑکے لڑکیوں کو غور سے دیکھ دیکھ کر ممکنہ جوڑے بنانے میں مشغول رہتے حتیٰ کہ جب محترمہ بے نظیر بھٹو کی اچانک موت کی خبر بریک ہوئی تو انہوں نے ایسا بین ڈالا (کیونکہ ان کے فین تھے) کہ ان کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ روتے جاتے تھے اور بولتے جاتے تھے اور اس وقت بھی ان کی رائے یہ تھی کہ اگر بلاول اور فاطمہ کی شادی کر دی جائے تو نہ صرف خاندانی اختلافات دور ہو جائیں بلکہ پارٹی کو تقویت ملے گی۔ اگر ذوالفقار جونیئر کو بھی بختاور یا آصفہ سے جوڑ دیا جائے تو سونے پر سہاگہ والی بات ہوگی۔

تو ایسے زبردست پلانرز کی موجودگی میں اول نے نہ

صرف بارہ جماعتیں خیریت سے پاس کرلیں بلکہ میڈیکل کے پانچ سال بھی اس کے کنوارے پن پر کوئی آنچ نہ آئی اور ہاؤس جاب بھی بغیر منگنی کے گزر گیا تو یہ منے لاہوری کے لیے مقام عبرت تو تھا ہی' خود ادل کے لیے وجہ ذلت بن گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ بیان ہوچکا کہ اس میں اماں امیر اور خود ادل کے نصیبوں اور افعالوں اور کچھ (محلاتی سازشوں) کا دخل تھا۔

باجو' ہی' ابلی' صبو اور میرا پکا ارادہ تھا کہ جب تک ادل کی گاڑی میں کراچی کا چپہ چپہ نہ گھوم لیں' ہر ہوٹل اور ڈھابے میں کھانا نہ کھالیں (اسی کے پیسوں سے) اس کی شادی نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے تو حنہ' زلے' انجو' نورے' سب آئیڈیل بھابیاں تھیں لیکن ادل کی "اعلا تعلیم" سے ہمیں یہ خدشہ لاحق ہوگیا کہ ضرور کراچی کی کوئی تتلی اسے پکڑے گی اور ہم تو کراچی کی لڑکیوں سے بھی ایسے ہی خوف زدہ تھے جیسے کوئی گوری میموں سے ہوتا ہے۔ اور تو اور خود اپنے شہر اور اپنے خاندان کی لڑکیوں سے کچھ بعید نہ تھا کہ کوئی "ڈاکٹر صاحب" کی بیوی بن کر اور کراچی کی بتیاں دیکھ کر اپنی اوقات بھول جائے اور ہمیں ہماری اوقات یاد دلادے۔

ادل کچھ ایسا بھی "لالی پاپ" نہ تھا کہ سب لڑکیوں کو بہن بنالیا ہو بلکہ اس زمانے میں جب وہ نبیل کی طرح دکھتا تھا اور نبیل ابھی منور ظریف نہ بنا تھا تو وہ لڑکیوں کی توجہ کو اچھی طرح انجوائے بھی کرتا تھا اور جب "دھواں" میں داؤد کی موت کے اگلے دن 'کالج میں سکھر کی شازیہ **کھمرو** نے بے ساختہ "داؤد" کہہ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اس پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی تو ادل "دھواں" بن کر اڑ گیا۔

معاملہ بھائی جان (منے لاہوری) تک پہنچا کہ ایسے معاملات کی بو پانے میں وہ آج کے کسی بھی صحافی سے اس زمانے میں بھی سات قدم آگے تھے۔ انہوں نے فوراً" اپنا نیٹ ورک پھیلایا جو جیکب آباد سے شروع ہوکر شکار پور سے ہوکر سکھر پہنچا' سارے دوستوں کے شجرے کھنگال کر کھمرو فیملی کا شجرہ معلوم کیا اور اس ساری کارروائی سے اماں امیر سمیت ہم سب کو لاعلم رکھا لیکن ان کے کارندے جو خبر لائے وہ نہایت حوصلہ شکن تھی۔

شازیہ **کھمرو** کا نکاح اپنے کزن سے ہوچکا تھا جو ہمایوں سعید سے ملتا جلتا تھا۔ اس دن بھائی جان نے جلالی انداز میں تعلیم نسواں کے خلاف تقریر کرتے ہوئے فتویٰ دیا کہ "منگنی شدہ اور نکاح شدہ لڑکیوں کو کو ایجوکیشن کالج میں آکر پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔" اور ادل بے چارہ یہ سوچتا رہا کہ اگر پڑھنے آہی گئی ہیں تو ہمایوں جیسے منکوح کے ہوتے ہوئے نبیل پر ملتفت ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر کار دو تین دن تک انوپ جلوٹا کی غزلیں سننے' ڈان ہوٹل پر رات گئے تک چائے سے شغل کرنے اور عاشر عظیم کو دو تین گالیاں دینے کے بعد وہ پھر سے پڑھائی میں مشغول ہوگیا۔



ان ہی دنوں ابلی کی شادی کا غلغلہ اٹھا اور شادی بیاہ کے دن ہی وہ ہوتے ہیں جب شریف گھروں کی خواتین و حضرات' بچے اور بچیاں ایک دوسرے میں بعد نماز عید کی طرح گھل مل جاتے ہیں اور ذرا ڈھولکی بجاؤ گوریو' مہندی لگا کے رکھنا اور دیدی تیرا دیور دیوانا جیسے شریر گیت انہیں گھلنے ملنے کے مزید مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ایسی ہی تقریب کے دوران جب باجو، ہی اور حنہ تنقیدی نظروں سے ابلی کی ساس اور نندوں کا جائزہ لے رہی تھیں' انجو اور نورے اپنی "دوہریاں" (ہار) سیٹ کرنے میں مشغول تھیں' میں' بدی' کاشی ان کی خواتین کے حلیوں کے مطابق سر جوڑ کر جلدی جلدی پیروڈیز بنانے میں مشغول تھے کہ منے لاہوری اور ادل کی نگاہ انتخاب ایک ساتھ (یہ آج تک طے نہیں ہوسکا کہ پہلی نظر کس کی پڑی تھی۔ منے کی یا ادل کی یا دونوں کی ایک ساتھ) بارات کے ساتھ آئی ہوئی ایک سکھی پر پڑی اور بقول ادل کے دوسری نگاہ شیطان کی ہوتی ہے' اس لیے پہلی نگاہ کا دورانیہ ہی کم از کم

پندرہ منٹ ہونا چاہیے۔ ادھر منے کی آنکھ کے کیمرے نے لڑکی کو "زوم ان" کیا اور بلاشبہ 'بلامبالغہ' حسین پایا' فوراً" ادل سے کہا۔

"گھٹ وچ گھٹ ایٹری تے ہووے۔" (کم از کم ایسی تو ہو)"

"ودھ وچ ودھ بی ایٹری ہووے بھائی جان۔" (زیادہ سے زیادہ بھی ایسی ہو بھائی جان۔)

بس پھر کیا تھا بھائی جان نے باجو ہمی' حنہ' نورے' انجو سب کو الرٹ کیا کہ تنقیدی جائزے بند کریں اور دولہا والوں کے ساتھ تعلقات بہتر بنائیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک نہایت سفاک جلاد کی طرح انہوں نے ہماری نقالی کا قلع قمع کر ڈالا اور "تمیز کے دائرے" میں رہنے کی تلقین کی۔ ہم بڑے آگ بگولہ ہوئے لیکن اس وقت منے کے چہرے پر جو جلال تھا' وہ جلال چانڈیو سے کم نہ تھا لیکن ہم نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو "داشو مسٹ گو آن" کے اشارے کیے اور مطمئن ہو گئے۔

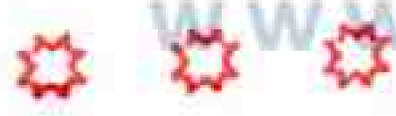
ادھر بھائی جان اور ادل "اج کھنجھرتے' کیٹی بندر تے۔" اور "چنڑ جو ٹکرو لگیں تھو اج تہ توں" پر محو رقص دولہا والوں کی ساری آنٹیوں باجیوں اور بچیوں سے تعلقات استوار کرتے رہے۔ اماں امیر اور ابا منا نے معاملے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے جلد از جلد رسمیں ختم کرنے کی تاکید کی لیکن پھوپھی اشرف اور نجی ڈھول اور شہنائی پر "چھڑ" چکی تھیں اور ان کا ساتھ دینے کو سلو' بین' روبی' لالی سب میدان میں اتر چکے تھے۔

ادھر منا اپنی شاطرانہ چالیں چلتے ہوئے لڑکی کا تعارف حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ دولہا کی بہن کی نند تھی۔ ادھر ادل کو' جو اپنے ازلی یار غار کاشی کو شریک راز کر چکا تھا اور مجھ سے بھی نہ چھپا سکا تھا تو اب وہ اور کاشی تو کیمرے سے لڑکی کی تصویریں لینے کی کوشش میں تھے جبکہ میں یہ سوچ رہی تھی کہ ادل کو باز کیسے رکھا جائے۔ اس وقت میرے ذہن میں کراچی والے مذموم ارادے دور دور تک نہ تھے۔ بس اماں امیر کی طرف سے تفویض شدہ یہ سیکرٹ مشن یاد تھا کہ ایم بی بی ایس کے فائنل تک ادل کو شادی سے بچانا ہے ورنہ ڈاکٹر بننے سے پہلے ہی وہ چار عدد "ٹلر" (ناک بہتے ہوئے) بچوں کا باپ بن چکا ہو گا۔

اس ڈرامے کا ڈراپ سین اگلے دن ہی ہو گیا جب ایلی کے جہیز کے کپڑوں کی بے مثل ڈیزائننگ دیکھ کر اس کی بڑی نند انگشت بدنداں رہ گئی اور بھائی جان سے التجا کی کہ وہ اگلے مہینے ہونے والی اس کی نند کی شادی کے ڈریسز بنوانے میں اس کی مدد کریں۔

"کک۔۔۔ کون سی نند؟" بھائی جان ہکلا گئے اور ظاہر ہے وہ نند اور کون ہو سکتی تھی؟ اس رات منے لاہوری نے لڑکیوں کی بے شرمی پر لمبی چوڑی تقریر کی کہ شادی کی ڈیٹ فکس ہونے کے بعد پرائی شادیوں میں اتنا تیار ہو کر جانے کی کیا ضرورت ہے اور ادل نے نہایت اندوہناک انداز میں اپنا مشہور زمانہ شعر ارشاد فرمایا۔

ہم نے جس پر نگاہ ڈالی اس کی شادی ہو گئی
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں



"چار چیزیں ہیں جو دسمبر میں مجھے اپنی طرف بلاتی ہیں۔" علی ٹی وی کے کسی اسپورٹس چینل سے نشر ہونے والے پرانے میچ میں سعید انور کی بیٹنگ دیکھ کر اسی طرح دل خوش کر رہے تھے۔ جیسے ہم معاشرتی علوم کی کتابوں میں اپنے اسلاف کے کارنامے پڑھ کر کرتے ہیں۔ میں "دو گھنٹے" سے انٹرنیٹ پر ٹائم مینجمنٹ کے مختلف آرٹیکلز پڑھ رہی تھی کہ "ایک ایک منٹ" کیسے بچایا جائے۔ کہ ادل نے یہ بیان جاری کیا۔

"راکھ پڑھ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ان میں ایک تو حنہ کے ہاتھ کی بنی ہوئی سبزی ہے' گڑ کی روٹی' دوسری ماسی سلطان کی بنی ہوئی چائے' تیسری ڈان ہوٹل کی چائے اور چوتھی باجو کے ہاتھ کی چاول کی روٹی اور ساوی (ہری) چٹنی۔" وہ میری بات نظر انداز کرتا۔ کہتا گیا۔

"چٹورے' چاروں چیزوں کا تعلق کھانے پینے سے

ہے۔" میں نے طنز کیا۔
"نہیں..." اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "چاروں چیزوں کا تعلق "جیکب آباد" سے ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ جب ایک لاہور کا رہنے والا "لہور لہور ہے" یا "لاہور نہیں دیکھیا تے جمیا ہی نہیں" کا نعرہ لگاتا ہے تو اس کی وجہ کیا یہ ہوتی ہے کہ لاہور ایک بڑا شہر ہے؟ یا پنجاب کا کیپٹل ہے؟ نہیں' اس لیے کہ وہ اس کا اپنا شہر ہے۔ اس لیے میں بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ جیکاد (جیکب آباد) جیکاد ہے۔"
ہم سمجھ گئے کہ اس پر "گھر سے دوری" کا دورہ پڑ چکا ہے۔
"ادل!" میں نے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔ "لاہور والا ٹرپ یاد ہے؟"
"ہاہاہا۔" وہ قہقہہ لگا کر اٹھ بیٹھا۔
"سات چالاک آدمی۔" ہم دونوں بے تحاشا ہنسنے لگے۔ علی نے ہماری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ہم انہیں دورہ ملتان و لاہور و اسلام آباد براستہ بہاولپور کی تفصیلات سنانے لگے۔

☆ ☆ ☆

ورلڈ کپ 96 کی شکست کا غم دور کرنے کے لیے منے لاہوری نے ہمیں لاہور کا دورہ کروانے کا عظیم فیصلہ کیا اور میں' ادل' کاشی' ممی' صبو' بھائی جان خود اور ڈرائیور بشیر پر مشتمل سات لوگوں کا قافلہ علی الصبح جیکب آباد سے ملتان روانہ ہوا اور دو دن ملتان ہی ڈھونڈتا رہا۔ ہر دو کلو میٹر کے بعد بھائی جان "انڈھے بھی ملتان لبھیا" (اندھے نے بھی ملتان ڈھونڈ لیا) کی مقامی ضرب المثل دہراتے رہے جو ہم بی بی اماں کے زمانے سے سنتے چلے آرہے تھے لیکن ہمارے خاندان کے پی ایچ ڈی غلام نبی سدھایو عرف بالو جو کہ کاشی کے والد محترم تھے سے رجوع کرنے کے باوجود ہم یہ معلوم کرنے سے قاصر رہے تھے کہ وہ اندھا کون تھا اور اس نے کب' کیوں اور کیسے ملتان ڈھونڈا تھا۔
آخر کار چودہ آنکھوں کی تلاش رنگ لائی اور ہم ملتان پہنچ گئے اور لگتا تھا کہ ملتان پہنچنا تو بس اس اندھے کو مات دینے کے لیے تھا کیونکہ بھائی جان روڈ کے دونوں اطراف چند عمارتوں کا تعارف کروا کے آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ پورے سفر کے دوران منے لاہوری کی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ بوتیک چھانے جائیں تاکہ اگلی کسی شادی کے لیے ڈیزائن چرائے جا سکیں۔ ممی اور صبو کو شاپنگ کا شوق چڑھا تھا اور مجھے ادل اور کاشی کو ہر اس جگہ اترنے کا شوق تھا جو بھائی جان کے ایجنڈے میں قطعی شامل نہ تھی۔
اسلام آباد میں تو ایک جگہ ہم نے پی سی او سے احمد فراز (اصلی) کے گھر فون بھی کر ڈالا لیکن ان کی بیگم نے بتایا کہ وہ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔
اسی طرح لاہور میں ہم نے "داستان سرائے" جانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن منے لاہوری نے ہوٹل ہی لکشمی چوک کے قریب ڈھونڈا تاکہ 'کھایا' کھایا اور خوب کھایا جائے اور پھر بازار میں زیادہ سے زیادہ جوتے' کپڑوں کا نظارا کیا جائے۔ چلتی گاڑی ہی سے میں نے چوبرجی دیکھا اور پی ٹی وی کے پروگرام "ورثہ" کو یاد کیا۔ ہمیں اس خاتون سے بھی ملنے کی بڑی خواہش تھی جن کی آواز "ورثہ" اور اس جیسے دیگر تاریخی پروگراموں میں آتی تھی۔
دو تین لوگوں سے "پاک ٹی ہاؤس" کا پوچھ کر خود کو انٹلیکچوئل ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن منے لاہوری کی موجودگی میں ایسی ساری کارروائیوں کو ہم سمیت منہ کی کھانی پڑی۔ آخر کار انہیں ایک گھنٹے سے ایک درزی کے ساتھ سلائی کے اسرار و رموز پر گفتگو میں مصروف دیکھ کر ہم وہاں سے کھسک گئے اور ایک بڑے سے بک اسٹور پر پہنچ گئے۔ میں نے ممی کو فوراً "چاند پکھراج کا" کی جانب متوجہ کیا کیونکہ دوران سفر میرے پاس یہ کتاب دیکھ کر ممی اس پر اپنی خطرناک ناگن آنکھیں جما چکی تھیں اور مجھے پورا راستہ چالی دینے سے چوز ا دینے والا انڈا' اندھیرے میں چمکتے ہند سے والی گھڑی' شب برات والا غرارہ' اشتیاق احمد کے "خودکشی کی دعوت' رلے راٹا" ٹوٹ بٹوٹ اور آنکھ

پچھلی کے کئی شمارے' اے۔ پی۔ سی سے بروس لی بنانے والی گیم' ڈنکی کونگ وڈیو گیم' لعاب لگانے سے جامنی ہوجانے والی پنسل' ببل گم کی خوشبو والے ربر' مقناطیس والا لوڈو' سلیم ملک کی تصویروں والا البم' بنا کا گیت مالا کے کیسٹ' میری سلیم بک غرض کہ ہر وہ چیز یاد آ رہی تھی جو بچپن سے لے کر صمی جون جولائی کی چھٹیوں کی سالانہ واردات میں مجھ سے ٹھگتی اور بٹورتی آئی تھی۔ اور اب مجھے اپنی شاعری کی کتاب کو اس کے قبضے سے ہر حال میں بچانا تھا۔

"چار سو روپے۔" دکان دار نے قیمت بتائی۔

"کیوں بھئی؟" میرے تیور بگڑ گئے۔ "ہم نے کراچی سے تین سو کی لی ہے وہ بھی اردو بازار سے نہیں بلکہ طارق روڈ کے ایک بک اسٹور سے۔"

"آپ مفت میں لے لیں ہم تو اس پر ہی خوش ہوجائیں گے کہ سندھ کے لوگ بھی کتابیں پڑھنے لگے ہیں۔"

"ہا...!" ہماری غیرت پر اتنا برتاوا...

کاشی جو اپنی بچپن کی پسندیدہ کتاب "رفیق روزگار" کو دیکھ کر ایک بار پھر سے نئے کاروبار کی سوچ رہا تھا' صبو ناولز کی طرف کھڑی تھی اور ادل انگلش سیکشن میں تھا۔ سب خونخوار طریقے سے دکان دار کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہوگئے۔

کاشی نے جو تاریخ رفیع الدین سے شروع کی تو مولانا عبیداللہ سندھی' جی ایم سید' ڈاکٹر نبی بخش بلوچ سے ہوتا ہوا نصیر مرزا تک آن پہنچا۔ ادل' مرزا قلیچ بیگ کے "زینت" سے شروع ہوا تو علی بابا' امر جلیل' تنویر عباسی کو لے کر آغا سلیم کے "ہمہ دوست" تک لمبی لمبی فہرستیں سناڈالیں۔

میں نے شاہ جو رسالو کے بیت شروع کیے تو استاد بخاری' شیخ ایاز' بیدل فقیر' طالب المولیٰ سے لے کر زیب سندھی تک کی نظمیں' غزلیں سناڈالیں۔ کاشی نے پھر ایوب کھوڑو سے سلسلہ شروع کیا اور بے نظیر بھٹو تک پہنچا' ادل نے شرح تعلیم کے اعداد و شمار شروع کیے۔ دکاندار بے چارہ بری طرح بوکھلا گیا' اور قسمیں کھانے لگا کہ وادی مہران کے باسیوں سے پانچ ہزار سال سے محبت کرتا ہے۔ ثبوت کے طور پر نہ صرف اس نے اپنی دراز سے شیشوں والی سندھی ٹوپی نکال کر دکھائی جو وہ نماز جمعہ کے لیے پہن کر جاتا تھا بلکہ اپنے حلق سے

"د۔ ڈیڈر' ج۔ چچ کی آوزیں نکال کر سندھ سے محبت کا ثبوت پیہم فراہم کیا۔

کاشی نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ج۔ میح اور پ۔ پکوری۔ ٹ۔ وٹ' گ۔ سنگ کا ٹیسٹ بھی لیا۔ اس کی محبت اور لسی کے ٹھنڈے گلاسوں نے ہمیں بھی ٹھنڈا کردیا۔

"قادر بخش مٹھو کا رشتے دار تھا کوئی۔" کاشی نے باہر آکر لاپروائی سے کہا۔

ہمیں جو کتابیں اس نے تحفے میں دیں ان میں ایک سات چالاک آدمی بھی تھی۔ ہم تادیر حیران رہے کہ حکومت پنجاب کو ہمارے دورہ پنجاب کی اطلاع کس نے دی کہ اس نے ہنگامی بنیادوں پر کتاب بھی چھپوالی اور کیسے معلوم ہوا کہ ہم سات لوگ ہیں جبکہ منے لاہوری کو ہم درزی سے مذاکرات اور بشیر ڈرائیور کو نان چھولے کھاتے ہوئے چھوڑ کر آئے تھے۔ اس رات ادل ہوٹل کی بالکنی میں دو گھنٹے مراقبہ فرماتا رہا اور آخر کار ارشاد فرمایا۔

"مجھے پتا چل گیا ہے کہ جب موئن جوڈرو والی نامعلوم زبان پڑھی جائے گی تو اس میں کیا لکھا ہوگا...؟"

"کیا...؟" ہم نے پوچھا۔

"میں تے ہونڈا ای لیساں۔"

کہتے ہیں کہ "میلے کی موت" (میلے کی واپسی) خراب ہوتی ہے' جب ہم لاہور' اسلام آباد' مری' بھوربن' سب گھوم چکے اور واپسی کا قصد کیا تو معلوم ہوا کہ گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی۔ لاہور ریلوے اسٹیشن کو جیکب آباد کا آبائی اسٹیشن سمجھتے ہوئے منے لاہوری نے ہم سب کو "پارلر" میں سوار کروادیا اور بیٹھو' بیٹھو کا شور مچانے

لگے، اتنی ساری سیٹیں دیکھ کر ان کے حواس جاتے رہے۔ اول اور کاشی کو چائے کے تھرماس دے کر چائے لینے بھیج دیا اور ہمیں فاتحانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"دیکھا؟ تم لوگ کہہ رہے تھے کہ سیٹیں نہیں ملیں گی۔" بشیر ڈرائیور گاڑی سمیت پہلے ہی کچھ وجوہات کی بناء پر گوٹھ روانہ ہوچکا تھا۔ جیسے ہی سیٹی بجی لوگ آکر ہمارے اوپر کھڑے ہوگئے۔

"یہ میری سیٹ ہے جی۔" ایک صاحب میرے سامنے کھڑے ہو کر کہہ رہے تھے۔ میں ہیڈ فون لگا کر جیا علی کی فلم دیکھنے میں مشغول تھی اور ساتھ ساتھ دوسری اسکرین کو بھی دیکھ رہی تھی کہ وہاں وہی فلم ہے یا کوئی اور۔۔۔ دو خواتین ممی اور صبو کو برا بھلا کہنے میں مصروف تھیں اور تین مسٹنڈے بھائی جان، اول اور کاشی سے دو دو ہاتھ کرنے میں مصروف تھے۔

عقدہ کھلا کہ دراصل قبضہ مافیا ہم تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو لاہور کا اسٹیشن دیکھنے اتر گئے تھے۔ (پینڈو کہیں کے) اب ٹرین چل چکی تھی اور ہمارا جھگڑا جاری تھا۔ آخر منے لاہوری نے انہیں اپنے چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کا واسطہ دے کر اگلے اسٹیشن تک کی مہلت مانگی۔

لاہور کینٹ پر اتر کر چائے کے وہی تھرماس جو اول اور کاشی ایمرجنسی میں بھروا کے لائے تھے، وہیں سے چکرم بسکٹ کھائے اور چائے پی۔

"کتنے چھوٹے دل کے لوگ ہیں، اتنی بڑی بڑی سیٹیں تھیں۔ دو دو کر کے بیٹھ سکتے تھے۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"ہاں! یہ تمہاری جیکب آباد سے شکار پور جانے والی مہران نہیں تھی کہ دو دو کر کے بیٹھ جاتے۔" کاشی نے مذاق اڑایا۔

منا لاہوری پُراسرار طور پر غائب ہو چکے تھے۔ اول کا اوپری ہونٹ لٹکتا جارہا تھا۔ بقول باجو، اول کے موڈ کا اندازہ اس کے اوپری ہونٹ کے لٹکاؤ سے ہوتا ہے۔ جتنا لٹکے گا اتنا موڈ خراب اور جب وہ لٹک لٹک کے نچلے ہونٹ کو بھی ڈھانپ لے تو جس کو بھی اپنی خیریت مطلوب ہو وہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکے۔"

وہ ایک بنچ سے ٹیک لگا کر سر جھکائے بیٹھا تھا اور ہماری ہمت نہ تھی کہ اس سے بات کرتے۔ میں نے اور کاشی نے منے لاہوری کو ادھر ادھر ڈھونڈا۔ ہمیں شک تھا کہ وہ چھپ کر سگریٹ پینے گئے ہیں لیکن ایک گھنٹہ گزر گیا۔

"ہائے! ہمارا بھائی ہمیں پردیس میں چھوڑ کر فرار ہوگیا۔" ممی نے دہائی دی۔

"اب یہ بھی کہیں کہ ہماری جیب بھی کٹ گئی ہے اور ہمارے پاس ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں۔۔۔" کاشی نے مشورہ دیا۔

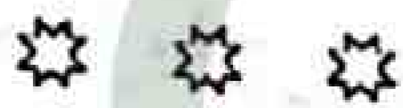
"ٹن" کی آواز پر ہم نے چونک کر دیکھا اور ہنسی روکنا محال ہوگیا۔ ایک آدمی اول کے آگے سکہ پھینک کر چلا گیا تھا۔ بے چارہ، اول کے لٹکتے ہونٹ کی تاریخ سے واقف نہ تھا۔ قریب تھا کہ بین الصوبائی جنگ چھڑ جاتی، منے لاہوری کی واپسی عمل میں آگئی۔

"پی، آئی، اے آفس گیا تھا۔" انہوں نے تھکے تھکے لہجے میں ہمیں حلیم کی تھیلیاں تھمائیں۔ جہاز میں "جھونٹے" (جھولے) کھانے کے خیال سے ہی میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"وہاں بھی سیٹیں نہیں۔" انہوں نے مایوسی سے کہا اور ہم سب کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے ان کے ہاتھ میں پکڑے تھیلے کو دیکھ کر کہا۔

"راستے میں سستے کٹ پیس مل رہے تھے۔"



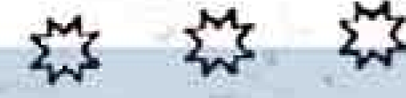
سارے طریقے آزمانے کے بعد آخر کار ایک نائٹ کوچ کے ذریعے ہم لاہور سے ملتان پہنچے۔ کوچ میں شاہ رخ کی فلم "رام جانے" دکھائی گئی اور پتا نہیں کیوں بار بار دکھائی گئی۔ ہمیں بچپن کا وہ زمانہ یاد آگیا جب وی۔ سی۔ آر پوری رات کے لیے کرائے پر چار فلموں کے ساتھ آتا تھا۔

"ہم ڈدان" کے شروع ہوتے سوجاتے اور آدھی

رات کو آنکھ کھلتی تو بھائی جان "شکتی" ریوائنڈ کررہے ہیں اور باجو کا اصرار کہ "مقدر کا سکندر" لگائی جائے۔ لیکن اس غریب کوچ والے کے پاس شاید ایک ہی فلم تھی جووہ ختم ہونے پر دوبارہ لگادیتا تھا اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہیڈ فون کا کوئی سسٹم نہیں تھا اور شاہ رخ کے ہکلاہٹ والے ڈائیلاگ پوری رات بار بار بار سن کر ہم سن ہوگئے، ملتان کے ایک ہوٹل میں ہمارا یہ حال تھا کہ لاشوں کی طرح پڑے ہوئے تھے اور بولنے کی سکت نہ تھی، جو کوئی بولنے کی کوشش کرتا مارے ہکلاہٹ کے بات پوری نہیں کرسکتا تھا۔ صرف منے لاہوری کی عظیم شخصیت ہشاش بشاش، چائے وائے پی کر دورہ ملتان پر روانہ ہوچکی تھی۔

تین چار تھیلوں کے ساتھ ان کی واپسی ہوئی۔

"اتنی اچھی شلواریں آئی ہیں کڑھائی والی۔" انہوں نے خوشی خوشی تھیلے کھولتے ہوئے بتایا۔



ملتان سے صادق آباد اور پھر صادق آباد سے جیکب آباد کا سفر سدا ابہار کوچ میں۔ گریہ والم کی داستان ہے۔ سدا ابہار کوچ کی جہازی سائز کھڑکیوں میں شیشے نہیں تھے، دن کی گاڑی اور جولائی کی گرمی۔۔۔۔ اسلام آباد کی خوب صورتی، مری بھوربن کی ٹھنڈ، لاہور کے مزے سب ہوا ہوگئے۔ لگتا تھا کہ ازل سے سدا ابہار کوچ میں بیٹھے ہیں اور ابد تک بیٹھے رہیں گے۔

بیٹھے بیٹھے صدیاں گزر گئیں اور جب ہمیں یقین ہوگیا کہ اس سفر کا خاتمہ کبھی نہیں ہوگا، ہم کبھی جیکب آباد کی شکل دوبارہ نہیں دیکھیں گے، ہم اپنے پیاروں سے بچھڑ چکے ہیں تو ایسے میں اچانک۔۔۔۔ ہمیں "بھونگ والی مسجد" نظر آگئی جو ہمیشہ کی طرح اس دن بھی زیر مرمت تھی لیکن ہمارے لیے زندگی کا پیغام۔ ادل کے مردہ وجود میں ایسی جان پڑی کہ کنڈکٹر کی طرح بس سے لٹک کر "جیکاد جیکاد" کے نعرے لگانے لگا۔



علی کا ہنس ہنس کر برا حال ہوچکا تھا۔ "میں آج تک کسی بس کا ہارن سنتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔" ادل نے کہا۔

"اور شاہ رخ کی آواز سنتے ہی مجھے ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔" میں نے بتایا۔

"کاش میں بھی اس ٹور میں تم لوگوں کے ساتھ ہوتا۔" علی نے کہا۔

"اور کاش "وہ" بھی ہمارے ساتھ ہوتی۔" ادل نے حسرت سے کہا "میڈا ابھی تے کوئی ہووے۔"

"آون۔۔۔" علی کچھ کہہ رہے تھے۔

"یار یہ تم آون۔۔۔ (میں) پہ اتنا زور کیوں دیتے ہو۔ آووں۔۔۔" ادل نے کہا۔

"کیا مطلب" علی برا مان گئے "اور تم لوگ مچھلی کو "مشی" کہتے ہو۔" وہ فوراً "لاڑکانہ جانکلے۔

"ارے یار، میں تمہاری بات کررہا ہوں اور تم لاڑکانہ جانکلے۔ ناڑاں (پیسے) بہت ہوگیا ہے تمہارے پاس۔"

"یہ جو جیکب آباد میں "ہارس اینڈ کیٹل شو" ہوتا ہے اس میں سارے جانور "لوکل" ہوتے ہیں۔" علی نے ادل پر وار کیا۔

"ہارس تو وہیں کے ہوتے ہیں۔ کیٹل ہم لوئر سندھ سے منگواتے ہیں۔" ادل نے سنجیدگی سے کہا۔ علی نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اتنے بڑے جیون ساگر میں تو نے پاکستان دیا۔" اسکرین پر الن فقیر کو دیکھتے ہی میں نے آواز تیز کردی۔ ادل اور علی چونک پڑے۔ پھر ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے کھڑے ہوگئے اور ہو اللہ، ہو اللہ کہتے ہوئے جھومر ڈالنے لگے۔



ہماری ساری محلاتی سازشوں کے باوجود ادل اپنی طویل کنوارپنے کی زندگی میں کم از کم دو مرتبہ عارضی بنیادوں پر منگنی شدہ ہوا تھا۔ ایک قصہ تو اس وقت شروع ہوا جب اس نے "Crow Eaters" پڑھنے

کے بعد گھر کے مٹکوں اور کولرز سب میں نمک ڈال دیا۔ لیکن کسی نے نوٹس نہ لیا کیونکہ جیکب آباد کا پانی ہوتا ہی باڑا (کھارا) ہے لیکن بھائی سلو بجن کی چھٹی حس بھی زبان کے ساتھ جڑی ہوئی تھی کو کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا اور وہ اس ضرورت سے زیادہ باڑے پانی کی تحقیق پر کمربستہ ہوگئے۔ ادھر حنا نے دیگر باوثوق ذرائع کے ساتھ مل کر ادل کے کمرے سے "مست ملنگ جا کتا ای" اور "اساں کوں عشق مریندا" ڈھولن ول ول قتل کریندا" جیسے گانے بجنے اور خود ادل کے گنگنانے کی اطلاع دی۔

ادل کے اوپری ہونٹ کا لٹکاؤ سرے سے غائب ہو چکا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب لاڑکانہ میں چانڈکا میڈیکل کالج کے قریب ایسی فوٹو شاپ کھلی تھی جہاں سے ادل جب بھی فوٹو کھنچواتا تھا "ابرار الحق جیسا دکھتا تھا اور چوں کہ ابرار اس وقت نہایت پاپولر تھا لہٰذا شہرت کے مروجہ اصولوں کے مطابق وہ "ہیرو" تھا۔

تو وہ ابرار جیسا فوٹو ادل اپنی ہر فائل میں لگاتا حتیٰ کہ انلارج کروا کے کمرے میں بھی لگا دی تھی۔ آصی' کاشی اور بدی نے جاسوسی کے بعد باہمی صلاح و مشورے سے اور فدا میرانی اور یاسر شورو سے تصدیق کے بعد خود بھی اس بات کی تصدیق کی کہ ادل کسی کے ساتھ چکر چلا رہا ہے ۔۔۔ منا لاہوری تو یہ سن کر ہی اچھل پڑے کہ اس بار قرعہ فال ان کے دوست کی بہن کے نام نکلا تھا جس کا اسی سال میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا تھا اور اس کے گھر والوں نے ادل سے کالج میں اس کی رہنمائی کی درخواست کی تھی۔

باجو اور ابلی نے آدھی رات کو مجھے فون کیا اور ان سب کے مذموم ارادوں سے آگاہ کیا۔ ابھی تو کراچی میں پورٹ گرینڈ' دودریا کے ریسٹورنٹ وغیرہ بن رہے تھے' جہاں ہمیں گھومنا تھا بلا شرکت غیرے۔

ادھر اماں امیر کا سدا کا فلسفہ کہ پڑھائی سے پہلے شادی نہیں ہوسکتی۔ لیکن منے نے شعلہ بیانی' زبان دانی اور لمبے لمبے جھوٹ بول کر لاجواب کرنے کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ بقول ان کے اگر دوران تعلیم ہی بندے کی منگنی کردی جائے تو اس کا قبلہ درست رہتا ہے اور وہ انسان بنا ۔۔۔ رہتا ہے اور کسی کے آگے کچھ بن کر دکھانے کی چاہ اسے پڑھائی پر مرکوز رکھتی ہے۔ یہ سن کر ممی نظریں چرا گئیں' جس کی منگنی کے بعد بی۔ اے میں سپلی آگئی تھی۔

ادل کی حالت زار اور منے کی وکالت نے سب کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ باجو نے فون پر مجھ سے کہا کہ اچھا ہے' خاندان میں بہت دن سے کوئی تقریب نہیں ہوئی اور وہ "ہل پنہل" کے نئے جوڑے پہننے کو بے تاب ہے اور منگنی ہی تو ہے' ضروری نہیں کہ ہر منگنی نکاح تک پہنچے۔ ہم سب بھی ایمرجنسی میں جیکب آباد پہنچے جہاں ادل کی منگنی کے "دسہرے" (ڈھولکی) ہو رہے تھے۔ ادل' منے لاہوری اور ادا رشید عباسی عرف شیدائی کے جلو میں مسکرائے جا رہا تھا۔

باجو حسب معمول بھاری جوڑے اور جیولری میں شازیہ خشک بنی "حسینہ پوپری" پہ جھومے جا رہی تھی۔ اماں امیر اپنے سارے نظریات بھلا کر زیورات کے ڈبے کھولے بیٹھی تھیں۔ ممی ساڑھی اور سیدھی مانگ میں انڈین ہیروئن بننے کی کوشش میں فوت ہو رہی تھی۔ ابلی نے اچانک نیا سوٹ میسر نہ ہونے کے احتجاج میں ایک ہاف سلیوز شمیز کے اوپر ادل کا کڑھائی والا ویسٹ کوٹ اور دھاری دار ٹائٹ پاجامہ پہن لیا تھا اس پر بھی کمینی سب سے اچھی لگ رہی تھی۔

ساری لڑکیاں "ہل پنہل" کے ڈریسز میں ہیروئن بنی ہوئی تھیں۔ "اوطاق" میں ہل پنہل کا مالک' درزی وہاب میرا ایمرجنسی سوٹ سی رہا تھا' لیکن آپا ثریا اور پھوپھی اشرف کے اصرار پر منے لاہوری نے اسے ابلی کے سوٹ کا آرڈر بھی دے دیا تھا تاکہ وہ ۔۔۔ گنگا کے پاجامے سے نجات حاصل کرے۔ گنگا ان کی کرائے دار بوڑھی عورت تھی اور ایسے ہی پاجامے پہنے رہتی تھی۔ درزی وہاب اور اس کے "ہل پنہل" کا پس منظر یہ تھا کہ وہ ہمارا "فیملی درزی" تھا۔ گھر میں ہی اتنی خواتین تھیں کہ اسے کسی اور کی

طرف دیکھنے کی نہ فرصت تھی نہ جرأت (خواتین کو دیکھنے کی نہیں کپڑے بیننے کی) ایک بار جب وہ اپنے سالانہ ڈیزائن چوری دورے پر کئی شہروں کی خاک چھان کر واپس آیا تو حیرانی سے منے لاہوری سے بولا۔

''یار یہ بڑے شہروں میں دکانوں کے کیسے کیسے نام ہوتے ہیں اب یہ ''نی پتہل'' کیا نام ہے۔''

تو بدی، پپو اور منے نے باہمی مشورے سے اس کی دکان جو اس سے پہلے تک بے نام تھی کو ''نی پتہل'' کے وزن پر ''ہل پتہل'' (چل پتہل) کا نام دیا جس پر وہ اب بہت اترایا۔

ہم سفر سے آئے تھے، چائے تیار ہوئی اور سب حال احوال پوچھنے لگے۔ علی کو حنہ کی غیر موجودگی محسوس ہوئی۔

''بھابھی حنہ کہاں ہیں؟ نظر نہیں آرہیں نہ۔''

''وہ ''بھاگ'' گئی ہے۔'' باجو نے کہا۔

''ایں!'' علی ہکا بکا۔۔۔ ''بھ۔۔۔ بھ اگ۔۔۔''

''ہاں۔۔۔'' اول نے تصدیق کی۔

اب علی پریشان کہ آگے کیا پوچھیں۔ ''پھر۔۔۔ آ۔۔۔ پ لوگ یوں آرام سے بیٹھے ہیں۔''

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟'' منے لاہوری نے حیرانی سے کہا۔

''وہ تو اکثر ''بھاگ'' جاتی ہے؟''

''کس کے ساتھ؟'' علی سخت پریشان۔

''کبھی ڈرائیور کے ساتھ، کبھی نوؤ (بیٹے) کے ساتھ۔''

''ب۔۔۔ بیٹے کے ساتھ۔۔۔''

علی نے تھوک نگلا۔ ''میں نے تو سنا ہے یہاں بڑے سخت رواج ہیں۔ کارو کاری اور۔۔۔''

''کیا مطلب؟'' بھائی سلو کو غصہ آگیا۔

''یہ کارو کاری کا ذکر کہاں سے آگیا' حنہ کے بھاگ جانے سے اس کا کیا تعلق ہے' بھاگ جانا نارمل سی بات ہے شام تک آجائے گی۔''

اب علی بالکل بے ہوش ہونے والے تھے کہ اول اور کاشی کے فلک شگاف قہقہوں نے چھت ہلادی۔

''اب میں سمجھا!'' اول بمشکل ہنسی ضبط کر کے بولا۔

''تم کیا سمجھ رہے ہو؟ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ وہ جو بھاگ جاتی ہیں۔''

''ارے بھائی! بھاگ ناڑی شہر کا نام ہے۔ وہ وہاں سدے (بلاوے) دینے گئی ہے۔'' سب بہت ہی ہنسے۔

''یہ ''بھاگ'' کیسا نام ہے شہر کا۔۔۔'' علی خفیف ہو کر بولے۔

''جیسا چوہڑ جمالی ہے' ور ہے' ساکرو ہے' سونڈا ہے۔۔۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''دوہرے لاڑل جی ماں لاڑوں اڑایاں۔''

(دولہے کا ہار لاڑے سے بنواؤں)

لنگھیاں (گانے بجانے والیاں) ڈھول بجاتی ہوئیں گھر میں داخل ہو چکی تھیں۔

''یہ تم لوگ ہر چیز لاڑے سے کیوں اڑواتے ہو؟'' علی نے اول سے اترا کر کہا۔

اول نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر لاڈ سے گلے لگا کر بولا۔ ''تمہیں بھی تو ہم نے لاڑے سے اڑوایا ہے۔''



منگنی کے موقع پر منے لاہوری کی خوشی دیدنی تھی۔ اپنے لحیم شحیم وجود کے ساتھ ہو جمالو پر جھومر میں ڈالتے نہ تھکتے تھے۔ جھومر کے ہر راؤنڈ پر پھولے ہوئے سانس کے ساتھ وہ ایک نیا بیان جاری کرتے۔

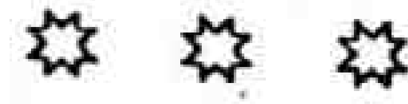
''لڑکی والے بہت اچھے ہیں۔''

''خاندان والوں کے بوتے بھرے ہوئے ہیں۔''

''آنٹی شاہ زادی گھور (نوٹ وارنے) میں کیسی کنجوسی کر رہی ہیں۔''

ہم سب بھی گھور کر کر کے اور جھومر میں ڈال ڈال کے تھک چکے تھے۔ ستانے بیٹھے اور مشروبات پیش کیے گئے تو دلہن کے محل نما گھر پر نظر ڈالی۔ سارا گھرانہ حسین و جمیل اور جب رسم کے لیے نادیہ کو لایا گیا تو اس کے ہوش ربا حسن نے ہمارے چھکے چھڑا دیے۔

"ادل تو گیا سمجھو۔" ممی نے کہا۔
"اتنی امیر، حسین اور پھر لڑکی ڈاکٹر بن رہی ہے۔" باجو نے کہا۔ ہم سب کو کراچی میں اپنا مستقبل سخت مخدوش نظر آنے لگا۔
"میری تو نند کا گھر ہے کراچی میں۔" ابلی نے اترا کر کہا۔
"کمینی! نند کے گھر اور اپنے گھر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"
میں دل ہی دل میں کراچی میں رہائش پذیر دیگر رشتے داروں کی فہرست مرتب کرنے لگی تاکہ ان سے تعلقات از سر نو استوار کیے جاسکیں۔



مصدقہ اطلاعات کے مطابق ادل کا چہرہ جو منگنی کے بعد غیر معمولی طور پر کھلا رہتا تھا آہستہ آہستہ مرجھانے لگا تھا۔ یہ ڈائل اپ انٹرنیٹ کا زمانہ تھا' بڑی مشکل سے نیٹ کنیکٹ ہوتا پھر ایک نیلے رنگ کی پٹی دھیرے دھیرے چلنا شروع ہوتی تو لگتا کہ مہران ایکسپریس جیکب آباد کے اسٹیشن سے سرکنا شروع ہوئی ہے۔ اکثر اوقات ہم ایک دوسرے کو فون کرکے بتاتے کہ "میں نے تمہیں ای۔ میل کی ہے پڑھ لو۔" یا یہ کہ میں MSN پر سائن ان ہوں تم بھی آؤ پھر MSN تک رسائی جوئے شیر لانے کے مترادف تھی۔ پھر فون کرکے اطلاع دی جاتی کہ اب سائن آؤٹ ہوچکے ہیں۔ ہاٹ میل پھر بھی کبھی کبھی ای۔ میل کے سبجیکٹ تک کھل جاتا تھا اور ہم میل کے سبجیکٹ سے ہی پوری میل کا مضمون بھانپ لیتے تھے۔ منگنی کے بعد ادل کے سبجیکٹ کچھ یہ تھے۔
"آئے ہو میری زندگی میں تم بہار بن کے....."
"رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی....."
لیکن بتدریج ان میں مایوسی آتی گئی۔
"دوست دوست نہ رہا' پیار پیار نہ رہا۔"
"حیف ہوئی بے قدرا....." اور پھر جس دن اس کی ای۔ میل "دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت' درد سے بھر نہ آئے کیوں۔" کے ٹائٹل سے موصول ہوئی تو مجھے بھی کھٹکا ہوا۔ اوپر سے باجو کا فون آیا کہ ادل کا اوپری ہونٹ لٹکتا جارہا ہے۔ وہ کمرہ نشین ہوگیا ہے' کبھی کبھی اس کی جھلک نظر آتی ہے' لیکن اس کا حال ایسا ہے کہ کل میرا بیٹا وودی کہہ رہا تھا۔
"کیا ادل ماما کالے صابن سے نہانے لگے ہیں۔"
بقول باجو انہوں نے احتیاطاً" باتھ روم میں جاکر دیکھا' لیکن وہاں وہی ہرا ریکسونا رکھا تھا اور کالے صابن کے کوئی آثار نہ تھے' البتہ رنگ گورا کرنے کی جو کریم ادل نے استعمال کرنا شروع کی تھی' وہ غائب تھی۔
پھر باجو نے روتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ ادل کے کمرے سے ہر وقت "کتی کالے ویس بیٹھا روندا زاروزار ہوسئی۔" کی آواز آتی رہتی ہے۔ کمرے تک صرف حنہ کی رسائی ہے اور وہ باہر آتی ہے تو اتنا روتی ہے جتنا وہ "دیوداس" دیکھ کر بھی نہیں روئی تھی۔
یہ ساری روداد سن کر میرا دل بھر آیا اور فوری طور پر میں اماں امیر کے گھر پہنچی اور کسی سے بھی بات کرنے سے پہلے ادل کے کمرے میں دھاوا بول دیا۔
"اداسی سے کہو اپنے بال باندھے' اب تک اس کی جوئیں تمہارے سر میں بھی پڑچکی ہوں گی۔" میں نے چھوٹتے ہی کہا۔
"یہ اداسی ہی میری ہم سفر ہے۔" "میڈا بھی تے کوئی ہووے۔" ادل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
پھر ادل نے جو کہانی سنائی' وہ کچھ یوں تھی۔
"مجھ میں اور نادیہ میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ ہمارے سیاسی' سماجی خیالات' ارادے' عزائم' خواب' خیال' پسند ناپسند سب الگ ہے۔ میں نے اس سے پوچھا "میں ابرار الحق لگتا ہوں؟ اس نے کہا "نہیں ابھیشیک لگتے ہو۔" میں نے کہا "تم صنم بلوچ لگتی ہو۔" اس نے کہا نہیں "میں انوشکا شرما" لگتی ہوں۔" میں نے کہا "تم پر بلوچی کھگا بہت سوٹ کرے گا۔" اس نے کہا۔ "تمہیں مجھ پر کم کم کی ساڑھی سوٹ کرے گی۔"
میں نے کہا "تم حویلی میں کون سا کمرا لوگی؟" تو کہنے

لگی۔ "کون سی حویلی؟ میں پہلے کراچی اور پھر آسٹریلیا جاؤں گی۔"

میں نے اس سے کہا کہ میں پڑھائی کی تکمیل کے بعد یہیں "امام سینٹر" میں بیٹھ کر اپنے شہریوں کی خدمت کروں گا یا زیادہ سے زیادہ کراچی، حیدر آباد چلا جاؤں گا اس سے آگے کچھ نہیں۔"

اس پر وہ پھٹ پڑی اور بولی۔ "نہ میں اس قدیم حویلی میں رہوں گی، نہ منے لاہوری کے ڈیزائن کردہ اور ہل بہل کے سلے ہوئے کپڑے پہنوں گی، نہ بسری بناؤں گی، نہ میں چھتیس لوگوں کی سرائیکی ہر وقت سن سکتی ہوں، نہ خود بول سکتی ہوں اور آسٹریلیا جانے پر کوئی کمپرومائز نہیں۔" یہ سرائیکی والی بات سن کر تو میں شدید تڑپ اٹھا اور بولا۔

"تمہاری اتنی "نانگیں" تھیں تو مجھ سے منگنی کیوں کی؟"

"امی نے کہا تھا ایک بار شادی ہو جائے دُم ہلاتا تمہارے پیچھے آئے گا۔" اس نے بھی جلدی میں راز اگل دیا۔

یہ دم ہلانے والی بات سن کر میرے اندر کا بلوچ مصطفیٰ قریشی جیسی دھاڑ مارنے ہی لگا تھا کہ آس پاس بیٹھے لوگوں کا خیال کر کے میں نے بڑی مشکل سے خاموشی اختیار کی اور اس سے آخری بات کہہ کر اٹھ آیا۔

"کیا بات؟" میں نے پوچھا۔

"رکی پونٹنگ کو میرا اسلام کہنا اور یہ کہ اتنے ورلڈ کپ جیتنا کوئی شرافت نہیں ہے۔"

☆ ☆ ☆

"فدا نے اپنے بیٹے کا نام ادل رکھا ہے۔" ادل نے آدھا نیم آدھا شہد لہجے میں اطلاع دی۔ فدا میرا ڑیں ادل کا جگری یار تھا، لیکن اب تو اس نے محبت کی انتہا کر دی، لیکن میرا خیال تھا کہ اس میں محبت سے زیادہ ان کھانوں کا کمال تھا جو وہ کراچی سے کوئٹہ جاتے ہوئے جیکب آباد۔ اسٹیشن پر ادل سے وصول کرتا تھا۔

اگر ادل کراچی میں بھی ہوتا تو گھر فون کر دیتا اور شبو یا اسرار ادل کے گھر سے کھانوں کے ٹفن لے کر اسے ٹرین میں پہنچا دیتے اور وہ کوئٹہ تک حنہ اور زلے کے ساتھ کے بروسٹ، کباب، بریانیاں اور بسریاں اڑاتا جاتا، لیکن ادل کے اس اطلاع فراہم کرنے کے بین السطور جو کچھ تھا اسے سمجھنا کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔

"بیڑا غرق ہو فدا کا۔" میں نے غصے سے کہا۔ "اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔" (ہمارے ہاں کسی اور کا نام نہیں رکھا جاتا سوائے اس کے کہ وہ شخص فوت ہو چکا ہو)

"ہم بھی تمہارے بیٹے کا نام فدا رکھیں گے۔" میں نے غصے میں اعلان تو کر دیا، لیکن فوراً" اپنی غلطی کا احساس ہوا تو سٹپٹا کر بولی۔

"دفع کرو، فدا بھی کوئی نام ہے، اس سے تو بہتر ہے کہ بندہ اپنے بچے کا نام "موداٹیں پٹاس" رکھ لے۔"

ادل نے اپنا گپلو منہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بولا۔

"میں اپنے بچے کا نام موداٹیں پٹاس تو کیا کاکا منا، چھوٹا پانڈا، پیلا بابا، جانو جر منی، شمن علی میرالی، طفیل سنجراڑیں، ایاز گاد، کچھ بھی رکھنے کو تیار ہوں، لیکن "میڈا بھی تے کوئی ہووے۔"

"مایوس نہ ہو، اللہ تمہیں بھی صاحب اولاد کرے گا۔"

"پہلے صاحب زوجہ تو ہو جاؤں۔"

☆ ☆ ☆

ادل کی دوسری منگنی کو نیم منگنی کہنا زیادہ بہتر ہو گا اور یہ کچھ زیادہ پرانی بات بھی نہیں تھی۔ بہت عرصے بعد ادل نے اسپتال کے ریسپشن پر ایک ایسی لڑکی دیکھی جسے دیکھ کر اسے منے لاہوری کا دیرینہ ڈائیلاگ "گھٹ وچ گھٹ ایڑی تے ہووے۔" یاد آیا۔

لڑکی اردو اسپیکنگ تھی، ادل کو اپنی اردو کے جوہر دکھانے کا موقع اور کب مل سکتا تھا سو وقتاً" فوقتاً" فراز،

فَیض، امجد اسلام امجد کی نظمیں، غزلیں اور مظہرالاسلام، امرتا پریتم کے پیراگراف کارڈز پر لکھ لکھ کر ڈیک پر کھسکاتا رہتا اور انجان بن جاتا۔

آخر کار انچارج میڈم کے سامنے اس کی طلبی ہوئی۔ ندا سارے کارڈ لے کر میڈم کے پاس پہنچ چکی تھی۔ ادل کو اپنی عزت خاک میں ملتی نظر آئی اس لیے فوراً" سے پیشتر اپنی پسندیدگی کا اظہار کردیا۔

ندا نے بھنا کر کہا۔ "تو سیدھے سیدھے کہہ دیتے، یہ اتنے مشکل شعر لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میری اردو پہلے ہی ویک ہے۔"

"لیکن مشکل اشعار کون سے؟" ادل نے حیرانی سے کہا۔

"یہ۔۔۔" ندا نے ایک کارڈ اٹھایا اور میڈم کو دکھا کر مشکل سے پڑھنے لگی۔

"رہا ساتھ چاند کے منتظر، تیری کھڑکیوں سے ادھر کوئی۔"

میں بار بار پریشان ہو کر کھڑکی سے باہر چیک کرتی، لیکن وہاں چوکیدار چاچا کے علاوہ کوئی نہ تھا۔" اس نے احتجاج کیا۔ "اور یہ" "رنگ پیراہن۔۔۔" پے راہن۔۔۔ یہ کیا؟"

ادل کو ہنسی چھپانا مشکل ہو گیا، لیکن ظاہر ہے ادل کو اس سے اردو کا ہوم ورک نہیں کروانا تھا۔

"لیکن میں نے اکثر آپ کے ہاتھ میں کتابیں دیکھی ہیں۔"

"وہ تو ڈائجسٹ ہوتے ہیں، کبھی کبھی پڑھ لیتی ہوں۔"

اتفاق سے منا لاہوری ان دنوں کراچی آئے ہوئے تھے اور اس وقت بلا مبالغہ طارق روڈ کے سترہویں دورے پر تھے۔ بوتیکس دیکھ دیکھ کر ان کا دل نہیں بھرتا تھا۔

ندا کے بارے میں سن کر ہی انہیں گویا تازہ نقل کیے گئے ڈیزائنز پہننے کے لیے ایک نئے شکار کی دست یابی کی امید پیدا ہو گئی۔ اسی رات ندا کے گھر پہنچے اور اس کے والد کو نیم رضامند کر کے دم لیا۔

ادھر ادل نے اگلے دن ندا کو لنچ پر انوائٹ کیا اور مجھ سے کچھ نیم ادبی اور کچھ ڈائجسٹی سوالنامہ تیار کرنے کی درخواست کی۔ میں بھی اس وقت "اے غزال شب" پڑھنے میں اس قدر غرق تھی کہ جو سمجھ میں آیا بتادیا۔ دو دن بعد اچانک ادل کی آمد ہوئی، میں فوراً بریانی بنانے لگی، لیکن اس نے منع کردیا۔ منہ کچھ اترا اترا سا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے اداسی سے کہا۔

"کچھ تو بولو، لنچ کی روداد بیان کرو۔" میں نے حکم دیا۔

"سنو!" وہ بولا۔

"چند ابتدائی باتوں کے بعد میں نے چپکے سے جیب سے پیپر نکالا جس پر تمہارے سوالات لکھے تھے۔"

"آپ نے آمنہ مفتی کا "الو برائے فروخت نہیں""

دیکھا تھا؟"

"نہیں تو۔۔۔"

"پڑھا تھا؟"

"جی نہیں۔۔۔"

"آمنہ مفتی کو جانتی ہیں؟"

"آں۔۔۔ (یاد کرتے ہوئے) وہ تو نہیں جنہیں لکس ایوارڈ ملا تھا۔"

"ہاں! وہی۔۔۔" ادل خوش ہو گیا۔ "یعنی جانتی ہے۔"

"ہم۔ اصل میں لکس ایوارڈز کی پکس دیکھ رہے تھے تو حیران ہو رہے تھے کہ یہ لڑکی کون ہے جس نے نہ صرف شلوار قمیص بلکہ دوپٹا بھی پہنا ہوا ہے۔ اس لیے نام یاد رہ گیا۔"

"وہ فیس بک پر میری بہن کی "پکی سہیلی" ہیں۔" ادل نے رعب جھاڑا۔

"اچھا۔۔۔" لاتعلقی۔

"میری بہن بھی رائٹر ہیں، لکھتی ہیں ڈائجسٹ میں۔" ادل اترایا۔

"اچھا۔۔۔ (ذرا دلچسپی سے) کون؟"

"ثمینہ عظمت۔۔۔" (فخر سے۔)

"ہوں۔ (مایوسی سے) اترا تو یوں رہے ہیں جیسے سائرہ رضا کے بھائی ہوں۔"

"آپ سائرہ رضا کے بھائیوں کے بارے میں کیا جانتی ہیں؟" ادل مشکوک ہوا۔

"یہ کہ اگر وہ چاہیں تو اترا سکتے ہیں۔"

"مطلب کہ آپ کی فیورٹ رائٹر ہیں۔"

"اتنی زیادہ نہیں۔۔۔" پھر بھرپور دلچسپی سے بولی۔

"میری فیورٹ تو گل شہزادی' ندیا رانی اور ساغرہ بانو ہیں۔ اف اللہ اتنے مزے کے ناول لکھتی ہیں۔"

"بانو قدسیہ کا 'راجہ گدھ' پڑھا ہے آپ نے؟"

"ندیا رانی کا "میرے خوابوں کا راجہ" پڑھا ہے۔"

"اداس نسلیں؟"

"اداس راتیں۔" پڑھا ہے۔"

"بریانی بنانا آتی ہے؟"

"تو ڈنر بنا لیتی ہوں۔"

"شادی کا ڈریس کیسا بنوائیں گی؟"

"صنم جیسا۔"

"بلوچ' سعید' جنگ یا چوہدری؟"

"میری دوست صنم!"

"کیا آپ کی آئی ڈی پرنسز' باربی ڈول' انوسینٹ اینجل' بابا کی لاڈو' مانو بلی ہے؟"

"جی نہیں۔۔۔"

"کیا آپ کی ڈی پی پر فواد خان ہے؟"

"جی نہیں۔۔۔"

"اچھا!" ادل چپ ہو گیا۔

"اب میرے کچھ سوالوں کے جواب دیں۔" ندا نے کہا۔

"جی فرمایئے!"

"آپ اتنی ساری "صنموں" کو کیسے جانتے ہیں؟"

"کیا آپ کو عاطف اسلم کے کنسرٹس کے مفت ٹکٹ ملتے ہیں؟"

"کیا آپ کا کوئی دوست پلاسٹک سرجن ہے جو میری لک ذرا مائرہ خان جیسی کر دے؟"

"کیا آپ کی آئی ڈی ڈان' ڈینگ' باڈی گارڈ' اچھا بچہ یا معصوم فرشتہ ہے؟" کیا آپ اپنی ڈی پی پر ماورا یا عروہ کی تصویر لگاتے ہیں؟ وہ سوال پر سوال کرتی گئی اور بغیر کسی سوال کا جواب سنے اٹھ کر چلی گئی۔

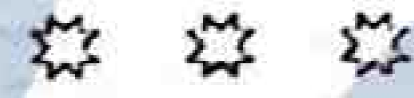
ادل کی نیم منگنی اپنے اختتام کو پہنچی اور ہاں! اچانک اسے کچھ یاد آیا اور اس نے جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"املا۔" وہ بولا۔ "جو شروع میں ہی میں نے اسے کروایا تھا۔ تین الفاظ بولے جن میں سے مستنصر حسین تارڑ پر وہ مس۔ مس ہی کرتی رہ گئی باقی دو الفاظ اس کاغذ پر لکھے ہیں۔ میں نے کاغذ کھول کر دیکھا اس پر لکھا تھا۔

"دیوانے غالب۔"

"بالے جبرئیل۔"
اس نے مجھ سے یہ بھی پوچھا کہ "بالے جبرئیل کیا ہے؟" میں نے بتایا تو کہنے لگی کہ "علامہ اقبال نے اس کا نام بالے جبرئیل کیوں رکھا؟"
"پھر؟" میں نے پوچھا۔
میں نے کہا کہ "اقبال کو بچپن میں پیار سے سب "بالا" کہتے تھے۔" ادل نے ایک آہ بھر کر کہا۔



بہت عرصہ بیت گیا۔ ادل نے FCPS بھی کرلیا۔ اب تو اس نے "میڈا بھی کوئی ہووے" کہنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ملاقات بھی کم۔ مجھے ایسا ٹائیفائیڈ ہوا کہ مجھے لگتا تھا کہ بس آخری دن ہیں۔ ہر وقت رقت طاری رہتی۔ ذرا طبیعت بہتر ہوتی تو اپلی کو فون کیا وہ خود گردے کی تکلیف کی شکایت کر رہی تھی۔
اس نے بتایا کہ باجو کا بی پی ہائی رہنے لگا ہے' بھائی سلو کا کولسٹرول بڑھ گیا ہے' ممی کی طبیعت بھی خراب رہتی ہے۔ میرا دل بھر آیا۔
"لگتا ہے ہمیں ادل کی پٹیں (بددعائیں) لگی ہیں۔"
"ہاں یار! بے چارہ چپ سا ہو گیا ہے۔"
"وہ سیفی کی سالی والا رشتہ اچھا تھا۔" ادل کا آخری کنوارا دوست سیفی ابرو بھی گزشتہ سال شادی شدہ ہونے کے مقام پر فائز ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی امریکن نیشنلٹی رکھتی تھی۔ وہ ادل کے پیچھے پڑا رہا کہ وہ اس کی سالی سے شادی کرلے اور دونوں دوست امریکا شفٹ ہو جائیں۔ ہمیں ادل کی قومی غیرت سے یہ توقع ہرگز نہ تھی سو ہمارے اصرار پر بھی وہ راضی نہ ہوا۔
اب ہم سب گناہ گار خواتین نے منے لاہوری کے دربار میں حاضر ہو کر معافی کی استدعا کی۔ جس پر منے لاہوری نے حسب معمول حسب توقع اور حسب توفیق ہماری اجتماعی بے عزتی کی۔ ہمیں ہمارے ناپاک عزائم یاد کروائے' گھناؤنی سازشوں کے طعنے دیے اور

آخر کار اس بات پر رضامند ہو گئے کہ اب ادل کی شادی کی ذمہ داری ان پر چھوڑ دی جائے اور ہم بہنیں چپ کر کے شادی کی تیاری کریں۔ ہم تجسس سے مرنے کو تیار تھے' لیکن جینے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کیوں کہ اتنی بہنوں کا اکٹھا مر جانا ادل کی شادی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوتا۔
آخر کار بھائی جان کی طرف سے سگنل ملا کہ شادی میں شرکت کے لیے حویلی پہنچ جائیں۔ ہم سب "لونگ پھوٹا تھالی میں" کرتے ہوئے ناچتے گاتے وہاں پہنچے۔ سہرے گائے' جھومریں ڈالیں' گھوریں کیں۔ ادل کو گنڈھیاں (ہار) پہنائے اور اسی طرح گاتے بجاتے واپس آگئے۔
آنے والے دنوں میں مری' اسلام آباد' لاہور' بھوربن' کاغان' کالام ہر جگہ سے ادل اور اس کی دلہن کی تصویریں ہمیں واٹس اپ پر موصول ہونے لگیں۔ ادل نے کوہ مری کے اس درخت پر جہاں اس نے لکھا تھا کہ "ایک دن اس کے ساتھ آؤں گا" کے ساتھ ایک خصوصی تصویر لے کر بھیجی تھی جس میں اس کی دلہن خوش بخت صاف نظر آرہی تھی۔
اچھی پیاری لڑکی تھی' لاہور والے بک شاپ کے دکاندار' ریلوے اسٹیشن' لکشمی چوک' چوبرجی ہر جگہ کی تصویریں لیں۔ اس کے ہنی مون کو چار چاند لگ جاتے اگر وہ واپس سدا بہار کوچ سے آتا' لیکن وہ اس خیال سے باز رہا۔
ادل کو کراچی آئے پندرہ دن ہو چکے تھے' لیکن ہمارا اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ادھر سے منا لاہوری کے برابر طعنے فون پر مل رہے تھے کہ اتنی توفیق نہیں کہ ادل اور خوش بخت سے مل۔ آؤ اور ان کی دعوت کرو۔ ہماری ساری ہمدردی' پیار' پچھتاوا' بیماری ادل کی شادی کے گزرتے ہی ہوا ہو چکے تھے۔
"ہونہہ ہم جائیں... دعوت؟ خود اتنا بے غیرت اور بے مروت' پندرہ دن ہو گئے نہ فون' نہ میل (اب تو میل کا زمانہ بھی نہیں) ٹیکسٹ کردے۔ واٹس اپ

اور جانے کیا کیا اسکائپ پہ بات کرلے۔ نہیں بھئی اس لڑکے کے ان ہی افعالوں کی وجہ سے تو ہم اس کی شادی میں روڑے اٹکاتے تھے۔ اب منے کو بھی پتا چلے گا۔ طارق روڈ کی خاک چھانیں گے تو اسی روڈ کے کسی کونے پر رات کو سونا پڑے گا۔

کھا گئی لڑکی ہمارے بھائی کو۔۔۔ لیکن علی سدا کے مروتی اور ادل ان کا پیارا' فوراً" تیار ہوئے' مجھے بھی ساتھ لیا۔ ادل کو اطلاع بھی کردی۔ ڈرتے ڈرتے دھڑکتے دل اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ اس گھر میں قدم رکھا جہاں ہم نے برسوں حکمرانی کی تھی اور اب وہ گھر پرایا ہوچکا تھا۔ خوش بخت نے نہایت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔

"ادل بس آنے ہی والے ہیں۔ اصل میں آتے ہی یہاں پر دہشت گردی کے واقعے کی وجہ سے اسپتال میں ایمرجنسی لگ گئی' دن رات وہیں ہوتے ہیں' ذرا فرصت ملتی ہے تو یہی کہتے ہیں کہ تھٹھہ چلنا ہے۔ آپی میں نے آپ لوگوں کا کمرا اسیٹ کردیا ہے' لیپ ٹاپ بھی رکھ دیا ہے۔"

(میں نے شرمندگی سے بیگ میں رکھے اپنے لیپ ٹاپ کے بارے میں سوچا جو میں احتیاطاً" لے آئی تھی۔) "بھائی جان آپ پہلے چائے لیں گے یا کھانا لاؤں؟" علی نے میری طرف دیکھا۔ میں پورے راستے ان کا سر کھاتی آئی تھی کہ حفاظتی طور پر اپنی پھپھی کے گھر بھی فون کردیں' شاید وہاں جانا پڑے۔

"آپی! ادل آپ کے لیے لاہور سے کچھ کتابیں لائے تھے وہ بھی میں نے آپ کے کمرے میں رکھ دی ہیں۔" اس نے مزید مجھے شرمندہ کیا۔ "آپ لوگوں کے تحفے بھی رکھے ہیں۔ سوری آپ لوگوں کو گھر آکر دینے تھے' لیکن مصروفیات۔۔۔"

اسی وقت ادل آگیا۔ تھکا ہوا' نڈھال' لیکن خوشی سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ میں نے فرط محبت سے اس کی پیشانی چوم لی اور دھیرے سے اس کے کان میں بولی۔

"تیہڈا بھی تے کوئی ہووے۔" وہ بے تحاشہ ہنس پڑا۔

خوش بخت نے کھانا لگانے کا پوچھا۔

"کیا بنایا ہے؟" ادل نے پوچھا۔

"بریانی۔۔۔" اس نے جواب دیا۔

"بریانی تمہیں اماں امیر' آپا منا اور میری سب بہنوں اور بھابیوں سے سیکھنی ہوگی۔" ادل نے محبت بھرے فخر سے کہا۔

"سیکھ لوں گی۔" خوش بخت نے خوش دلی سے کہا۔

لیکن! بریانی منہ میں ڈالتے ہی ادل کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"بالکل ویسی!" وہ حیرت سے چلا اٹھا۔

"دیکھا۔۔۔!" میں نے اترا کر کہا۔

"یاد ہے میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خاندانی وصف آنے والی بہوؤں میں بھی منتقل کردیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے بہنوں کو اس کا ادراک نہ ہو' لیکن یہ جو اصل میں۔۔۔" میں نے بیان جاری رکھا' اس مرتبہ صرف ادل ہی نہیں خوش بخت بھی منہ کھولے سن رہی تھی۔

میں خوش بخت کو بیٹھے رہنے کا اشارہ کرکے فرج سے کولڈ ڈرنک لینے کے اٹھی اور اپنے پاؤں سے ڈسٹ بن کو کاؤنٹر کے نیچے کھسکا دیا جس میں سے اس بریانی مسالے کا پیکٹ صاف نظر آرہا تھا جو اماں امیر' آپا منا' باجو ہمی' حنہ' زلے' انجو' نورے' ایلی اور میں استعمال کرتے تھے۔ اور اب خوش بخت استعمال کررہی تھی۔



ایمل رضا

دلوری کا درجہ

ساس نے اسے شادی والی رات ہی کہا تھا۔
"دیکھ آمنہ.... !عورت تو جھیل کی مانند ہوتی ہے جتنی گہری اتنی چپ۔ اور مرد سمندر موافق.... پھیلا ہوا' وسیع' بھٹکانے والا.... کناروں سے کوسوں دور رکھنے والا.... جھیل کو سمندر کے زعم سے کیا واسطہ جس کی نہ منزل ہے نہ راستہ...." ایسی گہری باتیں سن کر آمنہ کا تاثرات سے عاری چہرہ مزید سفید پڑ گیا تھا۔
اور اس کی ساس کلثوم من ہی من میں سوچتی رہی تھی.... "اپنی یہ آمنہ تو ٹھوس اینٹ ہے.... اس پر کبھی کوئی نقش نہیں کھدے گا۔" خود آمنہ کی حیثیت بھی اس گھر میں الف لیلیٰ کی شہرزاد جیسی تھی جو مرکزی کردار ہوتے ہوئے بھی اپنا کوئی مرکز نہیں رکھتی۔
کلثوم نے ہاتھ جھٹک کر لاپروائی سے سوچا.... "سمجھ ہی گئی ہوگی۔" اور وہاں سے اٹھ گئی.... لیکن آج پورے ڈھائی سال بعد آمنہ نے روئی کا ایسا بھالا کلثوم کو دے مارا تھا جو تیز دھار کٹاری کی طرح کلثوم کو لہولہان کر گیا تھا۔
"اسی بے سمت.... بھٹکانے والے سمندر میں.... سالوں آس جمائے سیپ اپنے اندر موتی پیدا کرتی ہے اماں ! جو جھیل میں کبھی پیدا نہیں ہوتا۔"
منہ پر ہاتھ رکھ کر کلثوم نے سنا.... اور اس کا روم روم کانپ اٹھا۔ وہ تو یہ بات کر کے کب کی بھول بھی چکی تھی۔ تو کیا آمنہ نے اتنے عرصے سے اسے اپنے اندر ہی کہیں حنوط کر رکھا تھا.... واپس لوٹانے کی خاطر.... دکھ کی دھنکی بجا کر.... ساکھ کی تبدیلی اور اندر کی غرضی کو دبانے کے لیے۔
"اچھا تو یہ آمنہ سیپ بننا چاہتی ہے.... ! یا سیپ کا موتی.... یا تپسیا ناری...." کلثوم کی حیرت ٹوٹے نہ ٹوٹتی تھی۔
"خیر جو ہو سو ہو.... جو بنے سو بنے.... میں کیوں پریشان ہوں.... شادی ہی تو ہو رہی ہے.... جو ہر گھر میں ہوتی ہے.... کبھی نہ کبھی۔" کلثوم کو اپنی بہو سے بہت پیار تھا۔ بے چاری اپنے ہچکولے کھاتے دل کو طفل تسلی بھی نہ دے سکی۔ جو بڑے دنوں سے اپنے ساتھ کلثوم کو بھی چکر پہ چکر دے رہا تھا۔
اندر ہی اندر کلثوم ڈری ہوئی تھی.... جانتی تھی کہ یہ کوئی ایسی عام شادی بھی تو نہیں ہے۔ سارا خاندان حیرت میں تھا.... ہر فرد کی انگلی کا رخ کلثوم کے گھر کی طرف تھا.... ساٹھ سالہ کلثوم کا آگنہ ہی جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا.... چہرے پر لمبی لمبی جھریاں.... سوکھے مڑے ہاتھ پیر.... ٹوٹتے گرتے دانت.... سفید بھنویں.... کملایا چہرہ.... مانوبت جھڑ بھی آ کے اکتاہٹ کا شکار ہو بیٹھے.... جب سے لاٹھی اس کے ہاتھ میں آئی تھی تب سے ہی وہ اپنے طور پر چل چلاؤ کے دور میں ہی رہ رہی تھی اب جیسے کسی نے ایک دم سے اسے چوبی کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ بھی ہتھکڑیوں سمیت....
ساری یہ آمنہ کی کارستانی.... ڈھائی سالوں میں جو کلثوم کے گھر کی استانی بن بیٹھی تھی.... اس گھر کی بڑی بہو کے خطاب سمیت.... کہنے کو اللہ لوک.... گاؤں کی جھلی.... اور اسی اللہ لوکی میں وہ کام کروا رہی تھی کہ.... خود کلثوم نے بھی تو ساری زندگی کتنا کچھ سہا تھا۔ لڑائی



جھگڑا' بے رخی' الزام تراشی' بے توجہی' شک' بے وفائی یہ تو ہر گھر میں ہی چلتا ہے اور بڑے ٹھسے سے چلتا ہے۔ آہستگی سے یہ برائیاں گھر معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کا اہم جز اور خاصیت جو بن چکی ہیں۔ پھر بھی کلثوم کا دل کبھی اس آمنہ جتنا مضبوط نہ ہو سکا۔ مردوں کا کیا ہے۔ وہ تو آگ میں کود جانے کو بھی کہہ دیں گے تو کیا ساری عورتیں کود جائیں گی۔ لیکن یہ اپنی آمنہ... نہ دریا... نہ سمندر... بس زمین کے اندر کا پانی...

کلثوم اکثر سوچتی... پتا نہیں اس آمنہ کو اتنا دادی اماں بننے کا کیا شوق ہے۔ کیوں یہ سارے زمانے کا درد اپنے اندر قید کرلینا چاہتی ہے۔ کیوں یہ اتنی ٹھوس مٹی بننا چاہتی ہے جس پر بارش اثر کرے نہ ٹھوکر... اور پھر من میں آتا کہ وہ اسے بٹھائے اور سمجھائے... کہ جتنا بڑا جگرا وہ اپنا کرنے جارہی ہے' کہیں وہ پھٹ ہی نہ جائے۔ ایسی خدمت گزاری کا نتیجہ بھی ہمیشہ اسفل ہی رہا ہے۔

خود کلثوم اپنے پورے حجم کے ساتھ اس کی ایک زندہ مثال تھی۔ یہ تو عورت کے ازلی مقدر کا ابدی انجام ہے۔ لیکن خود کلثوم بھی ان باتوں کو زبان پر نہ لا سکی۔ ان باغیانہ خیالات کو زیادہ دیر سوچتے رہنے سے بھی اسے ابکائی آنے لگتی۔ وہ ایک مرد کی ماں جو تھی' بیوی' بہن' بیٹی بھی اور عورت جب ان چار رشتوں میں بٹ جائے تو وہ کسی ایک طرف کی حامی ہو کر اپنا نقصان کیسے کر سکتی ہے۔

یہ بھی جانتی تھی کہ کہنا سننا عبث ہے۔ آمنہ کیوں سمجھتی... کس لیے۔ یہ بات واقع ہو جانا سرے سے ہی غیر معمولی تھا... وہ تو جلتی کڑاہی کی گرم ریت تھی۔ جو جتنی جلدی گرم ہوتی اتنی جلدی ٹھنڈی بھی... کوئی جوش کوئی ولولہ آتا بھی تو پانی کا ایک ہی چھینٹا اس کی بھاپ کو دوبارہ پانی میں بدل دیتا اور اب تو ویسے بھی بہت سا پانی پلوں کی نیچے سے گزر گیا تھا۔ کبھی نہ واپس

آنے کے لیے.... شادی کی تاریخ رکھی جا چکی تھی۔ دو دن بعد بارات تھی۔

پورے گھر کو قمقموں سے سجانے کے لیے دو لڑکے بلائے گئے تھے۔ دوسرے بہت سے کاموں کی طرح یہ کام بھی آمنہ نے ہی سرانجام دیا تھا۔ شام ڈھلنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں گھر سجتا رہا۔ کلثوم کا دل ایسے کٹتا جیسے بچپن میں اس کا باپ برسات میں اس کی پسندیدہ انگور کی بیل کو بے دردی سے کاٹتا تھا۔ برساتی کیڑوں کے ڈر کی وجہ سے.... وہ انگور کی بیل تو ہر برسات میں کٹتی تھی۔ اور یہ بیل ایک جھٹکے سے ہی آمنہ نے جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکی تھی۔ اس گھر میں رہتے ہوئے نجانے کب آمنہ میں اتنی ہمت پیدا ہو گئی کہ وہ زمینی پیداوار ہونے کے بجائے آسمان سے اتری ہوئی مخلوق دکھنے لگی تھی۔

کلثوم کی نظر میں وہ دن ہی منحوس ہو گیا۔ جس دن آمنہ کی ماں اور کلثوم کی سہیلی ساجدہ کا خط اسے ملا تھا۔ وہ سوچتی کاش خط پر آدھا ادھورا لکھا پتا بالکل ہی غلط ہو جاتا۔ چھ ماہ کے بجائے وہ سالوں بعد کلثوم کو ملتا۔ اس طرح نہ یہ آمنہ بیاہ کے اس گھر میں آتی.... نہ یہ سب کرواتی۔

"او بھابھی ملنگی...." "او اللہ میاں کی گائے۔"

"و جھلی آمنہ.....!"

اس کے آنے سے یہ صدائیں بھی عام ہو گئیں۔ کلثوم کا گھرانہ کوئی جاہل گھرانہ تو نہیں تھا۔ ہر فرد پڑھا لکھا۔ کالج یونیورسٹی سے نکلا ہوا تھا۔ پھر کیا کوتاہی رہ گئی تھی کلثوم سے جو سب آمنہ کو ٹاٹ کا پیوند سمجھنے لگے.... کچھ پر رعب چل گیا.... کچھ کو پیار سے سمجھالیا گیا۔ بس عامر اپنے لہجے کا کڑواپن کبھی ختم نہ کر سکا۔

"دیہاتن، جاہل، گنوار، بدسلیقہ، ان پڑھ۔"

کلثوم جانتی تھی ابتدائی عادتیں وقت کے بہاؤ سے سیراب ہو کر اب پختہ ہو چکی ہے۔ جانچنے پرکھنے کی آنکھ اب بھی ویسی ہی ہے۔ بچپن میں بھی وہ ناشتے کی ٹیبل پر پراٹھے کا ہر ہر بل کھول کر دیکھ بھال کر کھانے کا عادی تھا۔

لیکن آمنہ نے کبھی برا نہ مانا.... اسے برا ماننا آتا ہی نہ تھا۔ اسے تو ڈھنگ سے خوشی منانی بھی نہ آتی تھی۔ اچھے کپڑے، نئے سینڈل پہننے بھی نہ آتے تھے۔ بال بنانے بھی نہ آتے۔ میک اپ کرنا، سنورنا.... غرض اس کے نہ کر سکنے والے کاموں کی گھر والے لمبی فہرست تیار کر سکتے تھے۔

شروع شروع میں چھوٹی نندیں ذرا کی ذرا مہربان ہو کر اسے کل وار گڑیا سمجھ کر گھڑی دو گھڑی کے لیے بدل دیا کرتی تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ انہیں بھی یقین ہو گیا کہ یہ آمنہ ہر بات کو رد کرنے.... ہر اک کو مات دینے کی ماہر ہے.... انار کلی فراک میں وہ یوں ٹھیائی پھرتی گویا پردوں سے الجھ رہی ہو۔ تازہ تازہ ہیئر کٹنگ کا وہ دنوں میں برا حال کر دیتی۔ جدید اونچی ہیل والے سینڈل اسے پیروں پر کاٹتے.... ڈگمگاتی پھرتی.... اوپر سے میک اپ اس کا وضو بہالے جاتا.... بس لے دے کے وہ خیمہ نما چادر.... کالے چمڑے کے کھسے.... اور گھوڑے کی پونچھ جیسا لمبا پراندہ.... ان تین چیزوں میں وہ کبھی کبھی غضب ڈھانے کی اپنی سی سعی کر لیتی تھی۔ گویا نظام عالم درہم برہم کرنے جا رہی ہو۔

نادان تھی.... جن کے لیے وہ اتنی تگ و دو کرتی تھی وہ تو اسے بلوری صراحی پر گارے کا لیپ گردانتے تھے.... پسند کیا جانا تو دور، وہ تو اسے اپنا ماننے کی حامی بھرتے ڈرتے تھے۔ یہ کھائی آہستہ آہستہ پاتال سے جا لگی۔ ہر بات میں آمنہ مجرم!

وہ ہنسے گائے تو ملنگنی.... ساکت رہے تو مٹی کا ڈھیر

بات کرے تو بدتمیز.... چپ رہے تو جاہل

کام کرے تو جمعدارنی.... سوئی رہے تو بوجھ

آمنہ سے وہ جھلی، کلو، ملنگنی، اللہ میاں کی گائے اور نجانے کیا کیا بن گئی۔ لیکن اس نے شکایت کے لیے کبھی اپنے لب وا نہ کیے۔ ساری زندگی اس نے چیزوں کا اتنا گھاٹا سہا تھا کہ اب اگر اس پر کوڑے بھی

برسا دیے جاتے تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتی۔
کہتے ہیں کہ کسی کے دل میں جگہ بنانی آسان نہیں ہوتی۔ خاص کر تب جب سامنے والا ذہن کا تنگ اور دل کے سارے کھڑکیاں دروازے مقفل کیے بیٹھا ہو۔
آمنہ ساری ہمتیں باندھ کر اور ساری کشتیاں جلا کر اس گھر میں آئی تھی۔ اس بات پر یقین ہوئے تو اب مہینوں گزر گئے تھے کہ وہ کوئی پری پیکر یا حسن کی دیوی نہیں ہے۔ ذہن و دل کی خوب صورتی وہ تب دکھاتی جب کلثوم کے علاوہ کوئی اس کی بات سننا بھی گوارہ کرتا۔ ہاتھوں کے حسن کو آخری حسن سمجھ کر وہ اس گھر میں جگہ جگہ اپنی چھاپ چھوڑنے لگی۔
نظر نہ آنے والا مگر آنکھوں میں آچبھنے والا....
گھر کے ایسے بہت سارے کام جو بے پروائی کا شکار تھے اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ بھانے والوں کو اس کے کام میں حسن اور ناقدوں کو کیڑے نظر آتے۔
ہفتے بھر کی محنت کے بعد اس نے لمبی اجاڑ کیاری کو بے انتہا خوشنما بنا دیا۔ طرح طرح کے پھول کھلا دیے۔
"کوئی بات تو ہے بھابھی جھلی میں...."
"وہاں گاؤں میں ان لوگوں کو اور کام ہی کیا ہوتا ہے۔ مٹی میں پل کر ہی تو جوان ہوتے ہیں۔"
"بھابھی نے آج تو تمہارے ہاتھ کا دال گوشت بھی بھلا دیا اماں...." آمنہ کی مسکراہٹ ابھی آدھے راستے میں ہی ہوتی کہ کہیں سے آواز آجاتی۔
"دال سبزی پکانے کی ہی تو عادی ہے یہ.... کبھی سینڈوچ بنانے کو کہو.... ڈھنگ سے توس بھی نہ مل پائے گی۔"
مہینے ڈیڑھ مہینے بعد وہ گھوڑی پر چڑھ کر پنکھے ٹیوب لائٹس صاف کر دیتی۔ کچن اسٹور صحن کی نچلی خراب ہوئی دیواروں پر دوبارہ پینٹ کر دیتی۔
"سب فارغ وقت کی اکتاہٹ کا نتیجہ ہے۔ پڑھی لکھی ہوتی تو شوق اور رجحان بھی الگ ہوتے۔"
کلثوم کو بعض اوقات لگتا کہ آمنہ کو اس گھر میں لا کر اس نے اپنی یا سب گھر والوں کی جان پر کوئی ان

دیکھا ظلم کر دیا ہے۔ جب چھوٹے ہی نہیں مان دیتے تھے تو بڑے کیوں پیچھے رہتے۔
شادی شدہ نندیں بھی اکثر کہہ دیتیں۔
"انسان کی اپنی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے.... یہ کیا سب کی خوشی میں خوش.... سب کے غم میں راضی.... اپنی ذاتی رائے بھی قائم کرنا سیکھو بھابھی...."
وہ انہیں کیسے بتاتی کیسے سمجھاتی کہ بیویوں کی اپنی ذاتی رائے الگ فیصلے نہیں ہوتے۔ ان کا تو سب کچھ ان کے شوہروں پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ جو انہیں اپنی جان.... جنت کی ہواؤں سے بھی زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔
اور اب اسی عزیز از جان پر انگلیاں اٹھنے والی تھیں۔ اور یہ آمنہ کو کسی طور قبول نہ تھا۔ اس لیے سارے انتظامات کی تیاری اس نے اپنے ذمے لے لی تھی۔



پہلا مرحلہ شادی کارڈ کا تھا.... کیسے ہوں کتنے ہوں۔ کس رنگ کے ہوں۔
"کارڈ کی کیا ضرورت ہے آمنہ!" کلثوم بس اتنا ہی کہہ سکی۔ پچھلے کئی مہینے سے اس کی زبان لحہ بہ لحہ چھوٹی ہو رہی تھی۔ وہ الفاظ بھول رہی تھی جملے کھو رہی تھی اور تسلی اسے مل نہیں رہی تھی۔ دن رات وہ ایک ہی بات کی تسبیح کر رہی تھی۔
"کیا یہ سب اتنا آسان ہے؟" جو وہ سوچتی کہ عامر جیت گیا تو اسے لگتا ساری دنیا کی عورتیں ہار گئیں، جو وہ سوچتی آمنہ فاتح بن گئی تو اسے محسوس ہوتا جیسے وہ خود ہار گئی۔ نقصان دونوں طرف سے تھا۔
"اماں کارڈ نہ چھپوائے تو کیا منہ سے کہیں گے؟ ایسے تھوڑی نا اچھا لگتا ہے.... شہر میں تو ایسا رواج نہیں.... اور پھر عامر کے سسرال والے کیا سوچیں گے؟"
"کس کس کا خیال ہے آپ کو بھابھی.... بس ایک اپنی ہی فکر نہیں.... اپنے اوپر بھی توجہ دیں.... اپنے

بارے میں بھی سوچیں۔۔۔" چھوٹے دیور نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر جیسے نیند سے جگانا چاہا۔
"میں کیا سوچوں دیور جی اپنے بارے میں۔" وہ پیار سے مسکرائی۔
"اپنے شوہر کے گھر بیٹھی ہوں۔ آرام سے ہوں۔۔۔ اور کیا چاہیے۔" کہتی ہوئی وہ دوبارہ اپنے اوپر ڈالے کاموں میں جت گئی۔ یہ دیکھے بغیر کے اس کی اس بات سے دیور اور چھوٹی نندوں کو کیسی جھرجھری سی آگئی تھی اگرچہ اس گھرانے میں اب مزید حیران ہونے کی گنجائش نہ رہی تھی۔
"اوہ بھابھی جھلی۔۔۔ کلو ماشاءاللہ میاں کی گائے۔"
اور آج ڈھائی سال بعد یہ آوازیں نجانے کہاں تھیں۔ ان آوازوں پر کیسی انجانی چادر تن گئی تھی۔ ان چاہے رعب کی۔۔۔ جیسے گھر کا تختہ الٹا گیا ہوں۔ سیلاب آگیا ہو طغیانی سمیت۔۔۔ آمنہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح ایک دم سے وہ زماں و مکاں پر حاوی ہو گئی ہے۔ جھلی بھابھی سے وہ آمنہ بھابھی ہو گئی ہے۔
عزت والی گھر کی بڑی بہو۔
اس کا دل کیا وہ چیخ چیخ کر پورا گھر سر پر اٹھالے۔
"مجھے اتنی عزت کی عادت نہیں ہے۔ مجھے اتنی عزت نہ دو۔۔۔ میں ٹوٹ جاؤں گی۔ بکھر جاؤں گی یا بہہ جاؤں گی۔" لیکن اگر وہ چیخ سکتی۔ داخلی جذبات کو خارجی کرب میں ڈھال سکتی تو نوبت یہاں تک آتی؟
ایک دن بعد اس گھر میں شادی تھی اور آمنہ کو لگا اس کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی یہ گھر نجانے کیوں ماتم کدہ بنتا جا رہا ہے۔ چھوٹی نندوں کو وہ خود بازار لے کر گئی تھی۔ ہاتھ پکڑ پکڑ کر زبردستی کپڑے پسند کروائے تھے۔
"بھائیوں کی شادی کی تو بڑی چاہ ہوتی ہے بہنوں کو اور ایک تم ہو کہ۔۔۔" دیوروں کے ساتھ بھی وہ خود مارکیٹوں کے چکر لگاتی رہی۔
"گھر میں تو نیکر شرٹ میں پڑے رہتے ہو۔۔۔ بارات، ولیمہ پر بھی یہ ہی پہنو گے کیا؟"
"پڑے تو ہوئے ہیں بھابھی۔۔۔ آپ کی شادی والے۔۔۔ وہ ہی پہن لیں گے۔"
"وہ تو دو سال پرانے ہیں۔۔۔ وہ کیوں پہنو بھلا۔۔۔ اب تو فیشن بھی بدل گیا ہے۔ اور ہمارے پاس روپے پیسے کی بھلا کون سی کمی ہے۔ جو پرانے پہنیں۔" دو سالہ پرانی بھابھی اب فیشن کی باتیں کر رہی تھیں۔
ایسی ہی باتوں کے دوران ایک دن خالہ ساس کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ جو شادی کی وجہ سے بہت دن پہلے ہی آگئی تھیں۔
"بڑی بہو کی مت تو نہیں ماری گئی کلثوم۔۔۔"
"مت ماری جاتی تو ایسی خوب صورت بری تیار کرتی۔۔۔ رنگ سے ایسا رنگ جوڑا ہے کہ دلہن والے دانتوں میں انگلیاں دبالیں گے۔"
"اور تو کانوں میں دہائی۔۔۔ خاندان میں ایسا کبھی پہلے ہوا۔۔۔ کس کس کو وضاحت دیتی پھرے گی۔"
"جس نے یہ سب کروایا ہے۔ وہ ہی وضاحت دے گی۔"
ساری ذمہ داری آمنہ پر ڈال دینے کے باوجود بھی کلثوم ہلکی پھلکی نہ ہو سکی۔ اس نے کبھی سوچا نہ تھا کہ واقعات کو نسبت صرف رشتوں سے ہی ہوتی ہے۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی، آمنہ پورے محلے کو بھی کیسے وضاحتیں دے چکی ہے۔۔۔ شروع شروع میں تو محلے والیاں۔۔۔ کلثوم کی سہیلیاں۔۔۔ بس کریدنے آتی تھیں۔۔۔ جو نجانے کب سے آمنہ کی جنم جنم کی ساتھی بن چکی تھیں۔
"کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟" معمولی جھڑپیں جو بعد میں بڑی داستانیں بن گئیں۔ کھلے کمرے اونچی چھتیں۔۔۔ عامر کی دھاڑتی آواز گونجتی بازگشت کرتی جھنجھناتی ہوئی باہر جاتی تھی۔۔۔ باقی دبے الفاظ وہ خود کھود لیتیں۔۔۔ الجھی لائنیں یہ آمنہ سلجھا دیتی۔
"کیا تماشا تھا کل رات۔۔۔ کیا جھگڑا تھا ماں بیٹے کے بیچ۔"
"جوان لڑکا ہے نا خالہ۔۔۔ پڑھا لکھا۔۔۔ آفس میں

کام کرنے والا۔۔۔ بس وہاں ہی دل دے بیٹھا ہے۔"

"تو کلثوم کو کیا اعتراض ہے۔"

"اماں کہتی ہے آفس میں کام کرنے والی لڑکیاں بڑی چالاک ہوتی ہیں۔۔۔ لوٹ لیتی ہیں۔ پھنسا لیتی ہیں۔۔۔" وہ خلاؤں میں گھورتی کہتی۔

"اور تو۔۔۔ تو کیا کہتی ہے؟"

"میں؟" آمنہ جیسے سانس لینا بھول جاتی۔ "میری کیا حیثیت خالہ!"

☆ ☆ ☆

اور آج مہندی کا دن تھا۔ پہلے شادی کارڈ اور اب پورا گھر قمقموں سے روشن ہو گیا تھا۔ تنبو، قناتیں لگ چکے تھے۔ دیگیں بھاپ اگل رہی تھیں۔ رشتے دار آنے لگے تھے۔ پورا گھر لوگوں سے بھر گیا تھا۔ جب سارا خاندان ہی ڈھیٹ ہوا بیٹھا تھا تو محلے کی عورتیں کیونکر پیچھے رہتیں۔ سب نے کلثوم کو گھیر لیا۔ جو ایک ہی دن میں مزید سو سال جی چکی تھی۔ موم کی طرح پگھل کر تخت پر پھیلی ہوئی، سارے بدن کو آنسو بنائے۔ سہارے کی چھڑی بھی آج اس سے کہیں زیادہ لمبی ہو گئی تھی۔ ہونٹ یوں بند تھے جیسے کسی راز کو مشکل سے دبائے بیٹھی ہو۔

"چپ رہنے سے چہرے کا فریب نہیں جاتا۔۔۔ بڑی ہو گئی۔۔۔ اتنی عقل بھی نہ آئی کہ بیٹے کو قابو کیسے کرے۔"

"لو بھئی ایسا بھی کیا جنون۔۔۔ دو تھپڑ لگائے ہوتے تو کیسے نہ سمجھتا۔"

"سمجھایا تھا۔۔۔ خدا قسم سمجھایا تھا۔۔۔ بس آمنہ۔"

"عامر سے یہ توقع تو نہ تھی۔۔۔ پڑھے لکھے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ۔۔۔"

"مجھے بھی نہیں تھی۔۔۔ لیکن جب عامر کے ساتھ آمنہ بھی مل گئی تو۔۔۔ میرا پلڑا خود بخود ہی ہلکا ہو گیا۔۔۔ سوچا شاید اسی طرح آمنہ خوش رہ پائے۔"

"رہنے دے بہن۔۔۔! حقیقت تو یہ ہے کہ ماں کو ہمیشہ بیٹا ہی پیارا ہوتا ہے۔"

"حقیقت تو....." کلثوم برسات میں بھیگتے شہتیر کی طرح بہہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
"حقیقت تو یہ ہے بہن کہ آمنہ کو ساری حقیقتوں کا علم تھا۔"

ساس کو یاد آیا جب آمنہ نئی نئی اس گھر کی بہو بنی تھی۔ سارے کام دھندے سے فارغ ہو کر گھر کی پچھلی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ گرمیوں میں چھاؤں کے لیے..... سردیوں میں دھوپ کے لیے..... کبھی چھوٹے موٹے کام بھی وہاں ہی بیٹھ کر کر لیتی..... ایک دن کلثوم نے پوچھ لیا۔
"تو بار بار یہاں سیڑھیوں پر کیوں بیٹھ جاتی ہے آمنہ؟"
"سردی لگ رہی ہے اماں..... یہاں ذرا دھوپ آگئی ہے۔"
"دھوپ تو اوپر کی سیڑھیوں پر پہلے آجاتی ہے..... اور چھت پر اس سے بھی پہلے..... تو چھت پر چلی جایا کر۔"

"نہیں اماں..... اوپر جا کر کیا کرنا ہے..... میں تو اپنے درجے کے حساب سے ہی نیچے بیٹھتی ہوں۔ امی نے مرتے وقت کہا تھا..... ہمیشہ اپنے درجے میں رہ..... خواہ وہ درجے انسانوں کے ہوں یا مکانوں کے..... کوئی تجھے قبول کرے یا نہ کرے..... اس بات کو اپنی حیثیت کو کبھی نہ بھول۔ حقیقت کا علم رکھے گی تو زندگی آسان رہے گی۔"
کلثوم کو لگا جیسے نئی نویلی بہو نے اسے پہاڑ کی چوٹی پر سے دھکا دے دیا ہو۔ نوکیلے پتھروں..... خار دار جھاڑیوں کے اوپر..... تو گویا وہ یہ بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اس گھر میں سب سے نچلا درجہ رکھتی ہے۔ کلثوم کے دل میں آئی کہ وہ اس جھلی کو ایک کس کے چانٹا مارے اور اسے یاد کروائے کہ وہ اس گھر کی بڑی بہو ہے۔ لیکن ساس گھٹنے گھٹنے اس کی وزنی بات کی دلدل میں دھنستی چلی گئی۔
دو سال بعد آج پھر اسی آمنہ نے کلثوم کو ایک نئی دلدل میں لا دھکیلا تھا، جو پہلی سے زیادہ خوفناک حد تک اپنے اندر کھینچنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔
اتنے میں اسے آمنہ نظر آئی۔ پیلے چوڑی دار پاجامے اور سبز قمیص میں..... ہاتھوں میں گجرے ڈالے پیارا سا ہار سنگھار کیے..... اس کی نظر میں کوئی بات ہی تو نہیں ہونے جارہی تھی اپنی تمام تر سادگی سمیت کچھ ہو جانے کے ممکنہ خطرے کے ساتھ وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی..... جیسے شکست کی سیڑھیاں اتر رہی ہو۔ چلتے چلتے جیسی اسے کبھی گڑھے سے واسطہ ہی تو نہ پڑا ہو۔ لب بھینچے، مسکراتی ہوئی گویا کوئی جوار بھاٹا دبائے بیٹھی ہو اس کی مسکراہٹ بھد بھری تھی کہ مسکرائی نہ تو ہنس دے گی اور جو ہنس دے گی..... تو رو دے گی۔
"تیری بہو تو چاندی کی طرح چمک رہی ہے کلثوم۔"
"میری بہو ہے ہی بہت پیاری۔"
"ہاں..... بہو ہی تو ہے۔ بیٹی ہوتی تو یہ سب کرتی۔"
"تم سب کے سامنے ہے۔ دیکھ لو کتنی خوش، کتنی مطمئن ہے۔"
"وہ تو پگلی ہے..... تو ہی عقل دکھا جاتی کلثوم۔"
"ہاں واقعی وہ تو سودائی ہے..... تب ہی تو..... اتنا گھاٹے کا سودا کیا ہے اس نے..... سارے قصور ہمارے ہیں بہن..... سارے قصور ہمارے ہیں۔ ہائے آمنہ کیسے کرم تیرے..... جو تیری غلطی نکالوں تب بھی میں ہی مجرم۔"

"دولہا کہاں ہے بھئی..... کوئی دولہے کو تو لاؤ۔"
"میں لاتی ہوں۔" اور بجتی ڈھولکی پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ گویا صحرا کو دریا کی طرف موڑ دیا جائے۔ کسی کی کچھ کہنے، سوچنے سمجھنے کی ہمت ہی نہ رہی۔ اس گھر نے ہی تو اس کو اتنا بے پروا بنایا تھا۔ اب اس سحرزدہ ماحول میں..... وہ خود ہی تماشا گر تھی اور خود ہی تماشا.....
لمحے بھر بعد وہ سوتی شلوار قمیص میں ملبوس عامر کو لیے بیچ صحن میں لگے صوفے پر بٹھانے لگی۔ کوئی اس کا ہاتھ بٹانے کو آگے نہ بڑھا۔ ہر کام کی ذمہ داری بھی تو اس نے خود ہی لی تھی۔ اکیلی ہی تو جان ماری تھی کتنے دنوں سے۔ ڈھولکی پر دوبارہ بیٹھ کر اس نے گلے سے

ایسے سر نکالا کہ جیسے یہ اس کی زندگی کی آخری شادی ہو۔ اور اسے دوبارہ گانے کا کبھی موقع نہ ملنے والا ہو۔ بھول گئی تھی کہ گھر والے اسے پچھلے دو سال سے شہری بنانے کے لاکھوں جتن کر چکے ہیں۔

گاڑی کے ٹپے جو آلو مٹر سے شروع ہو کر تانگے والے پر ختم ہوتے ہیں.... اس نے سارے خزانے لٹانے کا آج اہتمام کر رکھا تھا۔ پورے صحن میں صرف ایک اس کی آواز گونجنے لگی اور باقی سب کی تالیاں۔ پہلے کی بات ہوتی تو بڑی نندیں یا خود کلثوم ایک جھاڑ پلا کر اسے وہاں سے اٹھا دیتیں۔ لیکن اب تو اس کم بخت نے نجانے کیسے سب کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔ کون کون سے جادو کر رکھے تھے اس نے سب پر.... اس کے آگے اپنا آپ چھوٹا لگنے لگتا.... اپنے ارادے اپنے فیصلے گھٹتے چلے جاتے.... دل کرتا وہی کریں، جو آمنہ کہے.... اس گھر کی مٹی اکٹھی کر کے اس نے اپنے لیے ایک ٹیلا بنا لیا تھا اور اب خود اس ٹیلے پر جا بیٹھی تھی اور جب کوئی اتنا اونچا ہو جائے کہ بادلوں سے باتیں کرنے لگے تو زمین کی ادنیٰ مخلوق اسے بھلا کیسے روک یا ٹوک سکتی ہے۔

"کوئی رہ تو نہیں گیا؟" تصویریں اتارنے والے فوٹو گرافر نے کیمرہ کلوز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں.... میں۔" کلثوم کو یہی ڈر تھا۔ آمنہ نے بچوں کی طرح ہاتھ کھڑا کر دیا تھا۔ وہ کب سے عامر کے پیچھے کھڑی ہو کر ویلوں کے پیسے اکٹھا کر رہی تھی۔

"اتنا تماشا لگانے کے بعد بھی تجھے چین نہیں آیا آمنہ...."

کبھی کبھی کلثوم اپنی نظریں آمنہ کے اندر تک گاڑ دیتی۔ اسے لگتا یہ سادگی یہ بھولا پن یہ معصومیت.... ان سب کے پس منظر میں کہیں چالبازی کی گانٹھ تو نہیں.... نیت کا کھوٹ تو نہیں.... گاؤں والیاں شاید کہیں اس روش کو مکاری گردانتی ہوں۔ لیکن کلثوم اپنے خیالات کو فوراً ہی جھٹلا دیتی۔ آمنہ کی نیت پر شک کرنا اپنی نیت پر شک کرنے جیسا تھا۔ اس کا باطن بھی ظاہر کی طرح شفاف تھا۔ تازہ پھوٹتے سوتے کی طرح نتھرا ہوا تھا اس کا دل.... دیوی سمان تھی آمنہ۔

"دیوی....؟" کلثوم کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ یہ سوال اپنے آپ میں کتنا بڑا سوالیہ نشان بن گیا تھا اس کے لیے.... کلثوم کے کیے ہوئے پکے وعدے کی بے حرمتی۔

"تو فکر نہ کر ساجدہ.... تیری بیٹی میری بیٹی.... اسے تو گرم سانس کی پھونک بھی نہ ماروں۔ دیوی کی طرح رکھوں گی اسے۔" اور یہ الفاظ اب کتنی بھیانک یاد بن چکے تھے۔

"کس چیز کی کمی ہے آمنہ کو.... دیوی کی طرح ہی تو رہ رہی ہے۔" کلثوم خود کو تسلی دیتی۔

"اور اگر آمنہ کی جگہ واقعی تیری سگی بیٹی ہوتی تو؟" کوئی اس کے اندر سے اسے جھٹلاتا۔

وہ عورت تھی۔ بحث کیسے نہ کرتی.... اسی بحث میں تو دو سال نکل گئے تھے۔

لیکن اس کی بات مانی گئی تھی نہ اس کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ عامر کی جوان آواز اس کی بوڑھی بیمار آواز سے ہمیشہ اونچی ہی رہی۔ سب اپنے اپنے کمروں میں جا دبکتے.... عامر باہر جا کر خودکشی کر لینے کی دھمکی دے دیتا اور آمنہ.... گھر کے اندھیرے حصوں میں جا کر رو رو کر خود کو ہلکان کر لیتی.... یہ منظر تو کلثوم کو ازبر تھا۔ اس کے تحت الشعور میں کسی چور کی طرح دبکا بیٹھا تھا۔ پچھلے کافی مہینوں سے آئے دن اسی کو تو دہرایا جا رہا تھا۔ لیکن یہ ضمیر کی ملامت.... اندر کی بحث کی ناکامی کا احساس.... یہ سورج تو نیا طلوع ہوا تھا۔

کلثوم نے دیکھا.... آمنہ عامر کے ہاتھ پر مہندی رکھ رہی تھی۔ مٹھائی کھلا رہی تھی۔ پھر سر سے پیسے وار کر اس نے اپنی ہی جھولی میں ڈال دیے۔

"میں جانتی ہوں آمنہ....! تیرا بس چلے تو تو خود کو بھی اس گھر سے وار کر خیرات بن جائے....! اپنی ماں سے کیے وعدے 'اپنے درجے کی پہچان.... پتھر پر لکیریں کھینچی ہے تو نے آمنہ.... اب جب تیری بات مانی گئی ہے.... شاید اب تو خوش رہ پائے۔ اور جو نہ رہ پائی خوش تو.... کیا کرن جوگی میں آمنہ...."

کیا کرن جوگی میں۔۔۔

☆ ☆ ☆

پچھلے دو مہینوں کی طرح اگلے دن بارات کی ساری رسموں میں بھی وہ پیش پیش رہی جیسے کسی زنگ آلود مشین کو گریس لگا دی گئی ہو اور اب اس کی روانی بے قابو ہو۔ آمنہ بھی تتلی بنی رہی۔ بری دکھانے سے لے کر دلہن کو گھر لانے تک۔۔۔ کلثوم تو ویسے ہی 'بارات میں نہ گئی تھی۔ اور نندیں نجانے کیوں شرمندہ شرمندہ سی تھیں۔

حالانکہ طوفان تو گزر چکا تھا۔ اپنے تمام تر بھیانک اثرات سمیت۔۔۔ پیچھے تو صرف اجاڑ زمین رہ گئی تھی۔ ایک خوفناک عالم اور یاس بھری نقاہت کے ساتھ۔۔۔ خیر آمنہ کو اس بات کی خوشی تھی کہ ڈھائی سالوں سے چلتی آ رہی لڑائی کی ٹرین کو بالآخر پلیٹ فارم مل گیا تھا۔ رات کو سب کو جلدی نیند آ گئی۔ جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہیں سو گیا۔ وہ ہی دلہن کو لے کر اس کے کمرے تک گئی تھی۔ واپسی پر عامر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اپنی دلہن کے سامنے۔۔۔ شاید دلہن کو ہی باور کروانے کے لیے۔

"تمہارا شکریہ آمنہ۔۔۔! پر یہ مت سمجھنا کہ میں شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔ یہ ہی میری اصل شادی ہے۔ میری پسند کی۔۔۔ تم جانتی ہو۔"

حسب عادت زخموں پر خود ہی پھایا رکھ کر وہ کلثوم کے پاس آ گئی۔ ابھی اس کی اہمیت ایسی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنی حیثیت بھول جائے۔ قفل لگے دروازوں کو کھولنے کا فن نہ وہ جانتی تھی نہ جان سکے گی۔ یہ زیست تو دائرہ بن کر اسے اپنے ہی قدموں سے بار بار ملائے گی۔ بالآخر تھک کر وہ نڈھال ہو جائے گی اور بس پھر انتظار رہ جائے گا۔ گھپ اندھیرے میں روشنی کا انتظار۔

"اماں۔۔۔ آج میں تمہارے ساتھ سو جاؤں؟"

"ہاں۔۔۔ سو جا۔" گڑگڑاتی 'گھٹی گھٹی سی آواز۔۔۔ آمنہ کا دل مٹھی میں آ گیا۔

"ہائے اماں۔۔۔ تمہیں کیا ہوا۔۔۔ تم کیوں رو رہی ہو؟"

آمنہ نے ساس کے چہرے سے رضائی ہٹا دی۔

"بن گئی دیوی تو آج۔۔۔ بیٹھ گئی استھان پر۔۔۔ اب حاصل کر پائے گی انصاف۔۔۔ اپنے اوپر سوتن لا کر۔۔۔"

جس بات کو وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس گھر کے افراد بار بار اسے اسی رخ پر پھیر رہے تھے۔ آمنہ کے لب جامد ہو گئے۔ یہ سوال نہیں گڑھا تھا۔

"کچھ کہا عامر نے۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ کہا کہ یہ ہی ان کی اصل شادی ہے اور وہ اس پر بالکل بھی شرمندہ نہیں۔" ساس کی ہچکی بندھ گئی۔

"پھر کیا ملا تجھے۔۔۔ یہ سب کروا کے آمنہ۔۔۔ مہندی گھولتے گھولتے تو' تو اپنے ہاتھوں کی دو انگلیاں بھی نہ رنگ سکی بدقسمتے۔"

"تم نے ہی تو کہا تھا اماں۔۔۔ کہ عورت مرد کی خوشی میں مکمل ہوتی ہے۔"

"اتنی مکمل ہو گئی تو پاگلے۔۔۔ کہ اب تازہ ہوا بھی تجھ میں سے نہ گزر سکے۔" کلثوم جانتی تھی۔ طوفان آنے کا اتنا خوف نہیں ہوتا جتنا پتوار کے چھوٹنے کا لہروں کے خاموش ہو جانے کا۔ کلثوم کی ذات اس بات کو جذب نہ کر سکی اور اس کی آنکھوں نے آنے والے وقت کی حیرت کو اپنے اندر سمو لیا۔

وہ رات کلثوم پر بہت بھاری تھی۔ اس نے چاروں طرف سے رضائی کی بکل ماری۔۔۔ سخت سردی۔ سارے دن کی تھکن۔۔۔ اور شب بو کے کھلے ہوئے سفید پھولوں کی مہک کی وجہ سے وہ سوتے جاگتے میں ساری رات سلگتی رہی۔۔۔ کچھ ایسی ہی بے داری اسے ٹھیک ڈھائی سال پہلے بھی ہوئی تھی۔ جب ڈاکیے نے اسے ساجدہ کا خط پکڑایا تھا۔ اس کی بچپن کی سہیلی۔۔۔ اس کی رہنما' اس کی مسیحا کا۔۔۔

تب ساجدہ کے نام کا خط' خط کی عبارت نے اسے کروٹ کروٹ بے چین رکھا تھا تین سطری خط کو بار بار پڑھنے اور رٹ لینے کے باعث ایک رات کاٹنا اس کے لیے عذاب بن گیا تھا۔۔۔ مدتوں پہلے کی۔۔۔ منظر سے غائب۔۔۔ آؤٹ آف فوکس ساجدہ اس رات نجانے

کیسے شب بو کی کھلے ہوئے پھولوں کی مہک بن کر ہر ہر در نہ... اندر سے آتی اس کو جھنجھوڑنے لگی تھی۔

چھ ماہ پہلے کا لکھا گیا خط تھوڑا غلط پتا ہونے کی وجہ سے نجانے کہاں کہاں گھومتا رہا تھا۔ اگلے دن صبح ہی صبح کلثوم گھر سے نکلی۔ بسوں سے، ویگنوں اور پھر تانگوں پر سفر کر کے وہ ساجدہ کے گھر پہنچی.... جہاں ہر سو خاموشی تھی۔ کسی بیمار کی عیادت کے احترام میں غار کے بھیتر جیسی.... کلثوم کو لگا جیسے مدتوں سے روشنی اس گھر سے روٹھی ہو۔

کلثوم کو دیکھ کر ساجدہ کا پیلا بیمار چہرہ لمحے بھر کو تمتما اٹھا تھا۔

"کیا ہوا ساجدہ؟ کیا حالت ہو گئی تیری....؟ کیسی خوب صورت ہوا کرتی تھی تو۔"

"مجھے یاد ہے کلثوم کہ میں کیسی تھی.... اور اب کیسی ہوں...... سب یاد ہے مجھے.... کیا میں تجھے کچھ یاد دلاؤں۔"

"ہاں.... دلا دے.... جو میں کچھ بھول گئی ہوں تو۔"

"یاد ہے، میری ماں نے کیسے ساری زندگی تمہارے خاندان کی خدمت کی.... کبھی نمک حرامی نہیں کی.... مجھے بھی اسی کی تربیت دی اس نے مگر.... جو خدا کا منظور.... یاد ہے، بڑے بے آسرا ہو جانے کے بعد تیری دولت کو اور تجھے جان پر کھیل کر لائی تھی میں لاہور تک.... تیری پیاس بجھانے کی خاطر اپنے پیروں پر چھالے نکلوا لیے.... بلوائیوں سے تجھے بچایا.... اور...."

"مجھے سب یاد ہے ساجدہ.... تو کیوں یاد کرواتی ہے اب...." کلثوم نے شفقت سے ساجدہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"تو پھر آج اسی پانی سے مجھے نئی زندگی دے دے کلثوم.... میری بیٹی کو بلوائیوں سے بچالے.... میں اور کچھ نہیں مانگتی کلثوم.... میں اور کوئی بدلہ نہیں مانگتی۔"

کلثوم نے آمنہ کو دیکھا۔ جو چائے لیے کھڑی تھی۔ سیدھی سادی معصوم سی موم کی گڑیا۔ کلثوم نے سوچا یہ تو کورا کاغذ ہے۔ رنگ کرنے سے حسین ہو جائے گی۔ تب یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئی کہ آخر رنگ کرے گا کون؟

ساجدہ کی تدفین کے بعد وہ آمنہ کو اپنے ساتھ گھر لے آئی۔ شروع شروع میں تو آمنہ ہر ایک کو ہی بہت پیاری لگی۔ بہنوں کو لگا انہیں ایک نئی سہیلی مل گئی۔ بھائیوں نے کہا یہ تو لوڈو کی طرح ہے۔ ہری، پیلی، لال، نیلی....

"یہ اس گھر کی ہونے والی بڑی بہو بھی ہے۔" خود سے کہتی ڈرتی کلثوم نے یہ بات نجانے کیسے سب کے سامنے کہہ دی۔ پورے گھرانے نے جیسے شیر کو کھلے میدان میں قریب سے دیکھ لیا۔ ایک دم آمنہ کچھ سے کچھ ہو گئی۔ لاتعداد کیڑے آمنہ کی ادنیٰ ذات میں سے نجانے کیسے نکل آئے۔

"جھلی، جاہل، گنوار، دیہاتن، یہ بنے گی اس گھر کی بہو...." اس کے گاؤں کی باتیں جنگل کی باتیں لگنے لگیں۔ سہیلی سہیلی کا کھیل ختم ہو گیا۔ قوس قزح والی لوڈو پر رات کی سیاہی پھیل گئی۔

عامر نے کتنا ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ گھر چھوڑ جانے کی دھمکی دی تھی۔ ناراض رہا تھا۔ بھوک ہڑتال کی تھی۔ لیکن کلثوم اپنے فیصلے پر ایک چٹان کی طرح ڈٹی رہی تھی۔ بھول گئی تھی کہ عورت کا فیصلہ کبھی چٹان نہیں بن سکتا۔ خواہ سامنے کا مرد کسی بھی روپ میں اس کے سامنے کیوں نہ ہو۔ عامر نے بات مان لی اور پھر اس زبردستی من مانی کا بھرپور بدلہ لیا اتنا کہ پہلی ہی رات جب اذانیں مل رہی تھیں، کلثوم نے آمنہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

پچھلے چھ ماہ سے وہ بھی اسی گھر میں تھی۔ حالات و واقعات نے اس کے ذہنی گرداب میں بھی گھرا پڑاؤ ڈالا تھا۔ شوہر پہلی ہی رات گھر سے باہر تھا۔ وضاحت لینے اور دینے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ صبح اٹھ کر اس نے تو جیسے محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ کوئی بات ہوئی ہے۔ اگرچہ پس منظر میں بے بسی اور بے قدری کا سورج تانبے کے تھال کی طرح روشن تھا لیکن یہ اس کا آخری ٹھکانہ تھا۔ اب اسے یہاں سے مر کر ہی نکلنا

تھا۔
"اللہ لوک جو تھی بے چاری۔"
یہ سب یاد کرکے کلثوم کی آنکھوں میں نمکین پانی بھر گیا۔ شب بو کے کھلے ہوئے پھولوں کی مہک سارے گھر میں پھیل چکی تھی۔ چاند کی ٹھنڈی سفید چاندنی نے کمرے میں داخل ہو کر پر نور سا اجالا کر دیا تھا۔
"عورت کو لحہ لحہ نئی زندگی کے لیے نیا پانی چاہیے ساجدہ..... اور اس دنیا کا پانی اس کی پیاس کے لیے ناکافی ہے۔" کلثوم خود سے باتیں کرنے لگی اور اس نے سوچا۔
"یہ بلوائیوں کے قصے..... نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی آخر یہ ہماری باتوں' ہمارے افسانوں سے ختم کیوں نہ ہو سکے۔" اور اس کے دل سے التجا نکلی۔
"کاش تب ساری بچ جاتیں..... یا ساری کی ساری ڈوب مرتیں..... کسی کا کسی پر نہ اترنے والا احسان تو نہ چڑھتا۔" اور پتا نہیں یہ بلوائی..... تب حقیقت میں تھے بھی کہ نہیں..... یا وہ محض عورت کا وہم تھا..... اس کا ازلی خوف' جس نے پرچھائی کی صورت اختیار کرلی تھی..... مونچھوں والے مرد کی..... ایک بلوائی کی تشبیہہ..... اور عورت اپنے اندر کے خوف سے ہی ڈرتی رہی۔ کنویں میں چھلانگ لگاتی رہی۔"
بھیگی آنکھوں اور جذبے سے بھرے دل کے ساتھ اسے ایک جھرجھری سی آگئی اور اپنے پیچھے لیٹی آمنہ کو اس نے گلے سے لگالینا چاہا۔ لیکن کروٹ بدلنے پر اس کے ہاتھ ہوا میں ہی لہرا کر رہ گئے۔ آمنہ بیڈ پر موجود نہیں تھی۔ ٹٹول کر انہوں نے اچھی طرح دیکھا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر لیمپ آن کیا۔ اپنا چشمہ لگایا۔ باتھ روم کی بتی بجھی ہوئی تھی۔
"کہاں گئی؟ اس وقت؟ اتنی سردی میں؟" ایک عجیب سی گھبراہٹ اور وسوسے نے اس کا احاطہ کرلیا۔ چادر لپیٹ کر وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ ساتھ کے کمرے میں نواسیاں سو رہی تھیں۔ بڑی آہستگی سے اس نے دروازہ کھولا۔ اندھیرے میں اسے کچھ نظر ہی نہ آرہا تھا۔
"سارا..... سفینہ۔" اس نے پکارا۔
"جی..... نانو۔"
"ماں کہاں ہے تمہاری؟"
"یہاں تو نہیں ہیں..... شاید ساتھ والے کمرے میں ہوں۔"
"کہاں گئی..... کہیں گھر چھوڑ کر تو نہیں چلی گئی..... رات کے اندھیرے میں..... باہر تو بلوائی بیٹھے ہیں آمنہ..... ہردم۔" اس کے دل نے چیخ کر کہا۔
"تو اندروں میں کون سی کمی ہے اماں۔" کہیں اندر سے جواب بھی آگیا۔
ساتھ کے کمرے میں ساری بیٹیاں سو رہی تھیں۔
"نجمہ او..... نجمہ!"
"جی..... جی!"
"بھابھی کہاں ہے تمہاری۔"
"وہ..... وہ تو تمہارے ساتھ ہی سو رہی تھی۔"
"کیا ہوا....." پروین بھی اٹھ بیٹھی۔
"نہیں..... نہیں..... کچھ نہیں سوجاؤ..... وہ' وہ آمنہ اب بیڈ پر نہیں ہے۔"
"ہائے اللہ..... تو کہاں گئی۔" اتنے میں عابدہ کی مری مری آواز آئی۔
"امی وہ پیچھے اسٹور روم میں گئی ہے۔ میں فہد کا فیڈر بنانے اٹھی تو انہیں وہاں جاتے دیکھا تھا۔"
"ہائے کیا ہوا..... خیریت تو ہے..... لائٹ جلاؤ۔"
"نہیں..... سوجاؤ تم سب..... میں نے ہی کہا تھا کہ سردی لگے تو اسٹور سے کمبل نکال لائے۔ سوجاؤ تم سب۔" کلثوم نے لاٹھی پر اپنی گرفت اور مضبوط کرلی۔ مبادا کہیں وہ گر ہی نہ جائے۔ ایک دم سے اس کی سانس کی نالی جیسے تنگ ہو گئی تھی۔ دو قدم اٹھانے مشکل ہو گئے۔
"اسٹور روم میں کیا کرنے گئی ہے وہ اس وقت..... نہ بیڈ' نہ تخت' نہ تپائی..... کہاں ہے وہ اتنی دیر سے..... کہیں کچھ ایسا ویسا تو نہیں کرلیا۔" اس کے ذہن میں اسٹور روم کا پنکھا گھوم گیا..... اس پنکھے سے بندھا رسہ

اور اس رسے سے لٹکتی آمنہ... خود کشی؟

"عورت کا ازلی خوف اور اس کی پرچھائی"... اس نے سہارے کو تھام لیا۔

"نہیں... نہیں آمنہ۔" اس نے گھٹی گھٹی سی چیخ ماری۔ "یہ پچھلا صحن آج کہاں کھو گیا مجھ سے... منع کیا تھا میں نے... نہ بن اتنی شوہر پرست... اتنی خدمت گزاری کا نتیجہ بھی ہمیشہ اسفل ہی رہا ہے۔ منوالی نا اپنی ضد..." ایک ایک قدم کو انگاروں پر رکھتی بمشکل تمام وہ پچھلے صحن میں پہنچی تھی۔

اسٹور روم کا دروازہ بند تھا۔ ذرا غور سے دیکھنے اور سننے پر اسے کچھ محسوس ہوا۔ تیسری سیڑھی پر بیٹھی آمنہ اور اس کے وجود سے نکلتی سسکتی آواز۔

"دیوی جھکتی نہیں... نہ مڑتی ہے۔ وہ تو بس ٹوٹتی ہے۔ تو یہاں بیٹھ کر کہہ رہی ہے؟ خدا سے شکوے کا سنہ دل کو ہلکا کر رہی ہے۔ ہائے آمنہ! تو جھوٹی بھی نکلی... کل رات میں تو سمجھی تھی کہ تیرے چہرے پر سچا اطمینان ہے... میں تیرے دل کے اندر جھانک چکی ہوں۔ پر تو تو منافق نکلی آمنہ... اپنی ماں کی طرح... وہ بھی سارے دکھ اکیلی سہتی رہی... کبھی اپنے دل کا حال نہ سنایا... میرا احسان لینا گوارہ نہ کیا۔ کبھی مجھے اپنی سہیلی نہ سمجھا... اور جو میں نے تجھے سہیلی بنایا تو... تو بھی اس رشتے کی کھوٹی نکلی۔

میرا ساٹھ سال کا تجربہ تو نے چھین لیا۔ آمنہ میں تو بے تجربہ ہو گئی... میری آنکھوں میں خوش رہنے کی دھول جھونکی، دھوکا دیا... میرے بالوں کی سفیدی ختم ہو گئی... میری آنکھوں کا نور اجڑ گیا۔ میں تو تجھ سے بھی چھوٹی ہو گئی آمنہ... تو نے تو میرا سب کچھ چھین لیا... سب لوٹ لیا۔"

اور اس کی سسکیوں کے درمیان ہی ساس کو کچھ اور بھی سنائی دیا۔ جس نے اسے رات کے اس ٹھنڈے پہر بھی تپتی ریت پر لیٹا دیا۔ اپنے دکھ میں گم وہ دعائیں مانگ رہی تھی اس گھر کے سکون اور عامر کی خوشیوں کی دعائیں۔

کلثوم نے اپنی چادر اپنے ہی منہ میں ٹھونس لی کہ کہیں اس کے رونے کی وجہ سے آمنہ کی دعاؤں میں خلل نہ پڑ جائے۔ کلثوم خود میں ایسے سمٹی جیسے اس نے کائنات کا کوئی بڑا راز پا لیا ہو۔ لمحے بھر میں جیسے بحرالکاہل سوکھ گیا ہو۔ کچھ باتیں شیشے کی طرح ہوتی ہیں۔ ساری کی ساری ایک دم واضح ہو جانے والی اور کچھ راز کٹاری کی طرح تیز دھار ہوتے ہیں۔ آشکار ہو جائیں تو روح تک گھائل ہو جاتی ہے۔

اپنی ساری زندگی کے حساب کتاب میں کلثوم کے حصے میں منفی نکل آیا تھا۔ یہ تیئس سالہ شیارن آمنہ نے اسے سمجھا دیا تھا۔ باطنی اور علامتی طور پر... اپنی زیست کے خود ساختہ زعم سے بھرپور اشاروں سے کہ کلثوم اصل میں کس درجے پر جیتی آئی ہے۔ اور عورت کی اصل تشبیہ کیا ہے۔ صرف کوما ("") ڈالنے سے عورت خاص نہیں بنتی... اس کے لیے ذہنی اور جسمانی تپسیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ دل کی رغبت روح کا ملن ضروری ہے۔

"ماں! تم... یہاں اس وقت؟" آمنہ نے آنسو صاف کر کے حیرت سے ساس کو دیکھا۔ کلثوم لاٹھی ٹیکتی آمنہ کے قدموں میں جا بیٹھی...

"اماں..." آمنہ نے دبی دبی سی چیخ ماری۔

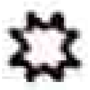
"وہیں ہی بیٹھی رہ..." کلثوم نے جیسے حکم دیا۔

"تیرا درجہ یہ ہے... مجھ سے اوپر... اور میرا یہ... تجھ سے نیچے۔" کلثوم غمگین ہو گئی۔

"میں ساس ہی رہی، ماں نہ بن سکی۔ اپنے بیٹے کو دوسری شادی سے باز نہ رکھ سکی۔ تجھے تیرا حق، خوشیاں نہ دلوا سکی۔ ایک مرد کی ماں ہی رہی۔ عورت ازل سے شاید مرد کی ماں ہی رہی ہے۔ وہ بہو کی ماں کبھی نہیں بن سکتی..." کلثوم خلاؤں میں دیکھنے لگی۔

"میں تجھے دیوی سمان رکھ تو نہیں سکی... پر دیوی کا درجہ ضرور دیتی ہوں۔" کلثوم آنسو خشک کرنے لگی۔

اور اس رات دونوں ساس بہو ایک دوجے کے گلے لگ کر خوب روئیں۔



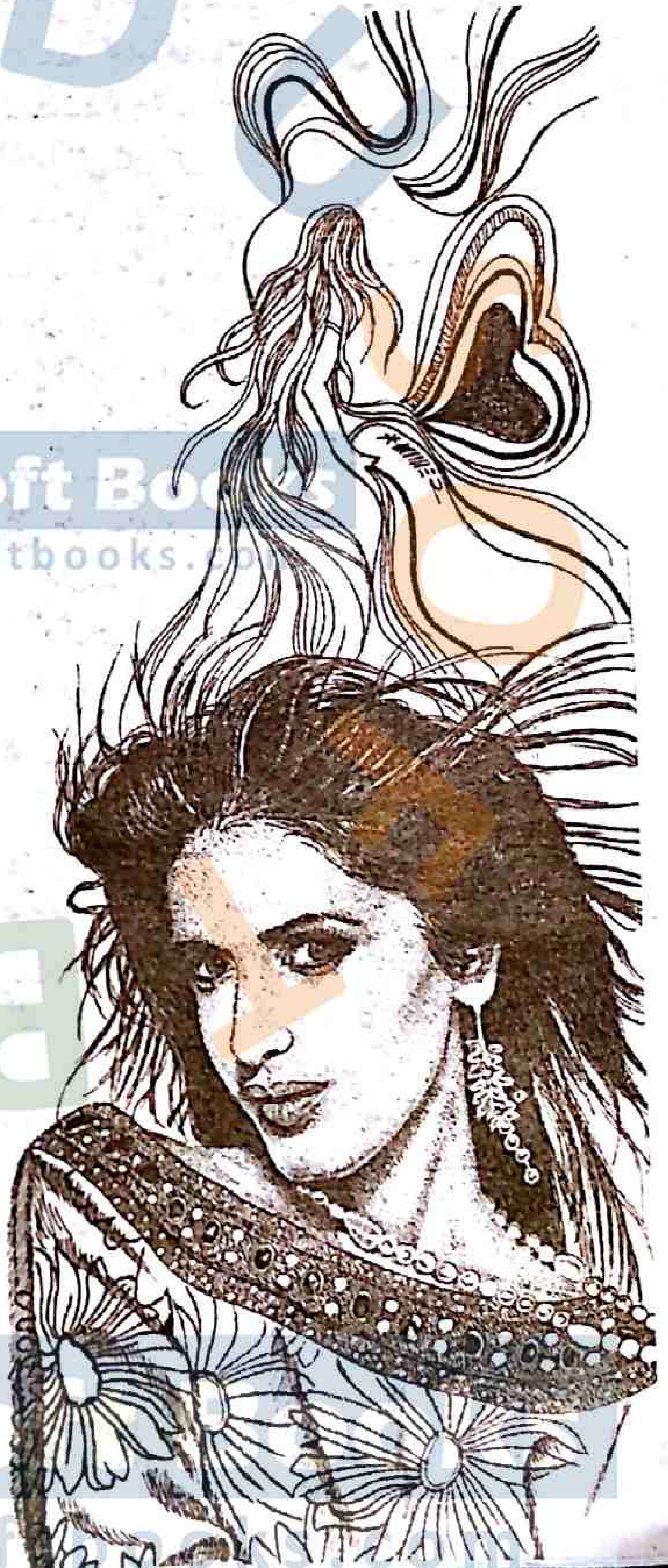
حیا بخاری

پارس کی ماں کی

دبئی ایرپورٹ کے رن وے پر جہاز دھیرے دھیرے رینگنے لگا۔ اس نے آگے پیچھے بیٹھے اپنے چاروں بچوں پہ ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ مطمئن سی مسکراہٹ اس کے تراشیدہ لبوں کو چھو گئی۔ اس نے مطمئن انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی۔ نگاہیں کھڑکی کے اس پار تیزی سے بھاگتے نظاروں پہ تھیں۔ ذرا سا دل ڈوبا تھا اور جہاز نے اڑان بھرلی تھی۔

وہ پورے اٹھارہ سال بعد پاکستان جارہی تھی۔ اماں کی وجہ سے۔ صرف اور صرف اماں، اپنی ماں کی وجہ سے۔ جو اس کی شادی کے بعد سے اس کے ساتھ ہی تھیں۔ لیکن پھر انہیں دیار غیر میں ہی سانسیں اکھڑ جانے کی فکر ستانے لگی۔ تو دو سال قبل واپس پلٹ گئیں۔ طبیعت اچانک بگڑ گئی تب ہی۔ ہانیہ کو بلوا بھیجا۔ شہروز کو چھٹی نہ مل سکی تھی۔ تب ہی وہ بچوں کے ساتھ جارہی تھی۔ اور ایسا زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اکیلی اتنا لمبا سفر طے کررہی تھی۔ مگر اب وہ اٹھارہ سال پہلے والی ہانیہ نہیں رہی تھی۔ یہ ایک انتہائی پروقار، بااعتماد ہانیہ تھی۔ اور اس کی شخصیت کو یہ وقار، اعتماد، شہروز نے ہی بخشا تھا۔

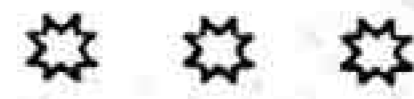
جہاز نے اڑان بھری تو لگا۔ اس نے یوں ہی گردن گھما کر ساتھ بیٹھے گیم کھیلتے سولہ سالہ حمزہ کو دیکھا تھا۔ اس کی نظر اس کے خوب صورت گورے ہاتھ پہ بندھے ننھے سے بریسلٹ پر پڑی۔ اس کی بیٹی نہیں تھی۔ چار بیٹے تھے۔ اور وہ بھی جڑواں کی صورت میں۔ پہلے دو جڑواں بیٹوں اور دوسری جوڑی میں دو سال کا فرق تھا۔ ان چاروں میں حمزہ سب سے چھوٹا تھا۔ اپنے جڑواں



بھائی طحہ سے پندرہ منٹ چھوٹا۔ اور باقی تینوں بھائیوں نے بہن کی ہر حسرت اسی چھوٹے پہ مٹائی تھی۔ سوائے حمزہ کے سب بھائیوں کو ایک بہن چاہیے تھی۔ اور خود ہانیہ کو نہ جانے کیوں اس کی پلکیں جھکنے لگی تھیں۔

"یا اللہ۔ میں تیرے ناشکرے بندوں میں سے نہیں ہوں۔ تو مجھے بیٹی بھی نوازتا تب بھی مجھے اسی قدر مطمئن پاتا۔ بس اب تجھ سے اس توفیق کی دعا مانگتی ہوں کہ مجھے ہر غرور سے بچا۔ کہ بے شک ہم صرف سوچ تک محدود ہیں۔ ہوتا وہی ہے جو تو چاہتا ہے۔"

بادلوں سے اوپر جہاز آگے سفر طے کر رہا تھا۔ اور ہانیہ زیدی نہ جانے کتنے پیچھے رہ گئی تھی۔ ماضی میں بھٹکتے.....



"ہاؤ۔" زوردار مردانہ آواز پہ وہ ذرا سی چونکی ضرور۔ لیکن ڈری نہیں۔ ابراہیم منہ بناتا اس کے پاس ہی سیڑھیوں پہ بیٹھ گیا۔

"کمال ہے یار۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا۔ جب دیکھو اس بند انیکسی میں پائی جاتی ہو۔" وہ کچنار کے سیڑھیوں پہ گرے کاسنی جامنی پھول چنتے ہوئے بولا۔

"جن بیٹیوں کے باپ مر جائیں۔ انہیں پھر کسی چیز سے خوف نہیں آتا۔" اس نے خالی خالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیابان قبرستانوں سے بھی نہیں۔ یہ تو پھر ہمارے اپنے گھر کی انیکسی ہے۔"

اس کی سرمئی سی لو دیتی آنکھیں اداسی کے رنگوں سے جگمگا رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں اس قدر حسین تھیں کہ ابراہیم بے ارادہ ہی انہیں دیکھے گیا۔ وہ رخ پھیر گئی۔ اور دونوں ہاتھ گھٹنوں پہ رکھ کر ان پر سر رکھ دیا۔

"کم آن ہانی۔ زندگی تو فانی ہے۔ صرف ایک شخص کے چلے جانے سے دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔" وہ اس

سے بس اتنا ہی کہہ پایا تھا۔

"لیکن جس شخص سے آپ کی دنیا شروع ہو۔ وہ شخص بچھڑ جائے تو واقعی دنیا ختم ہو جاتی ہے ابراہیم۔ اور صرف بابا ہی وہ شخص ہے۔ اور کوئی نہیں۔" دور آسمان پہ بادل تیرتے دکھائی دینے لگے تھے۔ سرد زندگی کی ایک اور رات مزید تاریک اور سرد گزرنی تھی۔" ہانیہ نے افسردگی سے سوچا۔

"اور بھی تو لوگ ہیں تمہاری زندگی میں ہانی۔" وہ اسے یقین دلانا چاہتا تھا۔ ہانیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ جیسے یقین کر لینا چاہتی تھی۔ تب ہی کہیں دور ایک کرخت سی آواز سنائی دی۔

"ابراہیم... ابراہیم۔" اور ابراہیم جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں پھر آؤں گا۔" تیزی سے کہتا چھلاوے کی سی تیزی سے وہ گرل پہ جھولتا نیچے غائب ہو چکا تھا۔ لبوں پہ اداس مسکراہٹ ابھری تھی۔

"بابا..." اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کچنار کی پتے جھاڑتی شاخ کو تھاما اور نم لہجے میں پکارتے ہوئے رو دی تھی۔



"کتنی بار سمجھایا ہے تمہیں ہانی۔ انیکسی میں مت جایا کر۔ نہ جانے کب سے خالی پڑی ہے۔" سرور بی بی نے کھانا اس کے سامنے رکھتے ہوئے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔

"ہمارے گھر کا ہی ایک حصہ ہے امی۔ خالی پڑے رہنے سے کیا ہوتا ہے۔" وہ جیسے مرے مرے ہاتھوں سے نوالے لینے لگی۔

"کیوں کچھ نہیں ہوتا۔ خالی جگہوں پہ جنات آجاتے ہیں۔ اوپر سے تم جوان اور خوب صورت۔ کل کو کچھ ہو گیا تمہیں تو میں تو جیتے جی مر جاؤں گی۔ تمہارے سوا میرا ہے کون اب اس دنیا میں۔" وہ محبت سے اسے دیکھے گئیں۔

"بات تو سچ ہے امی۔ واقعی اب ہمارا ایک دوسرے کے سوا اس دنیا میں رہا کون ہے۔" اس کا جی بھر آیا۔ دھیرے سے برتن پرے کھسکا دیے۔ سرور اسے مزید کھانے کا کہہ ہی نہ سکیں۔ خاموشی سے برتن اٹھا لیے۔

"سوچتی ہوں، کتنی جلدی بدل جاتے ہیں لوگ۔" وہ برتن ڈھک کر اس کے پاس ہی آکر بیٹھ گئیں۔

"جب تک تمہارے بابا زندہ تھے۔ سلیم بھائی 'عطیہ بھابھی کتنا خیال رکھتے تھے ہمارا۔ تمہیں تو سگی اولاد کی طرح پیار دیا تھا۔ لیکن تمہارے بابا کی آنکھیں بند ہوتے ہی آنکھیں ہی پھیر لیں۔"

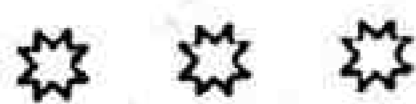
"سو جائیں امی۔ ورنہ پھر مائیگرین جاگ اٹھے گا سر میں۔" اس نے نرمی سے ماں کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ اور خود بھی کمبل لے کر لیٹ گئی۔

"ہاں ٹھیک کہتی ہو۔ بندوں کا کیا سہارا۔ اللہ کی نظر رہے بس۔ ویسے بھی کل خالہ رضیہ کچھ لوگوں کو ملوانے لا رہی ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے انیکسی کی بھی صفائی کر لوں گی۔" وہ بھی اس کے قریب ہی لیٹ گئیں۔

"وہ کس لیے امی؟" وہ نیند میں ڈوبے لہجے میں بولی بچوں کی جیسی معصوم سی نیند تھی اس کی۔ لیٹتے ہی آنکھیں بند ہونے لگتیں۔

"خالہ رضیہ کے دور کے رشتے دار ہیں۔ کرائے پہ گھر کی تلاش میں ہیں۔ خالہ رضیہ نے ہمارا بتایا تاکہ کچھ آمدن بھی ہو سکے اور گھر میں آبادی بھی ہو جائے۔" انہوں نے تفصیل بتائی۔

"ہمم۔" وہ شاید کچی نیند میں تھی۔ بڑبڑا کے رہ گئی۔ سرور بی بی نے مسکراتے ہوئے اس پہ آیت الکرسی پڑھ کر دم کی۔ اور خود بھی آنکھیں بند کر لیں۔



اگلے روز چاہ کر بھی سرور بی بی اوپر صفائی کے لیے نہ جا سکیں۔ خالہ رضیہ سویرے سویرے ہی ایک عورت کے

ساتھ آگئیں۔ انہوں نے تو انیکسی دیکھتے ہی منہ مانگا کرایہ دینے کی بات کردی۔ ویسے بھی انیکسی زیادہ استعمال نہ ہونے کی وجہ سے نسبتاً" اچھی حالت میں تھی۔ صرف مٹی اور گرد کی نہ جمی تھی، جس پر انہوں نے خود ہی صفائی کر لینے کا یقین دلایا۔ تو سرور بی بی کو ان کی اچھائی پہ یقین آگیا۔ اداس سی ہانیہ کو بھی وہ خاتون بہت اچھی لگیں۔ اور وہ جو پہلے انیکسی کرائے پر دینے کے خلاف تھی۔ اب خوشی خوشی اس خاتون کے جانے بعد انیکسی کی صفائی میں لگی تھی۔ جالے اتارے۔ ڈسٹنگ کی۔ خوب رگڑ رگڑ کر فرش دھویا۔ سیڑھیوں کو بھی چمکایا۔ شام تک انیکسی بالکل صاف ہو چکی تھی۔ شام کی چائے پی کر وہ انیکسی کی اندرونی سیڑھیوں پہ آکر بیٹھ گئی۔ جوان کے لان میں اترتی تھیں۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں؟" نہ جانے ابراہیم کب وہاں آیا تھا۔ اس نے بے دلی سے ایک نگاہ اس کی طرف ڈالی اور دوبارہ سے دیوار کے اس پار نظر آتے کھیلتے بچوں کو دیکھنے لگی۔

"میں نے تم سے کچھ کہا ہے ہانی؟" وہ لب کچل گیا۔

"کیا سن لیا تم نے...؟" اب کی بار وہ اس کی طرف متوجہ تھی۔

"چاچی نے کرائے دار رکھ لیے ہیں۔" وہ اس کے قدموں میں نچلی سیڑھی پہ بیٹھ گیا۔

"تم جانتے ہو بابا کے بعد گھر کے اخراجات چلنا مشکل نہیں ناممکن ہو رہا ہے۔ اچھا ہے امی کو آسانی ہو جائے گی۔" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"یہ اتنی بڑی بات نہیں ہانی۔" وہ آسانی سے کہہ گیا جبکہ ہانی کو سننے میں نہ جانے کیوں مشکل ہوئی۔

"یہ بڑی بات نہیں ابراہیم؟" اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

"میں چھپ چھپ کر مدد کر تو دیتا ہوں۔" وہ نظریں چرانے لگا۔

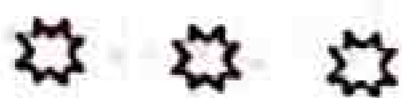
"سب کچھ تو تائی امی کے ہاتھ پہ رکھ دیتے ہو۔ اور چند سو میں ملنے والا اپنا جیب خرچ لے کر آجاتے ہو تم۔ جبکہ تم جانتے ہو ان سے تمہاری ضرورتیں بھی پوری نہیں ہوتیں۔ تب ہی امی وہ بھی تم سے نہیں لیتیں۔" وہ منہ پھٹ تھی یا صاف گو۔ ابراہیم فیصلہ نہ کرسکا۔

"میں ٹیوشنز رکھ لوں گا۔ پارٹ ٹائم جاب کر لوں گا۔"

"لیکن کس لیے ابراہیم! اتنی مشکل کس لیے اٹھاؤ تم......؟" وہ واقعی حیران تھی۔

"تمہارے لیے...... صرف تمہارے لیے ہانی۔" ابراہیم کی آنکھوں میں دیے جگمگانے لگے۔ اس کی آنکھوں میں اتنے پیارے رنگ دیکھ کر ہانیہ دم بخود بیٹھی رہ گئی۔ "پھر مجھے کرایہ داروں سے پرابلم نہیں ہے۔ لیکن اس عورت کا ایک جوان بیٹا ہے۔ اچھی پوسٹ پہ ہے۔ اچھے خاندان سے ہے۔ اور پھر جس طرح کے حالات آج کل امی نے بنائے ہوئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ سرور چاچی تمہارے بارے میں ادھر ادھر کا سوچ لیں۔" اس کے لہجے میں خدشے بول رہے تھے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہم پہلے ہی بہت مشکل میں ہیں ابراہیم۔ پلیز اب یہ ایشو کری ایٹ کر کے بڑی مشکل سے کھلے اس نئے دروازے کو ہم پر بند نہ کرا دینا۔ تم مرد ہو۔ مسائل کا سامنا کر سکتے ہو۔ مجھے اور امی کو اس چار دیواری میں ہی اگر سکون اور روزی میسر آرہی ہے تو اسے تم اپنا مسئلہ نہ بناؤ۔ میں دیکھوں شاید امی کو کوئی کام ہو۔" وہ اس کے پہلو سے نکلتی نیچے چلی گئی۔ ابراہیم دیر تک وہیں اس کا وجود کھوجتا رہا۔



سردیاں جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر جوبن پکڑ رہی تھیں۔ پھر بھی دن بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔ جب سے کرایہ دار آئے تھے۔ گھر کی ویرانی قدرے کم ہوئی

تھی۔ حالانکہ صرف ایک بیوہ ماں اور بیٹا ہی تھے۔ بیٹا بھی جاب کرتا تھا۔ صبح نکلتا تو شام کو گھر لوٹتا۔ لیکن گھر میں اصل رونق خیرالنساء آنٹی کی وجہ سے آئی تھی۔ سارا دن ہلکی آواز میں ٹی وی لگائے رکھتیں تاکہ گھر میں خاموشی سانس نہ لے سکے۔ ہر دس منٹ بعد ٹیرس سے جھانک کر اسے اشارے سے بلاتیں۔ اور وہ حسب معمول نہ جاتی تو اگلے بیس منٹ بعد حال احوال پوچھنے خود ہی نیچے آجاتی تھیں۔ ہانیہ کو وہ اچھی لگنے لگی تھیں۔ لیکن وہ چاہ کر بھی ان سے فری نہ ہوپاتی تھی۔ بلکہ چھپنے کی کوشش کرتی تھی۔ بابا کی وفات کے بعد وہ اپنا اعتماد بالکل کھو چکی تھی۔ ڈری سہمی ہانیہ 'اداسی کی تصویر بنی رہتی۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ صحن کی صفائی کر رہی تھی کہ خیرالنساء آنٹی نے آواز دے دی۔ وہ تیر کی طرح اندر کی طرف لپکی۔ آنٹی اس کی حرکت نوٹ کر کے مسکرادیں۔ اور واپس اندر آگئیں۔ آج شہروز کی بھی چھٹی تھی۔ سو وہ مزے سے صوفے پہ لیٹا موبائل پہ مصروف تھا۔ ماں کو مسکراتے ہوئے اندر آتا دیکھا۔ تو اٹھ بیٹھا۔

"کس کو آواز دے رہی تھیں امی۔" موبائل میز پہ رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"سرور بی بی کی بیٹی ہے۔ ہانیہ۔ بہت پیاری بچی ہے۔" ان کے لہجے میں محبت در آئی۔

"حیرت ہے۔ آپ نے اتنی آوازیں دیں، لیکن وہ تو آئی ہی نہیں۔ پھر پیاری بچی کیسے ہوئی۔" وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

"وہ تو اس کی طبیعت ہی کچھ ایسی ہے۔ ویسے تم نے دیکھا اسے؟" اچانک ہی ان کو خیال آیا۔

"نہیں۔ بس ایک دو دفعہ صحن میں دیکھا ہے۔ لیکن چہرہ نہیں دیکھ پایا۔ نہ ہی کوشش کی۔ کیوں؟ خیریت؟" اسے کھٹکا ہوا۔

"تمہاری جاب بھی ہو گئی ہے۔ اللہ کرے گا جلد گھر بھی مل جائے گا۔ میرا خیال تھا کیوں نہ میں ہانیہ کے لیے بات کروں سرور بی بی سے۔"

"اللہ کا نام لیں امی۔ وہ کیا سوچیں گی ہمارے بارے میں۔" شہروز تو بری طرح چونکا۔

"تو اس میں سوچنے والی کیا بات ہے۔ تم نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔ میری پسند ہے وہ۔ اور پھر جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔" وہ موبائل اٹھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"جی جناب۔ لیکن اس بہری کے گھر میں ہم خود پے انگ گیسٹ ہیں۔" اس کے انداز پہ خیرالنساء کو ہنسی آگئی۔

"خیر اب اتنی پیاری لڑکی کو تم بہری تو نہ کہو۔"

"ایکس کیوزمی۔ بہری میں نے نہیں آپ نے کہا ہے محترمہ کو۔" وہ بھی مسکرایا۔

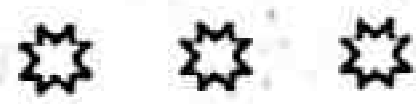
"خیر تمہیں پتا ہے۔ میں سرور سے بات کرنے لگی ہوں۔" ان کا لہجہ اب کے دوٹوک تھا۔

"مرضی ہے امی آپ کی۔ دیکھ لیں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ ویسے بھی ان کے چچا اور چچازاد سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔ کافی روکھے سے لوگ ہیں۔ یہ نہ ہو گھر میں بات طے ہو۔ اور مسئلہ بن جائے۔" پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے وہ شاید انہیں سمجھا رہا تھا۔

"اچھا!" وہ حیران ہوئیں۔

"حیرت ہے۔ میں نے سوائے رضیہ خالہ کے اس گھر میں کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔ ہاں ایک لڑکا اکثر آتا جاتا رہتا ہے۔ شاید وہی ہو۔ بات تو ویسے تمہاری ٹھیک ہے۔" وہ بھی سوچتے ہوئے بولیں۔

"اچھا میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ آفس کے لیے کچھ سامان لینا تھا۔" وہ ماں سے اجازت لیتا باہر نکل گیا۔ خیرالنساء بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔



دو گھروں کی درمیانی دیوار میں بنا لکڑی کا چھوٹا سا دروازہ جو اب اکثر دوسری طرف سے بند ہی رہنے لگا تھا۔ دستک دیتے ان کو پندرہ بیس منٹ ہو چکے تھے۔ ہانیہ نہانے گئی تھی۔ اور ان کو یہ موقع غنیمت لگا تھا

عطیہ بھابھی سے بات کرنے کے لیے۔ ورنہ تو اتنی دیر ان کو یوں دروازہ کھٹکھٹاتے دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو جایا کرتی تھی۔ تقریباً "بیس منٹ بعد دوسری طرف چپل گھسیٹتے محسوس ہوئے تھے" تو سرور نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ دروازہ کھلا تو عطیہ بتول ناگواری سے گھورتی نظر آئیں۔

"کیا مسئلہ ہو گیا سرور۔ کیا دروازہ توڑنے کا ارادہ ہے؟" تلخ لہجہ۔ سرور صبر کر گئیں۔

"بھابی۔ میں تو بس دستک دے رہی تھی کب سے۔ آپ نے آنے میں ہی دیر کر دی۔"

"ہاں۔ تو مجھے کیا کوئی کام نہیں ہے۔ ہر وقت فارغ بیٹھی رہتی ہوں کہ کان بس اس دروازے کی طرف کیے رکھوں کہ ابھی میڈم دستک دیں گی۔" سرور ان کی بات سن کر خاموش رہ گئیں۔

"خیر۔ اندر آؤ۔ کام ہے کوئی۔" راستہ دے دیا گیا۔

سرور ان کے پیچھے دروازے سے اندر داخل ہو گئیں۔ عطیہ انہیں لیے صحن میں رکھی کرسیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ "بیٹھو۔" ایک کرسی پہ بیٹھتے ہوئے جیسے انہیں بھی حکم دیا گیا۔

"اب کام کی بات کرو۔ میں نے پھر کہیں جانا ہے۔" سرور بس انہیں دیکھے گئیں۔ جب تک ہانیہ کے ابو زندہ تھے۔ یہی عطیہ بھابھی ہر وقت ان کے ہاں پائی جاتی تھیں۔ کبھی کچھ چاہیے ہوتا تھا۔ کبھی کچھ۔ ابراہیم کی پڑھائی سے لے کر گھر کے اخراجات تک میں ندیم زیدی ان کی مدد کیا کرتے تھے اور آج ان کی وفات کے بعد' ابراہیم کی اچھی نوکری کے بعد جیسے سب تعلقات ابدی نیند جا سوئے تھے۔ عجیب سی سرد مہری آ گئی تھی رویوں میں۔

"جلدی کرو سرور۔" عطیہ کی آواز پہ وہ بری طرح چونکیں۔

"وہ اصل میں عطیہ بھابھی! آپ کو تو پتا ہے کہ ہانیہ کے بابا کے بعد میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ تو میں چاہتی تھی کہ جلد از جلد ہانیہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ رضیہ خالہ کچھ لوگوں کو لانا چاہ رہی تھیں۔ لیکن آپ کو پتا ہے کہ ندیم نے اپنی زندگی میں ہی ہانیہ اور ابراہیم کی بات طے کر دی تھی تو میں نے سوچا۔"

"کیا بات کرتی ہو سرور۔" سرور اپنی بات مکمل نہ کر پائی تھیں۔ کہ عطیہ نے ٹوک دیا۔ "وہ تب کی بات تھی۔ جب ہانیہ اور ابراہیم ابھی بچے تھے۔ اب تو ماشاء اللہ سے دونوں جوان ہیں۔ اپنا فیصلہ خود کر سکتے ہیں۔ اور ویسے بھی میں خود بھی آ کر تم سے یہی بات کرنا چاہ رہی تھی۔" وہ رکی تھیں۔ اور سرور کو اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ "اصل میں ابراہیم کو اپنے آفس میں کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے۔ اور میں تو بہنوں کی طرح مشورہ دوں گی تمہیں۔ کہ گھر آئے رشتوں کو منع نہ کرو۔ بلکہ جب رضیہ خالہ آئیں تو مجھے بھی بلوا لینا۔ بھئی تائی ہوں آخر۔ ہانیہ میری بھی بیٹی ہے۔" بات ختم ہو گئی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں سرور بی بی دیر تک وہاں سے اٹھ نہیں پائی تھیں۔



شہروز دروازہ کھول کے اندر تو آ گیا تھا۔ لیکن سامنے کے منظر نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ آج پہلی دفعہ وہ آفس سے جلدی لوٹ آیا تھا۔ اور پہلی دفعہ ہی کسی کے حسن نے اسے مبہوت کر دیا تھا۔ کیا کوئی اس قدر سادگی میں بھی اس قدر حسین لگ سکتا ہے۔ اسے آج یقین ہوا تھا کہ بڑی بڑی کتابوں میں لڑکیوں کے حسن میں زمین آسمان کے قلابے ملا دینے والے لکھاری ایسے ہی اتنی ارفع تشبیہات نہیں دے دیتے۔ دنیا میں کوئی نہ کوئی واقعی اس قدر حسین ہوتا ہے کہ انسان دیکھتے ہی مبہوت رہ جاتا ہے۔ اور پھر دل بڑے مان سے اپنی سلطنت کی مسند پہ بیٹھا کر دنیا کی سب سے حسین چیزوں سے اس کے حسن کو تشبیہ دینے لگتا ہے۔ یہی کچھ آج حقیقت میں شہروز کے ساتھ ہوا تھا۔ کچنار کے درخت سے کچنار چنتی "کاسنی رنگ کے شیفون کے سوٹ میں وہ کچنار کے کاسی پھولوں کی طرح کھلی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں اداسی اور لبوں پہ

مسکراہٹ اس کی شخصیت کو عجیب سا سحر عطا کرتی تھی۔ اور وہ وہیں کھڑا دم بخود اس سحر میں جکڑتا جارہا تھا۔ تب ہی ہانیہ کی نظر اس پر پڑی وہ بڑبڑا کر سیدھی ہوئی اور دوپٹا ایک جھٹکے میں اپنے اردگرد لپیٹ لیا۔ شہروز کو بھی ہوش آیا۔ اور اپنی بے ارادہ حرکت پہ ڈھیر سارا شرمندہ بھی ہوا۔ نظریں جھکائیں اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر غائب۔ ہانیہ یوں ہی کھڑی رہ گئی۔

"یہ بندہ کچھ زیادہ ہی فری نہیں آنے جانے لگا اس گھر میں۔" نہ جانے کب وہ اس کے برابر آکھڑا ہوا تھا۔ آج پہلی بار ہانیہ کو اس پہ جی بھر کر غصہ آیا لیکن پی گئی۔

"اس گھر میں نہیں۔ اپنے پورشن میں۔" بے نیازی سے دیکھے بغیر تصحیح کی گئی۔

"اپنے پورشن میں۔۔۔ واہ۔۔۔ چند ہزار کرایہ دے کر پورا پورشن ہی ان کا ہو گیا، واہ!" تلخی سے کہا گیا۔ ہانیہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ "کبھی مکمل بات بھی سن لیا کرو۔" وہ بھی اس کے پیچھے کچن میں ہی چلا آیا۔

"کام ہوتا ہے مجھے۔ ویسے بھی اماں بتا رہی تھیں کہ تم بہت جلد کسی آفس والی لڑکی سے شادی کرنے والے ہو۔ تو اماں نے کہا ہے کہ جلدی جلدی میں بھی کپڑے بنوالوں۔ اس لیے بازار بھی جانا ہے۔" وہ اپنی دھن میں بولے جارہی تھی۔ یہ دیکھے بنا کہ ابراہیم کا منہ کس قدر کھل چکا تھا۔ "آخر اکلوتے بھائی ہو میرے۔" وہ مسکراتے ہوئے پلٹی۔ ابراہیم لب کچل گیا۔

"کس نے کہی یہ بات تم سے؟" وہ اس کا بازو پکڑ کے خود سے قریب کر گیا۔

"کیا ہوا ہے ابراہیم۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔ درد ہو رہا ہے مجھے۔" ہانیہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"پہلے تم بتاؤ۔ تمہیں یہ پٹی کس نے پڑھائی ہے؟" وہ تو جیسے سارے لحاظ بھول گیا۔

"اماں کو بتایا ہے۔ خود تمہاری اماں نے۔ اور کس نے۔" وہ ضبط سے آنکھیں بند کر گئی۔ پھر بھی آنسو گالوں پہ لڑھک گئے۔

"ان سے تو میں آج بات کرتا ہوں۔ اور تم۔۔۔" ہاتھ چھوڑ کر شہادت کی انگلی اٹھا کر خبردار کیا گیا۔ "خبردار جو آئندہ کبھی مجھے بھائی کہا۔" غصے سے پیر پٹختا وہ باہر چلا گیا۔ ہانیہ نے بے دردی سے نم آنکھیں رگڑ ڈالی تھیں۔ وہ شاید رو رو کے تھک چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں سرور بی بی سے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔ ایک بار ابراہیم سے پوچھ تو لیتیں۔" ڈریسنگ کرسی پہ بیٹھی لوشن لگاتی عطیہ نے ان کو دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئیں۔ جیسے وہ اس موضوع پہ مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"اکلوتا بیٹا ہے۔ کل کو پچھتانا نہ پڑے تمہیں۔" انہوں نے بھی بات ختم کی۔

"میرا بیٹا ہے۔ تو میری ہی بات ماننی ہوگی۔ بس آپ پلیز اس بات سے دور رہیں۔" وہ بھی لاپروائی سے سہلا گئیں۔ کہ ایک دم زوردار جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھلا اور ابراہیم اندر آیا۔ عطیہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے ابراہیم۔" انہیں یوں ابراہیم کا دستک دیے بغیر غصے سے اندر آنا تپا گیا تھا۔ ابراہیم سیدھا ان کی طرف ہی آیا۔

"امی۔ آپ نے کیا کہا ہے سرور چاچی سے؟" اس کا لہجہ آنچ دے رہا تھا۔ عطیہ کا بی پی ہائی ہونے لگا۔

"اوہ تو بھر دیے تمہارے کان۔ تم تو کہتے تھے کہ میں وہاں نہیں جاتا۔" انہوں نے ابراہیم کے لہجے کی نقل کی۔

"وہ میرے چچا کا گھر ہے۔ میرا وہاں جانا اتنا بڑا گناہ نہیں۔" ابراہیم بھی ان ہی کا بیٹا تھا۔

"تو تم بھی میرے اکلوتے بیٹے ہو۔ تمہارے مستقبل کا فیصلہ کرنا بھی اتنا بڑا گناہ تو نہیں جتنا تم ڈراما کر رہے ہو۔" ایک ہاتھ کمر پہ ٹکائے وہ لڑاکا عورتوں کی

طرح مقابلے پہ اتر آئی تھیں۔

"نہیں آپ سے بحث کرنے نہیں آیا امی۔ صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ میں شادی کروں گا تو صرف ہانی سے۔" اس نے دوٹوک فیصلہ سنایا۔

"اور میرا بھی یہ آخری فیصلہ ہے کہ تمہاری شادی اس لڑکی سے تو ہرگز نہیں ہوگی۔" عطیہ کا لہجہ بھی اٹل تھا۔ ابراہیم نے مایوسی سے ان کا چہرہ دیکھا۔ پھر باپ کی طرف دیکھا جو یوں کتاب میں گم تھے۔ جیسے اس دنیا سے ان کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

"لیکن کیوں امی؟ آخر کوئی وجہ تو ہوگی؟" وہ بے بس ہوا۔

"وجہ۔ اتنی بڑی وجہ تو ہے۔ خود ہانیہ۔" وہ ایک ایک لفظ پہ زور دے کر بولیں۔ ابراہیم انہیں نا سمجھی سے دیکھے گیا۔ "تمہاری چاچی کی تین نسلوں میں بیٹا نہیں ہوا۔ ان کی اماں بس دو بہنیں تھیں۔ تمہاری چاچی ایک اور پھر تمہاری چاچی کی پانچ بیٹیاں۔ چار تو اللہ کو پیاری ہو گئیں اور یہ ہانیہ کسی کی نسل ختم کرنے کو باقی رہ گئی۔ میں تو اپنے پیروں پہ کلہاڑی مارنے والی نہیں۔ ہاں جسے پتا نہ ہو بے شک اسے اندھا بنالیں تمہاری چاچی۔" کتنی بڑی وجہ بیان کی تھی عطیہ نے۔ ابراہیم کچھ دیر صدمے سے بول ہی نہ سکا۔

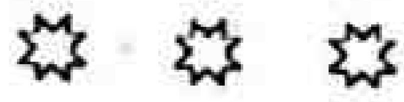
"یہ سب تو اللہ کے کام ہیں امی۔ اس کی مصلحت ہم کیا جانیں۔"

"اللہ بے شک قادر ہے، مگر اس نے ہمیں عقل بھی دی ہے اور ہاں اب بحث مت کرو۔ میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنے کو منہ کھولتے ابراہیم کو ٹوکا۔

"تو پھر یاد رکھیں امی۔ کہ آپ کا ابراہیم کبھی خوش نہیں رہ سکے گا اور میری وجہ سے آپ بھی۔" وہ پلٹ گیا تھا۔ عطیہ بتول نے "ہونہہ" کہہ کر مکھی اڑائی۔

"میرے خیال میں بیگم اس کی آخری بات پہ غور کرلو۔" سلیم صاحب ڈرتے ڈرتے بولے۔

"بچہ ہے، جب اچھی سی دلہن لے کے آؤں گی تو خود بخود ہانیہ کو بھول جائے گا۔ نہ جانے کیا تعویذ گھول کر پلا دیے ہیں میرے بچے کو۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔



"بھئی گھر تو بہت پیارا ہے آپ کا۔ بہت پسند آیا۔ بیٹی کے نام پہ ہی ہوگا۔" رضیہ خالہ نے شرمندہ سی نظروں سے سرور کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دی۔ جن خاتون کو وہ ہانیہ کو دکھانے کے لیے لے کر آئی تھیں۔ ان کی ٹپکتی رال اور لالچی طبیعت سے خود ان کا دل متلانے لگا تھا۔ نہ جانے کیسے اس بار ان خاتون کو جاننے میں ان سے غلطی ہو گئی تھی۔

"جی، ہانیہ کے نام پہ ہی ہے سب کچھ۔" سرور نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"السلام علیکم!" اسی وقت عطیہ بتول اندر داخل ہوئیں۔

"وعلیکم السلام! ان کی تعریف۔" خاتون کچھ زیادہ ہی بے صبری واقع ہوئی تھیں۔

"میں تائی ہوں ہانیہ کی۔" اس سے پہلے کہ سرور کچھ بولتیں، عطیہ نے خود ہی تعارف کرایا۔

"اچھا! مطلب آپ کے اور رشتہ دار بھی ہیں اس شہر میں؟" ایک اور سوال۔ وہ خاتون شاید سوالوں میں ہی بات کرتی تھیں۔ ہانیہ کا سر درد کرنے لگا۔

"نہیں۔ دور کے ہی رشتہ دار ہیں بس ہم دو دیورانیاں ہی ہیں قریبی۔" سرور نے بتایا۔

"اچھا آپ کی اولاد نہیں ہے کیا؟" عطیہ کا تو دل دہل گیا۔

"ارے کیوں نہیں ہے۔ ماشاء اللہ لڑکا ہے، کمانے والا ہے۔" "فوراً" وضاحت دی۔

"اچھا!" وہ خاتون کچھ حیران ہوئیں۔ "تو آپ نے کیوں نہیں مانگ لی اپنی اکلوتی بھتیجی۔" ایک اور سوال داغا گیا اور کمرے میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔

"بھئی معافی چاہتی ہوں۔ اپنے سارے محلے میں

سکینہ منہ پھٹ مشہور ہوں۔" اترا کر بتایا گیا۔

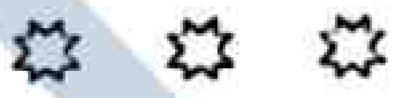
"اب صرف لڑکی کی دولت دیکھ کر ہی تو کوئی اپنے لڑکے کو اندھے کنویں میں دھکا نہیں دے سکتا۔ سب کچھ دیکھ بھال کر، پوچھ تاچھ کر کے ہی کرنا اچھا ہوتا ہے۔" سرور تو کچھ بول ہی نہ سکیں۔ ہانیہ پاؤں کے انگوٹھے سے قالین مسلنے لگی اور عطیہ نہ جانے کیوں مسکرانے لگیں۔

"بھئی۔ میں تو خود اس بات کی قائل ہوں کہ نہ کسی کو اندھیرے میں رکھا جائے۔ نہ خود اندھا دھند کنویں میں چھلانگ ماری جائے۔" عطیہ بولنا شروع ہوئیں تو سرور اشارے کر کر کے تھک گئیں۔ خالہ رضیہ سر پکڑ کے بیٹھ گئیں، مگر عطیہ بولتی رہیں۔

"آخر اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے ایک دن۔ بھئی سچ بتاؤں تو ہانیہ کی بات میرے بیٹے ابراہیم سے ہی طے تھی۔" سیڑھیوں سے اترتے قدم ایک دم رک گئے تھے۔ سیڑھیوں کے بالکل قریب بنے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے آتی آواز نے جیسے ان قدموں میں زنجیر ڈال دی تھی۔ "لیکن یہ ان کے بچپن کی بات تھی۔ تب مجھے امید تھی کہ کبھی نہ کبھی تو سرور بھابھی کی وراثت بدلے گی اور ہانیہ کو اللہ بھائی دے دے گا، مگر ایسا نہ ہوا۔ پہلے سرور بھابھی کی اماں، پھر سرور بھابھی اور اب ہانیہ۔ جب ان دونوں کے ہاں بیٹا نہیں ہوا تو اس سے بھی امید لگانا فضول ہی ہے۔ بس جی میں نے تو صاف منع کر دیا۔ اکلوتا لڑکا ہے میرا۔ اس کا بھی وارث نہ ہوا تو نسل ہی ختم۔ میں تو یہ رسک نہیں لے سکتی۔" ہانیہ شرمندگی سے بیٹھی رہ گئی۔ سرور نظریں نہ اٹھا سکیں۔ ایک ناکردہ گناہ کے بوجھ کے احساس سے اور رکے قدم بے حد ہلکے ہو کر، آزاد ہو کر آگے بڑھ گئے تھے۔

"میرے خیال میں بہت ہو گیا ڈراما۔" خالہ رضیہ کی برداشت جواب دے گئی۔ "میرے خیال میں آپ کوئی اور لڑکی دیکھ لیں۔" انہوں نے بات ختم کی۔

"آپ کا کیا خیال جی۔ ہم تو خود اٹھنے والے تھے۔ اللہ بھلا کرے بہن تمہارا، کہ تم نے آنکھیں کھول دیں۔ اللہ کی پناہ کیا زمانہ آگیا ہے۔ اولاد کی خاطر آخرت بھلائے بیٹھے ہیں لوگ۔" جاتے جاتے دل سے عطیہ کا شکریہ ادا کیا گیا۔ جو ان کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ خالہ رضیہ روتی سرور کو چپ کرانے لگیں اور ہانیہ سارے قصے کو سمجھنے کی کوشش میں لگی رہی کہ اس کی ماں کا قصور آخر تھا کیا...؟



کچنار کے درخت کے نیچے بیٹھی وہ خیالوں خیالوں میں بابا سے باتیں کر رہی تھی کہ کوئی دھیرے سے اس سے ایک قدم اوپر کی سیڑھی پہ آکر بیٹھ گیا۔

"ابراہیم ہی ہو گا۔ وہی بندر کی طرح ہمیشہ اوپر سے ہی نازل ہوتا ہے۔" اس نے بے دلی سے سوچا اور ویسے ہی ساکت بیٹھی رہی۔

"ہماری زندگی بھی موسموں کی طرح ہوتی ہے۔" اجنبی بھاری مردانہ آواز پہ وہ بری طرح چونکی۔ وہ ابراہیم نہیں۔ شہوز تھا۔ سرخ و سپید چہرے پہ خوب صورت مسکراہٹ سجائے وہ اسی سے مخاطب تھا۔ وہ نیچے اترنے لگی کہ شہوز نے تیزی سے راستہ روک لیا۔

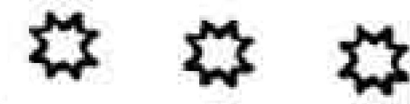
"میری بات تو مکمل ہونے دیں۔" بچے کی طرح ضد کی گئی۔ وہ ٹھہر گئی۔ "کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں، کبھی بارش، کبھی پت جھڑ اور پتا ہے اس موسم میں سب سے اہم چیز کیا ہوتی ہے؟" سوالیہ نگاہیں اس پر جمیں۔ وہ نفی میں سر ہلا گئی۔ "مقدر کی بارشیں۔" وہ مسکرایا۔

"کبھی اس قدر برستی ہیں کہ جل تھل کر دیتی ہیں۔ محبت، مان، خوشی کے اجزا سے ملی بارشیں ہماری زندگی میں بہار کا موسم بھر دیتی ہیں، لیکن کبھی ان بارشوں میں غم، نفرت اور دھوکا شامل ہو جاتا ہے۔ تو سب کچھ پت جھڑ ہو جاتا ہے، لیکن یہ تو حقیقت ہے نا کہ موسم دائمی نہیں ہوتے۔ پت جھڑ کی بارشوں کے اثر ختم کرنے

کے لیے بہار کی بارشوں کو آنا ہی ہوتا ہے اور بہت خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں جو مقدر کی بارش' بلکہ ہر قسم کی بارش ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کرتے ہیں۔ کیا میں آپ کے مقدر کی بارشیں شیئر کر سکتا ہوں؟"

پہلی ملاقات' بالکل اتفاقی طور پہ بات کرنا اور۔۔۔ ہانیہ سمجھ ہی نہ سکی' وہ سامنے کھڑا ساحر کیا سحر پھونک رہا تھا۔ اسے لگا اس کے سارے درد دور ہونے لگے تھے۔

"میں آج رات ہی امی کو آنٹی کے پاس بھیجتا ہوں۔ بڑے فیصلے' ہمارے بڑے طے کردیں تو ان فیصلوں میں دعا اور رب کی رضا دونوں شامل ہو جاتی ہیں۔ پھر نہ کہیں کوئی کمی باقی رہتی ہے' نہ دل میں کوئی خلش۔" مسکراتا' کہتا وہ نیچے اتر گیا اور وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ کچنار کے کاسنی پھول اس پر گرتے رہے۔



اور پھر سب کچھ ایک خواب کی طرح گزرا تھا۔ عطیہ بتول نے ابراہیم کی شادی ایک اونچے گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکی سے اس قدر ایمرجنسی میں کی گویا کسی کے دھرنا دینے کا خطرہ ہو۔ ہانیہ کے لیے آئے رشتے کے انکار کے بعد انہیں یہی فکر ستانے لگی تھی کہ کہیں ہانیہ' ابراہیم کے سر ہی نہ تھوپ دی جائے۔ ابراہیم اپنی شادی پہ بہت بیزار اور اداس تھا۔ اور اس سب سے بے خبر ہانیہ پوری خوشی' پورے دل سے اس کی سادہ سی شادی میں بھی خوب رونق لگاتی رہی۔ یہ اور بات کہ عطیہ اس کی اس خوشی کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتی رہیں۔

"اس لڑکی پہ نگاہ رکھو۔ ابراہیم یا اس کی دلہن کی بری کی چیزوں پہ کچھ کرنہ دے۔ دھاگہ وا گہ نہ نکال کر لے جائے۔ اس کی خوشی اور اطمینان کھٹک رہے ہیں۔" دور کی بھانجی کو نگرانی پہ مقرر کیا' مگر دل کو قرار نہ آیا۔ خود بھی لحہ بہ لحہ اسے ڈھونڈنے لگ جاتیں۔ "وہ کہاں گئی۔ نہ جانے کیا کر رہی ہوگی؟" شادی کی بجائے وہ ہانیہ کو دیکھتی رہیں اور اسی دن ان سب کی بے خبری میں خیرالنساء نے چپکے سے سرور کے کان میں اپنے دل کی بات ڈال دی تھی۔ سرور جو دل پہ اداسی کا بوجھ لیے بیٹھی تھیں۔ کھل ہی اٹھیں۔ مسکرائیں تو مسکراہٹ لبوں سے چپک کے رہ گئی۔ دور اسٹیج پہ دولہا دلہن سے شوخیاں کرتی ہانیہ کی نظر اچانک ماں پہ پڑی تھی اور بابا کے بعد پہلی بار ان کو یوں اطمینان سے مسکراتے دیکھ کر وہ بھی کھل اٹھی تھی۔

خیرالنساء اپنے نئے گھر شفٹ ہو گئیں اور ایک دن شہوز کے ساتھ آکر باقاعدہ طور پہ ان کا رشتہ طے کردیا۔ عطیہ بار بار بیٹے کی کمی گنواتی رہیں' لیکن خیرالنساء نے یہ کہہ کر خاموش کرادیا۔ کہ

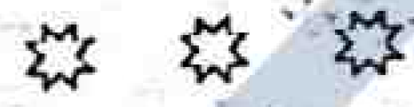
"بیٹیاں تو اللہ کے پیاروں کو دی جاتی ہیں۔ ہماری بھی چار پشتوں میں بیٹی نہیں ہوئی۔ میرے ابا نے تو بیٹی کی خاطر دوسری شادی کی تھی۔ تب کہیں جاکر میں پیدا ہوئی۔ وہ بھی منتوں مرادوں سے۔ ہمیں تو بیٹی کی صورت میں بس ہانیہ چاہیے۔ آگے اللہ کی مرضی۔ جس رنگ میں رکھے۔ ہم تو خاک ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔"

عطیہ تو مزید کچھ بول ہی نہ پائیں۔ شہوز البتہ جی بھر کے مسکرایا اور مسکراتے مسکراتے ہی اپنے نام کی انگوٹھی ہانیہ کی مرمریں انگلی میں سجادی۔ سال بعد شادی کی تاریخ طے کردی۔ سرور نے ہر حسرت پوری کی۔ بہت سا سامان تو ویسے بھی جمع کر رکھا تھا۔ صدر والی آبائی دکان بھی بیچ دی۔ شہوز نہ نہ کرتا رہ گیا' لیکن انہوں نے جہیز سے اس کا گھر بھر دیا۔ عطیہ دو دن تو مدد کے لیے آتی رہیں' لیکن پھر روز کی شاپنگ کی لسٹ اور سامان دیکھ دیکھ کر ان کی ہمت جواب دے گئی۔ درمیانی دروازے کو پھر تالا لگانا پڑا انہیں۔

شہوز اور خیرالنساء بار بار منع کرتے رہے۔ شرمندگی کا اظہار کرتے' لیکن اکلوتی اولاد کی شادی پہ سرور بی بی کے جذباتی الفاظ پھر سے ان کو چپ کرا دیتے۔ انہوں نے جیسے ہر خواہش اپنی بیٹی کے لیے رکھ دی تھی اور پھر

اپریل کی پہلی بارش میں بھیگتی بابل کے آنگن کی دہلیز پار کرکے وہ ساجن کے انگنا آبسی۔ اور اسی روز رخصت ہوتے وقت اماں نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"ابراہیم کو اللہ نے خیر سے بیٹی دی ہے۔ تم آؤ گی تو لے کے چلوں گی دیکھ لینا۔" اماں کے لہجے میں نہ طنز تھا۔ نہ حسد۔ سچی خوشی تھی۔ وہ بھلا کبھی بیٹیوں کی آمد پہ خفا ہوئی تھیں۔



ہانیہ گھر میں کیا آئی۔ اپنے مقدر کی بارشیں ساتھ لے آئی۔ شہروز کو گھر کے بعد گاڑی ملی اور شادی کے صرف نو ماہ بعد اسے ترقی دے کر دبئی برانچ کا انچارج بنا دیا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا، مگر متذبذب بھی۔ ہانیہ کی حالت ایسی تھی کہ نہ تو وہ اس کو ساتھ لے کر جا سکتا تھا نہ ہی اسے اکیلے یہاں چھوڑنے پہ دل آمادہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا تبادلہ رکوانے کی ہر ممکن کوشش کرلی، مگر بالآخر جانا پڑا اور دبئی جانے کے فوراً" بعد اس نے ماں اور بیوی کو وہاں بلوانے کی تگ و دو شروع کردی تھی۔ دن گزرے اور عالیان اور مہران ان کی زندگی میں چلے آئے۔ شہروز کا تو خبر سن کر بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر پاکستان پہنچ جائے۔ سرور بی بی تو خوشی سے نہال ہوئے جا رہی تھیں۔ مٹھائی پورے محلے میں تقسیم کی۔ عطیہ کے لیے تو جوڑا بھی ساتھ لے کر گئیں۔ مگر ان کا بی پی شوٹ کر گیا۔

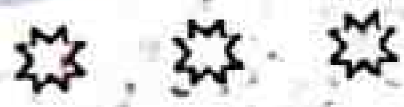
"بی بی۔ صاف صاف کہو۔ میرے ہاں دوسری پوتی ہونے پہ طنز مارنے آئی ہو۔" ابراہیم کی دوسری بیٹی ہوئی تھی۔ سو ان سے بھلا ہانیہ کے جڑواں بیٹوں کی خبر کیسے ہضم ہو پاتی۔

"اللہ نہ کرے۔ میں کبھی ایسا سوچوں بھابھی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ فجر کے وقت ہی اللہ نے ہانیہ کی گود میں دو چاند سے بیٹے ڈال دیے ہیں۔" شکر سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"لیکن ہانیہ کے ہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ بھی ایک نہیں دو دو۔" عطیہ لب کچلنے لگیں۔

"چاچی بہت بہت مبارک ہو۔ چلنا ہو تو مجھے بتا دینا۔ میں لے جاؤں گا۔" ابراہیم نے سنا تو بہت خوش ہوا۔

"اور اماں۔" مٹھائی منہ میں ڈالتے ہوئے وہ ماں کی طرف مڑا۔ "اب تو اللہ سے معافی مانگ لو۔ چاچی اور ہانی سے معافی مانگ لو۔ یہ نہ ہو تمہارے مکافات عمل میں ہم سب رگڑے جائیں۔" کہہ کر وہ اٹھا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔ عطیہ پیچھے سے اس کو للکارتی رہیں۔ سناتی رہیں۔ سرور نے چپ چاپ گھر کی راہ لی۔



وہ شہروز کے پاس دبئی گئی تو خیر النساء آنٹی، اماں کو بھی ساتھ لے گئیں کہ اکیلے دو دو بچے دادی نہیں سنبھال پائے گی۔ سرور بی بی نے بھی ان کے مان، ان کے پیار کی لاج رکھی اور ان کے پاس آگئیں۔ ابراہیم ایرپورٹ ان سب کو چھوڑنے خود گیا تھا۔ اور جب ان کو چھوڑ کے واپس آیا تو ہانیہ کا گلابی سراپا آنکھوں میں مقید کرلایا۔ اس رات وہ ٹیرس پہ بیٹھا آنسو بہاتا رہا تھا۔

"ہانیہ کے دو جڑواں بیٹے ہوئے ہیں۔" دو سال بعد ہی ابراہیم نے ماں کو اطلاع دی تھی جو بہو کے کرم سے اب اپنے کمرے تک محدود ہو گئی تھیں۔ بقول بہو کے۔

"اماں کو بچیوں کی ہر بات پہ اعتراض ہوتا ہے۔ اپنی عمر تو جی لی۔ اب کیا معصوموں کو ان کی وجہ سے ستر سال کا بنادوں۔" اماں اب کمزور پڑنے لگی تھیں۔ جو بہو سے بحث میں ہارنے لگیں۔ اوپر سے اس کی اوپر تلے پانچ بیٹیاں۔ ایک دوسرے سے سال، دو سال چھوٹی۔ نہ جانے کیوں نظر آجاتیں تو محشر یاد آنے لگتا ان کو۔ سو اسی سب سے بچنے کے لیے وہ کمرے تک ہی محدود ہو گئیں اور ابراہیم نے آج اطلاع دے کر گویا زخموں پہ نمک چھڑک دیا۔

"وہ کلموہی سرور ضرور جادو کروا کر گئی ہے تاکہ تیرے بیٹیاں اور اس کی ہانیہ کے بیٹے ہوں۔" وہ سینہ کوبی کرنے لگیں۔

"اماں۔ خدا کے لیے اب تو بخش دیں ان کو۔" ابراہیم کو ان پہ ترس آنے لگا۔

"تو تم مجھے بخش دو نا۔ اللہ کے لیے نہ دیا کرو یہ خبریں۔ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ اپنی لاڈلی بیوی کے پاس۔" اماں تو اس پہ ہی غصہ کرنے لگیں۔ خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ اور پھر اس گھر میں ہانیہ اور سرور کا کبھی ذکر نہ ہوا تھا۔ جب تک کہ سرور بی بی نہ لوٹ آئیں۔ انیکسی کرایہ داروں کے پاس ہی رہی۔ سرور اپنے گھر میں عبادت میں مشغول رہنے لگیں۔ اور ابراہیم بھی زیادہ تر ان کے پاس "سے سرور چاچی سے ہانیہ اور اس کے بچوں کے بارے میں سن کر بے حد اچھا لگتا۔

"ماشاء اللہ سے چاروں بیٹے اپنے ماں باپ کی طرح ذہین، تمیزدار اور سادہ ہیں۔ اچھے سے اچھا کھانے اوڑھنے کے باوجود غرور کا نام تک نہیں اور مجال ہے جو کبھی ماں باپ کا دل دکھا دیں۔ ذرا سی چوک ہو جائے فوراً" پاؤں پکڑنے پہ آجاتے ہیں۔ ابھی سے پانچ وقت کے نمازی ہیں۔" چاچی سرور بتائے جاتیں اور وہ اپنی

بیٹیوں کے بارے میں سوچے جاتا۔ جن کی تربیت اس نے بالکل ہانیہ کی طرح کی تھی۔ اس نے ہر بیٹی کو ہانیہ کے سانچے میں ڈھالنا چاہا تھا۔ اس کی ہر بیٹی اتنی کم عمری میں بھی بے حد سگھڑ اور سمجھ دار تھی۔ ٹی وی اور دوسرے مشاغل سے ابراہیم نے انہیں دور ہی رکھا تھا۔

سرور بیمار تھیں اور آج کل تو وہ بار بار چاچی کے گھر آ جا رہا تھا۔ ہانیہ بھی آ رہی تھی "اپنے بچوں کے ساتھ۔ اب تو سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ نہ جانے پھر بھی جانے کیوں اس کے آنے کا سن کر ابراہیم کا دل عجیب ہی لے پہ دھڑک رہا تھا۔ ہوتا ہے کچھ اچھے لوگوں کا وجود جو دور، بہت دور ہونے کے باوجود بھی آپ کی روح کو

معطر کیے رکھتا ہے۔

وہ آگئی تھی۔ کچنار کا درخت ویسے کا ویسا تھا بلکہ کچھ اور گھنا ہو گیا تھا۔ انیکسی کی دیواروں کا رنگ بدل گیا تھا۔ وہاں کرایہ دار رہ رہے تھے۔ سیڑھیوں پہ اب بھی کچنار کے پھول بکھرے پڑے تھے۔

"تمہارے بعد یہاں ہر چیز بدل گئی۔" وہ چونکی۔ وہ ابراہیم تھا۔ اسے ہمیشہ ہی دبے پاؤں آنے کی عادت تھی۔ ہانیہ مسکرا دی۔

"صرف یہاں نہیں۔ موسم تو ہر جگہ کا بدلتا ہے۔" اس کی مسکراہٹ پراعتماد تھی۔ وہ اداس سے زیادہ ایسی باوقار، پراعتماد اور خوب صورت لگتی تھی۔ ابراہیم زیدی نے وہیں کھڑے کھڑے اعتراض کیا تھا خود سے۔

"میں بھی ویسے ابھی کچھ دیر میں تم لوگوں سے ملنے آنے والی تھی۔ سوچا ذرا دیر پہلے گھر کو تو اچھی طرح دیکھ لوں۔" وہ دوبارہ پودوں کی طرف دیکھنے لگی۔ انار کے درخت پہ ننھی ننھی شاخیں سر اٹھانے لگی تھیں۔

"مجھے بچی نے بتایا تو رہا نہیں گیا۔" وہی صاف گو لہجہ۔ وہ ہنس دی۔

"تم تو مجھے بھائی نہیں کہنے دیتے تھے دیکھو تمہاری بیٹی نے خود بخود مجھے پھپھو مان لیا۔"

"کچھ رشتے ہم خود بناتے ہیں دل سے۔ یہ بھول کر کہ دل کی دنیا کے رشتے باہر کی دنیا سے بالکل مختلف بھی بن سکتے ہیں۔" وہ اداس تھا۔

"مجھے امید نہیں تھی کہ کم از کم آج کے دن بھی تم اداس باتیں کر کے ویلکم کرو گے۔" ہانیہ نے موضوع بدلنا چاہا۔ ابراہیم خاموش رہا۔

"ویسے ماننا پڑے گا۔ بہت پیاری بچیاں ہیں تمہاری۔ لائبہ بھابھی پہ گئی ہیں۔ تم پہ نہیں گئیں۔" وہ اقاً بولی۔ وہ بس مسکرا دیا۔ "اچھا تائی کیسی ہیں؟"

"اچھی ہیں۔ خود آ کر دیکھ لینا۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ہانیہ بیٹے کے بلانے پہ اس طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

عطیہ بتول نے ہمیشہ انا کو عزیز رکھا جس دو سے مانگتی رہیں اس کا احسان جھٹلاتی بھی رہیں، لیکن آج ہانیہ کے محبت بھرے سلام پہ یوں اس کے گلے لگ کر روئیں جیسے وہ نہیں ہانیہ ان کی بزرگ ہو۔ ہانیہ تو بس خاموشی سے ان کی کمر سہلاتی رہی۔

"کفر بکتی رہی میں۔ کھاتی رہی تمہارے گھر سے اور تمہارے گھر کی ہی بنیادیں ہلا دینے پر مصر رہی۔ خود کو خدا سمجھ بیٹھی۔ حال، ماضی، مستقبل یہ سب تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے تو بس اپنا وقت گزارنا ہے اور میں یہ سب بھول گئی۔ یاد رہا تو بس کہیں تم کسی اچھے گھر نہ چلی جاؤ۔ سرور کی بیٹی کو آسانی نہ ہو۔ وہی جلاپا یا حسد جو مجھے سرور کو دیکھ کر ہوتا تھا۔ تم لوگوں کے مالی حالات اچھے ہوتے دیکھ کر اور بڑھ گیا۔" کمزور سی عطیہ تائی اعتراف در اعتراف کیے جا رہی تھیں۔

"کتنے فخر سے تمہیں دھتکار کے باہر سے پڑھی لکھی، امیر کبیر بہو لائی اور اسے میرا ہی وجود برداشت نہیں اور اللہ کی شان دیکھو۔ کس قدر سہولت سے مجھے سمجھا دیا کہ بیٹیاں کیا ہوتی ہیں۔ اٹھارہ سالہ نگین سے لے کر بارہ سالہ رامین تک سارا دن میری خدمت میں لگی رہتی ہیں۔ کھانا، پڑھائی بعد میں، پہلے انہیں میں یاد آتی ہوں۔ تیری ساس سچ کہتی تھیں۔ بیٹیاں تو اللہ اپنے پیاروں کو نوازتا ہے۔ اب میں سمجھی مجھے بیٹی کیوں نہیں ملی۔ میں تو اس قابل ہی نہ تھی۔"

"ایسا نہ کہیں تائی۔ پلیز۔" ہانیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

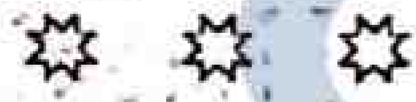
"بہت بوجھ ہے دل پر۔ اسے اتار نے دو بیٹا۔ کہتے ہیں معافی مانگ لینے سے گناہ معاف ہوں نہ ہوں۔ آدھے رہ جاتے ہیں۔ انسانوں سے کی گئی زیادتی کی تلافی ان سے وقت پہ معافی مانگ لینا ہے۔ مجھے معاف کر دو بیٹا۔ میں تمہیں چاہتی میری کرنی میری پیاری پوتیوں کو بھرنی پڑے۔ ان کی ماں کی کاہلی اور بدزبانی تو پورے خاندان میں پھیل چکی ہے۔ مشکل ہی

ہے کہ کوئی ان کے لیے دامن پھیلائے۔"

"خدا پہ توکل رکھیں تائی امی۔ یہ ہماری سوچ نہیں۔ اللہ کے فیصلے ہوتے ہیں۔" وہ ان کے ہاتھ سہلانے لگی۔

"بے شک۔ بے شک۔ ہمیشہ شاد رہو میری بچی۔"

اور ہانیہ نے مسکراتے ہوئے سوچا کہ تائی اتنی بری بھی نہیں تھیں جتنا وہ شادی سے پہلے ان کو سمجھتی تھی۔ اچھے لوگوں کی یہی تو خوبی ہے، ہمیشہ معاف کردیتے ہیں۔



پورے دس برس بعد وہ پاکستان آئے تھے۔ مکمل طور پر شفٹ ہونے۔ ہانیہ نے ضد کرکے شہروز کو نیا گھر لینے سے منع کیا تھا۔ اور اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنے گھر میں شفٹ ہوگئی تھی۔ انیکسی اماں کی وفات کے بعد اس نے خالی کرالی تھی۔ سو اب عالیان اور مہران کے لیے سیٹ کرادی تھی۔ شام تک سارا گھر سیٹ ہوچکا تھا۔ چائے بنا کر وہ لاؤنج میں آئی تو ابراہیم اور شہروز گپ شپ میں مصروف تھے۔ ہانیہ نے دیکھا۔ وہ بے حد کمزور اور وقت سے پہلے ہی بہت بوڑھا لگنے لگا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے اپنے ماں بابا یاد آئے۔ باتوں باتوں میں ہی ابراہیم نے بچیوں کے ذکر پہ نہ جانے کیوں خاموشی اوڑھ لی اور پھر فوراً" ہی اٹھ کر چلا گیا۔ ہانیہ رات تک اس کے اس عمل کو سوچتی رہی۔ رات کو وہ بستر پہ آئی تو شہروز کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ وہ صوفے پہ بیٹھنے لگی۔ جب شہروز نے پکارا۔

"ادھر آجاؤ۔" کتاب ایک طرف رکھ کے اس نے بازو اس کی طرف بڑھایا۔ وہ مسکرائی۔

"میں سمجھی آپ مطالعے میں مصروف ہیں۔"

"تم جانتی ہو۔ جب تک تم نہ آؤ میں یونہی خود کو مصروف رکھتا ہوں۔" محبت پاش نظروں سے اسے تکتے ہوئے وہ بولا تھا۔ ہانیہ نظریں جھکا گئی۔

"پریشان ہو؟" اسے مسلسل خاموش دیکھ شہروز اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اثبات میں سرہلا گئی۔

"کیا ہوا ہے ہانی؟" وہ بھی پریشان ہوگیا۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آئی اور کھڑکی کھول دی۔

بہار کا پتا دیتی نم ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کی روح تک کو سرشار کرگیا۔ شہروز بھی اس کے پاس چلا آیا۔

"آپ کو وہ دن یاد ہے جب آپ نے مجھے زندگی سمجھائی تھی۔" وہ سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔ حرف بہ حرف۔ لحہ بہ لحہ۔" وہ مسکرایا۔

"تو آپ کو آپ کی ایک بات بھی یاد ہوگی۔ بارشیں مقدر کی۔" وہ مسکرا کر اس کے قریب ہوئی۔

"سب یاد ہے سویٹ ہارٹ۔" وہ اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کرگیا۔

"مجھے لگتا ہے۔ میرے مقدر کی کچھ بارشیں مجھے امانتا" سونپی گئی ہیں۔ میں یہ بوجھ اتارنا چاہتی ہوں شہروز۔" شہروز کے لبوں پہ بھرپور مسکراہٹ بکھر گئی۔

"تم اپنی تائی امی کی پوتیوں کی بات تو نہیں کررہیں۔"

"توبہ ہے۔ کتنے تیز ہیں آپ۔" وہ خفا ہوئی۔ شہروز نے قہقہہ لگایا۔

"تو تم بھی تو یاد کرو نا میں نے کچھ اور بھی کہا تھا۔" اس نے ہانیہ کے سر پہ ہلکی سی چپت ماری۔

"کیا؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"بی بی۔ میں نے کہا تھا کہ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو اپنے مقدر کی بارشیں دوسروں کے ساتھ بانٹ لیتے ہیں۔"

"شہروز۔" مطمئن انداز میں کہتے ہوئے اس نے سر شہروز کے سینے پر ٹکا دیا تھا۔ باہر رم جھم ہونے لگی۔ اپریل کی پہلی بارش۔ ہانیہ کی جھولی میں ایسی ہی ایک بارش خوشیاں بھر گئی تھی شہروز اور خیرالنسا آنٹی کی شکل میں۔ اب اس کی باری تھی۔ اسے خیر بانٹنا تھی اپنے مقدر کی بارش سے۔

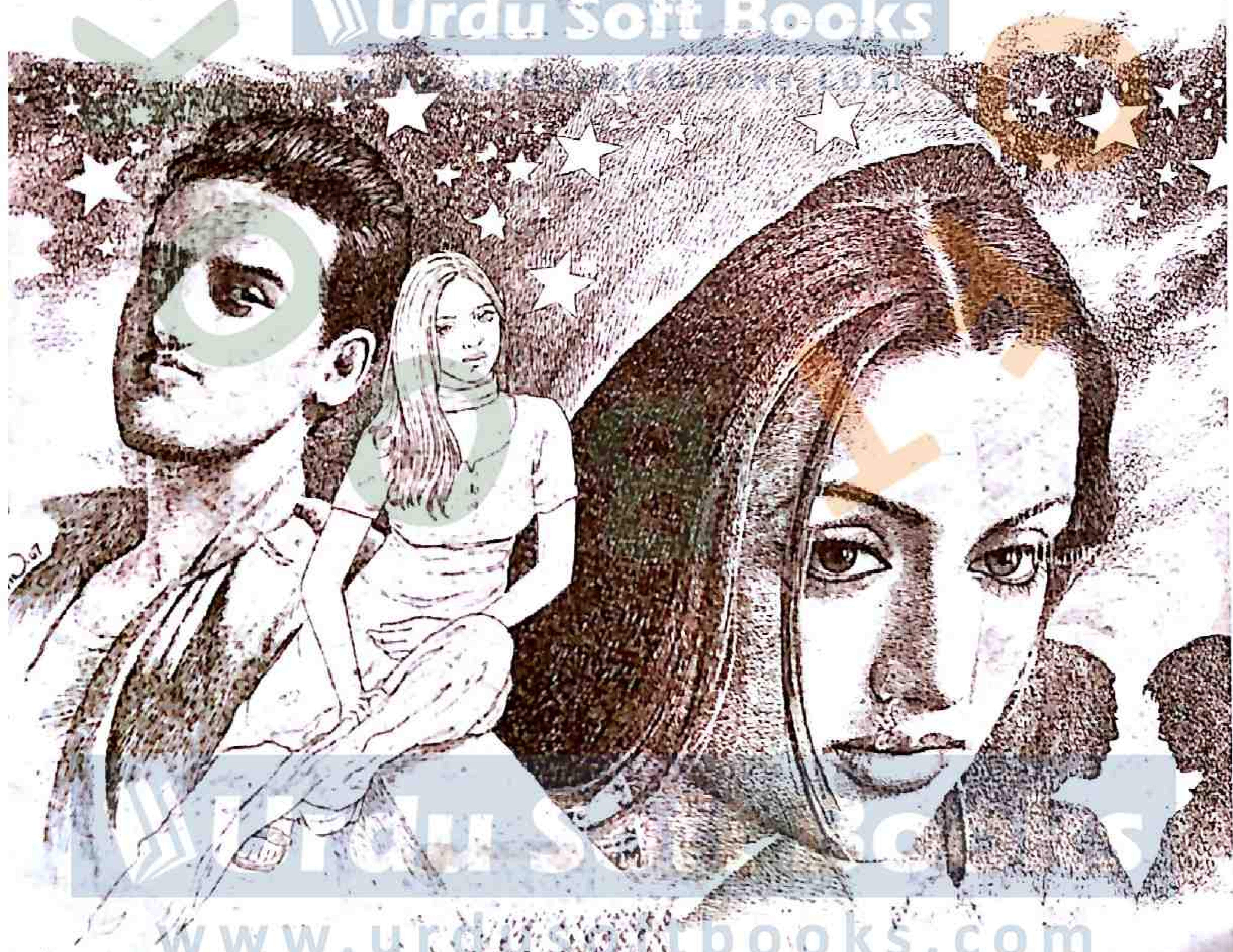


نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز تھا۔ فارس غازی اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف غازی کا بھانجا ہے جو اپنے ماموں فارس غازی سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعدی یوسف کی والدہ نے کڑی مشقت کر کے بچوں کی پرورش کی ہے' حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی یوسف کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ فارس غازی' سعدی یوسف کا ماموں ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن



ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔
ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے .... ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کاردار کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔ ہاشم سونیا کی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔
فارس غازی، ہاشم کاردار کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں، جس میں اس کا بھی حصہ ہے، رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔
چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے، جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے، ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے، لیکن سعدی پکڑ میں آئے بغیر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔
حنین اپنے اور سیم کے مشترکہ کمرے میں آتی ہے جب الماری کھولتی ہے تو اس کی نظر سنہری مخملیں ڈبے پر پڑتی ہے تو اس کے اندر ایک لاکٹ رکھا تھا۔ اس کی زنجیر میں سیاہ ہیرے کی شکل کا پتھر پرویا تھا جس کے اوپر سنہرے حروف میں "اینٹس ایور آفٹر" کندہ تھا۔ یہ سعدی کی چین کا جڑواں تھا۔
سعدی زمر سے ایک رشتے دار کی شادی میں جانے کا پوچھتا ہے، جس میں زمر کا سابق منگیتر حماد بھی آئے گا۔ زمر سعدی سے کہتی ہے کہ اگر وقت ملا تو وہ شادی میں جائے گی یہ بات جب بڑے ابا کو پتا چلتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔

مکمل ناول



سارہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ فارس آجاتا ہے۔ فارس سارہ سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کے خیال میں اس نے ہی وارث کو قتل کیا تھا؟ سارہ جواب میں کہتی ہے کہ اسے یقین ہے کہ اسے پھنسایا گیا تھا۔

ہاشم کی سیکریٹری کال کرکے اسے بتاتی ہے کہ آج سعدی اپنی مصروفیت کی بنا پر نہیں آرہا۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ سعدی کو جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا' وہ اس سے ملاقات کو یونہی ٹالتا رہے گا۔

ہاشم سعدی کو فون کرتا ہے کہ کیا ہم اچھے وقتوں میں واپس جاسکتے ہیں! جب تم مجھے دل سے ہاشم بھائی کہتے تھے۔ ہاشم کی بات پہ سعدی "شاید نہیں" کہہ کر کال کاٹ دیتا ہے۔

دوسری طرف سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہو جاتی ہیں۔ سعدی پریشان ہو کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ اس وقت سعدی اپنے ماضی کے اچھے وقتوں کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ سب باتیں یاد آنے لگتی ہیں جب ہاشم کو دل سے بھائی کہتا تھا اور جواہرات کے دل میں اس نے کس طرح اپنی جگہ بنائی تھی اور نوشیرواں سے بھی اس کی اس وقت دوستی ہو گئی تھی۔ ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کرکے سعدی کے سامنے کسی کہانی کے کرداروں کی طرح گھوم رہے تھے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہو جاتی ہیں۔

سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے' حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آنس اور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس' زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فہد سے زمر کی بات طے کردیتی ہیں۔ وارث غازی' ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پر کام کررہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی ہاشم کو خبردار کردیتا ہے۔ ہاشم' خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کررہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم' خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث' فارس کو وہ سارے شواہد میل کردیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم' فارس پہ ڈلواتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔' زرتاشہ مرجاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کرسکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر انفاقاً" بچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔

حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کرکے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی اپیل بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

جواہرات، زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے۔ اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ ان کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھالیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی، فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کر سکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالر شپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی، علیشا کو راضی کر لیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہو گی۔

ہاشم حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہو جاتی ہے۔

ہاشم، علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔

جواہرات، زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کر رہا ہے۔

فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جا رہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے، لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کر لے جا چکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے، کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے، لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات، زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا، جسے انکار کر دیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر، جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے لیک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہو چکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو مار دیں گے۔

ہاشم، حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے، کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے، جس میں ان ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً بعد کی تصویر ہوتی ہے، جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔

حنین، نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے، وہ کہتی ہے کہ نوشیرواں پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔

سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔
سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کردیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔
سعدی، زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہوسکتا ہے۔

''مثلاً'' کون؟'' زمر نے پوچھا۔

''مثلاً''... مثلاً'' ہاشم کاردار...'' سعدی نے ہمت کرکے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہوگئی۔

زمر کو ہاشم کاردار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔

حنین علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کرلی ہے جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو ان کا ہے۔

ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد لیتی ہے۔

ریحان خلجی عدالت میں زمر کو لاجواب کردیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔

فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔

زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتی ہے کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔

جیل سے علیشا حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کی علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے وہ ہے، ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔

حنین کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے پڑھنے سے انکار کردیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔

اورنگ زیب نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصے سے پاگل ہوجاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کردیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کرکے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کرلیتی ہے۔

زمر، فارس کی طرف سے مشکوک ہے۔ وہ اسے تہ خانے میں بنے کمرے میں جانے سے منع کرتا ہے لیکن زمر نہیں مانتی، وہ کمرے میں جاتی ہے تو وہ دیوار پر کچھ تصویریں لگی دیکھتی ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو فارس کے مجرم ہیں۔

جسٹس سکندر (فارس کے کیس کے جج) وارث غازی کا باس الیاس فاطمی، ڈاکٹر توقیر بخاری، ڈاکٹر ایمن بخاری (فارس کی سائیکالوجسٹ) اور دوسرے لوگ... فارس کہتا ہے کہ وہ ان سب سے اپنے ساتھ کی گئی ناانصافی کا انتقام لے گا۔

سعدی جب نوشیرواں سے ملنے جاتا ہے تو ڈاکٹر سارہ کو ساتھ لے جاتا ہے۔ سعدی کو امید ہے کہ ڈاکٹر سارہ نے سب کو بتادیا ہوگا۔

ہاشم نے حنین سے وہ یو ایس بی مانگی جو سعدی نے اس کے لیپ ٹاپ سے چرائی تھی۔ حنین نے دے دی تو زمر اور فارس کو بہت غصہ آتا ہے لیکن حنین بتاتی ہے کہ اس نے اصلی یو ایس بی نہیں دی تھی۔

ہارون عبید مشہور سیاست دان جو اہرات کے حسن کے اسیر ہیں۔ وہ ایک اسے ہیرا تحفہ میں دیتے ہیں۔ زمر احمر کو اپنا کوئی کام کرنے کے لیے کہتی ہے۔ احمر ہارون عبید کی الیکشن کمپین چلا رہا ہے۔ آب دار ہارون عبید کی بیٹی ہے جو سعدی کے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔

فارس، زمر سے کہتا ہے کہ اس نے تین وجوہات کی بنا پر زمر سے شادی کی ہے۔

(1) زمر کے والد کے احسانات (2) شادی کر کے وہ سب کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے، وہ سب کچھ بھول کر نئی زندگی شروع کر چکا ہے۔

تیسری وجہ وہ زمر کے اصرار کے باوجود نہیں بتاتا۔

حنین ہاشم کے بارے میں زمر کو بتا دیتی ہے۔ زمر کسی تاثر کا اظہار نہیں کرتی لیکن اسے ہاشم پر بہت غصہ ہے۔ زمر اسے اپنے جرم کے بارے میں بتاتی ہے تو زمر کہتی ہے کہ ایک او سی پی ایک معمولی سی لڑکی کو دھمکی سے بلیک میل نہیں ہو سکتا۔ اس کی موت کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔

سعدی کی یاد میں ایک تقریب منعقد کی گئی ہے، جہاں احمر شفیع، ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری بھی شریک ہیں۔

زمر اور فارس، حنین کو تقریر کرنے کا کہہ کر باہر نکل آتے ہیں۔

ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری کا نیا تعمیر شدہ شان دار اسپتال جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ فارس اور زمر واپس تقریب میں آجاتے ہیں۔

حنین اور زمر، ہاشم کی سیکرٹری حلیمہ کا نام سن کر چونک جاتی ہیں۔

ہاشم، سعدی سے کہتا ہے کہ حنین اس کے کہنے پر اس سے ملنے ہوٹل آرہی ہے۔ سعدی پریشان ہو جاتا ہے، پھر ہاشم اس کو فون پر حنین کا پروفائل دکھاتا ہے، تب وہ جان لیتا ہے کہ حنین چھ منٹ پہلے قرآن پاک کی وہ آیت پڑھ چکی ہے جو اس نے اپنے کمپیوٹر میں لوڈ کی تھی۔ سعدی پورے یقین سے کہتا ہے کہ "حنین ہاشم سے ملنے نہیں آئے گی۔" اور واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاشم تلملا کر رہ جاتا ہے۔

جسٹس سکندر کی ایک ویڈیو جس میں وہ او سی پی کو قتل کر رہے ہیں۔ ٹی وی چینلز پر چل جاتی ہے۔ یہ وہی ویڈیو ہے جو سعدی نے او سی پی کے گھر سے حاصل کی تھی۔

زمر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے تو اس کو پتا چلتا ہے کہ اس کا واحد گردہ جو سعدی نے دیا تھا۔ ناکارہ ہو چکا ہے۔

تیئسویں قسط

مورچال

آج تم جس دکھ کے مقام پہ ہو
میں اس جگہ سے گزر چکا ہوں
یقین کرو میں اس سے گزر چکا ہوں
تمہیں اس سے جست لگا کر نکلنا ہو گا
تمہیں اس سے نکالے گا صرف ایک فقرہ
ایک سطر۔ ایک دلیل
ایک کہانی، جو تم خود کو سنا سکو

وہ کیا ہے اس سے فرق نہیں پڑتا
اور ضروری نہیں ہے کہ وہ سچ بھی ہو
جب تک تم اس فقرے پہ یقین کرتی رہو
جب تک اس کے ذریعے تم خود کو معاف کرتی رہو
تم ڈھونڈو، وہ سطر۔ وہ فقرہ
وہ مقصد
تم اسے ڈھونڈو، تم یہ کر سکتی ہو
میں جانتا ہوں کہ تم یہ کر سکتی ہو

وہ ایک فقرہ خود کو سنانے کے لیے ڈھونڈو
پھر اس لائن کو مضبوطی سے تھام لو
اور پھر اس کی مدد سے خود کو۔
تاریک اندھیروں سے۔۔۔
باہر کھینچ نکالو

(شونڈارائمز۔بکل اپ)

سبز بیلوں سے ڈھکے بنگلے کو وہ رات اپنے داغ دار' سیاہ دامن میں چھپاتی جارہی تھی' جب ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ زمر اپنے کمرے میں تھی' سیم ہوم ورک پھیلائے لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ ابا بھی وہیں موجود کسی کتاب کے مطالعے میں گم تھے۔ ندرت کچن میں کھڑی' باآواز بلند غیر موجود حسینہ کو کوس رہی تھیں۔

(ہزار دفعہ کہا ہے' کوارٹر میں ۔۔۔۔ جانے سے پہلے چائے کی کیتلی مانجھ کر جایا کرو' مگر اسی طرح چھوڑ جائے گی اور یہ دیکھو۔۔۔ صابن ختم۔۔۔ ایک تو بندہ مکس یار ان ملازموں کے حوالے نہ کرے۔ گھول گھول کر ختم کردیتے ہیں۔)

جب کوئی نہ ہلا تو حنہ کمرے سے باہر نکلی اور دروازے کی طرف آئی۔ اتنے میں پورچ سے اندر کھلتے دروازے پہ دستک ہوئی تو وہ چونکی۔ (ایسا کون ہے جو باہر گیٹ سے اندر آبھی گیا اور صداقت نہیں جاگا؟)

''کون؟'' اس نے پوچھا۔ جواب میں خاموشی۔۔۔
حنین نے جی کڑا کرکے آواز بلند کی۔ ''کون؟''
''تو اب میں کون ہوگیا ہوں؟'' فارس کی آواز پہ حنین کا دل ڈوب کر ابھرا۔ آنکھوں میں خوش گوار حیرت ابھری اور لبوں پہ مسکراہٹ۔

پہلے لپک کر دروازہ کھولنے لگی' پھر رکی۔ (میں تو ناراض تھی۔) چہرے کے تاثرات سخت کیے' ماتھے پہ بل ڈالے اور دروازہ کھولا۔ پھر بازو' سینے پہ لپیٹے تندی سے سامنے دیکھا جہاں وہ دو اسٹیپ نیچے کھڑا تھا۔ ہاتھ سیاہ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے' اپنی سنہری آنکھیں اس پہ جمائے' وہ سادگی سے مسکرا رہا تھا۔ چھوٹے کٹے بال ویسے ہی تھے' البتہ رنگت ذرا کملائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''ہیلو حنہ۔۔۔!''

''وعلیکم ہیلو۔۔۔ آپ کو پہچانا نہیں۔ کیا آپ یہیں رہتے ہیں؟ کیا آپ اس فیملی کا حصہ ہیں؟ اوہ مگر نہیں۔ یہاں جو لوگ رہتے ہیں' وہ ایک دوسرے سے باتیں نہیں چھپاتے۔ کراچی کا کہہ کر گولبو نہیں چلے جاتے اور جب واپس آجاتے ہیں تو اسی روز ریسٹورنٹ میں اپنی بیوی کو وزٹ کرنے کے دو دن تک اپنے گھر والوں کو بھولے نہیں رہتے۔ یہاں جو لوگ رہتے ہیں ناوہ۔۔۔''

وہ خفگی سے تیز تیز بولے جارہی تھی اور وہ جو سکون سے۔۔۔ مسکراہٹ دبائے سن رہا تھا' آگے بڑھا۔ دو قدم اوپر چڑھا اور اس کے دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھ کر جھک کر اس کا ماتھا چوما۔

''بلیک کافی' ہلکی چینی اور ذرا سی کریم کے ساتھ۔۔۔ ایک بڑا مگ۔ لاؤنج میں لے آؤ۔'' یہ کہتا ہوا وہ برابر سے نکل کر آگے بڑھ گیا۔

حنین کی زبان' جذبات اور غصے کو بریک لگ گیا۔ چند لمحے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دو دن سے تیار شدہ' بار بار ریہرسل کردہ تقریر مکمل کیوں نہ کرسکی۔ پھر اس کے پیچھے لپکی۔ تیزی سے اس کے قریب آئی۔

''میرا بھائی کہاں ہے؟'' ساری ناراضی اڑن چھو ہوگئی تھی اور آواز میں بے قراری آگئی تھی۔

''میری کافی کہاں ہے؟'' وہ اندر چلتا گیا۔ حنین اس سے زیادہ تیزی سے اندر بھاگی۔ اس کا رخ کچن کی جانب تھا۔ پیچھے سے اس نے چیخ نما چکار سنی۔ سیم نے اسے دیکھ کر کوئی نعرہ لگایا تھا' ندرت بے تابی سے اس کی طرف بڑھی تھیں' ابا خوشی سے کچھ کہہ رہے تھے۔ حنہ نے کچھ نہیں سنا۔ کچن میں آتے ہی چیزیں الٹ پلٹ کیں۔ جلدی جلدی کافی بنائی۔ ٹرے میں سجائی اور اسے لیے باہر لاؤنج میں آئی۔

اب وہ صوفے پہ بیٹھا تھا' آگے ہو کر اور ساتھ بیٹھی

ندرت کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا نا کہ اسے لے آؤں گا۔ وہ میرے ساتھ نہیں آیا' مگر وہ ٹھیک ہے۔ وہ اپنا خیال خود رکھ سکتا ہے۔"

ندرت کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ "اگر وہ ٹھیک ہے تو فون کیوں نہیں کرتا۔ گھر کیوں نہیں آتا؟"

حنہ نے ٹرے سامنے رکھی اور خاموشی سے اس کے ساتھ آبیٹھی۔

"فارس! کیا تمہیں یقین ہے کہ ہاشم نے یہ سب کروایا ہے؟"

ابا سنجیدگی بھری فکر مندی سے پوچھ رہے تھے۔ کارپٹ پہ فارس کے قدموں کے قریب بیٹھا سیم فوراً" بول اٹھا۔

"یہ بات ڈسکس کرنے سے منع کیا تھا زمر نے۔"

حنین نے رکھ کر اس کے سر کی پشت پہ تھپڑ لگایا۔

"زمر' پھپھو نے۔"

"کیا ہے؟ اب تو مجھے بھی سارے راز پتا ہیں۔" سیم کا خیال تھا زمر کو اس کے نام سے پکارنے کا یہ ہی نظریہ تھا۔

"جی ہاں۔۔۔" وہ اسی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "میں شرمندہ ہوں کہ پہلے نہیں بتا سکا' مگر یہ سچ ہے۔ وہ ہی ہمارے دشمن ہیں۔"

"میرا بھائی کہاں ہے۔" حنہ نے اب کے چڑ کر پوچھا۔ فارس نے اسے دیکھا تو وہ شکایتی نظریں اس پہ جمائے ہوئے تھی۔

"وہ کچھ دن تک آجائے گا۔ میرے ساتھ نہیں آیا۔" فارس کہہ کر چند لمحے اسے دیکھتا رہا' پھر آہستہ سے بولا۔

"آئی ایم سوری حنہ۔۔۔ مجھے تمہیں بتانا چاہیے تھا۔"

اور اگر حنین کی کوئی خفگی رہی بھی تھی تو اب دور ہو گئی تھی۔ وہ کھل کر مسکرادی۔

"میں زمر کو بتاتی ہوں کہ آپ آگئے ہیں۔ خود سے تو ملکہ عالیہ آئیں گی نہیں۔" آخری فقرہ سرگوشی میں کہہ کر وہ جلدی سے اٹھ گئی۔

زمر اپنی اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی تھی اور چند صفحات اسٹیپل کر رہی تھی۔ بال آدھے بندھے' آدھے کھلے تھے اور نظریں کاغذ پہ جھکی تھیں۔ حنہ میز کے کنارے پہ آ ٹکی اور سوچتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"جب میں پندرہ منٹ پہلے یہاں کھڑی آپ کو احمر شفیع کے وزٹ کے بارے میں بتا رہی تھی تو آپ نے اتنی پیاری لپ اسٹک نہیں لگائی ہوئی تھی اور آپ نے یہ ٹاپس بھی نہیں پہن رکھے تھے اور کاجل بھی نہیں ڈالا ہوا تھا۔"

ابھی وہ کپڑوں کے بارے میں بھی کچھ کہتی کہ زمر نے بھوری آنکھیں اٹھا کر ایک "نظر" اس پہ ڈالی اور حنہ جلدی سے گڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔

"میرا مطلب ہے' وہ احمر والی بات۔۔۔"

"میں احمر سے بات کروں گی۔"

"آپ جو کروں گی' میں خود کروں گی۔ جب مجھے علیشا کی سچائی معلوم ہوئی تھی تو میں نے فوراً" اگلے دن مسز جواہرات کو بتا دیا تھا سب۔ جب مجھے اور آپ کو ہاشم کی سچائی معلوم ہوئی تھی تو میں آپ کی طرح رونے نہیں لگی تھی۔ خاور کے پاس چلی گئی تھی۔ آپ صرف انتہائی مشکل حالات میں روتی ہیں۔ میں شدید مشکل حالات میں آگے کا سوچتی ہوں۔ احمر شفیع کے یہاں آنے سے میں ڈیپریس ہو کر کونے میں نہیں پڑ جاؤں گی' بلکہ یہ جاننے کی کوشش کروں گی کہ احمر شفیع کون ہے؟ اس کے پاس میرا راز ہے تو ہمارے پاس اس کے راز ہونے چاہئیں۔ خیر' آپ باہر آجائیں۔ فارس ماموں آئے ہیں۔ یقیناً" ان کی آواز تو نہیں سنی ہوگی آپ نے۔" آخری فقرہ معصومیت سے ادا کیا تھا۔

زمر کچھ وقت لگا کر باہر آئی۔ ندرت اور ابا اسی پوزیشن میں بیٹھے فارس سے سعدی کی باتیں کر رہے

تھے۔ سیم اس کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ بار بار زوم ان' زوم آؤٹ کر کے۔

"مگر وہ آیا کیوں نہیں؟" ابا نے اب کے اکتا کر پوچھا تھا۔

"کیونکہ اسے انصاف چاہیے۔" زمر سنجیدگی سے کہتے ہوئے آگے آئی اور فارس کے مقابل صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ جما کر بیٹھ گئی۔

فارس نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور سر کو اثبات میں خم دے کر بولا۔ "وعلیکم السلام۔"

"تم دو دن سے ہو شہر میں' میں مل چکی ہوں تم سے پہلے بھی۔۔۔" بے نیازی سے کہہ کر نظروں کا رخ ابا کی طرف پھیرا۔

"سعدی نے کہا ہے فارس سے کہ اسے انصاف چاہیے۔ اسے ہاشم کاردار کے خلاف کورٹ میں کیس کرنا ہے۔ (فارس تصحیح کرتے کرتے رک گیا۔) اور مجھ سے پوچھیں تو یہ ہی درست راستہ ہے۔ ہمیں عدالت میں جانا چاہیے۔"

"عدالت میں۔۔۔" ابا دھک سے رہ گئے۔ ندرت نے نا سمجھی سے ان دونوں کو دیکھا۔

"ہاں تو کرنے دو کیس۔۔۔ فارس کا کیس بھی تو اتنے سال بھگتایا تھا' یہ بھی بھگتا لیں گے۔"

"نہیں آپا' وہ کیس سرکار پاکستان لڑ رہی تھی فارس غازی کے خلاف۔ میں اس کیس میں "دفاع" تھا' استغاثہ نہیں۔ کسی کو بے گناہ ثابت کرنا آسان ہوتا ہے' بہ نسبت مجرم ثابت کرنے کے۔ یہ کیس ایسا نہیں ہوگا۔ اس میں ہمارے مقابلے پر کاردارز ہوں گے۔ ہمارا سارا پیسہ خرچ ہو جائے گا' ہم عدالتوں کے دھکے کھائیں گے اور آخر میں ہم کیس ہار جائیں گے' کیونکہ اس ملک میں انصاف نہیں ہے۔ نہ انصاف ملے گا۔ میں سعدی کا ساتھ اس لیے دے رہا ہوں' کیونکہ ہم ایک خاندان ہیں۔ مگر میں اس سے متفق نہیں ہوں۔" فارس نے سنجیدگی سے دو ٹوک بات کی

تھی۔ وہ قطعاً" خوش نہیں تھا۔

"کیا کیس کرنا ضروری ہے؟" حنین الجھ کر بولی۔ "بھائی واپس آجائے' ہم لوگ پھر سے ہنسی خوشی رہیں اور بظاہر ہم خود کو نارمل ظاہر کریں اور وقت آنے پہ اپنا بدلہ لے لیں' اتنا بہت ہے نا۔" حنین کے لیے پہلے جو بہت آسان تھا' اب وہ اسے ذرا کم آسان لگ رہا تھا۔

"تم ایک انسان کو قید میں ڈالنے کے بعد اس سے یہ توقع نہیں کر سکتیں کہ وہ فوراً" ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ وقت تو لگے گا۔" وہ اب اسے سمجھا رہا تھا اور زمر سعدی کے فیصلے کے حق میں ابا کو دلائل دے رہی تھی۔



اب اپنے بھی سائے کا بھروسا نہیں یارو
نزدیک جو آئے ہے وہی وار کرے ہے

وہ داغ دار رات کاردارز کے آفس پہ بھی اسی طرح پر پھیلائے ہوئے تھی۔ رئیس کو دیے گئے گھنٹے کے مکمل ہونے میں ابھی چند منٹ باقی تھے' جب وہ ہاشم کے آفس میں دوبارہ داخل ہوا۔ چوکھٹ پہ ذرا دیر کو ٹھٹکا۔ ہاشم تنہا نہیں بیٹھا تھا۔ گو کہ وہ جس طرح انگوٹھے کے ناخن سے ٹھوڑی کو رگڑتے' سوچتی نظروں سے خلا میں دیکھ رہا تھا' یوں لگتا تھا جیسے واقعی تنہا بیٹھا ہو' مگر سامنے جواہرات براجمان تھی اور چائے کی پیالی سے گھونٹ بھرتی اس کی فراغت کی منتظر نظر آتی تھی۔

رئیس آگے آیا اور جواہرات کی پشت پہ آکھڑا ہوا۔

ہاشم نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ "کیا پتا چلا؟"

"فارس غازی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس نے واقعی غازی کے نام کا کمرہ الاٹ کر رکھا ہے۔ غازی نے بیوی کو بلانے کا وعدہ کیا تھا' علاج وغیرہ کروانا ہے۔ شاید اس کی بیوی کا گردے کا مسئلہ پھر سے شروع ہو گیا ہے۔"

جواہرات کی انگلیاں بے اختیار اضطراری انداز

میں گردن میں پڑے لاکٹ کو موڑنے لگیں۔ چہرے پہ بدقت مسکراہٹ برقرار رکھی۔

"وہ اسی کمرے میں رہ رہا ہے یا نہیں؟" ہاشم مطمئن نہیں تھا۔ اس نے علاج والی بات پہ دھیان نہیں دیا۔

"ریکی کرنے کسی کو کراچی بھیج رہا ہوں۔ ایک دو دن میں سب پتا چل جائے گا۔ فارس غازی کے گھر والوں کے فونز ہنوز ٹیپ کررہا ہوں۔ ابھی تک سعدی یوسف نے ان سے رابطہ نہیں کیا' نہ ان کی باتوں سے ایسا لگتا ہے۔"

ہاشم نے اکتا کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔

"زمر نے علاج کروانا ہے؟ کیوں اسے کیا ہوا؟" جواہرات نے سرسری سا لہجہ اختیار کیا۔

"یہ ناممکن نہیں ہے۔" ہاشم اپنے دھیان میں تھا۔ "اس نے مجھ سے الیاس فاطمی کا ذکر کیا تھا کہ فاطمی نے اسے سب بتایا ہے' مگر ہو سکتا ہے وہ پہلے سے جانتا ہو اور مجھے اور فاطمی کو الگ کرنا چاہتا ہو۔ میں اس دن سے فاطمی کی نگرانی کروا رہا ہوں' اگر اسے معلوم ہو گیا تو وہ میرا دشمن بن جائے گا۔" ہاشم بار بار نفی میں سر جھٹکتا تھا۔

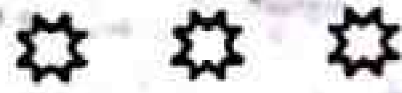
"فارس واقعی زمر کا علاج کروانا چاہتا ہے' اس میں ناممکن کیا ہے؟ ان لوگوں کو کچھ نہیں پتا' بے کار باتیں مت سوچا کرو۔" بدمزہ سی ہو کر اس نے پہلو بدلا۔ "اب اپنا موڈ بہتر کرو۔ جو ہوا سو ہوا۔ ہم ایک فیملی ہیں اور فیملی سے زیادہ دن ناراض نہیں رہتے۔" آگے بازو بڑھا کر اس کا ہاتھ دبا کر مسکرائی۔ ہاشم نے ایک سنجیدہ نظر اس پہ ڈالی۔

"میں ناراض نہیں ہوں۔ کوفت کا شکار ہوں۔ آپ کے ہر اس عمل پہ' جو آپ ہارون کے لیے کرتی ہیں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ ہماری فیملی کے درمیان دراڑیں نہ پڑیں تو ہارون کو سنجیدہ لینا چھوڑ دیں۔ جب سے وہ شہر میں واپس آیا ہے' میں یہ سب دیکھ رہا ہوں اور برداشت بھی کر رہا ہوں' اب نہیں کروں گا۔" اس کی آنکھوں میں گہری کاٹ تھی۔ جواہرات اندر تک دہل گئی' مگر بظاہر سکون سے مسکراتی رہی۔

"برداشت تو تمہیں اسے ساری زندگی کرنا ہو گا اور میں جو اس کے ساتھ اتنے اچھے سے پیش آتی رہی' وہ اپنے لیے نہیں تھا۔ تمہارے اور آبی کے لیے تھا۔" ہاشم کے تاثرات بدلے' آنکھوں کی سختی کم ہوئی۔

"تم آبی کی طرف نہیں بڑھتے تھے' کیونکہ تمہارا باپ تمہاری شادی ٹوٹنے نہیں دینا چاہتا تھا اور اس کا باپ تمہیں اس کو اپنانے نہیں دے گا' مگر شادی بھی ٹوٹ گئی اورنگ زیب بھی اسی صدمے کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا اور اب۔۔۔ میرے اتنے احسانوں کے بعد ہارون بھی کوئی پس و پیش نہیں کرے گا۔ اب تمہیں آبی سے بات کرنی چاہیے اور سنو' صرف آبی سے۔۔۔ ہارون سے کچھ مت کہنا کچھ۔۔۔ ابھی سے اس کو اتنا سر چڑھاؤ گے تو آگے مشکل ہو گی۔"

بے نیازی سے کہہ کر وہ پرس اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ ہاشم کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ چکے تھے' اس نے آہستہ سے سوچ میں گم اثبات میں سر ہلایا تھا۔



یاس و غم' رنج و تعب میرے ہوئے دشمن جاں
اے ظفر شب ان ہی دو چار نے سونے نہ دیا

وہ ڈر کر اچھلی۔ مڑ کر دیکھا تو سنجیدہ سا نوشیرواں وہاں کھڑا تھا۔ علیشا کی رنگت پھیکی پڑی۔

"میں یہاں صرف۔۔۔" خشک لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے بات بنانے کی کوشش کی تو شیرو نے ہاتھ اٹھایا۔

"سن چکا ہوں لمنونا سے۔۔۔ تم انیکسی دیکھنا چاہتی تھیں' اس لیے یہاں آئیں۔ یہ بھی ایک جھوٹ ہو گا' مگر چونکہ تمہارا تعلق ایک جھوٹے خاندان سے ہے تو ٹھیک ہے۔ تم جو بھی کرو' بس اس کاغذ پہ سائن کرو۔"

آنکھوں میں ناگواری لیے اکھڑے لہجے میں کہتے

ہوئے ایک فائل اس کی طرف بڑھائی۔

"اس کے بعد میرے شیئرز میرے پاس واپس آجائیں گے اور تم ایک خطیر رقم لے کر واپس چلی جاؤ گی۔"

"تم سب ایک ہی جیسے ہو۔" **علیشا** نے بے بسی بھرے غصے سے کہتے ہوئے فائل کھینچی اور دھپ دھپ کرتی آگے بڑھ گئی۔

نوشیرواں برآمدے کے زینے پہ آبیٹھا اور اداس نظروں سے سامنے نظر آتے قصر کو دیکھنے لگا۔ سامنے اس کے اپنے کمرے کی بالکونی تھی جس میں۔۔۔ یوں ہی۔۔۔ ایک پرانا منظر سا ابھرا۔ بالکونی کے دروازے سے لگا۔ نوشیرواں کاردار۔۔۔ آٹھ سال پہلے منشیات کی زیادہ مقدار سے مر رہا تھا اور ایک گھنگھریالے بالوں والا لڑکا اسے بچانے آیا تھا۔ شیرو نے سر جھٹکا۔ پیروں پہ نمی محسوس ہوئی تو دیکھا۔ اس کا لیبراڈار اس کے پیر چاٹ رہا تھا۔

"جیکی۔۔۔ میں نے تمہاری جان کبھی نہیں بچائی۔ صرف کھانا دیا ہے، پھر بھی تم احسان مانتے ہو، تو میں کیوں بھول گیا؟" وہ کتے سے مخاطب تھا۔ "میں نے یہ کیا کردیا؟" دکھ اور پشیمانی کی لہر نے اسے لپیٹ میں لے لیا۔

"میں اس رات سے کبھی بے خواب نیند نہیں سو سکا، مجھے ہر مائع شے کا رنگ سرخ لگتا ہے، لقمہ منہ تک لے کر جاؤں تو وہ خون آلود نظر آنے لگتا ہے۔ میں کیا کروں، جیکی؟"

اس نے سر اٹھا کر وحشت سے، اوپر چھائے آسمان کو دیکھا۔ "میرا ایک حصہ کٹ کر اس رات گر گیا تھا، وہیں اس زیر تعمیر مکان کی خون آلود مٹی میں۔۔۔ اور۔۔۔ "اس" کا ایک حصہ میرے اندر آبسا تھا۔ وہ حصہ ہر پل میرے ساتھ سانس لیتا ہے، ہر دن کے ساتھ بڑا ہوتا جاتا ہے، جیسے میں اپنے پہلو میں کسی وحشی جانور کے بچے کو جوان ہوتے دیکھ رہا ہوں۔" پھر اس نے نفی میں سر جھٹکا اور فون نکالا۔

"جی نوشیرواں! سائن کردیے **علیشا** نے؟" زمر نے دوسری گھنٹی پہ فون اٹھالیا تھا۔

"مسز زمر! حسد کیا ہوتا ہے؟" وہ ایک ہاتھ سے فون کان سے لگائے، دوسرے سے آنکھیں ملتا پوچھنے لگا۔

زمر نے گہری سانس لی تھی۔

"حسد وہ ہوتا ہے جو سب کو محسوس ہوتا ہے، کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی سے۔۔۔ مگر احمق لوگ اس کا کھل کر اظہار کرتے ہیں اور عزت دار لوگ اس کو چھپا لیتے ہیں۔"

"ضروری تو نہیں کہ ہمیں کسی سے حسد ہی ہو، ہم خواہ مخواہ بھی تو کسی کو ناپسند کرسکتے ہیں نا۔" وہ مزید بے چین ہو گیا تھا۔

"حاسد تین درجوں سے گزرتا ہے نوشیرواں۔ سب سے پہلے اس کا دل تنگ ہوتا ہے، ہر اپنے سے بہتر شخص کی تعریف سننے پر۔۔۔ پھر وہ اس کو اپنے دل میں بھی کم تر جاننے لگتا ہے اور دوسروں کے سامنے بھی اس کا قد گھٹانے کی کوشش کرتا ہے اور آخر میں وہ اس شخص کو نقصان پہنچاتا ہے۔ جسمانی اذیت سے قتل تک۔ دنیا کا پہلا قتل حسد کی وجہ سے ہوا تھا اور آخری قتل تک یہ جذبہ انسان سے انسان کو مرواتا رہے گا۔ مگر آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟"

نوشیرواں میں مزید سننے کی تاب نہ تھی، اس نے فون بند کردیا اور سر دونوں ہاتھوں میں گرادیا۔ اس کے گرد بنتے تاریک بھنور بڑھتے جارہے تھے۔ گویا اس کو نگلنے کے لیے بے تاب ہوں۔



اک عمر سنائیں تو حکایت نہ ہو پوری
دو روز میں ہم پر جو یہاں بیت گئی ہے

فروری کی تیسری صبح دھند آلود سی تھی۔ سارے مناظر دل کے آئینے کی طرح دھندلائے ہوئے تھے۔ تھوڑی دور تک "بصارت" جاتی، اس سے آگے "بصیرت" ختم ہو جاتی۔ ایسے میں اپنے بیڈ روم میں

بیڈ پہ کمبل گردن تک تانے، ماتھے پہ بازو رکھے سوتی ہوئی زمرد دکھائی دیتی تھی۔ فارس کھڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ نگاہیں باہر جمی تھیں۔ دفعتاً "وہ کچھ دیکھ کر چونکا، پھر باہر نکل گیا۔

سبز بیلوں سے ڈھکے بنگلے کا لان بنجر کے اندھیرے اور دھند میں نہایا ہوا لگتا تھا۔ فارس نے جیسے ہی باہر پورچ کی طرف کھلتا دروازہ کھولا، باہر کھڑی حنین کا ہتھوڑا اسی طرف آیا۔ وہ بروقت پیچھے ہوا اور حنین نے بھی "اوہ" کر کے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ وہ اسی دروازے پہ کچھ ٹھونک رہی تھی جس کو فارس نے کھولا تھا۔

"کیا کر رہی ہو اتنی صبح؟" آنکھوں میں حیرت لیے وہ باہر نکلا اور سر سے پیر تک حنین کو دیکھا۔

وہ ہڈ والا سوئیٹر پہنے ہڈ سر پہ گرائے ہوئے تھی۔ ایک ہاتھ میں ہتھوڑا تھا اور دوسرے کو کمر کے پیچھے چھپالیا تھا۔ نگاہیں بھی موڑلیں۔

"تو آپ مجھ سے ناراض ہیں حنین بی بی؟" وہ سینے پہ بازو لپیٹے چوکھٹ سے ٹیک لگا کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ حنین نے پلکیں اٹھائیں اور خفا آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"آپ کے خیال میں سوری کر لینے سے سب ٹھیک ہو جائے گا؟"

"میں نے رات کو جھوٹ بولا تھا، جب میں نے تم سے معذرت کی۔ میں یہ سب چھپانے پہ بالکل بھی شرمندہ نہیں ہوں حنین! میں یوں تم لوگوں کی حفاظت کر رہا تھا۔"

"زمر ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ انتہائی دو نمبر انسان ہیں۔" خفا سی مڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"مگر آئی ایم سوری، اگر میں نے دل دکھایا ہے تو..." اب کے نرمی سے بولا تو حنہ کا دل پگھل گیا۔ بغیر مڑے وہ پشت کیے کھڑی آہستہ سے بولی۔ "ہم اس رات وارث ماموں کے ساتھ تھے... ہم دونوں نے ایک ساتھ ان کو آخری دفعہ دیکھا تھا۔ ہم اس سب میں ساتھ تھے، آپ کو مجھے ساتھ رکھنا چاہیے تھا۔"

"میں پہلے ہی ڈوبی ہوئی کشتی ہوں حنین، اپنے ساتھ دوسروں کو نہیں ڈبو سکتا۔ یہ کر کیا رہی ہو؟" اس نے کمر کے پیچھے سے ہاتھ نکال لیے تو وہ پوچھنے لگا۔

حنہ نے جواب دیے بنا وہ شے دروازے پہ رکھی اور کیل جما کر ٹھونکنے لگی۔ فارس نے آگے ہو کر دیکھا۔ وہ ایک نیم پلیٹ تھی۔ پلاسٹک کی تختی۔ اس پہ اردو میں لکھا تھا۔ "مور چال۔"

"مور چال؟ کیا مطلب ہوا اس کا؟"

"مور چال... یعنی چیونٹی کا گھر... یہ پرانی اردو کا لفظ ہے۔ اسی سے ماڈرن اردو کا لفظ "مورچہ" نکلا ہے۔ چیونٹی کا گھر بھی کسی مورچے سے کم نہیں ہوتا نا۔"

"اچھا..." وہ مسکرایا۔ "یہ اس طرح نہیں ٹھونکا جائے گا۔ ڈرل استعمال کرو۔"

"میں کوئی مستری یا ترکھان نہیں ہوں جو ڈرل استعمال کروں۔" اس صبح تک حنین یہ ہی سمجھتی تھی سو کہہ گئی۔ فارس چپ ہو گیا۔

"بھائی گھر آجائے گا نا۔" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

فارس جواب دیے بنا سوچتی نگاہوں سے، دور دھند آلود آسمان کو دیکھنے لگا... ہر گزرتے لمحے وہ دور جا رہا تھا... اس مور چال سے دور... اس زمان و مکاں کی حد سے دور...

زرتاشہ کا ولیمے کا جوڑا فیروزی رنگ کا تھا۔ ساتھ میں نازک سی ڈائمنڈ جیولری پہن رکھی تھی۔ بال جوڑے میں بندھے تھے اور دوپٹا جوڑے کے اوپر ٹکا تھا۔ وہ کچھ فکرمند، کچھ پرجوش، ہر زاویے سے خود کو آئینے میں دیکھ رہی تھی اور وہ اس کے پیچھے صوفے پہ بیٹھا اس کو...

وہ دونوں برائیڈل روم میں تنہا تھے۔ ندرت آپا ابھی ابھی گئی تھیں اور زرتاشہ جو اتنی دیر سے ضبط کر کے سنجیدہ بنی بیٹھی تھی، اب جلدی سے اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"تم کیوں پریشان ہو، زرتاشہ؟" وہ تحمل سے بولا

تھا۔ زرتاشہ نے مڑ کر اسے دیکھا تو کاجل بھری آنکھوں میں ملے جلے جذبات تھے۔

"میرا میک اپ اوور تو نہیں لگ رہا؟ تین مہینے سے اپائنٹمنٹ لے رکھا تھا۔ کہہ کہہ کر تھک گئی، مگر کچھ گڑبڑ کردی اس نے۔ بس زیادہ لگ گئی ہے شاید۔ میں اسٹیج پہ جا کر بری تو نہیں لگوں گی؟ اور میں بہت نروس ہوں فارس! میں کیا کروں؟"

اس کے انداز میں کچھ ایسا تھا جو بچوں جیسا تھا اور فارس کو اپنی زندگی کی ساری نارسائیاں بھلا دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایش گرے سوٹ پہن رکھا تھا اور بال ہمیشہ کی طرح بہت چھوٹے نہیں تھے، ذرا بڑے تھے۔ قد میں وہ اس سے لمبا تھا۔ چلتا ہوا آیا اور اس کے کندھے کو نرمی سے تھاما۔

"تم بہت پیاری لڑکی ہو، تم اسٹیج پہ جاؤ گی تو کوئی تمہیں برا نہیں کہے گا۔ اگر کوئی تعریف نہ کرے تو وہ جلتا ہو گا تم سے۔" اور اس نے دیکھا، زرتاشہ کے تنے اعصاب واقعتاً "ڈھیلے پڑے، چہرے پہ مسکراہٹ در آئی۔

"میں اچھی لگ رہی ہوں؟"

وہ پھر سے مسکرایا۔ "ہاں۔" تب ہی دروازہ کھلا۔ فارس نے گردن موڑی اور چوکھٹ میں کھڑی لڑکی کو دیکھ کر اس نے بے اختیار گردن واپس پھیری۔ چہرے کی رنگت بدلی تھی۔ زرتاشہ کے کندھوں سے ہاتھ ہٹا لیے۔ زرتاشہ نے چوکھٹ کی طرف دیکھا، پھر مسکرا کر سلام کیا۔

"سوری۔ میں سمجھی سعدی ادھر ہے، کہاں گیا؟" زمر کہہ کر اپنے موبائل پہ نمبر ڈائل کرتی الجھ کر واپس مڑ گئی تھی۔

زرتاشہ نے فارس کو دیکھا۔ "یہ آپ کے بھانجوں کی پھپھو ہے نا؟" نئے نئے رشتے یاد کرنے میں وہ ہلکان ہو رہی تھی۔

"ہوں۔" وہ اپنا موبائل نکالتا مڑ گیا اور خوامخواہ بٹن دبانے لگا۔ چند لمحوں میں ماحول میں کوئی نادیدہ سا کھنچاؤ در آیا تھا۔ دل میں کچھ زور سے ٹوٹا تھا۔ وہ اس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا۔ گھنگریالے بال، ناک کی لونگ۔ لباس کا رنگ شاید نیلا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور باہر نکل گیا۔ زرتاشہ شادی کے پہلے "تھری ڈے فیز" سے باہر نہیں نکلی تھی اور یہ وہ تین دن تھے جن میں کچھ معلوم نہیں چلتا کہ کون آرہا ہے، کون جا رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔ وہ ہواؤں میں تھی، سو محسوس نہ کر سکی۔

اسٹیج پہ جب وہ فوٹو شوٹ کے وقت زرتاشہ کے ساتھ کھڑا تھا تو اپنے اندر کے تناؤ پہ قابو پا چکا تھا۔ وہ مسکرا بھی رہا تھا اور نیلے کپڑوں کی جھلک کو کن اکھیوں سے دیکھ کر اس نے کوشش کی کہ وہ مسکرا تا رہے، مگر تب وہ اچھا اداکار نہیں تھا، سو مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ اس کی بیوی کے ساتھ آکر کھڑی ہوئی تھی اور مسکرا کر اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ فوٹو شوٹ ختم ہوتے ہی وہاں سے اتر آیا۔ اس نے دیکھا تھا کہ ہاشم اور شہرین اسٹیج پہ چڑھ رہے ہیں مگر وہ نظرانداز کر کے آگے بڑھ گیا۔

چند منٹ بعد۔ جب وہ دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا، وارث وہاں آرکا۔ اس کے دوستوں کے ادھر ادھر مصروف ہونے کے بعد اس نے سنجیدگی سے فارس کو مخاطب کیا۔

"تم اپنی فیملی کو ہاشم سے دور رکھو۔ وہ تمہارے اترتے ہی زرتاشہ سے تمہارا ذکر نامناسب الفاظ میں کر رہا تھا۔ زمر وہاں کھڑی تھیں۔ انہوں نے تمہیں ڈیفینڈ کیا تو ہاشم مسکرا کر چپ ہو گیا۔ اس کی مسکراہٹ سے لگتا ہے، وہ کل کو تمہاری بیوی کے سامنے زمر کا نام لے کر اسے بدگمان کرنے کی کوشش کرے گا۔"

فارس نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔ "وہ کچھ نہیں جانتا۔"

"وہ ہاشم کاردار ہے۔ اسے سب پتا ہوتا ہے۔"

فارس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ اپنے راز کا عیاں ہو جانا۔۔۔ بہت بے قرار کر دینے والا تھا۔ وہ بری طرح ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ مگر اس واقعے نے اس کو محتاط کر دیا تھا۔۔۔ بے حد محتاط۔۔۔

مور چال کی تختی دروازے پہ نصب ہو چکی تھی۔ ہتھوڑے کی مسلسل ٹھک ٹھک کی آواز بند ہو چکی تھی۔ سناٹے نے اسے چونکایا۔ وہ پورچ میں رکھے جھولے پہ بیٹھا تھا اور اس سے فاصلے پہ دروازے کے ساتھ وہ دونوں کھڑی تھیں۔ زمر بال کان کے پیچھے اڑستی، خوابیدہ آنکھوں کے ساتھ شال کندھوں کے گرد لپیٹے، باہر آکھڑی ہوئی تھی اور حنین اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ فارس سر جھٹک کر اٹھا اور ان کے قریب چلا آیا۔ اسے دیکھ کر دونوں چپ ہو گئیں۔ وہ بھی خاموشی سے پاس سے گزرنے لگا تو زمر بولی۔

"ہم علیشا کی بات کر رہے تھے۔"

فارس سنجیدگی سے ان دونوں کی طرف گھوما۔ "اچھا! میں سمجھا صرف میں باتیں چھپاتا ہوں، میں راز رکھتا ہوں، میں جھوٹ بولتا ہوں۔"

حنین ادھر ادھر دیکھنے لگی اور زمر کی رنگت خجالت سے ذرا پھیکی پڑی۔ "وہ میں۔۔۔"

"میں سن چکا ہوں۔۔۔ آپ کو لگتا ہے کہ تین گز دور بیٹھے آدمی کو آواز نہیں آتی۔ وہ بھی نسوانی آواز جو مردانہ آواز سے زیادہ دور تک جاتی ہے۔ یہ جو آپ دونوں اسٹڈی میں بیٹھ کر سرگوشیاں کرتی ہیں اور ادھر بیسمنٹ میں رات کو بیٹھ کر باتیں کرتی تھیں، مجھے سب سنائی دیتی تھیں۔ وہ ویڈیو بھی دیکھ چکا ہوں جو آپ کے (زمر کو مخاطب کر کے) بغیر پاس ورڈ لگے لیپ ٹاپ میں پڑی ہے۔ جو سعدی نے ہاشم کے آفس میں بنائی تھی۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کے (حنین کو گھور کر) پاس فروزن قلم پڑی ہے، جو ہاشم کی فلیش سے نکلی ہے اور وہ جو ڈاکومنٹس آپ پرنٹ کر رہی ہوتی ہیں آج کل، زمر بی بی! وہ بھی دیکھ چکا ہوں۔ علیشا اپنی کی چین میں کیوں انٹرسٹڈ ہے، یہ بھی پتا کر لوں گا۔ اگر مزید کچھ کہنا ہے آپ نے تو بتائیں۔"

ہر وقت کے گلے شکووں کا رخ الٹا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں کبھی ایک دوسرے کو دیکھتیں، کبھی فارس کو۔۔۔ پھر زمر نے (بظاہر) بے نیازی سے شانے جھٹکے "ہاں ٹھیک ہے، ہم کافی عرصے سے واقف تھے کہ سعدی پہ حملہ ہاشم نے کروایا اور۔۔۔"

"نوشیرواں" وہ بے اختیار بولا۔ زمر رک گئی۔ فارس پہ جمی آنکھوں میں استعجاب سا نمایاں ہوا۔

"سعدی کو۔۔۔ گولیاں نوشیرواں نے ماری تھیں۔"

زمر بالکل پتھر کا بت بن گئی تھی۔ منفید بشل۔

حنین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "وہ لوزر؟ اس کی یہ ہمت؟" وہ غصے میں آگئی تھی۔ "اس نے کیوں کیا یہ؟"

"حسد میں۔۔۔!" زمر شل سے انداز میں بولی تھی۔ پھر ایک دم وہ مڑی اور اندر چلی گئی۔ حنین تیز تیز فارس سے کچھ کہہ رہی تھی، مگر وہ گردن موڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

آبنوسی لکڑی کے دروازے پہ سجا "مور چال" دن کی پھیلتی روشنی میں چمکنے لگا تھا۔

کچھ اس طرح سے سودا کیا مجھ سے وقت نے
تجربہ دے کر وہ میری ساری معصومیت لے گیا

کینیڈی کی سرسبز پہاڑیاں دھند میں لپٹی تھیں۔ کافی شاپ کی سیڑھیاں اترتا سعدی یوسف نیچے آرہا تھا۔ سفری بیگ کندھے پہ تھا اور سر پہ پی کیپ تھی۔ سیڑھیوں کے دہانے پر کامنی کھڑی فون پہ بات کر رہی تھی۔ اسے آتے دیکھا تو چہرے پہ سختی آگئی۔ ایک سرد نظر اس پہ ڈال کر آگے بڑھ گئی۔

کچن میں بوڑھا رونا سنگھی ایپرن پہنے کھڑا کام کر رہا تھا۔ اس پہ محض ایک نظر ڈالی۔ بولا کچھ نہیں۔ سعدی بے مقصد وہاں کھڑا رہا۔ مونچھ بھی ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر سر جھکائے ناشتا کرنے لگا۔ کافی شاپ کے مکین کافی کے دانوں جیسے سخت اور کڑوے ہو گئے

تھے۔

"میں جا رہا ہوں۔" اس نے بوڑھے کو اطلاع دی۔

وہ چپ چاپ کام کرتا رہا۔

"تو جاؤ... روکا کس نے ہے؟" وہ درشتی سے کہتی پیچھے سے آئی اور غصے بھری نظروں سے اسے گھورا۔ "مگر جانے سے پہلے اتنا بتا کر جاؤ اس بندے کا کیا بنا؟"

سعدی چہرہ موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ بولا کچھ نہیں۔

"تمہاری وجہ سے ایک غنڈہ میری شاپ پہ آیا۔ میرے بچے کے سر پہ پستول رکھا۔ ہمیں یرغمال بنایا۔ پھر تم اس کے ساتھ باہر گئے۔ وہاں سے تم نے فوڈ اتھارٹی والوں کو کال کیا اور میری شاپ پہ محکمے کے لوگ آکر سارا کھانا الٹ کے چلے گئے۔ دو دن سے ایک گاہک یہاں داخل نہیں ہوا۔ ہمارے کھانے میں زہریلا مواد نکلا جو تم نے ہی ڈالا ہوگا' تاکہ تم بابا سے بدلہ لے سکو اور پھر شام کو تم آجاتے ہو اور وہ بھی صحیح سلامت... اور وہ بندہ اب بھی لاپتا ہے۔" بولتے بولتے وہ ہانپنے لگی۔ "تم مجھ سے سچ بھی بول سکتے تھے' مگر تم نے نہیں بولا۔ کم از کم یہ بتا دو اس بندے کے ساتھ تم نے کیا کیا؟"

"میں نے اس کی گردن توڑ دی اور اس کی لاش پہاڑی سے نیچے پھینک دی۔ میں جتنی مکاری اور چال بازی سے اس جگہ کو اپنا سیف ہاؤس بنانے میں کامیاب ہوا تھا' اس نے اس پہ پانی پھیر دیا تھا۔ اب میں جا رہا ہوں اور ایک جعلی پاسپورٹ کے ذریعے اس ملک سے بھاگ جاؤں گا۔ میں ایک نااہل جاسوس ہوں اور جاسوس ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انہیں فرق نہیں پڑتا کہ لوگ ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔"

"نکل جاؤ میرے گھر سے..." وہ چلائی تھی۔ سرخ آنکھوں میں بہت سے آنسو لیے۔ سعدی خاموشی سے مڑا۔ مونجی نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ بوڑھا چپ چاپ کام کرتا رہا۔ سعدی یوسف بے تاثر چہرے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ چند لمحوں بعد وہ سر جھکائے باہر اسٹریٹ پہ چلتا دور جاتا دکھائی دے رہا تھا۔



نہ گلے رہے' نہ گماں رہے نہ گزارشیں ہیں' نہ گفتگو
وہ نشاطِ وعدہ وصل کیا' ہمیں اعتبار بھی اب نہیں

دھند دوپہر تک کافی ہلکی ہو گئی تھی۔ سورج نے چہرا دکھایا تھا۔ اسپتال کی لابی مکمل طور پہ روشن تھی۔ چمکیلے فرش پہ باریک ہیل پہنے' سفید لباس پہ سیاہ کوٹ پہنے اور بال باندھے زمر یوسف چلی آرہی تھی۔ کاؤنٹر پہ رک کر اس نے ریسیپشنسٹ نوجوان کو سلام کیا تو بھوری آنکھوں میں سادگی سی دکھائی دیتی تھی۔

"ڈاکٹر قاسم نے کہا تھا کہ......"

"جی میم! آپ کی نئی دوا تیار ہے۔ انہوں نے بھجوا دی تھی۔" وہ دراز سے پیکٹ نکالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ڈاکٹر قاسم اب کیسے ہیں؟"

"اسی طرح ہیں۔ آپ ان کو سمجھاتی کیوں نہیں ہیں۔ انہیں اس شخص کو پولیس کے حوالے کرنا چاہیے تھا۔ سی سی ٹی وی میں اس کی فوٹیج بھی تھی' مگر ڈاکٹر صاحب نے وہ بھی ڈیلیٹ کروا دی۔" وہ ناخوش اور فکرمند لگ رہا تھا۔

"کس شخص کو...؟" اس نے اچنبھے سے نوجوان کو دیکھا۔ پچھلی دفعہ یہاں کوئی دوسرا لڑکا تھا' جس نے اسے ڈاکٹر قاسم کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع دی تھی۔

"وہ مریض جس نے ان پہ تشدد کیا تھا۔ آپ کو کسی نے نہیں بتایا؟" وہ اس نوجوان کو گزرے کئی برسوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک دفعہ اس کے پاس ایک کام لے کر بھی آیا تھا۔ جب وہ اے ڈی پی تھی۔ تب ہی قدرے آگے ہو کر کہنے لگا۔ "ایک آدمی مریض بن کر آیا تھا ایک روز... وہ نکل گیا تو کافی دیر بعد جب میں اندر گیا' کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اگلے مریض کو بلایا نہیں تھا' تو دیکھا کہ وہ زمین پہ گرے پڑے ہیں اور زخمی حالت میں ہیں۔"

"کب کی بات ہے یہ...؟" وہ متحیر رہ گئی۔

"ٹھہریں! میں آپ کو تاریخ بتاتا ہوں۔ اسی تاریخ کی فوٹیج ہم نے مٹائی ہے نا۔" وہ اس کے دلچسپی لینے پہ ذرا پرجوش ہو کر دراز سے کچھ ڈھونڈنے لگا۔ پھر ایک کاغذ نکالا اور تاریخ پڑھ کر سنائی۔ یہ ماہِ کامل کی

رات سے اگلے دن کی تاریخ تھی۔ زمر کے حلق میں کچھ اٹکا۔

"اور اس تاریخ کو ڈاکٹر صاحب سے ملنے آنے والے مریض نے ان کو مارا پیٹا؟"

"دراصل وہ مریض نہیں تھا۔ رجسٹر میں نام بھی نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سے فون پہ بات ہو گئی تھی اور اندر چلا گیا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے اعتراض نہیں کیا تو میں سمجھا کہ۔۔۔"

"کیسا۔۔۔ کیسا دکھتا تھا شکل میں۔۔۔؟" بدقت لہجہ متوازن رکھا۔

"فوٹیج تو ہم نے مٹادی۔ شکل اتنی اچھی نہیں یاد، مگر لمبا سا تھا۔ گرے سا سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ چھوٹے کٹے بال تھے، بہت چھوٹے اور۔۔۔" وہ یاد کرکے ایک ایک نشانی بتا رہا تھا اور زمر بار بار خشک لبوں پہ زبان پھیرتی تھی۔

"آپ وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اس حالت میں پایا؟ آئی ایم سوری، مگر آپ کے ساتھ ذرا ایرانی علیک سلیک ہے، اس لیے آپ کو بتا رہی ہوں کہ اگر یہ کہانی آپ نے کسی اور کو سنائی تو سارا الزام آپ کے سر پہ آئے گا۔ فوٹیج بھی آپ نے مٹائی، ڈاکٹر صاحب کو اس طرح گرے بھی آپ نے دیکھا اور اس مریض کو جاتے ہوئے بھی آپ ہی نے دیکھا۔ عدالت سمجھے گی کہ آپ اپنے جرم کو کور کرنا چاہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی اگر اس بندے کو کور کر رہے ہیں تو پولیس کے سامنے اس کا نام نہیں لیں گے، مگر آپ کی غیر حاضریوں سے اکثر نالاں رہتے ہیں۔ اگر آپ کا نام لے دیا تو؟ میری مانیں تو اس قصے میں نہ پڑیں۔"

ایک ہی سانس میں اسے مفت مشورے سے نوازتی وہ اس کے ہکا بکا چہرے کو نظرانداز کرتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔

پھر وہ کن قدموں سے وہاں سے نکلی، اسے پتا نہیں چلا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور رنگت زرد پڑ رہی تھی۔ کار میں بیٹھ کر کافی دیر گہرے گہرے سانس لے کر اس نے خود کو پرسکون کیا۔

"اس نے میرے ڈاکٹر کو مارا پیٹا۔۔۔ اور اس کے بعد ڈاکٹر نے اچانک سے کڈنی ٹرانس پلانٹ کی بات ختم کردی، وہ اب مجھے امید دلانے لگے ہیں کہ نئی دوا سے میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ کچھ غلط ہے اس سب میں۔۔۔"

وہ نفی میں سر ہلاتی، بڑبڑائے جارہی تھی۔



سبز بیلوں سے ڈھکے مورچال میں دوپہر کے وقت سناٹا چھایا تھا۔ حنین ڈائننگ ہال میں بیٹھی انگلیوں میں وہ کی چین الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے علیشا سے کوئی بات نہیں کی تھی، نہ اسے کرنی تھی۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ سوچنے لگی۔۔۔ یہ کی چین علیشا کیوں مانگ رہی ہے واپس؟ اس میں کیا بات ہے ایسی؟ آنٹس ایور آفٹر کیا یہ کسی قسم کا کوڈ ہے؟ کچھ تو ہے۔

شہر کے دوسرے حصے میں واقع ایک ریسٹورنٹ کے اندر دوپہر کی روشنی بھری تھی۔ فارس غازی کونے والی میز پہ بیٹھا، ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، بازو سینے پہ لپیٹے منتظر نظر آرہا تھا۔ بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتا، پھر سنہری آنکھیں دروازے پہ مرکوز کر دیتا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ جیسے کسی کا انتظار کر رہا تھا۔

اور اس انتظار کی گھڑی میں پھر ذہن کی رو بھٹکنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکو تو ان میں یادوں کے اوراق کھلتے نظر آرہے تھے۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ آفس میں بیٹھا تھا اور سر جھکائے فائل میں لگے کاغذ باری باری نکال رہا تھا، جب سامنے کوئی کرسی کھینچتے ہوئے بیٹھا۔ فارس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ وارث تھا اور مسکرا کر اس سے خیریت پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ مجھے کیا ہونا ہے؟" بے نیازی سے کندھے جھٹکتے فارس نے فائل بند کرکے پرے ڈالی۔

"تھوڑی اور چھٹی لے لیتے۔ شادی ایک ہی دفعہ ہوتی ہے۔ کچھ دن اور لگا لیتے ناردرن ایریاز میں۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ بہت چھٹیاں ہو گئیں پہلے ہی۔۔۔ اب کام پہ واپس آنا ہی تھا۔" وہ بہت تازہ دم نہیں لگ رہا

تھا۔ چائے آنے کے بعد وارث نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہہ ہی دیا۔

"تم خوش ہو زرتاشہ کے ساتھ...؟"

"ہاں..." وہ بازوؤں کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھے اور چھت کو دیکھتے ہوئے سوچ سوچ کر کہنے لگا۔ "اچھی ہے شکایتیں زیادہ کرتی ہے، بچپنا بھی ہے، مگر اتنی چالاک نہیں ہے۔"

"اس کو موازنے اور مقابلے کے پیمانے سے ہٹادو فارس..."

فارس ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ "میں اس کا موازنہ کسی سے نہیں کر رہا۔" پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ "اگر تم اور ندرت آپا بار بار مجھے وہ باتیں یاد نہ دلاؤ تو مجھے وہ یاد بھی نہیں آتی۔"

"اوکے، آئی ایم سوری..." وارث نے متانت سے کہتے ہوئے کپ میز پہ رکھا۔ "مجھے لگا تھا کہ تم گلٹی ہو کہ..."

"میں گلٹی نہیں ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہاں یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ زرتاشہ سے اتنی محبت کروں جتنا اس کا حق ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ... یہ میں نہیں کر پارہا ابھی..."

"فارس! میاں بیوی کو ایک دوسرے سے لازمی محبت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے درمیان مؤدت اور مرحمت ہونی چاہیے۔ مودت کہتے ہیں الفت کو، اٹیچ ہونے کو، دوستی ہو جانے کو اور مرحمت ہوتی ہے ایک دوسرے سے ہمدردی کم پیشن خیال رکھنا، احساس کرنا دوسرے کا۔ محبت ضروری نہیں ہوتی اور جانتے ہو، بیوی اپنے شوہر کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ تم اس کو کہو وہ خوب صورت ہے۔ وہ ہر روز نکھرتی جائے گی، اسے کہو، وہ خدمت گزار ہے، وہ مزید خدمت کرے گی، اس کو سراہو گے تو اس کا اعتماد بڑھے گا، لیکن اگر ہر وقت اس کے اندر نقص نکالو گے تو اس کو کھوکھلا کر دو گے، وہ ٹیڑھی پسلی سے نکلی ہے، اس کو سیدھا کرنے کی کوشش میں تم اسے توڑ دو گے۔ اس لیے اس کے ساتھ دوستی اور رحم کا رشتہ رکھو۔ میں چاہتا ہوں تم اس کے ساتھ خوش رہو اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ خوش رہے۔ کوئی بھائی نہیں چاہتا کہ اس کے بھائی کی بیوی تکلیف میں رہے۔"

الفاظ وارث کے لبوں سے نکل کر ہوا میں ٹھہرتے تھے۔ کہتے ہیں تمام الفاظ فضا میں معلق ہو جاتے ہیں، ازل سے ابد تک کے لیے ٹھہر جاتے ہیں! اسی لیے ہم جب چاہیں انہیں یاد کر لیتے ہیں... محسوس کر لیتے ہیں۔ وہ الفاظ کی اس بازگشت سے تب نکلا جب سامنے والی کرسی کھینچی گئی۔ فارس نے ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی اور فوراً" کھڑا ہو گیا۔

"سارہ!" احتراماً" سر کو خم دیا... سارہ ملائمت سے مسکراتی سامنے بیٹھی۔

"خیریت تھی نا فارس؟ تم نے اتنی ایمرجنسی میں مجھے بلوایا۔"

"کوئی بھائی نہیں چاہتا کہ اس کے بھائی کی بیوی تکلیف میں رہے۔" وہ کہتے ہوئے واپس بیٹھا۔

سارہ نے اپنی سبز آنکھیں چھوٹی کر کے غور سے اسے دیکھا۔ وہ بال جوڑے میں باندھے، ہاتھ میں فولڈر اور پرس اٹھائے ہوئے تھی۔ آفس سے لنچ بریک میں آئی تھی۔ وہ پہلے اس سے بچیوں کا حال پوچھنے لگا۔ پھر ذرا دیر بعد بولا۔

"دو آپشن ہیں آپ کے پاس..." اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ "یا تو آپ انگلینڈ چلی جائیں، کچھ عرصے کے لیے روپوش ہو جائیں، میں ہر چیز ارینج کروادوں گا۔ یا پھر آپ اگر گواہی دینا چاہیں تو میں آپ کی حفاظت کروں گا۔"

"گواہی؟" سارہ کے حلق میں کچھ اٹکا۔ رنگت سفید پڑی۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"سعدی مل گیا ہے سارہ... اور جب وہ واپس آئے گا تو وہ عدالت میں جائے گا۔ آپ سعدی کے ساتھ تھیں اس رات، میں جانتا ہوں۔ عدالت آپ کو بلائے گی... واپس بیٹھ جائیں۔"

آخری الفاظ سختی سے کہے اور وہ، جو اٹھنے لگی تھی،

بے بسی اور غصے سے اسے دیکھتی واپس بیٹھی۔

"تو آپ گواہی دیں گی یا نہیں، فیصلہ آپ کو کرنا ہے، لیکن میں ہر حال میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ زمر اور سعدی چاہیں گے کہ آپ عدالت میں پیش ہوں، مگر میں ایسا نہیں چاہتا۔ اگر آپ پیش نہیں ہونا چاہتیں تو ان کے علم میں لائے بغیر میں آپ کو یہاں سے بھجوا دوں گا، کسی محفوظ مقام کی طرف۔۔۔ فیصلہ آپ کا ہے۔" سنجیدگی سے کہہ کر واپس ٹیک لگا کر بیٹھا۔ سارہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھے گئی، بولی کچھ نہیں۔ کتنے ہی پل خاموشی سے بیت گئے۔ پھر وہ ذرا نرمی سے بولا۔

"ابھی کسی کو آپ کا نہیں پتا۔ اس لیے ابھی تک فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

"کرنل خاور کو پتا ہے۔" اس کے لب پھڑپھڑائے۔

فارس کا اطمینان غائب ہوا، ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ "کیا؟ وہ کب ملا آپ کو۔۔۔؟"

"سعدی کے اس۔۔۔ اس حادثے کے تین دن بعد۔۔۔ میں رات کو اپنے کمرے میں سو رہی تھی جب۔۔۔" وہ نظریں جھکائے، ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بتانے لگی۔

رات کے اس پہر۔ کمرہ تاریک تھا۔ سوائے مدھم نائٹ بلب کی زرد روشنی کے، جو منظر کو دیکھنے کے قابل بنا رہی تھی۔ بیڈ پہ سارہ لحاف تانے سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ آنسوؤں کے سوکھے نشان واضح نظر آتے تھے۔ دائیں بائیں اہل اور نور بے خبر سو رہی تھیں۔ تب ہی کوئی کھٹکا سا ہوا۔ سارہ کی آنکھیں ایک دم کھلیں۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ لاؤنج سے کسی شے کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ تیزی سے بستر سے نکلی، پیروں میں سلیپرز ڈالے اور باہر آئی۔

"امی؟" محتاط انداز میں پکارتے ہوئے وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو دیکھا، سامنے ٹی وی مدھم آواز میں چل رہا ہے۔ سارہ کے ماتھے پہ بل پڑے۔ آنکھوں میں اچنبھا ابھرا، مگر اس سے پہلے کہ وہ ریموٹ اٹھاتی، کسی نے گردن سے دبوچ کر اسے دیوار سے لگایا اور منہ پہ سختی سے ہاتھ جما دیا۔ ساری چیخیں اس کے حلق میں دم توڑ گئیں۔

ٹی وی کی روشنی کے باعث۔۔۔ وہ خوف زدہ آنکھوں سے اتنا دیکھ سکتی تھی کہ پستول کی نال اس کی گردن پہ رکھنے والا کرنل خاور ہے۔

"آواز نکالی تو گولی مار دوں گا۔" وہ دبی آواز میں غرایا۔ سارہ نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلایا۔ دونوں ہاتھ دیوار پہ جمائے، وہ کانپنے لگی تھی۔

"تم سعدی کے ساتھ تھیں، تم نے سب دیکھا ہے۔ میں نے ہاشم کو نہیں بتایا، کیونکہ وہ کہے گا تمہیں مار دوں، لیکن اگر تم نے کسی کو بتایا تو میں تمہاری بچیوں کو غائب کرا دوں گا۔ سن رہی ہو یا نہیں؟" سارہ جلدی جلدی اثبات میں سر ہلانے لگی۔ آنسو آنکھوں سے ابل ابل کر چہرے پہ لڑھک رہے تھے۔

"وہ دس منٹ کھڑا رہا، مجھے ڈراتا رہا، دھمکاتا رہا اور میں ڈر گئی۔ اس کی آمد کے بارے میں میں نے امی تک کو نہیں بتایا۔"

"مجھے تو بتا دیتیں سارہ۔۔۔ میں تو تھا نا آپ کے ساتھ۔۔!" وہ افسوس سے اسے دیکھ کر بولا تھا۔ سارہ نفی میں سر ہلاتی، پرس اٹھاتے ہوئے اٹھی۔

"میرے ساتھ کوئی بھی نہیں ہے فارس۔۔۔ مجھے جو بھی فیصلہ کرنا ہے، خود کرنا ہے۔" وہ اس سے اپنی بھیگی نظریں ملائے بغیر چلی گئی اور وہ لب بھینچے بیٹھا، اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔



کبھی گریباں کے تار گنتے، کبھی صلیبوں پہ جان دیتے
گزر گئی زندگی ہماری ۔۔۔ سدا یہی امتحان دیتے

فوڈلی ایور آفٹر کے بالائی ہال کا دروازہ فارس نے دھکیلا تو روشن سے ہال میں زمر سر جھکائے میز پہ جھکی کچھ لکھتی نظر آئی۔ آہٹ کے باوجود سر نہیں اٹھایا۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ ہشاش بشاش سا کہتا کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ زمر نے آنکھیں اٹھائیں تو ان میں اندر

تک اترنے والی چبھن تھی۔

"اسی جگہ بیٹھ کر تم نے کہا تھا کہ اب مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے۔"

اس کے الفاظ اتنا صدمہ لیے ہوئے تھے کہ فارس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ چونک کر (ٹانگ پر سے ٹانگ ہٹاتا) سیدھا ہوا۔

"کیا ہوا؟"

زمر قلم پرے رکھ کر پیچھے کو ہوئی۔ "کتنے مان سے میں کہہ رہی تھی کہ تمہیں کتنا غلط سمجھتی رہی مگر تم فارس۔۔۔ تم کبھی نہیں بدلو گے۔"

"اب کیا کیا ہے میں نے؟" اس کی تیوری چڑھی۔

"تم نے کچھ نہیں کیا۔ تم صرف کسی سے ملنے گئے تھے اور وہاں جا کر تم نے مار مار کر اس کا حشر برا کر ڈالا۔ یاد ہے، کس کی بات کر رہی ہوں یا میں یاد دلاؤں؟"

وہ غصے بھری بے بسی سے بولی تو فارس نے گہری سانس لی اور ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے، مجھے غصہ آگیا تھا۔ لیکن زمر بی بی! مار پیٹ کے بھی مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ ایک مار ایسی ہوتی ہے جس میں درد ہوتا ہے مگر زخم نہیں بنتا اور ایسے ہی مارا تھا میں نے اسے ورنہ مار مار کر اپاہج کیسے کیا جاتا ہے یا جان کیسے لی جاتی ہے، معلوم ہے مجھے۔" وہ سرد مہری سے خفا خفا سا کہہ رہا تھا۔

"دو ہاتھ لگا دینے سے اس کا کچھ نہیں بگڑا۔ ہاں جو منہ پہ اسے مارا، اس کے لیے معذرت کر لی تھی میں نے۔ اب کیا پاؤں پڑتا؟ اور اس سعدی کو دیکھو۔ دو دن صبر نہیں ہوا۔ پیاری پھپھو کو کال کر کے سب بتا دیا۔ اور کون سی شکایتیں لگائی ہیں میری؟"

وہ برہم تھا اور خفا بھی۔ (اس لیے تو اسے نہیں دیا تھا زمر کا پرائیویٹ نمبر کہ وہ اس کی شکایتیں لگاتا پھرے۔)

زمر ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔ اسے چند لمحے لگے یہ سمجھنے میں کہ وہ دونوں دو مختلف افراد کی بات کر رہے تھے، اور جب اس نے فارس کے الفاظ پر دھیان دیا تو۔۔۔

"تم نے سعدی کو مارا؟" وہ بھوکی شیرنی کی طرح غراتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تو اور کیا پیار کرتا؟ جتنا خوار اس نے مجھے کیا اس کے بعد دو ہاتھ نہ جڑتا تو وہ اب بھی واپس نہ آتا۔"

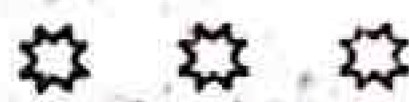
"تم نے سعدی کو۔۔۔ مارا؟" وہ بے یقین تھی۔ کون ڈاکٹر، کیسا ڈاکٹر، اسے سب بھول گیا تھا۔

"میرا خیال ہے آپ سوگ مناتی رہیں، جب تک میں کچھ کام کر لوں۔" تلخی سے کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

زمر ابھی تک شل کھڑی تھی۔ وہ غصے میں تھی اور اس کی۔۔۔۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی، وہ باہر نکل گیا تھا دروازہ زوردار آواز سے بند کر کے۔

وہ بے دم سی واپس کرسی پہ گری۔ سعدی۔ ڈاکٹر قاسم۔

فارس غازی کے بارے میں اسے سچ نہ ہی پتا چلا کرے تو زیادہ بہتر تھا۔ اس کا دماغ الجھ گیا تھا۔



ہمارے لفظوں سے نطق چھینا ہے اپنی محرومیوں نے ورنہ
سخن وروا ہم بھی اپنی بستی کے پتھروں کو زباں دیتے

ہوٹل کا ڈائننگ ہال برقی قمقموں اور جھلملاتے فانوس سے روشن تھا۔ آبدار عبید نے اس وسیع و عریض ڈائننگ ایریا کی دہلیز پہ رک کر موبائل کی اسکرین روشن کی، اور پھر میسج لکھا۔

"میں واپس آگئی ہوں، فارس! کیا ہم مل سکتے ہیں اب؟"

اور بھیج دیا۔ وہ سر پہ سرخ رومال کشمیری لڑکیوں کے انداز میں باندھ کر پیچھے کو ڈالے، سفید منی کوٹ پہنے، لیڈیز تو پیس سوٹ میں ملبوس تھی۔ پاؤں میں اونچی سلور ہیل تھی، اور کہنی پہ اٹکا ڈیزائنر بیگ جو سورج مکھی کے پھول جیسا زرد تھا۔

دور سے اس نے ہاشم کو دیکھ لیا تھا سو نزاکت سے قدم قدم چلتی وہ آگے آئی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگی ایک میز پہ موجود تھا۔ سیاہ تو پیس سوٹ، اوپری جیب سے جھلکتا سفید کارڈ، بال جیل سے پیچھے کیے، وہ ٹانگ پہ

ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پہ سکون تھا' اور لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ۔ اس نے آبی کو آتے دیکھ لیا تھا تب ہی آنکھوں میں نرم سا تاثر ابھرا' اور مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

آب دار اس کے سامنے آرکی۔ ہاشم آگے بڑھا' اس کے لیے کرسی کھینچی' پھر واپس اپنی جگہ آکر بیٹھا۔

"ہیلو گریم ریپر!" وہ مسکرا کر بیٹھی اور بیگ میز پہ رکھا۔

"ہیلو ریڈ!!"

"میں کھانا کھانے نہیں آئی' تیمارداری کرنے آئی ہوں۔ تمہاری تیمارداریاں نہیں بھولتی میں۔ کیسے ہو؟" وہ محظوظ انداز میں بولی تھی۔

وہ ہلکا سا ہنس کر سر جھٹک کر' ویٹر کو بلانے لگا۔ کھانا آنے تک وہ دونوں ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ مودب بیرے دائیں بائیں سے آکر میز پہ اشیائے طعام سجاتے گئے۔ گلاب کی پتیوں کے درمیان رکھی موم بتی کا شعلہ بھی روشن تھا۔ آب دار چہرے پر مدھم مسکراہٹ سجائے بیٹھی رہی' البتہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ مزید بے چین ہوتی جارہی تھی۔

"آج کل میں عجیب عجیب باتیں سوچنے لگا ہوں۔" وہ آگے کو ہو کر بیٹھا۔ نگاہیں کبھی موم بتی پہ جھکاتا' کبھی اٹھا کر اسے دیکھ کر بولتا۔ "فارس کے بارے میں۔" آب دار کی رنگت فق ہوئی۔ اس نے پہلو بدلا

"مجھے لگتا ہے وہ مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ جیسے وہ سعدی کے بارے میں سب جانتا ہے' جیسے سب لوگ مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔ لیکن اب مجھے پرواہ نہیں ہے۔" وہ دھیمے یاسیت بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"جب میں موو آن کرنے کا فیصلہ کرچکا تو پھر یہ باتیں میرے لیے بے معنی ہیں۔"

"یہ صرف تمہارا وہم ہے ہاشم!" وہ مضطرب سی بولی تھی۔ گود میں رکھے ہاتھ کانپے تھے۔

"سچ بھی ہو تو مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ یہ دشمنیاں' یہ سیاستیں' یہ سب پیچھے چھوڑنا چاہتا ہوں۔" وہ واقعی تکان سے کہہ رہا تھا۔

"کیا تم میری مدد کرو گی؟"

"میں... کیا کرسکتی ہوں؟" وہ جبراً" مسکرائی۔

"تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کرسکتی ہو۔" وہ آزردگی سے مسکرایا۔ نگاہیں آبی پہ جمی تھیں۔ "تم جانتی ہو کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ تم مجھے بہت عزیز ہو اور میں ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا جس میں تم نہ ہو۔ کہتے ہیں جب کوئی کسی کی جان بچاتا ہے تو اس کی زندگی اس مسیحا کی امانت بن جاتی ہے۔ تمہاری زندگی جتنی تمہاری ہے اتنی میری بھی ہے۔"

پس منظر میں بجتی دھیمے سروں کی موسیقی... موم بتی کا ٹمٹماتا شعلہ... خواب ناک زرد روشنیاں... ہر شے سے بے نیاز وہ یک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"آئی... ایم... ان لو... ود... یو۔" اس نے یہ الفاظ توڑ توڑ کر ادا کیے تھے۔ آنکھیں آبی کی آنکھوں پہ ہنوز جمی تھیں۔ "اور میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنی زندگی ایک ساتھ گزاریں۔ کسی دوسرے ملک چلے جائیں' جہاں تم کہو۔ اور ایک نئی دنیا بسائیں۔ اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تمہیں اسپرنگ ویڈنگ چاہیے یا سمر ویڈنگ؟ مگر موسم گرما سے زیادہ تاخیر میں برداشت نہیں کرسکتا۔"

چند لمحوں کی بوجھل خاموشی دونوں کے درمیان حائل ہوئی۔ آبدار ذرا آگے کو ہوئی' خشک لب گیلے کرکے آپس میں مس کیے۔ "ہاشم' میں تمہاری بہت عزت کرتی ہوں اور تمہیں بہت پسند کرتی ہوں' تم نے میری جان بچائی تھی' مگر یہ سوال... یہ پروپوزل... یہ بہت غیر متوقع ہے میرے لیے۔"

"مجھے کوئی جلدی نہیں' ریڈ۔ تم سوچ لو۔" وہ نرمی اور رسان سے کہہ رہا تھا۔ آنکھیں پل بھر کے لیے بھی آبی کی آنکھوں سے ہٹ نہیں پارہی تھیں۔ "سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلو' کچھ دن لے لو..."

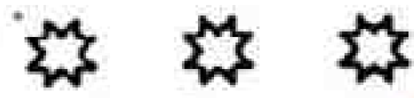
"ہاشم..." وہ بے چینی سے بولی۔ "میں نے سوچ لیا ہے۔ میں تمہاری بہت اچھی دوست ہوں اور دوست ہی رہنا چاہتی ہوں' مگر یہ سب... شادی...

رشتہ۔۔۔ نئی زندگی۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں۔۔۔"

"آب دار!" آنکھیں اس کی آنکھوں پہ مرکوز کیے، اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے نرمی سے آبی کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔ آب دار کا ہاتھ جتنا گرم تھا' اس کا اتنا ہی ٹھنڈا تھا۔

"میں نے کہا نا ہم سوچ لو' کچھ دن لے لو' آرام سے فیصلہ کرو۔۔۔ اور پھر مجھے بتاؤ کہ تمہیں اسپرنگ ویڈنگ چاہیے یا سمر ویڈنگ۔۔۔ ہوں!"

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ اس کے لہجے کی ٹھنڈ آبی کے اندر سرایت کرتی اس کے خون تک کو جما گئی۔ اس نے بے اختیار تھوک نگلا۔ وہ اب نیپکن کھولتا اس سے ہارون کا حال پوچھ رہا تھا۔ آب دار کی ساری بھوک مر گئی تھی۔



مرا یہ خون مرے دشمنوں کے سر ہو گا
میں دوستوں کی حراست میں مارا جاؤں گا

صبح کے اس پہر ایئرپورٹ کی ساری بتیاں دور سے جھلملاتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اندر لوگوں کا بے نیاز ہجوم اپنی اپنی منزل کی سمت گامزن تھا۔ ایک کاؤنٹر کے سامنے ٹوپی اور بڑھی شیو والا لڑکا کھڑا تھا جس کی آنکھوں پہ چشمہ لگا تھا۔ سامنے بیٹھا آفیسر اس سے معمول کے سوالات پوچھنے کے بعد استفسار کر رہا تھا۔

"سو آپ افغانستان سے آرہے ہیں؟"

"جی' میں سری لنکا سے افغانستان گیا تھا' چند گھنٹے وہاں قیام کیا' ایک دو دوستوں سے ملا اور پھر یہاں آگیا۔" اس نے رٹا رٹایا بیان دہرایا۔

"حیدر ہمایوں خان! ویلکم ٹو پاکستان۔" اس نے پاسپورٹ پہ مہر لگاتے ہوئے کہا۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھوں میں زخمی سا تاثر ابھرا۔

کچھ دیر بعد وہ کندھے پہ بیگ اٹھائے' قدم قدم چلتا ایئرپورٹ کے احاطے سے باہر آرہا تھا۔ جیکٹ کی زپ بند کرلی تھی اور ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال لیے تھے۔

شہر ویسا ہی تھا' ویسی ہی ٹھنڈ' ویسے ہی لوگ۔

سعدی نے چلتے چلتے چہرہ اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ تارے تھوڑے' بہت دکھائی دیتے تھے' ماحولیاتی آلودگی کی دبیز تہہ نے ستاروں کو بڑے شہروں کے آسمان سے عرصے ہوا چرا لیا تھا۔ مگر چلو۔۔۔ آسمان تو اپنا ہی تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ہوا کو محسوس کرنا چاہا۔

چند گھنٹوں کا یہ سفر بے حد اذیت ناک تھا۔ ہدایت کے مطابق وہ ڈائریکٹ آنے کے بجائے لمبے روٹ سے آیا تھا۔ ہر پل اسے لگتا تھا کہ وہ پکڑا جائے گا' مار دیا جائے گا۔۔۔ مگر پاسپورٹ گورنمنٹ ایشوڈ تھا' نقلی نہیں تھا۔ سو سفر آرام سے طے ہو گیا۔ اور اب پاک سرزمین اسے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ فارس نے فون کر کے اسے چند دن کی مہلت دی تھی اور گو کہ وہ ابھی کچھ دن مزید تنہائی میں اپنا دماغ "خالی" کرنا چاہتا تھا' لیکن اب وہ مزید بھاگ نہیں سکتا تھا۔ چیونٹی کو اپنے گھر واپس جانا ہی تھا۔

ٹیکسیاں اس کے قریب آکر رکتیں' ہارن دیتیں' سوال کرتیں' مگر وہ نظر انداز کر کے آگے بڑھتا گیا۔

دفعتاً" سڑک کنارے ایک کوڑے دان کے ساتھ ٹھہرا' جیب سے پاسپورٹ نکالا اور اس کے چار ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑا کوڑے دان میں پھینکا اور پھر آگے چلتا گیا۔ دو ٹکڑے سڑک کنارے موڑ کر اچھال دیے اور آخری ٹکڑا چند کوس دور ایک دوسرے کوڑے دان میں ڈال دیا۔ پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

چند لمحے گزرے۔۔۔ اور اس پہلے کوڑے دان کے پاس ایک شخص آکر رکا۔ رات کی تاریکی میں اس کا چہرہ اتنا واضح نہ تھا۔ کوٹ کے کالر اس نے کھڑے کر رکھے تھے۔ آنکھوں پہ سیاہ چشمہ تھا' کانوں کے گرد مفلر۔۔۔ اس نے جھک کر کوڑے دان میں ہاتھ ڈالا' پاسپورٹ نکال کر ایک پلاسٹک بیگ میں ڈالا۔ پھر آگے بڑھا۔ سڑک کنارے لگی باڑ پھلانگی۔ اس طرف سے مڑتے ہوئے دونوں ٹکڑے اٹھا کر پلاسٹک بیگ میں ڈالے۔ پھر واپس سڑک تک آیا۔ سامنے سعدی یوسف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا اور جس لمحے سعدی نے آخری ٹکڑا ایک کوڑے

دان میں اچھالا' وہ شخص ٹھہر گیا۔ یہاں تک کہ سعدی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تب وہ دبے قدموں آگے آیا' یہ ٹکڑا بھی اٹھایا اور اپنی زنبیل میں ڈالا۔

"یہ پاسپورٹ ذرا سی گوند سے واپس جوڑ کر عدالت میں سعدی یوسف کو دہشت گرد ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔" اس نے پلاسٹک کی زنبیل کو اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے خود سے کہا۔ چند لمحوں بعد سرخ مفلر سے منہ ڈھکا ہوا شخص 'دوسری سمت جاتا دکھائی دے رہا تھا۔



ان سے کہو ہم طوفانوں سے ڈرنے والے لوگ نہیں
قاتل کو مرتے دم تک قاتل ہی بولا جائے گا

جمعے کی دوپہر اس ہاؤسنگ سوسائٹی کے خوب صورت بنگلے قطار میں کھڑے نرم گرم دھوپ سینکتے دکھائی دیتے تھے۔ ایسے میں سبز بیلوں سے ڈھکے بنگلے کے برآمدے کے دروازے پہ "مور چال" کی تختی نصب تھی۔ اندر جاؤ تو لاؤنج میں گہما گہمی تھی۔ آج جمعہ تھا اور جمعہ ویسے بھی پاکستان کی ساری ندرت بہنوں کا یوم بریانی ہوتا ہے سو اس وقت کچن میں رونق لگی تھی۔ ندرت ایک طرف سیم کو برتن لگانے کا کہہ رہی تھیں تو دوسری طرف رائتہ پھینٹتی حنین کو تیز ہاتھ چلانے کا۔ زمر کھڑی سلاد کاٹ رہی تھی۔ فارس لاؤنج میں بیٹھا اپنے فون پہ لگا تھا اور بڑے ابا ٹی وی پہ خبریں دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں ڈور بیل بجی۔ ایک دفعہ ذرا سی بجی۔ باوقار انداز۔

دہی پھینٹتی حنہ کے ہاتھ تھمے۔ اس نے چہرہ اٹھا کر اطراف میں دیکھا۔ جمعہ۔۔۔ بریانی۔۔۔ ساری فیملی کا اکٹھا ہونا اور پھر ڈور بیل۔۔۔ کس کی کمی تھی؟ کس نے آنا تھا؟ حنین کے سارے وجود میں خوش گوار لہر دوڑ گئی۔ وہ ایک دم سب چھوڑ کر بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ فارس دروازہ کھولنے اٹھ گیا تھا' مگر وہ تیزی سے اس کے سامنے آئی۔

"پلیز مجھے کھولنے دیں۔" اس کی آنکھیں نم تھیں۔ فرط جذبات سے چہرہ تمتما رہا تھا۔ فارس مسکرا کر رک گیا۔ "اس نے آج ہی آنا تھا۔" حنین بھاگتی ہوئی باہر آگئی۔ پورچ کا دروازہ کھولا اور پھر گیٹ کی طرف لپکی۔ کوئی گیٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔ حنہ نے دھڑکتے دل اور مسکراتے چہرے کے ساتھ گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولا اور۔۔۔۔

حنین کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ساری دنیا ہی منجمد ہو گئی گویا برف کا اجڑا ویران صحرا بن گئی ہو۔

"ہیلو حنین!" باہر کھڑے ہاشم نے مسکرا کر کہا۔ تھری پیس گہرے سیاہ سوٹ میں ملبوس' وجیہہ چہرے والا ہاشم وہاں تنہا تھا۔ حنین کی نظریں اس کے عقب میں دوڑیں۔ پیچھے اس کی کار کھڑی تھی اور باہر چند گارڈ۔ حنین کا چہرہ بجھ گیا۔ وہ سامنے سے ہٹ گئی۔

"آیئے ہاشم بھائی!"

"تم اب مجھے ٹیکسٹ نہیں کرتیں۔ کوئی ناراضی ہے کیا؟" وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتا اندر داخل ہوا۔ وہ ملے جلے جذبات میں گھری اس کے ساتھ چلتی آئی۔

"آپ مصروف ہوتی ہوں بہت۔ آپ اس دنیا میں موجود ہیں' یہ تک بھول جاتا ہے۔" برآمدے کے اسٹیپس چڑھتے ــــــ ہاشم نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

"میری موجودگی کسی کو نہیں بھولتی۔" پھر اسٹیپ پہ چڑھا۔ آگے بند دروازہ تھا اور اس پہ نصب تختی۔

"مور چال؟" اس نے زیر لب پڑھا۔

"چیونٹی کا گھر۔" حنین بولی۔ ہاشم نے انگلی سے تختی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ڈھیلی ہے' مضبوطی سے جمی نہیں' ذرا سی ٹھوکر سے گر جائے گی۔ اندر بتانے آیا ہوں۔" شائستگی سے کہتے ہوئے وہ وہیں کھڑا ہو گیا۔ حنین تیزی سے اندر آئی۔ (دروازہ اس کے منہ پہ بند کر دیا۔)

"ہاشم۔۔۔ ہاشم بھائی آئے ہیں۔" لاؤنج میں پہنچ کر اس نے پھولے سانس کے ساتھ اطلاع دی۔ لمحے بھر میں تمام حرکات رک گئیں' آوازیں بند ہو گئیں۔ زمر اور ندرت کچن سے نکل آئیں۔ ابا' فارس اسے دیکھنے لگے۔ سب سے پہلے زمر کو ہوش آیا۔

"ٹھیک ہے' وہ ہمارا مہمان ہے۔ فارس' تم اسے اندر لاؤ۔ ڈائننگ ہال میں۔ ہم کھانا لگاتے ہیں۔" وہ تیز تیز ہدایات دیتے ہوئے بولی۔ "حنہ' سیم بھابھی' ابا سب سن لیں' کوئی کچھ ظاہر نہیں کرے گا۔ پہلے کی طرح نارمل رہیں گے سب۔ اوکے؟"

آنکھیں دکھا کر سختی سے تنبیہہ کی۔ سب متفق تھے۔ فارس منہ میں کچھ چباتا بے نیازی سے اٹھا۔ (گویا کچھ سنا ہی نہ ہو) اور باہر چلا گیا۔

چند لمحوں بعد تمام گھر والے طویل ڈائننگ ٹیبل کے گرد کرسیاں سنبھال رہے تھے جب فارس ہاشم کو لیے چلتا ہوا اس طرف آیا۔ ہاشم مسکرا کر سب سے ملا۔ حال احوال دریافت کرتے ہوئے کرسی کھینچی۔ ابا کی سربراہی کرسی کے بائیں طرف۔ اس کے مقابل فارس بیٹھا تھا۔ ہاشم کے برعکس وہ رف سے سوئیٹر اور جینز میں ملبوس تھا۔ کرسی کھینچتے ہوئے بھی موبائل پہ کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔

"میں غلط وقت پہ آگیا شاید۔" وہ سب کو دیکھتے ہوئے بولا۔ سب خاموش رہے۔ ندرت اس کو دیکھنا نہیں چاہتی تھیں' سو برتن درست کرتی رہیں۔ حنین سر جھکائے نیپکن جوڑتی رہی۔ زمر لبوں پہ مسکراہٹ سجائے بیٹھی رہی۔ ابا کے تاثرات بھی تنے ہوئے تھے۔

"نہیں' ایسا کس نے کہا؟" فارس نے کندھے اچکائے اور بریانی کی بھاپ اڑاتی اشتہا انگیز مہک والی ڈش اٹھا کر سامنے رکھی۔ وہ چہرے سے سنجیدہ اور قدرے بے نیاز لگتا تھا۔

"بہت دن سے آنا چاہ رہا تھا... آج ہی وقت نکال پایا۔" ہاشم چمچہ کانٹا سنبھالتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگا۔ "آپ لوگ ٹینس لگ رہے ہیں۔ خیریت ہے؟" زمر کا دل زور کا دھڑکا۔ جلدی سے مسکرا کر کہنے لگی۔

"نہیں۔ دراصل آپ کی طبیعت کا سنا تھا تو..." مگر فارس اس سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"ٹینس کوئی نہیں ہے۔ بس سب کو علم ہو گیا ہے کہ تم نے میری بیوی اور بھائی کو مارا تھا اور آف کورس سعدی کو بھی زخمی' اغوا' واٹ ایور' وہ سب کروایا تھا۔ رائتہ؟"

کہتے ہوئے اس نے رائتے کا ڈونگا ہاشم کے سامنے رکھا۔ سب ایک دم بے یقینی سے فارس کو دیکھنے لگے۔ زمر تو بالکل شل رہ گئی۔

صرف ایک شخص نے جیسے کوئی اثر ہی نہیں لیا اور وہ ہاشم تھا۔ اس کا چہرہ ویسے ہی مسکراتا رہا اور نظریں فارس پہ جمی رہیں۔ پھر اس نے سر کو ذرا سا خم دیا۔

"ظاہر ہے۔" کہتے ہوئے چاول پلیٹ میں نکالے' ذرا سا رائتہ اوپر ڈالا۔ سب کے سانس رکے ہوئے تھے۔ پھر ہاشم نے چہرہ اٹھایا تو اس پہ مغموم سا تاثر تھا۔ آنکھوں میں سادگی تھی۔

"میں جانتا ہوں میں نے اچھا نہیں کیا۔" آواز میں افسوس تھا۔

"سب جانتے ہیں۔" فارس نے اسی بے نیازی سے کندھے اچکائے' موبائل ایک طرف دھرا اور اپنی پلیٹ میں چاول نکالنے لگا۔

"انسان بہت سے کام کرتا ہے' جو اسے نہیں کرنا چاہئیں۔ میں نے بھی غلطیاں کی ہیں' گناہ کیے ہیں۔ وارث کو..." رک کر سلاد کے باؤل سے چند کھیرے اپنے پلیٹر میں نکالے۔ "میں نہیں مارنا چاہتا تھا' مگر خاور مجبور ہو گیا تھا۔ آئی ایم سوری فار دیٹ۔"

چاولوں کا چمچہ منہ میں رکھا' نوالہ چبایا' پھر ندرت کو دیکھا جو اسے گلابی پڑتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔

"آپ واقعی بہترین شیف ہیں۔ خیر۔" فارس کی طرف نظریں پھیریں۔ "پور زرتاشہ...؟ وہ کولیٹرل ڈیمیج بن گئی' اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں اور مسز زمر کے لیے بھی واقعی افسوس ہے...."

زمر سلگتی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔ اس کا تنفس تیز ہو رہا تھا۔

فارس نے چاولوں میں چمچہ چلاتے ہوئے کندھے جھٹکے۔ "یقیناً" ایسا ہی ہوا ہوگا۔"

"رہا سعدی تو مجھے اس پہ حملے کا علم نہیں تھا' ہاں جب پتا چلا تو میں نے اس کو محفوظ جگہ بھجوا دیا' اس کا

خیال رکھا' وہ بھی اتنا ہی ناراض ہے جتنا کہ آپ لوگ' مگر یہ آپ سب کا حق ہے۔ وہ بہت جلد واپس آجائے گا اور پھر ظاہر ہے وہ میرے خلاف کورٹ میں جانا چاہے گا۔"

"حالانکہ میں نے اسے منع کیا تھا' ابھی جب میں کینڈی میں اس سے ملا تھا۔" فارس نے پلیٹ میں چمچہ چلاتے ہوئے نظریں اٹھا کر ہاشم کو دیکھتے ہوئے بتایا۔ "مگر وہ اپنی بات پہ اڑا ہوا تھا' سو میرا خیال ہے' ہاں' وہ کورٹ جائے گا۔"

"اس کا حق ہے۔" ہاشم نے گہری سانس لی۔ وہ دونوں یوں گفتگو کر رہے تھے جیسے دوسرا کوئی وہاں موجود ہی نہ ہو۔ "مگر میں اپنے کسی گناہ کو جسٹی فائی نہیں کروں گا۔ آپ مجھے کورٹ میں لے جانا چاہیں' لے جائیں۔ میں سزا بھگتنے کے لیے بھی تیار ہوں' لیکن......"

اس نے رک کر ایک اور چمچہ منہ میں رکھا اور چاول چبائے۔ سب سانس روکے اسے دیکھ رہے تھے۔

"اس سے ہم دونوں خاندانوں کا نقصان ہی نقصان ہوگا۔ آپ اچھے لوگ ہیں۔ میں بھی اب پہلے جیسا نہیں رہا' خود کو بدل رہا ہوں' موو آن کر رہا ہوں' میں چاہوں گا کہ آپ لوگ مجھے معاف کر دیں' میں نے اپنے کیے کی بہت سزا بھگت لی ہے۔ ساری زندگی بھگتوں گا' مگر انتقام اور انصاف کی نئی جنگ لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ لوگوں نے میری وجہ سے بہت مشکلات جھیلی ہیں' میں نہیں چاہتا کہ آپ مزید دکھ اٹھائیں۔"

پلیٹ پرے کھسکائی تو فارس نے اشارہ کیا۔ "اور لو نا۔"

"نہیں تھینکس' میں ڈائٹ پہ ہوں۔ بہرحال' میں ایک دفعہ پھر معذرت کرتا ہوں' میں نے اسی لیے سعدی یوسف فاؤنڈیشن بنائی ہے' تاکہ مزید کسی اور خاندان کو اس سب سے نہ گزرنا پڑے۔ آگے آپ لوگ جو بھی کرنا چاہیں' آپ کی مرضی۔" نیپکن اٹھا کر ہاتھ صاف کیے۔ "میری طرف سے آپ آزاد ہیں' معاف کریں یا سزا دیں۔ میں پرانی باتوں اور حسابوں میں اب نہیں پڑنا چاہتا۔ میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ کیونکہ میں اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ تھینک یو۔"

"شیور۔ ویلکم!" ہاشم کھڑا ہوا تو فارس بھی کھڑا ہوا۔ ہاشم نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"مجھے کام ہیں کچھ' اب چلتا ہوں۔"

فارس نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سر کو خم دیا۔ "میں سعدی کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کروں گا ہاشم! مگر کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔"

ہاشم الوداعی کلمات کہہ کر مڑ گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

بریانی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور گرم جذبات ابل رہے تھے۔ ڈائننگ ہال میں سب کو سانپ سونگھا ہوا تھا۔ سب شل تھے۔ ندرت بدقت بول پائیں۔

"وہ اپنے کیے پہ شرمندہ ہے!!"

"تم نے... اسے کیوں بتایا؟" زمر نے ہکلاتے ہوئے فارس کی طرف رخ پھیرا۔ وہ بے یقین تھی۔

"وہ ادریس اور میرے بارے میں پتا کروا رہا تھا' اس کو شک تھا' میں نے کنفرم کر دیا۔" وہ اسی رغبت سے چاول کھا رہا تھا۔

"انہوں نے ہم سے معافی مانگی۔" حنہ بھی بے یقین تھی' متحیر تھی۔

"پتا نہیں۔" ابا تلخی سے بولے۔ یک دم باہر کسی شے کے گرنے کی آواز آئی۔ حنہ ایک دم اٹھ کر باہر بھاگی۔

دروازہ کھلا تھا اور پورچ کے ماربل کے فرش پہ دروازے کی تختی گری پڑی تھی۔ وہ اتنی زور سے دے ماری گئی تھی کہ دو ٹکڑوں میں ٹوٹ گئی تھی۔ بند گیٹ کے باہر گاڑیوں کے زن سے گزر جانے کی آواز سنائی دی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا وہ معافی کیوں مانگ رہا تھا اور تم اس سے یہ کس طرح بات کر رہے تھے؟" اندر زمر ہنوز گومگو سی بول رہی تھی۔

"وہ معافی نہیں مانگ رہا تھا زمر! وہ ہم سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ وہ ہمیشہ ہی تیار ہوتا ہے زمر! وہ اچھا آدمی نہیں ہے مگر وہ ایک عظیم آدمی ہے مگر اس کو صرف ایک بات نہیں معلوم کہ اس دفعہ......" کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے فارس مسکرا کر بولا تھا۔ "میں بھی تیار ہوں۔"

اپنے آفس کی عمارت کی بالائی منزل کی راہداری میں تیز تیز چلتے ہاشم نے ٹائی ڈھیلی کی۔ اس کا چہرہ فرطِ جذبات سے تمتما رہا تھا۔ دو آدمی اس کے ساتھ چل رہے تھے اور مسلسل اس کی رفتار سے ملنے کی کوشش میں لگے تھے۔ اپنی کرسیوں اور کیبن میں کام کرتے ورکرز رک رک کر اس کو دیکھنے لگے تھے۔ ٹھوکر سے اس نے نوشیرواں کے آفس کا دروازہ کھولا۔

"وہ مجھے چیک کر رہا تھا کہ میرا غصہ کیسا ہے؟ کہ میں وہ پہلے والا انسان ہوں یا نہیں۔" سامنے میز کے پیچھے نوشیرواں بیٹھا، موبائل پہ لگا تھا۔ آواز پہ ناگواری سے چہرہ اٹھایا۔ ہاشم کسی وحشی جانور کی طرح اس کی طرف لپکا اور اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا، پھر یکے بعد دیگرے دو تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیے۔

"کیا بکواس کی تھی میں نے؟ سعدی یوسف کو مت چھیڑو۔ مجھے سنبھالنے دو۔" تیسرا تھپڑ اسے مارتے ہوئے وہ چلایا تھا۔

"وہ جانچ رہا تھا کہ ہم کتنا جانتے ہیں۔ پرکھ رہا تھا کہ ہم کتنے اہل ہیں۔ محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے اعصاب کتنے مضبوط ہیں۔"

ہاشم نے ہکابکا سے کھڑے شیرو کو پرے دھکیلا اور غصے سے حلق کے بل چلایا۔ "میری زندگی برباد کر دی تم نے۔ ہم سب کو برباد کر دیا۔ میری برسوں کی ساکھ... عزت... سب برباد ہو جائے گا۔"

"اور وہ کہہ رہا تھا کہ وہ سب سمجھ گیا ہے۔ وہ پہلے جیسا آدمی نہیں ہے جو ہمارے ہاتھوں بے وقوف بن جائے گا۔"

نوشیرواں منہ پہ ہاتھ رکھے، حق دق شل سا کھڑا تھا۔ ہاشم ایک دم آگے بڑھا اور اس کے میز کی ساری چیزیں زور سے ہاتھ مار کر نیچے گرا دیں۔

"وہ پنچ گھٹیا لوگ جن کو میں اپنے برابر کرسی پہ بھی نہ بٹھاؤں، وہ سب جانتے ہیں۔ سنا تم نے؟ جس زمر کو تم اس آفس میں لاتے تھے، وہ سب جانتی ہے۔ اور تمہاری وجہ سے میں ان کے ہاتھوں دھوکا کھا گیا۔ تمہاری وجہ سے ان کو اتنی مہلت مل گئی کہ وہ تیاری کر لیں۔" خون آشام آنکھیں نوشیرواں پہ گاڑے، وہ غرا رہا تھا۔ پھر اس نے کوٹ اتار کر پرے پھینکا۔

"اور وہ کہہ رہا تھا کہ ہم اس کے ساتھ جنگ کر کے اس کا نقصان نہیں کریں گے، اپنا نقصان کریں گے۔ میں متفق ہوں ویسے اس بات سے مگر چونکہ سعدی سے وعدہ کیا ہے، تو پھر... نبھانا ہو گا۔"

جواہرات تیزی سے آفس میں داخل ہوئی تو اندر کا منظر دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی۔ بکھری ٹوٹی چیزیں، منہ پہ ہاتھ رکھے کھڑا نوشیرواں اور شرٹ کی آستینیں چڑھاتا، غصے سے چیخ چیخ کر اسے گالیاں دیتا ہاشم۔

"میرا پاور پلانٹ تباہ ہوا ہے چند دن پہلے... میں ایک اور اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتا تھا مگر تھینکس ٹو نوشیرواں کاردار... آدھا مرد نوشیرواں کاردار... اس نے میرا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔"

جواہرات کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ "ہاشم کیا ہوا ہے؟"

"فارس جانتا ہے۔ وہ سب جانتا ہے۔ ہمیشہ سے جانتا تھا اور وہ لوگ ہمارے خلاف کورٹ جا رہے ہیں۔" جواہرات کا سانس تھم گیا تھا۔

"اور وہ کہہ رہا تھا کہ وہ موو آن کرنے کے لیے تیار ہے۔ وہ اگلے ہر مرحلے کے لیے تیار ہے... وہ ہر شے کو سنبھالنے کے لیے تیار ہے۔"

"او گاڈ ہاشم!" جواہرات پریشانی سے اس کے قریب آئی۔ "اب کیا ہو گا؟"

"کیا مطلب کیا ہو گا؟ میں... میں ہاشم کاردار ہوں۔ یہ میری زندگی کی پہلی جنگ نہیں ہے ممی۔ میں اس پورے خاندان کو تباہ کر دوں گا۔ وہ ایک ایک پیسے کے محتاج ہو کر چوبیس گھنٹوں میں سڑک پہ آ جائیں

گے۔۔۔ میں۔۔۔ تیار۔۔۔ ہوں۔" نفرت اور تلخی سے چبا چبا کر کہتے اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اونچی آواز میں رئیس سمیت دوسرے افراد کو اندر آنے کا کہنے لگا۔۔۔ افراتفری۔۔۔ چیخ پکار۔۔۔ بھگدڑ۔۔۔ پورے آفس میں گویا قیامت آگئی تھی۔

☆ ☆ ☆

عداوتوں کے عذاب سورج نے اتنی مہلت نہ دی کہ محسن
ہم اپنی جلتی زمیں کے سر پہ کوئی بگولہ ہی تان دیتے

جمعے کی اس دوپہر یوں لگتا تھا گویا برفیلے بادلوں کی تہہ پگھل کر فضا میں غائب ہوگئی ہو' اور کہیں اچانک سے سنہری سورج آسمان پہ نمودار ہوتا پورے شہر کو سونے کا خول چڑھا گیا ہو۔

اپنے آفس کے کھلے دروازے پہ ہاشم اسی طرح ڈھیلی ٹائی اور چڑھی ہوئی آستینوں کے ساتھ کھڑا چند افراد کو اندر جانے کا راستہ دے رہا تھا۔ آخری داخل ہونے والے صاحب ہارون عبید تھے۔ ان کے پیچھے احمر آنے لگا تو۔۔۔

"تم ابھی اسی وقت فائرڈ ہو۔" رعونت سے انگلی سے دفع ہوجانے کا اشارہ کیا۔

احمر ساکت رہ گیا۔ "مگر سر۔۔۔"

"تم فارس کے دوست ہو' مجھے اعتبار نہیں رہا تم پر اور اس وقت میرا اعتبار تم کما نہیں سکتے۔۔۔ سو۔۔۔ آؤٹ!" ہاشم غصے سے کہہ کر اس کے منہ پہ دروازہ بند کرکے اندر آیا۔ جواہرات اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑی نظر آرہی تھی اور ناگواری سے سامنے بیٹھے ہارون کو دیکھ رہی تھی۔ پھر ہاشم کو دیکھا۔

"ہارون کو کیوں لائے ہو؟ تاکہ یہ خوش ہوجائیں؟" "ان کی وجہ سے ہمارا پاور پلانٹ تباہ ہوا ہے ہاشم!"

"ہمیں اس وقت ایک ہونا ہے ممی' اپنی سیاستیں بعد میں کیجیے گا۔" وہ سرد مہری سے کہہ کر آگے آیا۔ ہارون کافی محظوظ ہوتے نشست سنبھال چکے تھے۔ باقی لوگ ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ نوشیرواں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ آج ہاشم نے بھی وہی گالی دی تھی مگر وہ اسے تین گولیاں نہیں مار سکتا تھا۔ تو چوائس ہمیشہ انسان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

"وہ سکینڈل کو اس کے شروع ہونے سے پہلے کچلا جاتا ہے۔ اور ہم سب کو مل کر اسے کچلنا ہوگا۔ میں ہاشم کاردار ہوں' اور یہ اسکینڈلز میرا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے' ہاں اگر میں ڈوبا' تو تم سب بھی میرے ساتھ ڈوبو گے۔" اپنی سیٹ کے پیچھے کھڑے وہ ماتھے پہ تیوریاں ڈالے بلند مگر آہنی آواز کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"ایک گھنٹے کے اندر اندر۔" وہ اپنی سیٹ کے پیچھے کھڑا تحکم سے کہہ رہا تھا۔ "ان لوگوں کو ہم پائی پائی کا محتاج کردیں گے۔ ان کے پاس مہینے بھر زندہ رہنے کا خرچا بھی نہیں ہوگا۔" پھر اس نے فون اٹھایا اور کان سے لگایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فون پر کہہ رہا تھا۔

"چند آئی ڈی کارڈز کی کاپیز بھیج رہا ہوں قدیر صاحب۔ یوسف خاندان کے ان آئی ڈی کارڈز سے وابستہ تمام بینک اکاؤنٹس فریز کردیے جانے چاہئیں۔۔۔ آپ کے پاس ایک گھنٹہ ہے۔"

"جب ان کے سارے اثاثے منجمد کردیے جائیں گے تو ان کے پاس ہم سے لڑنے کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔ ان کو اپنی فکر پڑجائے گی۔" ہارون نے تائیدی انداز میں سرہلایا تھا۔ جواہرات "ہوں" کہہ کر رہ گئی۔

"مجھے اس ملک میں۔۔۔" ہاشم اب رئیس سے کہہ رہا تھا۔ "ان کی ایک ایک زمین' پلاٹ' مکان سب کا حساب چاہیے۔ یہ گھر جس میں وہ رہ رہے ہیں' ہارون! تم اس کے مالک سے رابطہ کرو' ہم ابھی اسی وقت اس کو خرید رہے ہیں۔ شام تک ان کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا جانا چاہیے۔ اور تم!" سامنے کھڑے تین افراد کی طرف متوجہ ہوا' جو اس کی ہدایت کے منتظر تھے۔

"اپنے سارے آدمی لے جاؤ۔۔۔ شہر کے بدترین فراری مجرم جو کسی سے نہ ڈرتے ہوں۔۔۔ کوئی پولیس'

کوئی چیک پوسٹ، تمہیں آج کے دن کوئی نہیں روکے گا۔ ان کے گھر کے باہر جا کر اپنی گاڑیاں روکو، اور گولیاں چلا چلا کر ان کی دیواروں کو چھلنی کر دو، سارے شیشے توڑ دو۔ جب متوقع خوف و ہراس پھیل جائے تو واپس آجانا۔"

آفس میں ہر کوئی اپنے کام میں لگ گیا تھا۔ ہارون فون کرنے باہر چلے گئے تھے، ہاشم بھی موبائل پہ مصروف تھا۔ ایک نوشیرواں تھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ بالکل چپ۔

"بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے..." ہارون نے اپنی جگہ پہ دوبارہ بیٹھتے ہوئے ہاشم کو مخاطب کیا۔ "ان کے نام پہ کوئی پراپرٹی نہیں بچی۔ کوئی اثاثہ ایسا نہیں ہے جس پر قبضہ کر کے ہم ان کی کمر توڑ سکیں۔ واحد بچی ہوئی پراپرٹی اس نے آپ کو ہی فروخت کی تھی۔ وہ انیکسی جس کی مالیت کے کروڑوں روپے فارس غازی کے کسی اکاؤنٹ میں پڑے ہوں گے اس وقت۔" محظوظ انداز میں جواہرات کو دیکھا، جو پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔

"میں نے اپنی انا کے پیچھے وہ انیکسی خرید لی، مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ میری ہی رقم سے ہمارے خلاف کیس لڑے گا۔"

"اور وہ گھر؟" ہاشم نے تیزی سے بات کاٹی۔ "وہ کس کے نام ہے؟"

"وہ چند دن پہلے ان خاتون سیاست دان نے خریدا ہے جن کو بدنام کرنے میں تمہاری ماں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ہم اس عورت سے وہ گھر نہیں خرید سکتے۔ ہم اس سے بات بھی نہیں کر سکتے۔" وہ گہری سانس لے کر کہہ رہے تھے اور ہاشم نے غصے سے میز پہ رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر دیوار پہ دے مارا۔ کانچ کے ٹکڑے فرش پر جا گرے۔ سب خاموش ہو گئے۔ پھر وہ فون اٹھاتے ہوئے بولا۔

"لیکن وہ اس رقم کو استعمال نہیں کر سکیں گے۔ جب ان کے بینک اکاؤنٹس فریز ہو جائیں گے تو وہ اس رقم سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔" دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔ ہاشم کے چہرے پہ جوش تھا۔ امید تھی۔

"جی قدیر صاحب! کام ہو گیا؟" رابطہ ہوتے ہی وہ تیزی سے بولا۔ "گڈ۔" وہ مسکرایا۔ "تو ان کے تمام اکاؤنٹس فریز ہو گئے۔ ویری گڈ۔"

اس نے وکٹری کی دو انگلیاں بنا کر اوپر اٹھائیں۔

جواہرات نے سکون کی پہلی سانس خارج کی۔

"یعنی اب وہ ان بینک اکاؤنٹس سے کچھ نہیں لے سکتے۔ زبردست۔ ویسے اندازاً" کتنا سرمایہ فریز ہوا ہو گا؟" اور پھر اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ "دو ہزار سینتیس روپے؟ آپ مذاق کر رہے ہیں؟"

ہاتھ کے اشارے سے باقی لوگوں کو خاموش ہونے کو کہا۔ آفس میں سناٹا چھا گیا۔

"کیا مطلب ان کے اکاؤنٹس خالی کیوں ہیں؟ پچھلے ایک ماہ میں انہوں نے اپنا تمام سرمایہ کہاں منتقل کر دیا ہے؟"

اب کی دفعہ اس نے فون آہستہ سے پرے ڈالا تھا۔

"فارس اپنی تمام رقم کہیں اور منتقل کر چکا ہے اور ہم ٹریس نہیں کر پا رہے کہ کدھر۔"

"سر... پلیز یہ دیکھیں۔" حلیمہ تیزی سے آفس میں داخل ہوئی اور اس سے پہلے کہ ہاشم اس کو جھلا کر باہر جانے کو کہتا، اس نے ایک ٹیب میز پہ رکھا۔

اسکرین پہ موجود چہرہ دیکھ کر ہاشم چونک کر سیدھا ہوا۔

"میرا نام ہے سعدی یوسف!" وہ سڑک کنارے چلتے ہوئے سیلفی کیمرے سے اپنے چہرے کی ویڈیو بناتا تلخی سے کہہ رہا تھا۔ "مجھے آٹھ ماہ تک سری لنکا کے شہر کولمبو کے ہوٹل (نام لے کر) کے تہہ خانے میں قید رکھنے والے کاردار خاندان اور ہارون عبید کو میں یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ میں... واپس آگیا ہوں، اور میں خاموش نہیں بیٹھوں گا۔ میں عدالت میں جا کر بتاؤں گا کہ مجھے گولیاں مارنے والا نوشیرواں کاردار تھا۔ مجھے اغوا کر کے حبس بے جا میں رکھنے اور نیس کام پراجیکٹس کے حساس راز پوچھنے کے لیے تشدد کرنے والے مشہور زمانہ IPPs ہارون عبید اور ہاشم کاردار تھے۔" وہ چلتے چلتے پورے اعتماد سے بولتا

جارہا تھا۔ چہرے پر سختی اور آنکھوں میں تپش تھی۔ "اور اگر مجھے قتل کردیا گیا یا غائب کردیا گیا تو ہاشم کاردار اور ہارون عبید کو پکڑا جائے۔ کیونکہ...." ویڈیو کافی لمبی تھی۔ سنسنی خیز بھی تھی۔ جہاں ہاشم کے چہرے کا تناؤ بڑھتا جارہا تھا وہاں ہارون کی مسکراہٹ بالکل غائب ہوگئی تھی اور وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ اپنے نام پر چہرے کی رنگت اڑ گئی تھی۔ جواہرات بالآخر ہلکی سی مسکرائی تھی۔ جلتے دل پہ پھوار پڑی تھی۔

نوشیرواں جو اس سارے عرصے میں سر جھکائے بیٹھا تھا' ایک دم کھڑا ہوا۔ وہ موبائل پہ کچھ دیکھ رہا تھا۔

"بھائی.... لوگ اس ویڈیو کے نیچے میری تصویریں پوسٹ کررہے ہیں۔ میری بھی کوئی پرائیویسی ہے۔ یہ سب مجھے بدنام کررہے ہیں۔" اس کا چہرہ فق تھا اور اس پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پھر وہ لپک کر ہاشم کے پاس آیا۔ "مجھے اس سب سے نکالیں بھائی! پلیز کچھ کریں۔" اس کے چہرے پر التجا تھی۔ ساری ہٹ دھرمی' وہ پورا مرد بننے کا زعم' سب غائب تھا اور وہ بوکھلا ہوا لگتا تھا۔

ہاشم نے ایک قہر آلود نظر اس پہ ڈالی۔ "ہاں' ایک اسی کام کے لیے تو ہے تمہارا بھائی۔ مگر بے فکر رہو' ہر دفعہ کی طرح تمہارا پھیلایا ہوا گند میں صاف کرلوں گا۔" اور فون اٹھا کر ان افراد کو کال کرنے لگا جو اس نے فارس کے گھر کی طرف روانہ کیے تھے۔

"ان کے گھر کے سارے شیشے توڑ ڈالو۔ انہوں نے ویڈیو بنا کر ہمیں بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اتنی گولیاں برسانا کہ ان کی دیواریں چھلنی ہوجائیں۔" وہ از سر نو تاکید کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔



میں کھا کر ٹھوکر ابھی تک حوصلہ مند ہوں
یہ ٹھوکر جو تمہیں لگتی تو تم خود بکھر جاتے

فروری کی وہ گرم دوپہر اب بنگلے کی سبز بیلوں کو بھی جھلسائے جارہی تھی۔ لاؤنج کی کھڑکی کا بیرونی شیشہ سنہری روشنی کو منعکس کرتا چمک رہا تھا۔ اس گرم شیشے پہ تم اپنا ماتھا ٹکا کر اندر جھانکو تو ڈائننگ ٹیبل سے سب اٹھ کر اب لاؤنج میں آبیٹھے تھے۔ ندرت اپنے کمرے میں جاچکی تھیں۔ ابا فکر مندی سے کبھی فارس کو دیکھتے جو ٹانگ پہ ٹانگ جمائے پرسکون سا بیٹھا تھا' اور کبھی زمر کو جو بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ حنین اور سیم سامنے صوفے پر خاموش مگر مضطرب بیٹھے تھے۔

"سعدی کو گھر آجانا چاہیے تھا' وہ کیوں نہیں آیا؟" زمر کو بے بس سا غصہ آنے لگا تھا۔ "ہاشم سعدی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔"

"اوں ہوں۔ یہ وہ پہلا کام نہیں ہے جو وہ کرے گا۔" فارس نے سیل فون سے چہرہ اٹھا کر نفی میں سر ہلا کر کہا۔ زمر رک کر اسے دیکھنے لگی۔ سب اسے دیکھنے لگے۔

"پھر وہ کیا کرے گا؟"

"فارس نے ٹانگ پر سے ٹانگ ہٹائی اور ذرا آرام دہ انداز میں بیٹھ کر اور موبائل دونوں ہاتھوں میں پکڑے' ٹائپ کرتے ہوئے بولا۔

"وہ سب سے پہلے اپنے سب سے قابل اعتبار ملازموں اور دوستوں کو اکٹھا کرے گا اور جن پہ اعتبار نہیں ان کو نکال دے گا۔ احمر شفیع کی تو آج ہوئی چھٹی۔"

"اچھا۔ پھر؟" حنین نے دلچسپی سے پوچھا۔

"پھر یہ کہ وہ اپنے اتحادیوں اور خود اپنے آپ کو یہ بتائے گا کہ وہ ہارا نہیں ہے۔ ایک لمبی تقریر کرے گا۔ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ میں اس کے موقعوں سے بھی واقف ہوں۔ وہ وہی کام کرے گا جو وہ ہمیشہ ایسے موقعوں پہ کرتا آیا ہے دوسرے لوگوں کے ساتھ۔"

"ظاہر ہے' کزن کس کا ہے۔" زمر کلس کر بولی تھی۔ فارس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا' پھر سر کو تائیدی انداز میں خم دیا۔

"پھر وہ اپنے ملازموں کو حکم دے گا کہ یوسف خاندان کی ایک گھنٹے کے اندر اندر کمر توڑ دی جائے۔" فارس کے الفاظ پہ حنین کی آنکھیں پھیلیں۔

زمر بھی سیدھی ہوئی۔ "مگر کیسے فارس؟"
"وہ ہمارے بینک اکاؤنٹس فریز کروادے گا۔ اس کے اسٹیٹ بینک میں جتنے دوست ہیں' اتنے ہمارے پوری دنیا میں رشتے دار نہیں ہیں۔" وہ موبائل پر ہاتھ چلاتے ہوئے عام سے انداز میں بتا رہا تھا۔
"ہمارے بینک اکاؤنٹس؟" زمر بے دم سی ہو کر صوفے پر گری۔ "میری ساری سیونگز' ابا کے پیسے' سب بینک میں ہے۔ میں اتنی جلدی کیسے نکلواؤں گی سب؟"
"خیر اب تک وہ انہیں فریز کر چکے ہوں گے۔" فارس نے شانے اچکائے۔ زمر کی رنگت زرد پڑنے لگی۔ فارس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔
"ویسے تو زمر بی بی! آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتیں' مگر تھوڑی بہت عقل ہے مجھ میں۔ میں نے ہمارا سارا پیسہ کچھ عرصہ قبل چند آف شور بینک اکاؤنٹس میں منتقل کر دیا ہے۔ وہ اس کو ٹریس بھی نہیں کر سکتے۔" زمر کو اچنبھا ہوا۔
"مگر تم میرے بینک اکاؤنٹ کو کیسے آپریٹ کر سکتے ہو؟ تمہیں میری پن تک معلوم نہیں۔" فارس نے اثبات میں سر کو خم دیا۔
"بالکل' آپ کی پن جو آپ کی ڈیٹ آف برتھ ہے' وہ مجھے قطعاً "معلوم نہیں۔"
حنین نے مسکراہٹ چھپانے کو چہرہ جھکا لیا اور ابا نے ہنسی روکنے کو چہرہ موڑ لیا۔ البتہ سیم کے دانت نکل آئے تھے۔ زمر کے گال گلابی پڑے۔ تندی سے فارس کو دیکھا کر بولی۔ "مجھے اپنی ایک ایک پائی واپس چاہیے۔ اچھا!"
"خیر ماموں' اکاؤنٹس فریز کرنے کی ناکام کوشش کے بعد وہ کیا کرے گا؟" حنہ نے موضوع بدلنا چاہا۔
"وہ ہمیں ہمارے گھر سے بے دخل کر کے سڑک پر لانے کی کوشش کرے گا۔"
"وہ کیسے؟"
"وہ ہمارا گھر خریدنا چاہیں گے؟"
"ہمارا گھر؟ اگر انہوں نے گھر خرید لیا تو ہم کہاں جائیں گے؟" زمر پھر سے پریشان ہونے لگی۔ وہ جتنا خود کو پرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کرتی' اتنی مضطرب ہوتی جا رہی تھی۔ جواب میں سب نے خاموشی سے فارس کو دیکھا جو اپنے سیل فون کو دیکھ رہا تھا۔
"ہم یہیں رہیں گے کیونکہ میں یہ گھر ایک ایسی شخصیت کے ہاتھوں فروخت کروا چکا جن سے وہ بات تک نہیں کر سکتے فی الحال۔" اور ساتھ ہی ان خاتون کا نام بتایا۔ جس طرح وہ اطلاعات دے رہا تھا' اور سیم اور حنین دبی دبی مسکراہٹوں کے ساتھ چہرہ جھکا لیتے تھے' چڑیل کا خون کھول رہا تھا۔
"خیر' تمہارا وہ ڈیئر کزن جو تمہاری وجہ سے ہم سب کے سروں پہ مسلط ہوا ہے' وہ اس کے بعد کیا کرے گا تمہارے خیال میں؟ تم تو ان کا ذہن بھی پڑھ سکتے ہو نا۔ آخر ہو تو تم بھی آدھے کاردار۔" فارس نے سر کو تعریف وصولی کے انداز میں خم دیا۔
"تھوڑی دیر انتظار کیجیے۔" اور زیادہ دیر نہیں گزری تھی جب فارس نے چہرہ اٹھایا' یوں جیسے کوئی آہٹ سننا چاہ رہا ہو۔
"آ گئے۔" اس نے محظوظ انداز میں کہا۔ پھر سب کی منتظر صورتیں دیکھ کر بولا۔ "کرائے کے غنڈے ہمارے گھر پر فائرنگ کرنے آ گئے۔"
"تو پولیس کو کال کرو فارس۔" وہ مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ "وہ لوگ ہمارے گھر پر حملہ کریں گے تو ہمیں حفاظت چاہیے ہو گی۔"
"حفاظت کا بندوبست آپ کا یہ بے کار' جیل یافتہ' دو لوگوں کا قاتل شوہر پہلے ہی کر چکا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس آپ جیسی تیز زبان ہے نہ ذہانت و فطانت۔" وہ بڑے ادب سے بتا رہا تھا۔ "سو جب وہ لوگ آئیں گے' تو اس کالونی کی چار مختلف چھتوں پہ موجود لوگ اپنے تمام۔۔۔ آہم۔۔۔ "اوزار" اور "ہتھیار" لے کر نکل آئیں گے اور ان حملہ آوروں کو "شوٹ" کریں گے' جس کے بعد وہ ہمارے گھر پہ فائرنگ نہیں کر سکیں گے۔"
زمر تو زمر' ابا بھی دنگ رہ گئے۔ "فارس یہ تو خون

خراب ہوالی بات ہوئی۔"
زمر تیزی سے کھڑکی کی طرف لپکی اور پردہ ہٹایا۔ باہر کالونی کی سڑک پہ جیپیں رکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی کھلی چھتوں سے رائفلز اور جدید اسلحہ اٹھائے بیٹھے چند ہٹے کٹے افراد صاف دکھائی دیتے تھے۔ (گیٹ اور چار دیواری چھوٹی تھی سو یہ منظر بالکل واضح تھا۔)
"ایسے مت کرو فارس۔۔۔ روکو ان لوگوں کو۔۔۔ یہ غلط ہے' کوئی مر گیا تو؟ کال کرو انہیں۔" وہ بے چینی سے بولی۔ اسی وقت فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ درختوں سے پرندے ایک دم سے اڑے۔
کھڑکی میں کھڑی زمر کی رنگت پھیکی پڑی۔
"فارس' تم اپنے لوگوں کو منع کرو' کوئی گولی نہیں چلائے گا۔ یہ لوگ ہوائی فائرنگ کر کے واپس چلے جائیں گے۔"
"اب دیر ہو چکی ہے' میں شوٹنگ کا آرڈر دے چکا ہوں۔ وہ لوگ اپنی پوزیشنز سنبھال چکے ہیں اور آپ کھڑکی سے ہٹ جائیے' یہ نہ ہو کہ میں تیسری دفعہ جیل چلا جاؤں۔" وہ قدم بہ قدم چلتا اس کے ساتھ آکھڑا ہوا تھا۔
لاؤنج میں خوف زدہ سا سناٹا چھا گیا تھا۔ حنین اور سیم کی مسکراہٹیں غائب تھیں۔ ابا پریشان سے ہو گئے تھے۔ اور زمر کھڑکی سے نہیں ہٹ رہی تھی۔
"فارس ان پہ جوابی شوٹنگ مت کراؤ۔ تم ان کو کال کیوں نہیں کرتے۔" وہ بے بسی بھرے غصے سے بولی تھی۔ نظریں سامنے والی چھتوں پہ جمی تھیں۔ اور یکایک۔ قریبی دو چھتوں پہ چند افراد نمودار ہوئے۔ زمر کا دل زور سے دھڑکا۔ (باقی دو چھتیں اس جگہ سے دکھائی نہ دیتی تھیں۔) انہوں نے بلند آواز میں کچھ کہتے ہوئے نیچے سے چند "ہتھیار" اٹھا کر اوپر کیے اور ان کا نشانہ جیپ والے گھس پٹیوں کی طرف باندھا۔
زمر دھک سے رہ گئی۔
ان کے ہاتھوں میں اسلحہ نہیں تھا۔
"چچ چچ۔۔۔ کتنی کرمنل سوچ رکھتی ہیں آپ زمر بی بی۔ میں تو فوٹو شوٹ کی بات کر رہا تھا۔ آپ کیا سمجھیں؟" وہ افسوس سے کہہ رہا تھا۔
زمر کی شل نظریں وہیں پہ جمی تھیں۔ چھتوں پہ اکٹھے ہوئے رپورٹرز دھڑا دھڑ فوٹو گرافی کر رہے تھے گویا لائیو کوریج کر رہے ہوں۔ ان کے انداز نے گلی میں رکے کھڑے 'اسلحہ اٹھائے' دن کی روشنی میں بغیر کوئی نقاب پہنے 'کرایے کے غنڈوں کو بوکھلا دیا تھا۔ انہوں نے فائرنگ روک دی۔ چہرے گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر ہڑبونگ سی مچی۔ کسی نے نیچے ہونے کو کہا۔ کسی نے اندر بیٹھنے کو۔ ٹائرز حرکت میں آئے۔ سڑک پہ رگڑنے کی تیز آواز کے ساتھ گاڑیاں زن سے واپس ہوئیں۔ چند لمحوں میں وہ غائب ہو چکی تھیں۔
"ایسی وارداتیں عموماً" فراری مجرموں سے کرائی جاتی ہیں۔ فراری کسی سے نہیں ڈرتا' نہ پولیس سے' نہ معصوم شہریوں سے۔ وہ صرف "کسی" کے ساتھ دیکھ لیے جانے سے ڈرتا ہے۔ اس کے دشمن جان جائیں گے کہ وہ کن لوگوں کے ساتھ آج کل رہ رہا ہے' وہ صرف اسی بات سے ڈرتا ہے۔ اور یہ چند نئے رپورٹرز جن کو اپنا کیریئر بنانے کے لیے ایک چٹ پٹی خبر کی تلاش تھی' یہ ہر وقت یہاں موجود نہیں ہوں گے' مگر کاردار رزاب کسی کو یہاں بھیجنے کا خطرہ نہیں مول لیں گے۔ ہمیں دوبارہ "ڈرانے" کا مطلب ہو گا قصے کو مزید مشہور کرنا۔" وہ سنجیدگی سے کہتا اب لاؤنج میں ٹہل رہا تھا۔ ابا قدرے پرسکون تھے' حنین اور سیم نے مسکراتی نظروں کا تبادلہ کیا اور زمر لب بھینچے سنجیدہ سی کھڑی تھی۔ (دو نمبر آدمی۔ ہونہہ!)
"اب؟ اب کیا کرے گا وہ؟" زمر فارس کے مقابل آکھڑی ہوئی اور سینے پہ بازو لپیٹے سنجیدگی سے پوچھا۔
"شاید کچھ چھوٹے موٹے کام۔" اس نے شانے اچکائے۔ "جیسے ہمارے خلاف جھوٹے مقدمے کروانا' میڈیا میں ہمارے خلاف خبریں دینا۔ مگر میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ یہ سب کرے گا۔ شاید وہ خاموشی سے انتظار کرنا مناسب سمجھے۔ وہ چاہے گا کہ ہم الزام لگانے میں پہل کریں' اور یہاں پہ میں سعدی

اور اس کے انصاف والے آئیڈیل ازم سے متفق نہیں ہوں مگر ہمیں ہی الزام لگانے میں پہل کرنی ہو گی۔"

فارس نے گہری سانس لی اور موبائل اسکرین ان کے سامنے کی۔ "میں اتنی دیر سے اس ویڈیو کو مختلف جگہوں پہ بھیج رہا تھا۔ یہ وڈیو سعدی نے دو روز پہلے بنا کر بھیجی تھی۔ "میرا نام ہے سعدی یوسف۔" پچھلے آدھے گھنٹے میں اس کے ڈھائی ہزار ویوز آچکے ہیں اور جلد یہ ٹی وی پہ ہو گی۔"

اسکرین پہ دور سے نظر نہیں آیا کہ وہ کون سی ویڈیو تھی اور فارس نے موبائل واپس موڑ لیا' مگر سب بے چین ہو گئے تھے۔ "سعدی گھر کیوں نہیں آیا؟"

"ابھی تک دماغ درست نہیں ہوا اس کا۔" وہ خفگی سے بڑبڑایا تھا۔

"تو اب تمہارا ڈیئر کزن کورٹ میں جانے کا انتظار کرے گا؟" وہ اسی طنزیہ انداز میں بولی۔

"ہاں۔ اب وہ خاموشی سے ٹرائل کا انتظار کرے گا کیونکہ وہ اسے جیت کر نوشیرواں کو باعزت بری کروالے گا۔ اگر کوئی ٹرائل ہوا بھی تو۔"

"کیوں؟" سیم کو برا لگا۔ حنین بھی حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"میری بیگم سے معذرت کے ساتھ' مگر اس لیے کہ وہ زیادہ اچھا وکیل ہے۔" اب وہ ٹانگ پہ ٹانگ جما کر پیچھے ہو کر بیٹھا تو زمر پیر پٹخ کر مڑی۔

(میں جو اتنے ماہ خوار ہوئی۔ اس کو بھی انصاف دلایا۔ مگر نہیں۔ اسی کو ہیرو بننا ہوتا ہے آخر میں۔)

اور چند قدم دور گئی۔ پھر رکی۔ آنکھوں پہ چمک ابھری' لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ وہ واپس مڑی۔

"تھینک یو فارس۔ تم نے ہر چیز اتنے اچھے سے پلان کی' ہر مسئلے کا حل نکال کر رکھا' تھینک یو۔" اس کے بدلے انداز پہ فارس نے مشکوک انداز میں ابرو اٹھایا۔ "یو آر ویلکم!"

"اور تمہاری اس انتھک محنت کو دیکھتے ہوئے میں نے تمہیں دل سے معاف کر دیا ہے۔"

"کس چیز کے لیے؟" وہ ہنوز مشکوک تھا۔

"سعدی کو مارنے کے لیے۔" پھر باقی سب کو دیکھا۔ "اوہ تم نے نہیں بتایا کسی کو کہ جب تم اس سے کینڈی میں ملے تو تم نے اس کو کتنی بری طرح سے مارا تھا' اور اس کے منہ پہ وہ زخم بھی تم نے ہی دیا تھا' مگر خیر' تم غصے میں تھے' معاف کیا۔"

(چڑیل نہ ہو تو) وہ خفگی سے اسے گھورتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھا۔ حنین' سیم اور ابا ایک دم اسے دیکھنے لگے تھے۔ بے یقین' تفتیشی نظروں سے۔

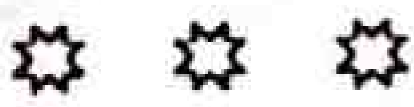
چلو جی۔ ساری کارکردگی پہ پانی پھر گیا۔

تب تک زمر مسکرا کر آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ بھی جانے کو اٹھا۔

"ماموں!" سیم نے صدمے اور غصے سے اسے دیکھا۔ حنین بھی آستین موڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایک منٹ۔ ذرا ہماری بات سنیں پہلے۔"

"جھوٹ بول رہی ہے وہ۔ استغفر اللہ!" وہ پیچ و تاب کھاتا (ان کی نظروں سے بچتا) بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا' اس سے پہلے کہ مورچال کی یہ چیونٹیاں اسے نوچ کھائیں۔



مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ مجھ سے تجھے وہ شکوۂ بے جا بھی نہیں

اگلی صبح تک کوئی خاطر خواہ واقعہ پیش نہ آیا۔ کسی بڑے طوفان سے پہلے کا سکوت سارے میں چھایا رہا۔ ہاشم اور جواہرات' ہارون کے ساتھ آفس میں بیٹھے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتے رہے۔ نوشیرواں اپنے کمرے میں موبائل بند کر کے سر منہ لپیٹے پڑا رہا۔ ہاشم نے اسے پیشکش کی کہ وہ ملک سے باہر چلا جائے گا مگر وہ راضی نہیں ہوا۔

"میرے دوست' میرا سوشل سرکل' وہ سب سمجھیں گے کہ میں نے یہ کیا ہے۔ کہ میں بھاگ گیا ہوں۔ نہیں' میں نہیں بھاگوں گا۔ مجھے کوئی ہتھکڑی نہیں لگا سکتا۔"

ندرت معمول کے مطابق ریسٹورنٹ میں تھیں۔
سیم اور حنہ بھی ادھر آگئے تھے۔ باہر فارس کے پہرے دار موجود تھے۔ سعدی کی ویڈیو سوشل میڈیا پہ پھیل رہی تھی، مگر اتنی تیزی سے نہیں کہ میڈیا والے ان کے گھر آپہنچیں۔ سو ابھی سکون تھا، سکوت تھا۔

فوڈلی ایور آفٹر میں گاہکوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ حنین کاؤنٹر سے دور، کونے کی میز سنبھالے لیپ ٹاپ کھولے بیٹھی تھی۔ میز پہ علیشا کی چین رکھی تھی اور ساتھ میں ٹوٹی ہوئی مور چال کی تختی۔ ایک نظر اس تختی پہ ڈال کر وہ اب اسکرین کو دیکھنے لگی۔ پھر کچھ سوچ کر خوب صورت تختیوں کو سرچ کیا۔ بہت سے امیج کھل گئے۔ تصاویر کی بہتات۔ حنہ ان کو دیکھے گئی۔ نت نئے ڈیزائن۔ رنگ۔ درمیان میں ایک قد آور آئینے کی تصویر بھی نظر آرہی تھی۔ اس نے یوں ہی اس پہ کلک کردیا۔ تصویر کی جگہ اس آئینے کی ویب سائٹ کھل گئی۔

حنین یوسف نے سن رکھا تھا کہ سنو وائٹ کی کہانی میں ایک جادوئی آئینہ تھا جو ملکہ سے باتیں کرتا تھا، اس نے اس جام جم کے متعلق بھی سن رکھا تھا جو بادشاہ جمشید کو پوری دنیا دکھاتا تھا۔ مگر اسے نہیں علم تھا کہ گوگل پہ کھلنے والی ویب سائٹ اس کے لیے بھی ایک دوسری دنیا کا دروازہ کھول دے گی۔

وہ ہوم ڈیکور کی ایک ویب سائٹ تھی اور جو صفحہ اس نے کھول رکھا تھا، اس میں بتایا جارہا تھا کہ چھوٹے سے کمرے کو کیسے سجا کر خوب صورت بنایا جاسکتا ہے۔ کیسے دنیا بھر کے رنگ اور پھول اس میں بھرے جاتے ہیں۔ شہد کی وہ مکھی بے اختیار آگے ہوئی اور آنکھوں میں خوشگوار تحیر بھرے ان رنگوں کو دیکھے گئی جو ایک گھر کو سلیقہ اور سجاوٹ عطا کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

"واؤ" ہر دوسری تصویر پہ اس کے لبوں سے نکل رہا تھا۔ ایسا نہ تھا کہ اس نے اچھے گھر نہ دیکھے تھے۔ کورین اور ترکش ڈراموں کے گھر وہ دیکھتی آئی تھی۔ مگر اس نظر سے نہیں دیکھے تھے۔

کیش کاؤنٹر کے ساتھ کھڑا فارس، جنید سے کچھ پیپرز لے کر دیکھ رہا تھا۔ اکاؤنٹس وغیرہ کا حساب۔ (ندرت مارکیٹ گئی تھیں گھر کی ماہانہ گروسری لینے) اور ریسٹورنٹ کے ملازمین یہ فرض کرچکے تھے کہ آئندہ ان کا نیا باس وہی ہوگا۔ شاید وہ خود بھی یہ طے کرچکا تھا۔

دفعتاً" ریسٹورنٹ کا دروازہ کھلا اور ایک جانی پہچانی مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ فارس نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس طرف آرہی تھی۔ سفید لمبا کوٹ پہنے، اور بال سرخ اسکارف میں لپیٹے، ماتھے سے چند سرخ لٹیں نکالے، کہنی پہ ڈیزائنر بیگ اٹکائے وہ ایک میز کی کرسی کھینچ کر بیٹھی اور بلی جیسی آنکھیں جھپکا کر اسے دیکھا۔ فارس نے بے اختیار دور بیٹھی حنہ کو دیکھا۔ وہ لیپ ٹاپ میں گم تھی۔ پھر وہ اس کے سامنے آبیٹھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" سنجیدگی سے پوچھا۔ ساتھ میں بغور اس کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھ رہا تھا۔

"ناراض ہوں۔" وہ بچوں کے سے خفا انداز میں بولی۔ فارس نے گہری سانس بھری۔ "تو یہاں کیوں آئی ہیں؟"

"آپ نے کہا تھا میرے بابا کا نام نہیں آئے گا اس کیس میں۔ پھر سعدی یوسف ان کا نام کیوں لے رہا ہے؟"

"میں نے کہا تھا ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ہم یہ کیس نہیں جیت سکتے سو کسی کا بھی نام آجائے، فرق نہیں پڑتا۔ اور کچھ؟" اس کا لہجہ خشک ہوگیا۔ وہ چند لمحے چپ رہی۔

"آپ مجھے اس طرح چھوڑ کر کیوں آئے؟ مجھے کہہ دیتے، کیا میں رکاوٹ ڈالتی؟ خاموشی سے چلی جاتی۔" وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔ سرمئی آنکھیں اس پہ جمی تھیں۔ "کم از کم مجھے یہ تاثر تو نہ ملتا کہ جیسے میں آپ پہ مسلط تھی۔ میں تو صرف آپ کی مدد کررہی تھی۔ یا شاید استعمال ہو رہی تھی۔"

"آئی ایم سوری!" اس کے چہرے کے تاثرات

نرم پڑے۔ "نہیں ... خیر... آپ ٹھیک ہیں؟" اب کے نرمی سے پوچھا۔ وہ مسکرائی۔ آنکھوں میں ہنوز اداسی تھی۔

"میرا دل چاہتا ہے کبھی میں ایک فون کال کر کے آپ کو بلالوں اور آپ چلے آئیں۔"

"مس آب دار' میں اپنی مرضی کا مالک' چھتیس سالہ' چھ فٹ ایک انچ کا مرد ہوں۔ میں اس طرح بلانے پہ نہیں آیا کرتا۔" سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کر اسے کچھ سمجھایا۔ وہ پھر مسکرائی۔ آنکھیں نم ہوئیں۔

"مجھے چیلنج نہ کریں کیونکہ میں ایسا بہت کچھ کر سکتی ہوں جس کے بعد آپ دوڑے چلے آئیں گے۔ خیر!" اس کے جواب سے پہلے سر جھٹکا۔ "مجھے مدد چاہیے آپ کی۔"

وہ جو ناگواری سے کچھ کہنے لگا تھا' رک گیا۔

"ہاشم نے مجھے پرپوز کیا ہے' اور وہ 'نہ' نہیں سننا چاہتا۔ اس کا انداز سنگین تھا۔"

"تو... آپ شادی کرنا چاہتی ہیں اس سے؟" وہ چونکا تھا مگر پھر عام سے انداز میں پوچھا۔

"وہ اچھا ہے' میرا دوست ہے' مگر...." اس کی سنہری آنکھوں پہ آنکھیں جمائے وہ نرمی سے بولی۔ "مجھے کسی اور سے محبت ہے۔"

فارس نے بہت دھیرے سے اثبات میں سرہلایا۔ "اور... اس کسی اور کو آپ نے بتایا کہ آپ اس سے ....!"

"وہ جانتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ... جانتا ... ہے۔" وہ اب کے چیلنجنگ انداز میں مسکرائی۔

فارس نے بدقت چہرے پہ چھایا نارمل تاثر برقرار رکھا۔ (ہاں ابھی اس "کسی اور" کی بیوی ادھر ہوتی تو تمہیں بتاتی۔)

"تو آپ کیا کریں گی؟" سرسری سا پوچھا۔

"آپ بتائیں میں کیا کروں؟ ہاشم کو بتادوں اس کسی اور کے بارے میں؟ کیا یوں وہ میرا پیچھا چھوڑ دے گا؟"

"آب دار!" وہ ذرا ٹھہرے ہوئے انداز میں دھیما سا بولا۔ "ہاشم میرا کزن ہے' میں اسے بہت اچھے سے جانتا ہوں۔ اپنے اور اس کے درمیان کسی تیسرے کو مت لائیں۔ اسے مت اکسائیں۔ اس کو اس کی وجہ سے ریجیکٹ کریں' اپنی وجہ سے نہیں۔"

"اور اگر وہ نہ مانا تو؟"

"ظاہر ہے وہ نہیں مانے گا۔ تو آپ کسی ایسے شخص سے اس پر دباؤ ڈلوائیں جو اس پہ رعب رکھتا ہو اور میرا خیال ہے آپ ایسا کر سکتی ہیں۔ کیونکہ آپ اس تیسرے شخص کے ان احکامات سے بھی واقف ہیں جن سے ہاشم نہیں ہے۔"

"اوہ!" آب دار کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ "میں سمجھ گئی۔ خیر۔" ادھر ادھر دیکھا۔ "کچھ کھلائیں پلائیں گے نہیں کیا؟"

"نہیں۔ اب آپ جائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ کوئی بھی تعلق آپ کو کبھی نقصان دے۔" وہ سنجیدگی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب کی دفعہ میں بلاؤں تو آیئے گا ضرور ورنہ میں نے کہا نا' مجھے بلانے کے سارے طریقے آتے ہیں۔" آب دار مسکرا کر کہتی ہوئی اٹھی۔ بیگ اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ ناخوش سا کھڑا کچھ سوچتا رہ گیا۔

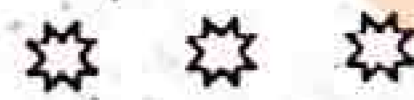
چند فرلانگ دور ایک کیش اینڈ کیری اسٹور کے اندر دن کے وقت بھی تیز سفید بتیاں روشن تھیں۔ ندرت یوسف ٹرالی لیے اشیاء خورونوش کے ریکس کے ساتھ چلتی جارہی تھیں۔ وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ کوئی ان کو دیکھ رہا ہے۔ فاصلے سے۔ احتیاط سے۔

ریکس کی لمبی قطار کے آخر میں... وہ اوٹ سے نکل کر ان کو دیکھ رہا تھا۔ سر پہ کیپ' گلاسز' اور بڑھی ہوئی شیو نے سعدی کا چہرہ قدرے مختلف بنا رکھا تھا۔ اس کی زخمی نظریں ندرت کے تعاقب میں تھیں۔ وہ اس سے چند قدم ہی دور تھیں۔ اس طرف ان کی پشت تھی۔ فربہی مائل عام سے گرم سوٹ میں ملبوس تھیں۔ شال سر پہ لے رکھی تھی۔ سوئیٹر حسب عادت بنا آستین والا تھا۔ وہ کبھی آستینوں والا سوئیٹر نہیں پہنتی تھیں۔ ایک ہاتھ میں جہیز کے دو کنگن

تھے۔ جو ہر موسم میں ہر وقت پہنے رہتی تھیں۔ کنپٹیوں اور ماتھے سے ذرا سفید بال جھلک رہے تھے۔ آنکھوں کے حلقے بڑھ گئے تھے۔ بار بار رکتیں۔ کچھ یاد کرتیں۔ پھر کوئی شے اٹھاتیں۔ شاید اب وہ چیزیں بھولنے لگی تھیں۔ شاید ذہنی طور پہ بہت الجھی رہنے لگی تھیں۔

وہ اوٹ سے ان کو دیکھے گیا۔ چھپ کر۔ نم آنکھوں سے۔ وہ اب ایک ریک کے سامنے کھڑیں' ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر کچھ یاد کر رہی تھیں۔

"کیا رہ گیا؟ اب گھر پہنچ کر یاد آئے گا۔" وہ خود سے خفا تھیں۔ وہ اوٹ سے نکلا اور قدم قدم چلتا ان کے قریب آیا۔ وہ پشت کیے کھڑی تھیں۔ وہ ٹرالی کے سرے پہ آکھڑا ہوا۔ ایک نظر سامان پہ ڈالی۔ پھر سامنے والے ریک سے مایونیز کا بڑا جار اٹھا کر ان کی ٹرالی میں رکھا اور آگے بڑھ گیا۔ ندرت نے کسی کو جار رکھتے دیکھا تھا۔ سو فوراً" گھومیں۔ جار اٹھا کر دیکھا۔ ہاں' یہی تو بھول گئی تھیں۔ سر اٹھایا۔ متلاشی نگاہ دوڑائی۔ کوئی نہیں تھا۔ آس پاس سوائے گاہکوں اور ورکرز کے۔ کچھ دیر حیران ہوئیں۔ مگر شاید کسی ورکر سے مانگا تھا انہوں نے تب ہی اس نے لا دیا ہو گا۔ خیر' ٹرالی دھکیلتی آگے بڑھ گئیں۔



جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی رہو اس پر ظفر
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیے

جواہرات اپنے لان میں آرام دہ کرسی پہ نیم دراز دھوپ سینکتے ہوئے' موبائل کان سے لگائے' نخوت اور ناگواری سے کہہ رہی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ مسز عباد! ان لوگوں کا ہمارے ساتھ جائیداد کا تنازعہ ہے' چھوٹے لوگوں کی چھوٹی باتیں' ہونہہ۔ ورنہ میرا شیرو تو آپ نے دیکھ رکھا ہے۔ پرندے کا بچہ نہیں مار سکتا وہ۔" رک کر کچھ سنا۔ ناگواری سے چہرہ سیاہ ہو گیا۔ "شوٹنگ کلب کا ممبر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسی نے سعدی کو شوٹ کیا تھا۔ یہ تو اس کا ٹیلنٹ ہے' آرٹ ہے۔" وہ چار باتیں مزید کہہ سن کر اس نے جھنجلا کر فون بند کیا اور ساتھ رکھی میز پہ ڈال دیا۔ ناک چڑھائے کوفت سے سر جھٹکا۔

"یہ ذرا ذرا سے لوگ۔"

"آنٹی!" دور سے چہکار سی سنائی دی تو جواہرات نے لمبی کرسی پہ نیم دراز گردن موڑی۔ سبزہ زار کے دوسرے سرے سے آب دار چلی آرہی تھی۔ سورج مکھی کے رنگ کا لمبا فراک پہنے' بال سرخ رومال میں باندھے' کہنی پہ اٹکی باسکٹ میں ڈھیروں پھول لیے وہ اس وقت واقعتا" ریڈ رائیڈنگ ہڈ لگ رہی تھی۔ جواہرات کے چہرے کے زاویے سیدھے ہوئے' مسکرا کر اسے ہاتھ ہلایا۔

"کیسی ہیں آپ آنٹی؟ یہ پھول میں آپ کے لیے لائی ہوں' اپنے باغیچے سے توڑ کر۔" دوسری لمبی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے اس نے باسکٹ درمیانی میز پہ رکھی۔ سفید گلابی چہرہ سرما کی دھوپ کی تمازت سے دہک رہا تھا مگر آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔

"میں ٹھیک ہوں' ہنی! تم نے اتنے عرصے بعد شکل دکھائی۔" یونہی نیم دراز اپنا انگوٹھیوں والا ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ دبائی' پیار سے بولی۔ گہری آنکھیں اس کے شفاف چہرے پہ جمی تھیں۔

"بس آنٹی۔ مجھے تو اس فصیح کی فکر ہے۔" وہ توبہ توبہ والے انداز میں کانوں کو چھو کر بولی۔ "سنا ہے وہ ابھی تک سری لنکا میں غائب ہے' پولیس اس کو تلاش کر رہی ہے لیکن آنٹی میں تو سوچتی ہوں کہ وہ نہ ہی ملے تو اچھا ہے۔ ورنہ ہاشم تو اس کو دیکھتے ساتھ ہی گولی مار دے گا۔"

"کیوں؟" جواہرات چونکی۔

"یہ دیکھیں۔ اس فصیح نے بھی کیسی غداری کی ہاشم کے ساتھ۔" اس نے بڑے سے ٹیب کی اسکرین پہ چند بٹن دبا کر اسے جواہرات کے سامنے کیا۔ اسکرین پہ چلتے منظر کو دیکھ کر آرام دہ کرسی پہ نیم دراز

جواہرات کی رنگت فق ہو گئی۔

وہ آفس چیئر پہ بیٹھی تحکم سے فصیح کو ہدایات دیتی نظر آرہی تھی۔ سعدی اور خاور کے قتل کی۔

جواہرات نے چونک کر آبی کو دیکھا۔ وہ اسی سادہ انداز میں بولے جارہی تھی۔

"کیسا ہولناک کام کیا فصیح نے۔ ہاشم کی پیٹھ پیچھے اس کے مہمانوں کو مارنے کا سوچا۔ ہاشم کے پلانز تھے اپنے مہمانوں کے بارے میں۔ فصیح نے ان کو خراب کردیا۔ تب ہی تو وہ دونوں بھاگ نکلے اور یہ اسکینڈل شروع ہوا۔ جب ہاشم کو معلوم ہوگا کہ فصیح اس کا ذمہ دار ہے تو وہ تو فصیح کی جان لے لے گا۔ اس سے سارے رشتے ناتے توڑ دے گا۔"

جواہرات پہ نظریں جمائے وہ معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

"اس پہ کبھی اعتبار نہیں کرے گا ہاشم فصیح کے اس عمل سے کتنا دکھ پہنچے گا۔ آپ سمجھ سکتی ہیں نا۔ مجھے تو فصیح کی بہت فکر ہے۔ اس لیے پلیز آپ یہ سب ہاشم کو نہیں بتایئے گا ورنہ وہ تو فصیح سے اپنا رشتہ ہی ختم کردے گا۔"

فصیح نامہ سنا کر وہ نوٹ واپس پرس میں ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور ہاں آنٹی.... ہاشم نے مجھے پرپوز کیا ہے، لیکن مجھے پتا ہے کہ آپ ایسا نہیں چاہتیں اور آپ کو پتا ہے کہ میں کتنی کیوٹ ہوں، آپ کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار رہتی ہوں۔ اب ہاشم کو اس ارادے سے صرف آپ ہی باز رکھ سکتی ہیں۔ تو سمجھا دیجیے گا۔ اسے ہول او کے میں چلتی ہوں۔ آج مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔" جھک کر جواہرات کے گال سے گال مس کر کے چوما، مسکرا کر سیدھی ہوئی اور ہاتھ ہلاتی واپس جانے کو مڑ گئی۔

جواہرات اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تھی۔ یونہی نیم دراز پڑی رہی۔ اس کا چہرہ فق تھا اور اعصاب شل۔ پھر دھیرے سے ان آنکھوں میں سرخی اتری۔ ایک دم زور سے ہاتھ مار کر اس نے باسکٹ الٹ دی۔

سارے پھول سبزہ زار پہ بکھرتے چلے گئے۔

وہ زرد گلاب تھے۔ دشمنی کی علامت۔



جو کہتے ہیں اس آندھی میں پر نہ تولا جائے گا
وہ اس بات پر خوش ہیں ہم سے لب نہ کھولا جائے گا

تھانے کے اس وسیع و عریض ہال نما آفس میں ہیٹر چل رہا تھا۔ ایس ایچ او اپنی کرسی پہ ٹیک لگا کر بیٹھا تھا اور قلم ہاتھ میں گھماتا سنجیدگی مگر قدرے بے نیازی سے سامنے بیٹھی زمر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے اتنے ہی سکون سے پیچھے ہو کر بیٹھی تھی اور تند نگاہیں ایس ایچ او پہ جمی تھیں۔

"سیکشن 161 سی آر پی سی CRPC کے تحت آپ ہماری اسی پرانی ایف آئی آر میں میرا بیان ریکارڈ کریں تاکہ میں ملزموں کو نامزد کرسکوں۔"

"زمر صاحبہ، میں آپ کو اتنی دیر سے بتا رہا ہوں کہ..." وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں آگے کو ہوا۔ "میں یوں بنا کسی ثبوت کے کاردار خاندان کے کسی فرد کا نام ایف آئی آر میں نہیں ڈال سکتا۔"

"میں آپ کو ثبوت تو کیا ایک وضاحت دینے کی بھی پابند نہیں ہوں کیونکہ CRPC 161 کے تحت یہ میرا حق ہے۔" وہ بھی اتنی ہی رکھائی سے بولی۔

"آپ تحمل سے میری بات سنیں۔" ایس ایچ او کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ ایک دم سے آفس میں بہت سے لوگ داخل ہوئے تھے۔ ایس ایچ او کھڑا ہو گیا۔

زمر نے گردن موڑ کر دیکھا اور پھر گہری سانس بھری۔

وہ سر پہ چادر لیے، قیمتی ہیرے کی انگوٹھیاں پہنے، ڈیزائنر بیگ اٹھائے باوقار سی خاتون جانی پہچانی تھی۔ چترال سے تعلق رکھنے والی سیاست دان، جس کا اسکینڈل پچھلے دنوں جواہرات کاردار نے مشہور کروایا تھا اور وہ اکیلی نہیں آئی تھی۔ وکلا اور گارڈز ہمراہ تھے۔ اس کے لیے فوراً" کرسیاں بچھائی گئیں۔ عملے کی دوڑیں لگ گئیں۔ کوئی چائے لانے بھاگا کوئی بیکری کی

طرف۔

"کیا آپ ان کا بیان ریکارڈ نہیں کر رہے؟" زمر کے قریب کرسی پہ بیٹھ کر وہ انگلی گال پہ رکھے 'نرم مسکراتے انداز میں پوچھنے لگی۔ ایس ایچ او نے سوالیہ نظروں سے زمر کو دیکھا۔

"یہ میری کرائے دار ہیں۔" خاتون نے تعلق بتایا۔

زمر خاموشی سے بیٹھی انگلی پہ اپنے بالوں کی لٹ لپیٹتی رہی۔

"اور میں چاہتی ہوں کہ آپ ان کی ایف آئی آر میں نامزد ملزم کا نام درج کریں۔ کیا نام تھا اس کا؟ ہاں نوشیرواں کاردار! صرف یہی نام یا کوئی اور بھی لکھوانا ہے؟"

اپنائیت بھرے انداز میں چہرہ زمر کی طرف موڑ کر پوچھا۔ زمر مسکرائی اور مسکراتے مسکراتے خاتون کی طرف جھکی۔

"تھینکس!" اس سے پہلے کہ وہ ویلکم کہتی، زمر کی مسکراہٹ سمٹی۔ "مگر نو تھینکس! مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میری ایف آئی آر ہے میں اسے خود ہی دیکھ لوں گی۔" تلخی سے فقرہ مکمل کیا۔ ایس ایچ او خاموشی سے تماشا دیکھنے لگا۔

خاتون ذرا سا مسکرائی۔ "مگر کیوں؟"

"کیونکہ آپ جیسے لوگ بدلے میں کچھ مانگا بھی کرتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ مجھے اپنے وکلا کو کیس میں شامل کرنے کو کہیں گی۔ کل کو یہ وکلا آپ کی مرضی کی سمت میں کیس کو لے جائیں گے 'بھاری رقم اور پبلک میں آکر معافی مانگنے کی شرط پر ان کو معاف بھی کردیں گے کیونکہ آپ ان کی ہزیمت چاہتی ہیں۔ لیکن میں آپ کو یہ کیس استعمال کرنے نہیں دوں گی۔ یہ ہمارا کیس ہے ہم اکیلے اس مقام تک پہنچے ہیں صاحبزادی صاحبہ! ہم اکیلے ہی لڑلیں گے۔" کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ صاحبزادی صاحبہ نے مسکرا کر چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

"تو آپ ان ایس ایچ او صاحب کو راضی کیسے کریں گی؟ نئے ملزم کا نام ڈالنے کے لیے؟"

"میں کیا کروں گی!" اس نے گھنگھریالی لٹ کان کے پیچھے اڑستے ہوئے مسکرا کر ایس ایچ او کو دیکھا۔

"میں یہاں صرف فارمیلٹی کے تحت آئی تھی، اور اب میں سیدھی پولیس کی ہائی کمان کے پاس جاؤں گی 'آئی جی صاحب کی بیٹی میری بھتیجی کی دوست ہے 'میں ان سے شکایت کروں گی۔ ڈی آئی جی صاحب کے میں نے کورٹ میں چند کام کر رکھے ہیں 'ایک کال میں ان کو بھی کروں گی۔ پھر میں اپنے پرانے ٹیچر ایک سیشن جج کے سامنے سیکشن 22 سی آر پی سی کے تحت پٹیشن فائل کروں گی 'یا صرف اپنی ایک بہت اچھی دوست مجسٹریٹ کے پاس پرائیویٹ کمپلینٹ فائل کردوں گی۔ اڑتالیس گھنٹے کے اندر نوشیرواں کاردار کا نام ایف آئی آر میں درج ہو گا۔ میرے پاس کام کروانے کے بہت طریقے ہیں۔ مجھے آپ کی کوئی مدد نہیں چاہیے۔ آپ آئیں 'آپ کا شکریہ۔ میں چلتی ہوں۔"

اپنے مدعا کو اپنے مخصوص انداز میں "زمرائز" کر کے وہ پرس اٹھاتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مڑتے مڑتے سر "ہونہہ" کے انداز میں جھٹکا بھی تھا۔

(سمجھتے کیا ہیں یہ مجھے۔ اتنے سال کورٹ میں جھک ماری ہے کیا میں نے؟)



کیوں لپٹتا ہے میرے ساتھ یہ دریا آخر؟
مجھ کو گرداب سے آگے بھی کہیں جانا ہے

اگلی دوپہر قصر کاردار کے ڈائننگ ہال کی طویل میز پہ کھانا کھانے ہاشم اکیلا بیٹھا تھا۔ چند مہمانوں کی متوقع آمد کے باعث وہ آفس سے جلدی آگیا تھا۔ نوشیرواں کو بلا بھیجا مگر میری نے واپس آکر مایوسی سے کہا "وہ کہہ رہے ہیں ان کو بھوک نہیں" تو ہاشم سر جھٹک کر کھانے لگا۔ تب ہی جب بیرونی دروازے سے سینڈل کی مخصوص ٹک ٹک سنائی دی۔ چہرہ اٹھائے بغیر بھی ہاشم جانتا تھا کہ نووارد کون ہے۔ اندر تک کڑواہٹ

پھیل گئی۔

"ہیلو ہاشم!" شہری مسکراتی ہوئی چلتی آرہی تھی۔ ہاشم نے تلخ تاثرات والا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"تمہیں میرے گھر آنے جانے کے اوقات کی خبر کون دیتا ہے؟"

ڈائننگ ٹیبل کے قریب ہاتھ باندھے مودب سی کھڑی فیونا نے فوراً" گھبرا کر نظریں جھکالیں۔

"مجھے تو تمہاری دوسری بھی کئی مصروفیات کی خبر ہے۔" وہ طنزیہ سا کہتی اس کے ساتھ کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ سنہری بالوں کی اونچی پونی بنائے، چھپکلی کے ڈیزائن والے لمبے آویزے پہنے، وہ حسب معمول خوب دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔

"سنا ہے تم شادی کر رہے ہو۔ سونی کو بھی منالیا۔ واہ۔" آنکھیں اس پہ جما کر طنزیہ بولی۔

ہاشم نے ابرو کے اشارے سے ملازموں کو جانے کا کہا اور اکتا کر کھانا ختم کرنے لگا۔

"ویسے تم ہمیشہ ہی اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ ہونہہ۔ اور شادی ٹوٹنے کا الزام میرے سر لگاتے رہے اتنے سال۔"

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"میرا نام ہے سعدی یوسف" دیکھنے کے بعد میں گھر کیسے بیٹھ سکتی تھی؟ ویسے اب تک تو تم پہ واضح ہو چکا ہو گا کہ میں نے نہیں، فارس نے وہ ویڈیو ریلیز کی تھی جج والی۔ مجھے تو سعدی نے یونہی درمیان میں پھنسایا تمہارا دھیان ہٹانے کے لیے۔"

"سب جانتا ہوں اور کچھ؟"

"اور یہ کہ اگر یوسفز واقعی تمہارے خلاف کیس کرنے جا رہے ہیں، تو میں یہ سوچ رہی تھی کہ جب مجھے subpeona کیا جائے گا تو میں عدالت میں کیا کہوں گی؟ آخر میرے سامنے بھی اعتراف کیا تھا نا شیرو نے سعدی کو گولیاں مارنے کا!"

نوشیرواں اسی وقت زینے اترتا نیچے آیا تھا۔ کھلے دروازے کے باعث شہری کی آواز کان میں پڑ گئی۔ پہلے ہی ابتر حلیے میں تھا، ملگجی ٹی شرٹ اور شارٹس، ان الفاظ پہ تو چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ تیزی سے سامنے آیا۔

"تم اس قابل نہیں تھیں کہ تمہیں کوئی پسند کرتا، یا تم سے کوئی دوستی کرتا۔ تمہاری وجہ سے میں نے اسے شوٹ کیا تھا اور اگر تم نے۔۔۔"

"شیرو!" ہاشم نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرایا اور وہ باوجود غصے کے چپ ہو گیا۔ شہرین اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک تند و تیز نظر شیرو پہ ڈالی۔

"میں کس قابل ہوں، تمہیں کورٹ میں معلوم ہو گا کیونکہ ڈیڈی نے مجھے دس منٹ پہلے بتایا ہے کہ کورٹ آرڈر کے ذریعے زمر نے ایف آئی آر میں تمہیں اور ہاشم کو نامزد کر دیا ہے۔"

"تھینک یو شہرین! تم جا سکتی ہو۔" ہاشم نے سختی سے کہا تو وہ پرس اٹھا کر مڑی اور آگے بڑھ گئی۔ شیرو نہیں بیٹھا، شل سا کھڑا رہا۔ پھر بے یقین نظروں سے ہاشم کو دیکھا۔

"میرا نام۔۔۔؟"

"اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی ٹرائل نہیں ہو گا، نہ انہیں کوئی تاریخ ملے گی نہ کوئی تمہیں گرفتار کرے گا۔ کھانا کھانا ہے تو کھاؤ ورنہ۔۔۔" اور اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی شیرو پیر پٹختا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ہاشم نے نیپکین زور سے پرے مارا اور پلیٹ دھکیلتا اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ لاؤنج تک آیا ہی تھا کہ بیسمنٹ کی سیڑھیوں کا دروازہ کھول کر باہر آتی علیشا دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرالی بیگ کا ہینڈل تھا جسے وہ ساتھ ہی گھسیٹ رہی تھی۔ ہاشم اسے دیکھ کر رکا۔

"کیا تم واپس جا رہی ہو؟"

علیشا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر قدم قدم چلتی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی اور چبھتی ہوئی نگاہیں اس کے چہرے پہ گاڑ دیں۔

"جی۔۔۔ میں کبھی نہ آنے کے لیے واپس جا رہی ہوں۔" چبا چبا کر وہ کہنے لگی۔ "میں نے بہت کوشش کی آپ لوگوں سے اپنی محرومیوں کا انتقام لینے کی، آپ

کو ذلیل کرنے کی' اپنا جائز پیسا آپ کی مٹھیوں سے نوچ لینے کی' مگر میں ہر دفعہ ناکام ہوئی۔ کیونکہ میں اکیلی تھی۔ اور کیونکہ میرے اندر فارس جتنی ہمت نہیں تھی۔ نہ میں سعدی کی طرح بہادر ہوں۔ میرا مقصد صرف پیسے کا حصول تھا۔ اور وہ مجھے نوشیرواں نے شیئرز واپس لیتے ہوئے کافی سے زیادہ دے دیا ہے۔ اور نہیں' ابھی میں ایئرپورٹ نہیں جا رہی۔ میں ہوٹل جا رہی ہوں۔ مجھے ایک دو دن مزید شہر میں رک کر ایک آخری کام کرنا ہے۔ پریشان مت ہوں' آپ کو تباہ کرنے کا کوئی کام نہیں۔ یہ سب یوسفز کرلیں گے۔ میں تو ہوں ہی پیسے کے پیچھے۔ تو ایک آخری چیز ڈھونڈ لاؤں آپ کے پاس' پھر اس کی قیمت آپ خود لگائیں گے۔"

ایک سانس میں کہہ کر وہ ایک زخمی نگاہ اس پہ ڈالتی آگے بڑھ گئی۔ ہاشم اسے گھور کر جاتے دیکھتا رہا۔

ایک ویڈیو کیا ریلیز ہوئی' ہر ایک کی اتنی اوقات ہو گئی ہے کہ وہ یوں چڑھ کر اس سے بات کرے! ہونہہ۔ وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار بنتا ہے

وہ دن بھی خاموشی سے ڈھل گیا۔ شام اتری اور پھر رات چھا گئی۔ ندرت ریسٹورنٹ بند کر کے گھر آگئی تھیں۔ سب اپنے کمروں میں سونے جا چکے تھے۔ فارس ابھی گھر نہیں آیا تھا سو گیٹ کھلا تھا۔ باہر دونوں گارڈز کو اس نے کسی بھی گھس بیٹھیے کو پوائنٹ بلینک پہ شوٹ ۔۔۔ گن والا شوٹ ۔۔۔ کردینے کے احکامات جاری کر رکھے تھے۔ سوائے کسی ایسے لڑکے کہ جو خاموشی سے دیوار پھاند کر اندر داخل ہو اور کسی تار کی مدد سے پورچ سے اندر کھلتا دروازہ کھولنے کی کوشش کرے۔ ایسے لڑکے کے بارے میں اس نے ریسٹورنٹ اور گھر دونوں جگہوں کے پہریداروں کو کہہ رکھا تھا کہ وہ اس کو یوں نظرانداز کریں جیسے اسے دیکھا ہی نہیں۔

ندرت وضو کر کے کمرے میں آئیں کہ نماز پڑھیں پھر خیال آیا کہ کچن کا چکر لگا لیں۔ گیلی آستینیں بازوؤں پہ برابر کرتی وہ باہر آئیں۔ کچن کے اندر آکر لائٹ جلائی۔ سلیب پہ رکھی خالی بوتلوں کو دیکھ کر وہ غصہ چڑھا کہ الاماں۔

"یہ حنین بیگم اور اسامہ خان' مجال ہے' جو کبھی خود سے بوتلیں بھر کر رکھ دیں۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ فلٹر سے بوتلیں بھر کر سلیب پہ رکھ دیا کرو۔ آگے فریج میں رکھنے کا موسم آئے گا تب کیا کریں گے یہ؟ ڈھیٹ اولاد۔"

کچن کی بوتلیں وہیں چھوڑ کر لاؤنج میں آئیں۔ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر چلتی ندرت نے لاؤنج اور ڈائننگ ٹیبل میں ادھر ادھر لڑھکی خالی بوتلیں اکٹھی کیں اور انہیں کچن میں لائیں۔

ایک دم وہ ٹھٹک کر رکیں۔ سامنے سلیب پہ چاروں بوتلیں بھری رکھی تھیں۔ پانی کے قطرے تک ٹپک رہے تھے۔ ندرت نے منہ میں انگلی دبائی۔ (شاید حنہ یا سیم میں سے کوئی ۔۔۔) مگر چند قدم آگے آئیں تو مزید ٹھٹکیں۔ سیم اور حنہ' ہمیشہ بوتلوں کو ان کے ڈھکن تک بھر دیتے تھے' وہ کہہ کہہ کر تھک گئیں کہ بوتل کو پورا نہیں بھرتے' دو گھونٹ جگہ چھوڑتے ہیں تاکہ ڈھکن کھولو تو منہ پہ پانی نہ چھلک پڑے' مگر ان پہ اثر نہ ہوتا۔ لیکن ابھی جو بوتلیں بھری رکھی تھیں' ان میں دو' دو گھونٹ جتنی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ ایسے جیسے ندرت بھرتی تھیں۔ ایسے جیسے سعدی بھرتا تھا۔ مگر۔۔۔ انہوں نے سر جھٹکا۔ شاید زمر نے بھری ہوں۔

وہ دوسری بوتلوں کو بھر کر باہر نکل گئیں اور کوئی خاموشی سے پینٹری کے دروازے کی اوٹ میں کھڑا ان کو دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

زمر کے کمرے کی لائٹ ابھی تک جلی تھی۔ وہ چہرے کے گرد دوپٹہ لپیٹے' اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی لیپ

ٹاپ پہ اپنا فیس بک گروپ کھولے ہوئے تھی۔ سعدی کی آئی ڈی کے سرخ زخمی گلاب پہ انگلی پھیرتے ہوئے وہ ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی۔ وہ گھر کیوں نہیں آیا؟ وہ گھر کیوں نہیں آتا؟ پھر سر جھٹکا اور آن لائن تفسیر کھولی۔ پہلے چند آیات کو پڑھا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔

"میں اللہ کی پناہ چاہتی ہوں شیطان مردود سے۔ اللہ کے نام کے ساتھ جو بہت مہربان، بار بار رحم کرنے والا ہے۔"

گہری سانس لے کر اس نے کی بورڈ پہ انگلیاں رکھیں۔ وہ سعدی کے لیے لکھ رہی تھی یا اپنے لیے، کیا فرق پڑتا تھا؟

النمل کی آیات میں فرمایا جا رہا تھا۔

"یا کون ہے
جو بے قرار کی دعا سنتا ہے
جب وہ اس کو پکارتا ہے
اور دور کرتا ہے اس کی تکلیف
اور وہ بناتا ہے تم کو زمین کا خلیفہ۔
کیا کوئی اللہ کے سوا ہے معبود؟
کتنی کم تم نصیحت پکڑتے ہو؟"

یہ آیت دل کو ایک دم پگھلا دیتی تھی۔ کی بورڈ پہ رکھی انگلیاں لرزیں۔

"پہاڑوں، نہروں، سمندروں اور زمین کی مثال دینے کے بعد آپ اللہ تعالیٰ "انسان" کی بات کرتے ہیں۔ "انسان" جو قرآن کریم کا موضوع ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انسان کو چٹان سا مضبوط، سمندر سا گہرا، اور زمین کی طرح پرسکون رہنا چاہیے، نہروں کی طرح ہر وقت بہہ نہ جائے، بلکہ سمندر کے کھارے اور میٹھے پانی کے حجاب کی طرح اپنے جذبات کو ابلنے سے روکے رکھے۔ مگر قرآن ان مضبوط چیزوں کی مثال دے کر ان سے زیادہ مضبوط مخلوق کی طرف آتا ہے لیکن اس کی سخت لاچاری والی حالت دکھاتے ہوئے۔ انسان کے ساتھ پہلے اتنی مضبوط چیزوں کی مثال دی، پھر انسان کو اتنا کمزور کیوں دکھایا اس آیت میں؟"

اس کے ہاتھ لمحے بھر کو رکے، لب کاٹتے ہوئے سوچا، پھر سر کو خم دیا۔

"مگر نہیں، کس نے کہا کہ مضطرب انسان "کمزور" ہوتا ہے۔ نہ انسان پہاڑ جیسا نہ سمندر جیسا نہ زمین جیسا ہو سکتا ہے ہر وقت۔ ہم پہ مختلف فیز آتے ہیں۔ اور جو سخت کمزور ترین لمحے میں ... لاچاری اور اضطراب کے عالم میں اللہ سے دعا کرتا ہے، اس کی مثال ان مضبوط چیزوں کے آگے دی جا رہی ہے، کیونکہ دعا کرنے والا ان سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ بھلے سجدے میں گرا ہو، رو رہا ہو، درد سے بلک رہا ہو، وہی اصل بہادر ہے۔ کیونکہ اس کا ایمان ہوتا ہے کہ اللہ اسے دے گا۔ چاہے لوگ کچھ بھی کہیں، چاہے سائنس کچھ بھی کہے، اس کی امید جوان ہوتی ہے کہ اللہ اسے دے گا۔ اللہ ہی سے مانگنا ہے۔ وہی اس کے دل کو سکون دے گا، وہی اس کی آزمائش کو ختم کرے گا۔

آزمائشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے صبر اور نیک عمل کافی نہیں۔ دعا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ دعا کے بغیر کیا ملتا ہے؟ اور مل جائے تو رہتا ہے کیا؟ دعا اللہ سے بات کرنا ہے، اور اسی بات نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو یہ یقین دلایا تھا کہ اگر وہ اپنا بچہ دریا میں ڈال بھی دیں تو اللہ ایک دن اسے ضرور ان کے پاس پھیر لائے گا۔ اور پہلے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دل خالی ہو گیا، مگر اللہ نے ان کو جمائے رکھا، کیونکہ اللہ سے تعلق نہیں توڑا تھا انہوں نے۔ اللہ سے بات کرنا نہیں چھوڑ دیا۔ میری طرح نہیں کہ مصیبتوں پہ دل اتنا اچاٹ ہو گیا کہ دعا مانگنی چھوڑ دی۔"

ایک زخمی سا تاثر اس کے چہرے پہ ابھرا۔ وہ سر جھکائے، ٹائپ کرتی جا رہی تھی۔

"دعا مانگنا بھی کوئی چھوڑتا ہے کیا؟ ایسے کوئی اللہ سے بات کرنا بھولتا ہے کیا؟ یہ اپنی پشیمانی اور شکووں کی اونچی دیوار کیوں بنا لیتے ہیں ہم لوگ؟ ایسے کوئی کرتا ہے کیا؟ اور جو کرتا ہے وہ بھی تب تک سکون نہیں

پائے گا جب تک واپس نہیں آئے گا۔ کچھ تو کاش اللہ سے بھی سیکھا ہوتا ہم نے۔ جانے والوں کو وہ روکتا نہیں ہے لیکن اگر وہ لوٹ کر آجائیں تو ان کے لیے سارے دروازے کھول دیتا ہے۔

ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچتے ہم کہ یہ جو ہم روز بروز اپنی دنیا میں 'شادی' بچوں' شوہر' کاروبار میں مصروف ہوتے جارہے ہیں' کوئی جو ہم سے زیادہ بڑا نظام سنبھالے ہوئے ہے' وہ ہمارے پلٹنے کا انتظار کرتا ہوگا۔ بے نیاز ہے وہ' فرق اسے نہیں پڑتا' مگر وہ ہمارے لیے ہم سے محبت کرتا ہے۔ ہم بھی اپنے لیے ہی اس سے محبت کرتے ہیں ویسے۔

اور اگر ہم... کبھی بھولے بھٹکے سے لوٹ آئیں تو ہم ایک کام کرتے ہیں "دعا" اس کو پکارنا... اور وہ تین کام کرتا ہے۔

اس آیت کے بقول وہ تین کام کرتا ہے... دعا کا جواب دیتا ہے... تکلیف کو دور کرتا ہے اور ہمیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے۔

ہم کمزوروں کو اگر کوئی چیز اتھارٹی' انصاف اور طاقت دلا سکتی ہے' کنٹرول عطا کرسکتی ہے تو وہ صرف دعا ہے۔ لاچار کی لاچاری ہٹے گی' مصیبت زدہ کی دور ہوگی' تب ملے گی اس کو خلافت۔ کونے میں پڑے ڈپریسڈ لوگوں کو نہیں ملتا کنٹرول۔ ہمیں سستی اور غفلت سے خود نکلنا ہوگا۔ اپنے ڈپریشن سے نکلنا ہوگا۔ اپنی پشیمانیوں سے' اپنے اندر کے اندھیروں سے... اس کے بعد ملے گا ہمیں اختیار۔ کہ معاف کرتے ہیں یا سزا دیتے ہیں۔ پھر ہم دیں گے سزا جسے ہم چاہیں' اور معاف کریں گے جسے ہم چاہیں۔ اور فسادیوں اور اپنے درمیان بنائیں گے ذوالقرنین کی دیوار' جب ہم چاہیں۔ ایسا اختیار پانے کے لیے ہمیں اپنی تکلیف سے نکلنا ہوگا' اور تکلیف سے ہمیں دعا نکالے گی۔ خواہشوں کا مل جانا نہیں نکالے گا۔ میرا یہ کام ہوجائے مجھے اتنا مال یا اولاد مل جائے تب زندگی پہ میرا "کنٹرول" ہوگا' نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ہمیں مضبوط اور پراعتماد زندگی دعا سے ملے گی۔ دعا کیا کرو بچے۔ یہی تمہارے کام آئے گی۔"

وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ لکھ رہی تھی گویا وہ سن رہا ہو۔ گویا وہ پڑھ رہا ہو۔ چلو' کبھی تو پڑھے گا۔ شاید تب وہ ایسی کوئی سطر ڈھونڈ لے جو اسے کرب سے نکال لائے۔

دیوار کے اس پار ندرت اپنے کمرے میں بچھے نماز والے تخت پہ بیٹھی' نماز ادا کررہی تھیں۔ وہ گھٹنوں کے مسئلے کے باعث دائیں ٹانگ سیدھی لٹاتیں اور بایاں پیر نیچے زمین پہ رکھتیں۔ یوں اس حالت میں سینے پہ دونوں ہاتھ باندھے وہ عشاء کے وتروں کی آخری رکعت میں تھیں۔ ان کی نگاہیں تخت پہ بچھی نماز کی محراب پہ جمی تھیں اور روٹین کے انداز میں وہ کلمات ادا کررہی تھیں۔ کمرے کا دروازہ ان کی پشت پہ تھا' تب ہی جب انہوں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی پھر کسی نے دھیرے دروازہ بند کیا تھا۔ ان کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔ وہ تسبیحات ادا کرتی رکوع میں جھکیں۔

"ان کے ابا کے گھر کا صحن بہت بڑا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں سے اٹا ہوا۔ وہاں صحن میں سب نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔"

رکوع میں جھکے جھکے ندرت کو خیال آیا تھا۔ ان کے گھٹنوں پہ رکھے ہاتھ کپکپائے۔ لبوں سے تسبیحات بمشکل ادا ہو پائیں۔

"ابا اپنے ابا جی کا قصہ اکثر سنایا کرتے تھے۔ کہ وہ اسی صحن میں اسی درخت تلے نماز پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ کہیں سے بچھو نکل آیا۔ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ نانا کے ابا جی نہیں ہلے۔ نماز ادا کرتے رہے۔ بچھو نے ان کو ڈنک مار دیا۔ ایک دفعہ۔ دو دفعہ۔ وہ نہیں ہلے۔"

کوئی ان کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔ ندرت بے وقت خود کو روک پائیں۔ سجدے کی جگہ پہ دھند سی اتر آئی۔ کوئی آنسو گال پہ چمکا تھا۔ لب اللہ اکبر کہتے ہوئے کپکپائے۔

"وہ اپنی نماز مکمل کرتے رہے۔ بچھو نے ان کو کئی ڈنک مارے۔ تعداد مجھے یاد نہیں۔ مگر سلام پھیر کر وہ گر گئے۔ ان کو ہسپتال لے جایا گیا۔ معجزاتی طور پہ ڈنک

نے ان پہ زیادہ اثر نہیں کیا تھا۔ وہ بچ گئے۔" ندرت نے کپکپاتے ہاتھ سجدے کی جگہ رکھ کر جھکتے ہوئے سجدہ ادا کیا۔

(پاک ہے میرا بہت اعلا رب۔۔۔)

"ابا کہتے تھے کہ انسان نماز نہیں توڑ سکتا۔ وہ بحث کرتی تھیں کہ فتویٰ کہتا ہے توڑ سکتے ہیں۔ مگر ابا کہتے تھے تقویٰ کہتا ہے نہیں توڑنی چاہیے۔"

سجدہ کی جگہ پہ چہرہ اور کندھے جھکائے (وہ ماتھا نہیں ٹیک سکتی تھیں کہ اتنا جھکنا ممکن نہ تھا) تسبیحات لرزہ خیز آواز میں ندرت کے لبوں سے نکل رہی تھیں۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے جارہے تھے گرتے جارہے تھے۔ سارا منظر دھندلا گیا تھا۔ وہ ان ہی تسبیحات کو دہرا دہرا کر پڑھ رہی تھیں۔

"انسان کو واقعی نماز نہیں توڑنی چاہیے۔ ایک یہی وہ حالت ہوتی ہے جس میں آپ کو دیکھ کر لوگ فوراً سے رک جاتے ہیں۔۔۔ انتظار کرلیتے ہیں۔ کسی کی جرات نہیں ہوتی کہ آپ کو مخاطب کرلے۔ کوئی آپ کو اشارہ تک کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ آپ اپنے رب کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، اور مسلمانوں کو اتنا خوف تو ہوتا ہے نا کہ کسی بندے اور اس کے رب کے درمیان نہ آئیں۔"

ندرت نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا اور تکبیر پڑھ کر دوبارہ سجدے میں جھکیں۔ آنسوؤں نے سارا منظر دھندلا دیا تھا۔ لبوں سے الفاظ سسکیوں کی صورت نکل رہے تھے۔ وہ بار بار تسبیحات کی تعداد بھول رہی تھیں، سو ان کو دہرائے جارہی تھیں۔ بار بار۔۔۔ بار بار۔۔۔ ان کو بس یہ محسوس ہو رہا تھا کوئی ان کے قریب بیٹھ رہا ہے۔

ندرت نے کندھے سیدھے کیے۔ ہاتھ گھٹنوں پر رکھے اور التحیات پڑھنے لگیں۔ پھر سلام پھیرا۔۔۔

"کوئی کسی کی نماز میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔۔۔ سوائے ایک کے۔۔۔ اور اس ایک کو تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رعایت دی ہے۔۔۔"

"اور وہ ایک۔۔۔" وہ ان کے بائیں گھٹنے کے ساتھ زمین پہ بیٹھا تھا۔ ندرت کو بس اتنا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک لڑکا ان کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس کا سر جھکا ہے۔"

"اور وہ ایک ہوتا ہے۔۔۔ بچہ! اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نواسی کو اٹھا لیتے تھے نماز میں۔۔۔ سو میں سوچتا ہوں امی! کہ اگر کوئی بچہ اپنی ماں کے پاس آئے۔۔۔" وہ بھیگی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ندرت کے لبوں سے الفاظ ہچکیوں اور سسکیوں کی صورت بلند ہونے لگے۔

"اگر کوئی بچہ اپنی ماں کے پاس آجائے اور وہ۔۔۔ اور وہ رو بھی رہا ہو۔۔۔ تو امی اس کی ماں کو اجازت ہے کہ وہ اپنے بچے کو اٹھالے۔۔۔ اور پھر اپنی نماز مکمل کرلے۔۔۔ امی! اللہ تعالیٰ اپنی نماز کے دوران بھی کسی کو اس کے بچے سے تکلیف کے عالم میں دور نہیں کیا کرتا۔۔۔ اتنی اجازت تو ہے امی۔۔۔"

وہ ان کے گھٹنے پہ سر رکھ کر رونے لگا تھا۔ بالکل بچوں کی طرح۔ پھوٹ پھوٹ کر۔ بلک بلک کر۔ ندرت کی آنکھیں ہنوز بہہ رہی تھیں۔

وہ اسی طرح ان کے گھٹنے پر سر رکھے رو رہا تھا۔ آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان۔۔۔ آہوں اور سسکیوں کے درمیان۔۔۔ وہ کیا دیکھ رہی تھیں۔۔۔ وہ کیا سن رہی تھیں۔۔۔ ان کو معلوم نہ تھا۔۔۔ منظر دھندلا تھا۔۔۔ مگر وہ اس کا چھوٹے کٹے بالوں والا سر اٹھا کر جھک کر اس کا چہرہ چومنے لگی تھیں۔

"میرا سعدی۔۔۔ میرا بیٹا۔" وہ اس کو پیار کررہی تھیں، اس کو دیوانہ وار خود سے لگائے چوم رہی تھیں، اور وہ روئے جارہا تھا۔ سارے منظر دھندلے تھے۔۔۔ گیلے تھے۔۔۔ آنسوؤں سے تر تھے۔۔۔ صرف ایک آواز آتی تھی۔۔۔ "میرا سعدی۔۔۔ میرا بیٹا۔"

دوسرے کمرے میں موجود زمر اس سب سے بے خبر لیپ ٹاپ آف کرکے اٹھی اور پھر سیل دیکھا۔ قدرے فکرمندی سے اس نے کال ملا کر فون کان سے لگایا۔

"کدھر ہو؟"

"آج تو بہت مس کر رہی ہیں۔ خیریت!" وہ مسکرا کر بولا تھا۔ غالباً ڈرائیو کر رہا تھا۔

"گیٹ لاک کرنا ہے۔ اور کوئی بات نہیں ہے۔" وہ خفگی سے کہتی بیڈ کی چادر خواہ مخواہ جھاڑنے لگی۔

"میں سوچ رہا تھا آج ہم ڈنر باہر کریں۔"

"ڈنر کا وقت دو گھنٹے پہلے گزر چکا' فارس غازی۔ اب آپ شریف انسانوں کی طرح گھر تشریف لے آیئے۔"

"فوڈلی ایور آفٹر ہمارے لیے چوبیس گھنٹے کھلا ہوتا ہے مادام۔ چابی ہے میرے پاس۔ آپ تیار ہو جائیں' میں آپ کو پک کر لوں گا۔"

وہ رک گئی۔ "اس وقت تو نہ کوئی شیف ہو گا نہ بیرا' پھر؟"

"شیف آپ بن جائیں گی' بیرا میں بن جاؤں گا۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ زمر کے لبوں پہ مسکراہٹ آرکی۔

"اگر یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے کوکنگ کروں تو گھر آجاؤ۔"

"مجھے معاف کیجیے۔ گھر میں پورے خاندان کے سامنے نہیں میں کوکنگ کروانے والا آپ سے۔ تیار ہو جایئے۔ میں آنے والا ہوں۔"

"اچھا یہ بتاؤ' کیا بنواؤ گے مجھ سے۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اسٹیک۔ کسی بھی قسم کی۔" پھر رکا۔ "آپ کو بنانی آتی ہیں نا؟"

"شیور۔ مسئلہ ہی کوئی نہیں۔"

ادھر اس نے فون رکھا' ادھر زمر نے جھٹ گوگل کھولا۔ دو چار تراکیب کے اسکرین شاٹس لیے' پھر جلدی سے الماری کھولی اور چند ہینگرز الٹ پلٹ کیے۔ ایک سیاہ سلک کی لمبی قمیص نکالی جس کے گلے پہ ننھے ننھے موتی لگے تھے۔ یہ ٹھیک رہے گی۔ اور جلدی سے تیار ہونے چلی گئی۔

وہ کار باہر گیٹ تک لایا اور سیل نکال کر اسے کال کرنے لگا۔ زمر نے کال کاٹ دی' یعنی وہ آرہی تھی۔

فارس نے فون کان سے ہٹایا اور دوبارہ سے ان باکس میں موجود پیغام پڑھا۔

"سر' ریسٹورنٹ میں' میں نے کسی کو جاتے نہیں دیکھا' لیکن اوپری منزل کی بتی جلی ہوئی ہے۔ شاید وہ لڑکا آگیا ہے۔" فارس کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"زمر بی بی' آپ شیف بننے والی ہیں' دو بیرے حاضر ہوں گے آپ کے لیے۔"

اور دوسرے بیرے سے ہی اس کی سرپرائز ملاقات کروانے وہ جا رہا تھا۔ وہ کتنی خوش ہو گی' سوچ کر ہی اسے مزہ آرہا تھا۔

موبائل یکدم زوں زوں کرنے لگا۔ فارس نے دیکھا۔

"آبدار کالنگ۔" اس نے کال کاٹ دی۔

پھر ایک پیغام موصول ہوا۔ "کیا آپ اس وقت آسکتے ہیں میرے پاس؟ پلیز مجھے آپ کی ضرورت ہے۔"

اس کے بعد کالز پہ کالز آنے لگیں۔ اس نے اکتا کر فون ہی سائلنٹ پہ لگا دیا۔ تب ہی گیٹ کھلا اور وہ باہر آتی دکھائی دی۔ سیاہ جھلملاتے لباس میں گھنگھریالے بال سمیٹ کر چہرے کے ایک طرف آگے کو ڈالے' ناک میں دمکتی سونے کی نتھ پہنے' وہ ایک سادہ مگر بے نیاز مسکراہٹ کے ساتھ چلی آرہی تھی۔

جب فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی تو وہ جو اسے ہی دیکھ رہا تھا' کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "اچھی لگ رہی ہو۔"

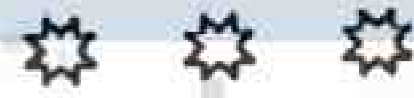
"میں بری لگی ہوں کیا کبھی۔" اس نے شانے اچکائے۔

چڑیل' گھنگھریالے بالوں والی ڈائن' سڑی ہوئی پراسیکیوٹر' جیسے وہ تمام القابات فارس کو یاد آئے جو کبھی میں لوگ اس کے بارے میں فرمایا کرتے تھے لیکن۔۔۔ وہ گہری سانس لے کر مسکرایا۔

"تو کوکنگ کریں گی آج آپ میرے لیے۔"

"اگر تم بیرا گیری کرو گے' تو ہاں!" وہ بھی سادگی سے مسکرائی۔ فارس نے سر کو خم دیتے ہوئے ایکسیلیٹر پہ پاؤں کا دباؤ بڑھایا اور گیئر کو حرکت دی۔ کار زن سے

آگے بڑھ گئی۔



ترے فراق کے لمحے شمار کرتے ہوئے
بکھر چلے ہیں ترا انتظار کرتے ہوئے

سبز بیلوں سے ڈھکا مورچال خاموش کھڑا تھا۔ اس کے اندر جاؤ تو ندرت ہنوز نماز والے تخت پہ تھیں اور وہ ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چہرے پہ تکان تھی، مگر آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔ ندرت ابھی تک رو رہی تھیں، بار بار اس کے چہرے اور سر پہ ہاتھ پھیرتیں۔

"بے غیرت نہ ہو تو، یہ بالوں کو کیا کرلیا ہے؟ ناں اتنے دن سے کدھر تھے؟ ماں کا خیال بھی نہیں آیا۔" کہتے کہتے اس کے سر پہ چپت لگائی۔ اس نے گہری سانس لی۔

"بس مارنا نہیں بھولتیں آپ ندرت بہن۔ شاپنگ کرتے وقت میرے لیے مایونیز لینا بھول جاتی ہیں لیکن۔ اگر پتا تھا کہ مجھے آنا ہے تو میں ناشتے میں کیا کھاؤں گا، اتنا تو سوچا ہوتا۔"

"لے آئی ہوں مایونیز، کیسے بھول سکتی تھی!" وہ اس کی بات کی گہرائی میں گئے بغیر آنسو پونچھتے بتا رہی تھیں۔ پھر گاڑی کی آواز آئی تو کھڑکی کی طرف دیکھا۔ سعدی نے انہیں اٹھنے سے روکا۔ "میں دیکھ چکا ہوں، فارس ماموں اور زمر ہیں، باہر گئے ہیں۔ ان کو ابھی نہ بلائیے گا۔ جانے دیں۔"

"اچھا مگر..." وہ پیر نیچے اتارتی چپل تلاش کرنے لگیں۔ "باقی سب کو تو بلاؤں حنین، اسامہ..." وہ اٹھ کھڑی ہوئیں تو وہ ان کے ساتھ باہر نکلا۔

اسامہ یوسف اس وقت گڈو بیگم کے کمرے میں اس کے سامنے بیٹھا تھا اور جمائیاں روکتا اس کو سن رہا تھا جو نہایت جوش و خروش سے بولے جا رہی تھی۔

"تم سوچ نہیں سکتے سیم! وہ جو گھر میں نے گوگل پہ دیکھے۔ وہ کوئی عالیشان محل نما گھر نہیں تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے گھر تھے، ان کے باتھ رومز تو ہمارے سے بھی چھوٹے تھے۔ مگر کس طرح ان کو سجایا گیا تھا، الامان۔ میں سمجھتی تھی خوب صورت گھر بڑے گھر ہوتے ہیں مگر مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ چھوٹے گھر زیادہ خوب صورت بنائے جا سکتے ہیں۔ اگر انسان کو سلیقہ آتا ہو۔"

"حنہ! صبح اس سلیقے پہ بات کرلیں گے۔ ابھی مجھے نیند آرہی ہے۔"

حنین نے اس کے سر پہ چپت رسید کی۔ "دو منٹ سکون سے بیٹھ کر میری بات نہیں سن سکتے؟ ابھی سعدی بھائی ہوتا نا تو..."

باہر سے کوئی شور سا بلند ہوا تھا۔ دونوں چونک گئے۔ ابا کی آواز... ابا کے رونے کی آواز۔ حنین اور اسامہ نے بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ننگے پیر بستر سے اتر کر باہر بھاگے۔ لاؤنج میں سب موجود تھے۔ ندرت نے صداقت اور حسینہ کو بھی بلوا لیا تھا۔ وسط میں صوفے پہ ابا کی وہیل چیئر رکھی تھی اور وہ روتے ہوئے کسی سے گلے مل رہے تھے۔ بول کچھ نہیں پا رہے تھے، بس آنکھیں بند کیے روتے جا رہے تھے۔ ان سے ملنے والا لڑکا سیاہ جیکٹ میں ملبوس تھا، مسکرا کر ان کے گلے لگ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ بال چھوٹے چھوٹے کٹے تھے، شیو بڑھی ہوئی تھی اور منہ کا زخم ویسا ہی تھا۔

حنین وہیں جم گئی۔ گویا پتھر کا بت ہو۔ آنکھیں شاک کے عالم میں کھلی رہ گئیں۔ سیم چیخ مارتا تیزی سے بھاگا اور پیچھے سے جا کر سعدی سے لپٹ گیا جو خود ابا سے گلے ملنے کی حالت میں جھکا ہوا تھا۔ سیم کے اس انداز پہ وہ ہنستے ہوئے الگ ہوا اور سیم کو بازو پھیلا کر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ صداقت خوشی خوشی پانی لے آیا کہ ابا کو پلائے۔ حسینہ (جس کو ندرت نے کھانا گرم کرنے کو کہا تھا) دوپٹہ دانتوں میں دبائے دلچسپی سے منظر نامہ دیکھنے لگی۔ (ان لوگوں کا بھی نا روز کوئی نیا ڈرامہ ہوتا ہے۔)

ساکت، متحیر، شل سی حنین کے لب بے اختیار مسکراہٹ میں ڈھلے۔ آنکھوں میں چمک سی ابھری۔

اور نمی بھی۔
وہ اب ہنستے ہوئے سیم کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتا ابا سے کچھ کہہ رہا تھا۔ (شاید یہ کہ سیم بڑا ہو گیا ہے۔)
حنین قدم اٹھاتی رہی۔
گویا برف کا صحرا تھا جس میں وہ قدم قدم چلتی جا رہی تھی۔

فاصلہ عبور کرتی جا رہی تھی۔
وہ مسافت کتنی طویل تھی....
وہ مسافت کتنی سرد، کتنی کٹھن تھی۔
اس کے پیر ٹھنڈے ہو کر جمنے لگے تھے مگر وہ بنا پلک جھپکے اس کو دیکھتی... آگے بڑھتی گئی۔
صوفے کنارے وہ رکی۔ "بھائی!" کسی نے اس کی پکار نہیں سنی۔ سیم اور ابا اب خوشی سے (آنسو پونچھتے) بات کر رہے تھے، ندرت کچن میں صداقت کو لیے چلی گئی تھیں۔ صرف سعدی نے گردن اٹھائی، پھر چہرہ موڑ کر اسے دیکھا جو اس کی پشت پہ کھڑی تھی۔ اس کا کپکپاتا ہاتھ صوفے پہ جما تھا اور مسکراتی متحیر نظریں سعدی پہ۔
"کیسی ہو حنین؟ ٹھیک ہو؟ ابا! سیم کتنا بڑا ہو گیا ہے، کیا یہ اب آپ کی دوا کا خیال رکھتا ہے۔" وہ دو لفظ اس سے بول کر مڑ کر اپنے ساتھ لگے سیم کی بابت ابا سے مسکرا کر دریافت کرنے لگا۔ جواب میں سیم اسے اپنی کارکردگی بتانے لگا اور ابا ہنستے ہوئے اس کی تائید کرنے لگے۔ "یہ میرا تمہاری طرح خیال رکھتا تھا۔"
ایسے میں صرف حسینہ نے محسوس کیا کہ پیچھے کھڑی حنین کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی ہے، اور وہ اسی طرح الجھی، متحیر سی کھڑی رہ گئی ہے۔ صوفے کی پشت پہ رکھا ہاتھ بھی گر گیا ہے اور وہ یک ٹک سعدی کی پشت کو دیکھ رہی تھی، جس نے دوسری نظر اس کو دیکھا تک نہیں تھا۔
کیا اس لیے پار کیا تھا برف کا صحرا کہ آخر میں سفید مجسمہ ہی بن جانا تھا؟

☆ ☆ ☆

کوئی قیس تھا تو ہو گا، کوئی کوہ کن تھا، ہو گا
مرے رنج مختلف ہیں مجھے ان سے نہ ملاؤ

رات کی سرد، پُرسکون خاموشی میں فوڈلی ایوپر آنٹر کی عمارت بھی ویران پڑی تھی۔ بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ پارکنگ خالی تھی۔ وہ دونوں کچن کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ زمر نے بتی جلائی تو کچن روشنی میں نہا گیا۔ وہ سیاہ لباس پہ سیاہ جیکٹ پہنے ہوئی تھی۔ اب جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گردن گھما کر طائرانہ نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔
"سو تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے کچھ بناؤں۔" مسکراہٹ دبا کر پوچھا تو وہ جو کچھ کہنے لگا تھا، فون کی تھرتھراہٹ پہ ٹھہرا، اثبات میں سر ہلایا اور فون نکال کر دیکھا۔ آبدار کی 25 مسڈ کالز۔ لیکن ابھی فون حنین کے نام سے جل بجھ رہا تھا۔ اس نے اسے کان سے لگایا۔ "ہاں حنہ، بولو۔" زمر آستین پیچھے کو موڑتی فریج کی طرف بڑھ گئی تھی اور اسے کھولے جھک کر مختلف اشیاء الٹ پلٹ کرنے لگی۔
"آپ نے بتایا ہی نہیں بھائی کے آنے کا۔" وہ کچھ ناخوش، الجھی الجھی لگ رہی تھی۔
فارس بری طرح چونکا۔ "تمہیں کیسے پتا؟ کیا سعدی نے کچھ کہا ہے؟" زمر اس نام پہ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔
"کچھ نہیں کہا، یہی تو غم ہے۔"
"حنین کیا کہہ رہی ہو؟" وہ ٹھٹکا۔
"بھائی گھر آ گیا ہے۔ اس وقت وہ لاؤنج میں امی کے ساتھ...." فارس نے پوری بات سنے بغیر بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ نیچے گرایا اور ایک دم چہرہ اٹھا کر دروازے کو دیکھنے لگا۔
"اگر وہ وہاں ہے تو یہاں کون ہے؟" وہ بڑبڑایا۔ زمر مڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، ساتھ ہی وہ مسلسل چونکی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم بالکل بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ "تم یہیں رکو۔ میں آتا ہوں۔"
"فارس! کیا ہوا ہے؟"
"گارڈ نے مجھے کہا، سعدی ادھر ہے، مگر.... تم یہیں

رکو۔" وہ برہمی سے کہتا باہر نکلا تو وہ فکرمندی سے پیچھے آئی۔

وہ ریسٹورنٹ کے اندھیر اور سنسان پڑے لاؤنج میں بے قدموں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا بریٹا پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور تاک کر ادھر ادھر دیکھتا وہ کسی کی تلاش میں تھا۔ اندھیرے میں فارس کا ہیولہ دکھائی دیتا تھا جسے وہ فکرمندی سے دیکھے گئی۔ فارس اوپری ہال کا دروازہ دھیرے سے دھکیلتا اندر جا رہا تھا۔ زمر کھڑی رہی، کیونکہ اس نے کہا تھا وہ یہیں رکے۔ اور پھر اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس کی گردن کی پشت کو کسی ٹھنڈی چیز نے چھوا تھا۔ پستول کی نال جیسی ٹھنڈی۔ وہ منجمد ہو گئی۔ مڑ بھی نہ سکی۔

"ہلنا مت، ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔ پچھلی دفعہ کمر میں ماری تھی، اس دفعہ کھوپڑی کے پار جائے گی۔" وہ اس آواز کو پہچانتی تھی، صرف پانچ برس قبل اس فون کال پہ نہیں پہچان سکی تھی۔

"اب آہستہ سے مڑو۔" دوسرا حکم جاری ہوا۔ وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گویا پتھر کے بت کی طرح گھومی۔ دھیرے سے اب اس کے مخاطب کا وجود سامنے آیا۔

کوٹ اور اونی ٹوپی میں ملبوس بڑھی شیو والا کرنل خاور اس پہ پستول تانے اسے گھور رہا تھا۔ زمر نے جواباً" اس کو بھی ان ہی نظروں سے دیکھا۔ پرسکون مگر چبھتی ہوئی نظریں۔

"اب اس کرسی پہ بیٹھ جاؤ۔" اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی جو اس نے میز پہ ڈال دی اور ایک کرسی کھینچ کر کچن کے وسط میں رکھی، اسے دوبارہ اشارہ کیا تو وہ اسے دیکھنے لگی۔

"تم نے اس کے پہرے دار کو خرید لیا اور اس کے نمبر سے فارس کو میسج کیا، تاکہ وہ ادھر آئے، تم نے اسے سعدی کا جھانسا دیا؟ ہے نا؟"

"بیٹھ جاؤ ڈی اے۔" اس نے غرا کر کہا۔ وہ کرسی پہ آ بیٹھی۔ گھٹنے ملائے۔ ہاتھ بدستور جیبوں میں تھے۔

"اب اس ہتھکڑی کو دونوں ہاتھ پیچھے کر کے پہنو۔" اس نے اگلا حکم دیا، ساتھ ہی بار بار دروازے کو دیکھتا گیا۔ وہ نہیں ہلی، بس گردن اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے ترس آتا ہے تم پہ۔۔۔"

"پہنو زمر صاحبہ!" وہ گھرک کر بولا۔ زمر نے جواباً" جیبوں سے بند مٹھیاں نکال کر ان کو کرسی کے پیچھے لے جا کر ملایا، مگر ہتھکڑی کو نہیں چھوا۔ "میں اپنے ہاتھوں سے خود کو ہتھکڑی نہیں لگاؤں گی۔ میں دوسروں کو ہتھکڑی لگوایا کرتی ہوں۔"

"لگتا ہے زمر صاحبہ! آپ نے پانچ سال پہلے والے واقعے سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔" وہ ہتھکڑی اٹھا کر اس کے پیچھے گیا اور جھک کر اس کے ہاتھ تھامنے چاہے۔ صرف ایک لمحے کے لیے وہ جھکا تھا، صرف ایک لمحے کے لیے۔۔۔ مگر وہ اٹھ نہیں سکا کیونکہ پیچھے سے اس کے سر پہ پستول کا دستہ زور سے لگا تھا۔ نازک حصے پہ لگنے والی چوٹ کے باوجود وہ گرا نہیں، بلکہ اسی پھرتی سے پلٹا اور پوری قوت سے سے پیچھے کھڑے فارس کے منہ پہ مکا دے مارا۔ فارس کا توازن بگڑا تو وہ پیچھے کو لڑھکا، لیکن پھر دوبارہ خاور کو گریبان سے پکڑ کر میز پہ کمر کے بل گرایا۔ زمر اب تک اٹھ کر سامنے دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی، تم میری بیوی کے قریب آؤ۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟" وہ سرخ بھبھوکا چہرہ لیے اس کے سینے پہ دباؤ ڈالے اس کے منہ پہ زور زور سے مکے مار رہا تھا۔ خاور کو دھندلا سا اپنے اوپر جھکا فارس نظر آ رہا تھا اور پھر اس کے کندھے کے پیچھے آ کر رکتی زمر۔

"بس کرو فارس، وہ مر جائے گا۔" پھر اندھیرا تھا۔ گناہوں جیسا سیاہ اندھیرا۔۔۔

منظر ہنوز دھندلا تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ چھت پہ لگا ایک سفید بلب جل رہا تھا۔ اس نے گردن سیدھی کی۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا چہرے اور گردن تک نمی سی چپکی ہو۔ شاید اس کا خون تھا۔ اس نے پھر سے آنکھیں جھپکیں۔ کندھے

سیدھے کیے۔ تب محسوس ہوا کہ دونوں ہاتھ دائیں بائیں دیوار سے بندھے ہیں۔ شاید گیس پائپ کے ساتھ۔ اس نے کلائیاں کھینچیں، مگر وہ ہتھکڑیوں میں کسی ہوئی تھیں۔ گویا وہ کسی صلیب پہ کھڑا ہوا تھا۔ صلیب کے نشان کی سی صورت بندھا کھڑا تھا۔ بھاری پلکیں اٹھا کر اس نے دیکھا۔

کچن کے دوسرے کونے میں وہ دونوں کھڑے نظر آرہے تھے۔ مرد اور عورت۔ مرد کی اس طرف پشت تھی اور وہ دونوں ہلکی بھنبھناہٹ کے ساتھ آپس میں بات کررہے تھے۔ اس کے مختل ہوئے حواس جاگنے لگے۔ گردن کو دائیں بائیں گھما کر ایکسرسائز کے انداز میں گویا تازہ دم کیا، پھر آواز لگائی۔ "مجھے مارنے کے لیے ادھر باندھا ہے کیا؟"

فارس گھوما اور پستول اٹھائے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس تک آیا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔ آنکھوں میں خون اترا ہوا لگتا تھا۔ "ایک لفظ نہ نکالنا منہ سے، ورنہ میں واقعی تمہیں گولی ماردوں گا۔"

"اچھا..." زخمی چہرے اور سوجی آنکھ والا خاور ہنسا۔ ہنستے ہنستے سر جھٹکا۔ "تم نے میری زندگی برباد کردی اور اب یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہیں جانے دوں گا؟"

"ہم نے تمہاری زندگی برباد نہیں کی۔" زمر ناگواری سے کہتی دو قدم آگے آئی۔ "تم نے ہمیں نقصان پہنچایا ہے کرنل خاور..."

خاور کی نظریں زمر سے ہوتی فارس تک گئیں۔ "بیوی کو نہیں بتایا کہ تم نے اور سعدی نے میرے ساتھ کیا کیا؟ آبدار کے ذریعے تم نے اسے پیغام بھجوایا، ہامان کو سولی چڑھادو۔ وہ کاغذ مجھے اس لڑکے کے سامان سے جلد مل گیا تھا۔ پھر سعدی نے زمر صاحبہ! میرے اوپر الزام لگایا کہ میں نے اورنگ زیب صاحب کو قتل کیا ہے اور پھر جب وہ مجھے چکمادے کر بھاگ نکلا تو یہ اس کے پیچھے آیا تھا۔ ایک پارک میں۔ آبدار صاحبہ کے ساتھ۔ سی سی ٹی وی فوٹیج میں دیکھا تھا میں نے تمہیں فارس غازی... اور تمہارا سارا گیم سمجھ گیا تھا میں۔ ابھی اگر موقع ملتا تمہاری بیوی کو یرغمال بنانے کا تو تم سے اعتراف بھی کرالیتا۔" پستول والا ہاتھ زور سے اس کے منہ پہ پڑا تھا۔ خاور کا چہرہ گھوم گیا۔ کنپٹی سے خون بھل بھل گرنے لگا۔ لیکن اس نے فوراً "مسکراتا چہرہ واپس موڑلیا۔

زمر چونک کر فارس کو دیکھنے لگی۔ یہ انکشاف اس کے لیے نئے تھے۔

"میرا آدمی کہاں ہے؟ تم کس ارادے سے یہاں آئے تھے؟" اس پر پستول تانے وہ غرا کر پوچھ رہا تھا۔

"اسے کہیں جھاڑیوں میں مار گرایا تھا، وہیں پڑا ہوگا۔ مگر ظاہر ہے، پہلے اس سے میسیج کروایا تھا۔ میں چاہتا تھا تم پورے خاندان کے ساتھ آؤ اور ہم تمہارے کسی بوڑھے یا بچے کو درمیان میں رکھ کر بات کریں۔ تم کیس تک واپس لے لیتے اگر میں آج یہ کرلیتا۔"

فارس نے جواب نہیں دیا۔ وہ پستول اس پہ تانے اسے سرخ آنکھوں سے گھورتا رہا، زمر جو پہلے اچنبھے سے فارس کو دیکھ رہی تھی، اب اس کے چہرے پہ تشویش پھیلنے لگی۔ "فارس۔" اس نے دھیرے سے پکارا، مگر وہ اسی طرح خاور پہ نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

"تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟ کیوں آئے تھے تم یہاں اس وقت؟"

"تمہیں کمپرومائزنگ پوزیشن میں لانا چاہتا تھا، لیکن بونس کے طور پہ مجھے کیا ملا؟" اس نے لال انگارہ آنکھوں کا رخ زمر کی طرف پھیرا۔ "مسز زمر کے تمام ڈاکومنٹس جو اور فائلز میں لگے ہوئے ہیں۔ ہاشم کے لیپ ٹاپ کی فائلز۔ اب مجھے صرف جاکر ہاشم کو یہ بتانا ہے اور وہ ان ڈاکومنٹس کا توڑ کرلے گا۔"

"یہ تب ہوگا جب تم زندہ یہاں سے جاؤ گے۔"

فارس کی اس پہ گڑی آنکھوں میں مزید سرخی اترنے لگی۔ وہ بنا پلک جھپکے، بازو لمبا کرکے پستول اس پہ تانے، بالکل بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا۔ اس کا تنفس تیز تھا، کان سرخ تھے اور اندر سے گویا کوئی آگ نکل رہی تھی۔

"فارس۔۔۔" اس کے قریب کھڑی زمر نے بے چینی سے پکارا۔۔۔ "ظاہر ہے وہ زندہ یہاں سے جائے گا۔ اس کو جانے دو۔"

"نہیں۔۔۔" اس پہ نظریں جمائے فارس غازی نے دائیں بائیں گردن ہلائی۔ زمر کی رنگت فق ہوئی۔ البتہ خاور کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیلی۔

"تم مجھے مارنا چاہتے ہو؟ تمہیں لگتا ہے میں زندہ ہوں؟ میں تو غازی اسی دن مر گیا تھا' جب بازار میں میرے دو بیٹوں کو گولیاں ماری گئی تھیں۔ یہ اتنے برس میں زندہ تو نہیں تھا۔"

"خاور پلیز' چپ ہو جاؤ۔" زمر نے بات کاٹی' مگر اس کی کوئی نہیں سن رہا تھا۔

"مارنا چاہتے ہو مجھے؟ چلو آؤ مارو مجھے۔" دیوار سے بندھے خاور نے سر کے اشارے سے گویا اسے چیلنج کیا۔

فارس پستول اس پہ تانے دو قدم آگے بڑھا۔

زمر احتیاط سے اس کے ذرا قریب آئی۔ "فارس! اس کو جانے دو۔"

"تمہیں مجھے مار ہی دینا چاہیے' کیونکہ ہاشم کے بغیر میری کوئی زندگی نہیں ہے۔ تم نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا' اب زندگی بھی لے لو۔ آؤ نا غازی۔ مار دو مجھے۔ چلاؤ گولی۔"

"فارس! اس کی بات مت سنو۔ اس کو جانے دو۔" زمر نے بے چینی سے پکارا۔

"تمہارے بھائی کو میں نے اپنے ان ہی ہاتھوں سے مارا تھا' ایسے ہی باندھ کر۔" وہ اپنی کسی ہوئی مٹھیاں بھینچ کر بتا رہا تھا۔

"میرے بھائی کا نام مت لو۔" وہ آنکھیں اس پہ مرکوز کیے غرایا۔

"کیوں نہ لوں؟" خاور اسے دیکھتے ہوئے تلخی سے بولا۔ "تم اس کے قتل کا بدلہ لینا چاہتے ہو مجھ سے' تم مجھے اور ہاشم کو قتل کرنا چاہتے تھے نا۔ لو اب کر لو۔"

فارس کو وہ اپنے سامنے دیوار سے بندھا نظر آ رہا تھا۔ اس منظر میں سرخی بھی تھی' دھندلاہٹ بھی اور اس منظر میں چند دوسرے مناظر بھی ابھر رہے تھے۔ پنکھے سے لاش جھول رہی تھی' جسے وہ دوڑ کر پیروں سے پکڑ رہا تھا۔ دو چھوٹی چھوٹی بچیاں ایک کفن میں لپٹے شخص کے سرہانے رو رہی تھیں' ننھی ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ رہی تھیں۔

"گولی چلاؤ غازی۔ بدلہ لو اپنے بھائی کا۔ زرتاشہ کا۔ زمر کا۔ سعدی کا۔ لو مجھ سے بدلہ۔ جیسے میں نے لیا تھا۔ جب اس بریگیڈیئر اور اس کے پورے خاندان کو مار ڈالا تھا۔ تب میں وہ بنا تھا جو آج میں ہوں اور آج تم میرے جیسے بنو گے۔"

فارس کے سامنے منظر ویسا ہی تھا۔ سرخ' دھندلا سا۔ وہ اسپتال کے بیڈ پہ سفید چہرے' بند آنکھوں اور سیاہ بالوں والی لڑکی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے' چہرہ شکستگی کے عالم میں جھکائے ہوئے تھا۔ اس لڑکی کا ہاتھ بہت ٹھنڈا اور بے جان تھا۔

"چلاؤ گولی' مار دو مجھے۔"

"فارس! اس کی مت سنو۔ یہ تمہارے جذبات سے کھیلنا چاہ رہا ہے۔" وہ فکرمندی سے کہتی اس کے مزید قریب آئی۔ ایک ایک قدم احتیاط سے رکھ رہی تھی۔ "تم اس کو نہیں مارو گے۔ تم اس کی جان نہیں لو گے۔ تم قاتل نہیں ہو فارس۔۔۔"

فارس نے جواب نہیں دیا۔ اسی طرح خاور پہ نگاہیں جمائے کھڑا رہا۔ خاور نے ہلکے سے ہنس کر سر جھٹکا۔

"مجھے معلوم تھا تم مجھے نہیں مارو گے۔ چلو مجھے غلط ثابت کرو۔ چلو مجھے جہنم میں پہنچا دو۔ ہمت ہے؟ غیرت ہے؟ ہے یا نہیں فارس غازی؟ مرد بنو!" وہ غرایا تھا۔

فارس کا تنفس تیز ہونے لگا۔ آنکھوں کی تپش شراروں میں بدلنے لگی۔

"فارس اس کی بات مت سنو۔ یہ قاتل ہے۔ اس کی زندگی بے کار ہو چکی ہے' اس لیے چاہتا ہے تم اس جیسے بن کر جیل چلے جاؤ۔ فارس تم اس کو نہیں مارو گے۔ میری بات سنو۔ فارس میری بات سنو۔" وہ اس

سے التجا کر رہی تھی۔ وہ پانچ سال پیچھے چلی گئی تھی اور وہ فون پہ فارس سے بات کر رہی تھی۔ زمان و مکان کی حدود آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

"مجھے ایک گولی مارو فارس۔۔۔ دل میں۔۔۔" وہ اسے اکسا رہا تھا۔ وہ تینوں ہمیشہ سے تکون میں تھے۔ پانچ سال سے وہ اس تکون میں قید تھے۔ آج وہ تکون پھر سے واپس آگئی تھی۔

"فارس تم اس کو نہیں مارو گے۔" آنسو زمر کی آنکھوں سے ابل رہے تھے۔ وہ اس سے تین قدم دور کھڑی اس کی منت کر رہی تھی۔ "اگر تم نے اسے مار دیا تو تم اس جیسے بن جاؤ گے ہم قاتل بن جاؤ گے۔ تم اپنی معصومیت کھو دو گے۔ نہیں ہو تم کافر۔۔۔ ماکر۔۔۔ کاذب۔۔۔ قاتل۔ نہیں ہو تم مجرم۔ تم بے گناہ تھے' لیکن اگر اس کو مارا تو نہیں رہو گے۔"

"اس نے۔۔۔" وہ بولا تو آواز عجیب غراہٹ کی صورت حلق سے نکلی۔ "میرے بھائی۔۔۔ اور میری بیوی کو مارا۔۔۔ میں انہیں نہیں بچا سکا۔ اس نے۔۔۔ انہیں مارا۔" پستول مزید تان لی۔ اس کا پستول والا ہاتھ پسینے میں شرابور تھا۔

"مگر تم اس کی جان نہیں لے سکتے فارس! سرکار جان لے سکتی ہے' شہری نہیں۔ یہ حق دفاع نہیں ہو گا' کیونکہ یہ آدمی تمہیں مارنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ یہ کسی دوسرے کی جان بچانے کے لیے بھی نہیں ہو گا۔ یہ "مارنا" نہیں ہو گا۔ یہ "قتل کرنا" ہو گا۔ کولڈ بلڈ میں قتل یہ جرم ہے۔ یہ گناہ ہے۔ فارس پلیز تم اس کو جانے دو۔ میری بات سنو۔"

وہ پانچ سال پہلے کی طرح اس کی منت کر رہی تھی۔ آنسو اس کے گالوں پہ بدستور پھسل رہے تھے۔

"رک کیوں رہے ہو فارس غازی؟ مارو مجھے۔ چلاؤ گولی' مرد بنو۔"

وہ دیوار سے بندھا شخص نفرت سے اسے دیکھتا پکار رہا تھا۔ اکسا رہا تھا۔ فارس کی گرفت ٹریگر پہ مضبوط ہوئی۔

"مجھے۔۔۔ بدلہ لینا ہے۔۔۔ اپنے بھائی کا۔۔۔ اپنی بیوی کا۔۔۔"

"میری بات سنو فارس۔۔۔" وہ ملتجی سی کہہ رہی تھی۔ "تم اس کو نہیں مارو گے۔ تم اس جیسے نہیں بنو۔ تم نے اسے مارا تو یہ جیت جائے گا' اس کے پاس چوائس تھی برسوں پہلے' یہ چاہتا تو نہ مارتا اپنے بچوں کے قاتل کو' مگر اس نے مار دیا۔ یہ تب ایسا بن گیا۔ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اس کے پاس چوائس نہیں تھی۔ یہ پرسکون ہو کر مرنا چاہتا ہے۔ تم اس کو وہ سکون مت دو۔ ہر قابیل کا مرنا ضروری نہیں ہوتا۔ تم سن رہے ہو فارس؟" وہ درد سے چلا کر بولی تھی۔ "تم اللہ نہیں ہو۔ تم قصاص مانگ سکتے ہو۔ تم انتقام نہیں لے سکتے۔ تم خون کا انتقام نہیں لے سکتے۔ تم انسان ہو۔ انتقام میں تم اس کی زندگی تباہ کرو' اس کی پراپرٹی کو آگ لگاؤ' اس کی عزت کو نقصان پہنچاؤ' تم یہ سب کر سکتے ہو' مگر کسی کی جان لینا۔۔۔ وہ لکیر پار کرلینا۔۔۔ یہ غلط ہے' تم یہ نہیں کرو گے۔"

"مرد بنو فارس غازی۔۔۔" وہ بھی مسلسل اس کو استہزائیہ انداز میں دیکھتا اکسا رہا تھا۔ فارس دانت ایک دوسرے پہ جمائے' اسے گھورتے ہوئے اس پہ پستول تانے کھڑا رہا' کھڑا رہا' کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ زمر کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ اس کے ساتھ کھڑی تھی' مگر قدم آگے نہیں بڑھا سکتی تھی کہ کہیں وہ کچھ کر نہ ڈالے۔

"کلک۔۔۔ کلک۔۔۔" سائلنسر لگے پستول کا ٹریگر فارس نے ایک دم دبایا۔ یکے بعد دیگرے۔۔۔ دو گولیاں۔۔۔ زمر کا دل بند ہوا۔۔۔ خاور نے آنکھیں بند کرلیں۔ مگر ایک جھٹکے سے اس کی ہتھکڑی ٹوٹی اور بازو نیچے گرے تو اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

فارس نے پستول شکستگی سے جھکا لیا تھا۔ اس نے گولیاں اس کی ہتھکڑیوں سے لگی زنجیر پہ ماری تھیں۔

"میں تمہیں نہیں ماروں گا کرنل خاور۔۔۔" وہ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتا نفی میں سر ہلا کر بولا تھا۔ "اس لیے نہیں کہ میں نے تمہیں معاف کیا' میں قیامت تک تمہیں معاف نہیں کروں گا' مگر اس لیے کہ میں۔۔۔ قاتل۔۔۔ نہیں ہوں۔۔۔ میں اللہ نہیں

ہوں۔"

خاور کے لیے یہ غیر متوقع تھا۔ اس کے بازو واپس پہلو میں گر چکے تھے' مگر وہ چند لمحے شل سا کھڑا رہا۔ زمر آنکھیں رگڑتی گہرے گہرے سانس لیتی خود کو پر سکون کرنے لگی' مگر آنسو ابل ابل رہے تھے۔

"تمہارے پاس چوائس تھی خاور۔ تب بھی تھی۔ میں اور تم۔۔۔ برابر نہیں ہیں۔" وہ نفرت سے اسے دیکھ کر بولا تھا۔ خاور کا چہرہ سیاہ پڑنے لگا' گویا وہ گل سڑ رہا ہو۔

"تم چاہتے تو قاتل نہ بنتے۔ تم اپنے بچوں یا ہاشم کے لیے قاتل نہیں بنے۔ تم اپنی وجہ سے قاتل بنے تھے۔ مگر میں قاتل نہیں بنوں گا۔ اب تم جاسکتے ہو۔" کہنے کے ساتھ اس نے پستول جیب میں ڈال لیا۔

خاور نے ایک ہاتھ سے دوسرے کی کلائی دباتے ہوئے' شل نظروں سے اسے دیکھتے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ پھر دھیرے سے اپنی جیب کو ٹٹولا۔ اس کا پستول اندر تھا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ دروازے تک پہنچ کر وہ پستول نکال کر ایک دم گھوما اور اسے زمر کی طرف تان کر ٹریگر دبا دیا۔ ایک دو تین چار۔۔۔ محض کلک کلک کی آواز سنائی دی۔ نہ کوئی دھماکا ہوا' نہ گولی چلی۔ خاور نے جھلا کر اپنے خالی پستول کو دیکھا۔

فارس نے دوسری جیب میں مٹھی ڈال کر باہر نکالی اور پھیلائی۔ اس میں خاور کے پستول کی چند گولیاں تھیں۔ خاور کے چہرے پہ شکست کے آثار دکھائی دینے لگے۔

"بھاگ جاؤ' اس سے پہلے کہ میں اپنا ارادہ بدل ڈالوں۔"

خاور نے تلملا کر دروازہ کھولا۔ "میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔" اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

زمر اسی طرح کھڑی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے' تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہچکی لینے کی آواز تھی۔ وہ اسے دیکھے بنا' میز پہ ہاتھ رکھے' آہستہ سے۔۔۔ شکستہ سا زمین پہ بیٹھا۔ اکڑوں حالت میں۔۔۔ کمر کرسی کی ٹانگوں سے لگالی۔ تھوڑی جھک کر سینے سے آلگی۔ وہ ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔

"میں بزدل نکلا۔ میں اسے نہیں مار سکا۔" وہ سر جھکا کر نفی میں ہلاتا کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ زمر نے گیلی آنکھوں سے دیکھا' فارس کی جھکی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر فرش پہ گر رہے تھے۔

"میں اپنے بھائی کا' اپنی بیوی کا۔۔۔ تمہارا۔۔۔ بدلہ نہیں لے سکا۔ میں بزدل نکلا۔۔۔ میں گولی نہیں چلا سکا۔" وہ مسلسل نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ تب زمر نے دیکھا' اس کی کنپٹی کے قریب۔۔۔ خاور کے مکے کے باعث۔۔۔ جلد پھٹ گئی تھی اور ذرا سا خون رس رس کر جمنے لگا تھا۔ کان تک خون کی لکیر آرہی تھی۔ اس نے میز پہ رکھے ٹشو باکس سے ٹشو کھینچا اور اس کے قریب زمین پہ بیٹھی۔

"آئی ایم سو سوری فارس۔۔۔" وہ اسی طرح روتے ہوئے بولتی ٹشو اس کے زخم سے مس کرنے لگی۔ "زرتاشہ کو مارنے کی ذمہ دار میں بھی ہوں۔ مجھے وہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا اسے لے کر۔۔۔ مجھے اس کی جان بچانی چاہیے تھی' مگر میں سمجھتی تھی فارس۔۔۔ کہ میں تمہاری جان بچا رہی ہوں۔۔۔ تمہاری روح کو۔۔۔ تمہارے دل کو بچا رہی ہوں۔" اس کا زخم صاف کرتے ہوئے وہ بولتی جا رہی تھی۔ "آئی ایم سو سوری۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا۔ میں نے بہت غلط کیا۔" فارس کا سر ہنوز جھکا تھا۔ اس کے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔

"میں نے تمہیں بہت ہرٹ کیا۔ تمہیں اتنا نقصان پہنچایا۔ میں خود غرض ہو گئی تھی۔ یا مجھے لگا تھا میں انصاف کے لیے کر رہی ہوں یہ سب۔ مگر فارس۔۔۔ میں چاہتی تھی تم اپنے کیے کی سزا اسی دنیا میں پالو۔ تاکہ تم خود کو کریکٹ کر لو۔ اپنی اصلاح کر لو۔ تم میرے لیے اہم تھے' ہمیشہ اہم تھے۔ تب ہی میں نے زرتاشہ کی جگہ تمہیں بچانا چاہا۔ تمہارے دل کا سوچا۔ آئی ایم سو سوری۔"

وہ اس کا خون ٹشو سے نرمی سے صاف کرتی بھیگی

پلکوں سے اسے دیکھتی کہہ رہی تھی۔ فارس نے چہرہ اٹھایا تو اس کی آنکھیں بھی گیلی تھیں۔

"میں نے چار سال جیل میں گزارے۔ اس آدمی کی وجہ سے۔ اور میں اس کو نہیں مار سکا۔" اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"آئی ایم سو سوری۔۔۔ پلیز مجھے معاف کردو۔" وہ اس کے جمے خون کو ہلکا ہلکا ٹشو سے رگڑ کر صاف کرتی کہے جا رہی تھی۔ "تم میرے لیے ہمیشہ سے اہم تھے۔ تم میرے لیے سب سے اہم ہو۔ تم کبھی کسی کو قتل نہیں کرو گے فارس۔۔۔"

فارس نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "مجھے زرتاشہ سے محبت تھی اور میں اس کے لیے قتل تک کرنا چاہتا تھا۔" آج اسے پہلی مرتبہ پتا چلا تھا۔

"اور زرتاشہ کبھی نہیں چاہے گی کہ تم جیل جاؤ، اس کا بدلہ لینے کی پاداش میں۔۔۔ زرتاشہ چاہے گی کہ تم خوش رہو، نئی زندگی شروع کرو۔"

"میرے سامنے وہ تھا۔ میرا مجرم اور میں اس کی جان نہیں لے سکا۔ میں بزدل نکلا۔"

زمر نے نفی میں گیلا چہرہ دائیں بائیں ہلایا۔ "تم مسلمان ہو۔ تم نے اللہ بننے کی کوشش نہیں کی۔ تم بہادر ہو، تم نے انسانیت دکھائی۔" فارس نے ناک سے گیلا سانس کھینچتے کرسی کی ٹانگ سے سر ٹکا دیا اور نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

"میں اللہ نہیں ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ میں اللہ نہیں ہوں۔ میں خدا نہیں بننا چاہتا تھا، اسی لیے میں نے اسے جانے دیا۔"

"ہم اپنا انتقام اللہ پہ چھوڑتے ہیں! ہم انصاف کے لیے لڑیں گے، مگر انتقام کے لیے نہیں۔ مجھ سے وعدہ کرو اب کسی کو مارنے کا نہیں سوچو گے۔" وہ اس کے خون اور بالوں کو نرمی سے ٹشو سے صاف کرتی کہہ رہی تھی۔ فارس نے اسے دیکھتے اثبات میں سر ہلایا۔

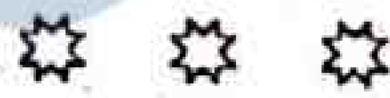
"نہیں سوچوں گا۔"

"میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ کسی بھی صورت نہیں۔ آئی لو یو سو مچ۔ آئی ریئلی ڈو۔ تم بہت اچھے ہو۔" وہ ابھی تک بے مقصد اس کے زخم پہ ٹشو پھیر رہی تھی۔ وہ تکان بھری آنکھوں سے اسے دیکھے گیا۔ اس کے لب ایک ہی جملہ پر بڑبڑا رہے تھے۔

"میں اللہ نہیں بننا چاہتا۔ میں ہتھیار ڈالتا ہوں۔ میں اللہ نہیں بننا چاہتا۔"

اور وہ بے آواز آنسو بہاتی اس کا زخم ابھی تک صاف کرتی دہرائے جا رہی تھی۔ "آئی لو یو سو مچ۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔"

باہر سرد رات قطرہ قطرہ جمتی رہی۔ پگھلتی رہی۔ جم کر پگھلتی رہی۔ ٹوٹا ہوا چاند بادلوں میں تیرتا رہا۔



ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

اس ٹوٹے چاند تلے۔۔۔ زمین پہ بنے مور چال کے لاؤنج میں جتنی گہما گہمی تھی، اس کے اس بیڈ روم میں اتنا ہی سناٹا تھا۔ حنین مدھم نائٹ بلب جلائے بستر پہ یوں بیٹھی تھی کہ پیر زمین پہ لٹکے تھے اور ہاتھ گود میں تھے۔ چہرہ ویران اور آنکھوں میں شل سا تاثر تھا۔ وہ یک ٹک بیٹھی خلا میں گھور رہی تھی۔ جب دروازہ دھیرے سے کھلا۔ اندھیرے میں بیٹھی حنہ نے چہرہ اٹھایا۔ باہر روشنی میں نہائے دروازے سے سعدی اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں فون اور چارجر تھا۔

"یہاں کہاں لگے گا؟ تھری پن ہے۔" اس نے نگاہیں ملائے بغیر سوال پوچھا۔ پھر خود ہی دیوار پہ ادھر ادھر دیکھا۔ تھری پن ساکٹ نظر آیا تو آگے بڑھا، جھک کر چارجر لگایا اور فون وہیں زمین پہ رکھ دیا۔ پھر جانے کو مڑا۔

"آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" وہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے بولی۔ سعدی کے قدم زنجیر ہوئے، مگر مڑا نہیں۔

"میں نے آپ کا آٹھ ماہ انتظار کیا، لیکن آپ۔۔۔

آپ کو مجھے دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔" اس نے ہچکی لی۔ شدت غم سے آنکھوں میں پانی بھر آیا۔
سعدی دھیرے سے پلٹا۔ اس کے چہرے پہ اب برہمی تھی۔
"اور ان آٹھ ماہ تمہارے نام سے مجھے کتنی اذیت ملی' اس کا احساس ہے تمہیں؟" وہ کھڑک کر بولا تھا۔
"تم نے چیٹنگ کی' میں نے تمہیں معاف کر دیا' تم نے ہاشم کو کالج بلایا' میں تمہاری اور زمر کی باتوں میں آگیا اور اس کو بھی جانے دیا' مگر کیا میں نے بکواس نہیں کی تھی کہ تم اس سے کبھی بات نہیں کرو گی۔ اس کو کبھی نہیں بلاؤ گی۔ پھر بھی تم نے وہی کیا حنین یوسف۔" اس کی آواز دبی دبی غراہٹ میں بدل گئی۔
حنین پتھر ہو گئی۔ ہاتھ روم کے دروازے کی کنڈی کھلی اور سیم باہر نکلا۔ حیرت سے ان دونوں کو دیکھا۔
"تم نے اس سے تعلق رکھا۔ مجھے سوچتے ہوئے شرم آتی ہے' مگر تمہیں کوئی خیال نہیں آیا۔ اپنے بھائی کی عزت کا کوئی خیال نہیں کیا تم نے۔ وہ تمہارا نام لے کر کیا کیا باتیں کرتا تھا میرے سامنے۔ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ تم نے مجھے آٹھ ماہ میں کتنی اذیت دی ہے' تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ تمہاری وجہ سے میرا سر کتنی دفعہ جھکا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ کر کہہ رہا تھا کہ تم آؤ گی اور میں جانتا تھا کہ تم نہیں جاؤ گی' لیکن تمہارے نہ جانے سے تمہاری اتنے عرصے کی خطائیں مٹ نہیں گئیں۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا اور میں فارس ماموں سے بھی پوچھوں گا کہ انہوں نے تمہارا خیال کیوں نہیں رکھا۔ میں امی سے بھی پوچھوں گا کہ وہ کدھر تھیں' جب تم اس سے بات کرتی تھیں۔"
بولتے بولتے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ سیم پہلے تو ساکت ہو گیا' پھر ایک دم سامنے آیا۔
"ایسے بات مت کریں۔" مگر سعدی نے نہیں سنا' وہ شل ہوئی حنین کی طرف انگلی اٹھا کر اسی برہمی سے بولا۔ "میں زمر سے بھی پوچھوں گا کہ۔۔۔"
"میں نے کہا میری بہن سے اس طرح بات مت کریں۔" اسامہ ایک دم سعدی کے مقابل آکھڑا ہوا' یوں کہ بیڈ پہ بیٹھی حنین چھپ گئی۔ سعدی کی انگلی فضا میں اٹھی رہ گئی۔ اس نے دیکھا دبلے پتلے اسامہ کا قد اس کے قریب پہنچ گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں بھی ویسے ہی سرخی تھی۔
"سیم تم یہاں سے جاؤ۔"
"میں نے کہا بھائی' انگلی نیچے کریں۔" وہ دانت پہ دانت جمائے غرا کر بولا تھا۔ سعدی کا ابرو بے اختیار اٹھا۔ ماتھے کی تیوریاں ڈھیلی ہوئیں۔
"میری بہن سے اس طرح بات مت کریں۔ آٹھ ماہ بعد آکر یوں ہم سے بات نہیں کر سکتے۔ آپ کو کیا لگتا ہے؟ صرف آپ نے تکلیف اٹھائی ہے؟ ہم سب خوش تھے؟ ہم نے بھی تکلیف اٹھائی ہے۔ ہم نے بھی اذیت کاٹی ہے اور میری بہن نے کچھ نہیں کیا۔ سنا آپ نے۔ اس نے کچھ غلط نہیں کیا۔ میں سب جانتا ہوں۔ آپ اس طرح میری بہن سے بات نہیں کر سکتے۔ آپ ہمارے ساتھ نہیں تھے۔"
وہ تیز تیز بول رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔
"آپ ہمارے ساتھ اس رات نہیں تھے جب پولیس فارس ماموں کو پکڑ کر لے گئی تھی۔ آپ کو پتا ہے وہ رات کیسی تھی؟ زمر نے مجھے کہا تھا کہ اب میں اس گھر کا بڑا مرد ہوں اور اس رات میں ہاشم کے کمرے کی بالکونی کا شیشہ بجاتا رہا تھا؟ میں اس شخص سے مدد مانگنے گیا تھا' بھائی جو ہمارا دشمن تھا۔ میں اپنے دشمن کے آگے ہاتھ پھیلانے گیا تھا۔ اس رات زمر اور حنہ کی ساری باتیں میں نے سن لی تھیں۔ آپ کو پتا ہی نہیں کہ اس رات نے میرے ساتھ کیا کیا۔ ہم نے ڈھائی تین ماہ ماموں کے بغیر گزارے۔ تب میں گھر کا بڑا مرد تھا۔ اور میں جانتا ہوں' میری بہن نے کچھ نہیں کیا۔ میری بہن فجر پہ اٹھ کر قرآن پڑھتی تھی۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ آپ آکر ہمیں یوں جج کریں اور اگر آپ نے اسی طرح ہم سے بات کرنی تھی تو اس سے بہتر تھا کہ آپ واپس نہ آتے۔"

سعدی کا ہاتھ واپس پہلو میں جا گرا۔ وہ بس سیم کو دیکھے گیا۔

پرندے بڑے ہو چکے تھے' ان کے ننھے پر' پرواز کا ہنر سیکھ چکے تھے اور اب تک وہ جانے کتنے آسمانوں کا چکر کاٹ آئے تھے' سمندر میں گرے شخص کو کیا پتا چلنا تھا۔ وہ جن کو پل پل سعدی کی ضرورت رہتی تھی' کوئی مسئلہ ہو تو وہ سائیکاٹرسٹ بن جاتا تھا' پڑھنا ہو تو ٹیوٹر' کہیں جانا ہو تو ڈرائیور۔ اب انہیں اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

وہ آہستہ سے مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ سیم آنکھیں رگڑتا فوراً" پیچھے بیڈ پہ شل بیٹھی بے آواز روتی حنین کے پاس آیا۔

"تم روؤ نہیں حنین۔ انہیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم سے یوں بات کریں۔"

حنین نے آنسو بہاتے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ فارس ماموں کو بتا دیں گے۔ میں نے پہلے ابو کو کھویا' پھر وارث ماموں کو' پھر بھائی کو' پھر ہاشم کو۔ میں ہر اس مرد کو کھو دیتی ہوں جس سے مجھے محبت ہوتی ہے۔ میں فارس ماموں کو بھی کھو دوں گی۔ وہ مجھ سے نفرت کریں گے۔"

"میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ میں اس گھر کا بڑا مرد ہوں حنین۔ باقی سب تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ تم روؤ نہیں۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔ صرف میں تمہارا بھائی ہوں۔" وہ مسلسل اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتا اسے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا اور حنین چہرہ جھکائے روئے جا رہی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا وہ بھائی کو یہ سب بتاتا ہو گا۔ وہ اس تاریکی سے اب کیسے نکلے گی؟

☆ ☆ ☆

میں تو بے حس ہوں مجھے درد کا احساس نہیں
چارہ گر کیوں روش چارہ گری بھول گئے

صبح ابھی دھند آلود تھی۔ نومولود اور تازہ جب فارس کی آنکھ کھلی۔ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔

وہ وہیں کچن کے فرش پہ کرسی سے ٹیک لگائے سو گیا تھا شاید۔ کب کیسے، کچھ علم نہ تھا۔ سر تھا کہ درد سے پھٹ رہا تھا اور کمر تختہ بن چکی تھی۔ وہ کراہتا ہوا اٹھا۔ جوتے پہنے ہوئے تھے، سو پیر درد کر رہے تھے۔ صرف دل ہلکا تھا۔

زمر چولہے کے ساتھ کھڑی تھی۔ آستینیں اوپر چڑھائے وہ کچھ بنا رہی تھی۔ مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرائی۔ "اٹھ جاؤ، میں ناشتا بنا رہی ہوں۔"

وہ آنکھیں ہتھیلی کی پشت سے رگڑتا اس تک آیا۔ ایک نظر اس کے پھیلاوے کو دیکھا۔ "میں اتنی دیر کیسے سوتا رہا؟"

"کیونکہ برسوں بعد تمہارے دل کو سکون ملا ہے۔" وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ ہاتھوں سے تیزی سے انڈے پھینٹ رہی تھی۔ فارس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ پھر کھڑکی کو دیکھا، جس کے پار گہری نیلاہٹ تھی۔

"میں مسجد جا رہا ہوں، تم ناشتا بناؤ۔ میں اپنی پرانی روٹین پہ واپس آنا چاہتا ہوں اب..." وہ ہلکے دل اور ہلکے کندھوں کے ساتھ طمانیت سے بولا تو زمر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "کیونکہ تم جان گئے ہو کہ تم خدا نہیں ہو۔ خدا کوئی اور ہے۔"

"درست!" سر کو خم دے کر وہ جانے لگا۔ پھر ٹھہر گیا۔ "تم نے ایک دو دفعہ کے علاوہ مجھے کبھی نہیں ٹوکا، نماز نہ پڑھنے پہ۔ ویسے یہ تمہارا فرض تھا کہ تم مجھے ٹوکتیں۔ مجھے احساس دلاتیں۔"

"فارس!" وہ کانٹا رکھ کر اس کی طرف گھومی۔ "سات سال کے، دس اور بارہ سال کے بچے کو ٹوکا جاتا ہے، مارا جاتا ہے، گھر سے نکالا جاتا ہے، نماز نہ پڑھنے پہ۔ بالغ مسلمانوں کو نہیں ٹوکا جاتا۔ اس کے سامنے نماز پڑھنا ہی اس کو نماز کی نصیحت کرنا ہے۔ پتا ہے کیا فارس، ہمارے گھر میں ایک ایسا شخص ضرور ہوتا ہے جو نماز نہیں پڑھتا یا وہ غیبت کرتا ہے یا کسی ایسی برائی میں ملوث ہوتا ہے جس سے ہم اسے نکالنا چاہتے ہیں مگر ہزار جتن کر کے نصیحت کر کے، لیکچر دے کر، سمجھا کر، غصہ کر کے اس کے لیے دعا کر کے بھی ہم اس کو نکال نہیں پاتے اس اندھیرے سے۔ اس کی اصلاح نہیں کر پاتے اور یہ ہی سوچتے رہتے ہیں کہ اس کا کیا بنے گا۔ یہ تو جہنم میں جائے گا۔" وہ سانس لینے کو رکی۔ وہ توجہ سے اسے سن رہا تھا۔

"تو پھر ہم اسے کیسے اس برائی سے نکالیں؟"

"ہم یہ جان لیں کہ وہ اس کی نہیں 'ہماری' آزمائش ہے۔ اس کی تو بخشش بڑے آرام سے ہو جائے گی، کیونکہ اس کا دل تو کچھ عرصے کے لیے اللہ نے نیکی کی طرف سے بند کر رکھا ہے، ہمیں آزمانے کے لیے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ اس نے تو نہیں پڑھ رکھی تفسیر، اس نے تو ہماری طرح حدیث کی کتابیں کھول کر نہیں پی ہوئیں، ہر وقت اس کی بخشش کی فکر نہیں کرنی چاہیے ہمیں۔ ہم کیا کرتے ہیں، یہ اہم ہے۔ ہمیں پتا ہے ہمیں ایسے موقعوں پر کیا کرنا چاہیے؟ جو خوبی اس میں دیکھنا چاہتے ہیں اس کو اپنے اندر ڈال لیں اور ایکسی لینس کے لیول پہ اسے اپنا لیں۔ وہ نماز نہیں پڑھتا تو ہم اپنی نماز کو خوب صورت بناتے چلے جائیں۔ اس کو دکھانے کے لیے نہیں، بلکہ اللہ کو دکھانے کے لیے کہ اللہ یہ ہے وہ پرفیکشن کا لیول جو میں اس کی عبادت میں بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس کو ایک لفظ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔ جس پہ الفاظ اثر نہ کریں، اسے عمل سے نصیحت کرنی چاہیے۔ اب جاؤ۔"

فارس نے گہری سانس لی۔ "تھینک یو۔ اس لیکچر کے لیے۔ ویسے مجھے آپ کی وہ بات بھی اچھی لگی تھی جو آپ نے رات کو بار بار دہرائی تھی۔ انگریزی کے تین الفاظ تھے، مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، آپ دہرانا پسند کریں گی۔" سادگی سے وہ پوچھ رہا تھا۔ زمر کانٹا اوپر اٹھائے اس کی طرف گھومی۔

"ہاں... وہ الفاظ یہ تھے کہ آئی ول کل یو۔ اب جاؤ۔" اور خفگی سے اسے گھور کر رخ پھیر لیا۔

"میں واپس آ کر آپ سے اس کا حساب مانگتا ہوں شیف صاحبہ۔" اور پھر چابیاں اور سیل فون اٹھاتا باہر نکل گیا۔

مور چال پہ وہ صبح روشن ہونے لگی تو کالونی کے درختوں نے دیکھا، حنین یوسف اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑی تھی۔ اس کے کٹے ہوئے بال ماتھے پہ گر رہے تھے اور پیچھے والے بالوں کی فرنچ چوٹی گوندھ رکھی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور آنکھوں میں چبھن سی تھی۔ دفعتاً" اس نے نیچے گیٹ کے پار کسی کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اندر کی طرف مڑ گئی۔

چند لمحے بعد وہ گیٹ سے باہر آتی دکھائی دی۔ سامنے علیشا کھڑی تھی۔ نیند سے بھری آنکھیں اور بالوں کی پونی بنائے، وہ گویا عجلت میں لگتی تھی۔

"حنین۔۔۔!" اس کو اتنے برسوں بعد دیکھ کر علیشا کی آنکھوں میں بہت سے جذبات ابھرے۔ مگر حنہ سپاٹ چہرہ لیے کھڑی رہی۔

"تمہیں صبح صبح اس لیے بلایا ہے، تاکہ تمہیں یہ دے سکوں یہ جو تمہاری تھی۔" کی چین اس کی طرف بڑھائی۔ علیشا نے بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے کی چین تھامی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی، حنین اندر چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

علیشا تیزی سے کیب کی طرف جانے کو مڑی اور ساتھ ہی دونوں ہاتھوں سے کی چین کے سیاہ ہیرے نما کرسٹل کو ٹٹولا۔ پھر اوپر لکھے آنٹس ایور آفٹر کو دبایا۔ زور سے۔ پھر دوبارہ۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ وہ رک گئی۔ حیرت آنکھوں میں لیے اس نے پھر کوشش کی، مگر بے سود۔ یک دم وہ چونک کر مڑی۔

حنین واپس وہاں آ کھڑی ہوئی اور سینے پہ ہاتھ لپیٹے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم نے کہا تھا علیشا کہ ہر انسان کے اندر خیر اور شر کے بھیڑیے ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ میرے اندر بہت سارا شر ہے۔ تو یہ جان لو علیشا کہ میں اب اپنے شر پہ شرمندہ نہیں ہوں۔ اب کوئی مجھے کتنا ہی جج کرے مجھے فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے اپنے اندر کے اندھیروں کو گلے لگا لیا ہے، میں نے وہ فقرہ ڈھونڈ لیا ہے جو مجھے ان اندھیروں میں رہنا سکھا دے گا اور وہ فقرہ ہے۔۔۔" وہ ایک دم آگے بڑھی۔

"میں نارمل نہیں ہوں۔ میں حنین ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بند مٹھی کھولی۔ علیشا کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئیں۔

حنہ کی ہتھیلی پہ اسی طرح کا سیاہ کرسٹل رکھا تھا، مگر اس کے اوپر لکھے الفاظ اندر کو دبے تھے یوں کہ کرسٹل اندر سے کھل گیا تھا۔ وہ ٹکڑوں میں بٹا تھا اور اس کے کو کھلے حصے میں ایک ننھا سا میموری کارڈ رکھا نظر آ رہا تھا۔

"تم ہمیشہ سے بے وقوف تھیں۔ اس لیے کاروارز سے ہارتی رہیں۔ ان کو ان ہی کے خلاف نہیں استعمال کر سکیں۔ تمہیں بھول گیا کہ میرے پاس دو کرسٹل تھے۔ ایک میرے لاکٹ والا جو تم نے دیا تھا اور دوسرا یہ کی چین۔ میں نے صرف دونوں کی جگہ بدل دی۔" اس نے مٹھی بند کر لی۔

"میں کی چین کو کھول نہیں سکی تو تمہیں اپنے لاکٹ والا ہیرا دیا، تاکہ تم مجھے دکھا دو، اسے کیسے کھولنا

ہے۔" علیشا بے بس چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ حنہ واپس پیچھے ہٹتی گئی۔

"اس میموری کارڈ میں کیا ہے' میں نہیں جانتی' مگر اب یہ میرے پاس ہے۔ اب یہ ہمارے پاس ہے۔ تم نے جیل سے یہ کی چین ہمیں بھیجا تھا۔ تھینک یو علیشا۔ تمہارا گفٹ ہمیں مل گیا ہے۔" وہ رکھائی سے کہتی واپس اندر گئی اور دروازہ بند کردیا۔ علیشا باہر تہی داماں' تہی دست کھڑی رہ گئی۔

قصر کاردار میں ہاشم ابھی بستر میں نرم گرم کمبل میں لپٹا' چائے پیتے ہوئے موبائل پہ نیوز ہیڈ لائنز دیکھ رہا تھا' جب دروازے پر زور سے کھٹکا ہوا۔ اس نے ناگواری سے چہرہ اوپر اٹھایا۔ پھر کمبل اتار تا نیچے اترا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں موجود تھا اور اس طرح کسی کے مخل ہونے پہ موڈ بگڑ چکا تھا۔ بے زاری سے اس نے دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے احمر کو دیکھ کر تاثرات مزید بگڑے۔

"تمہیں کس نے اجازت دی کہ....."

"آپ نے کہا تھا سر کہ مجھے آپ کا اعتماد کمانا ہے۔ میں اسے کما سکتا ہوں۔ میرا کیریئر' میری آزادی' سب کچھ اس جاب سے جڑی ہے۔ میں اس کو نہیں چھوڑنا چاہتا' سو میری بات سنیں۔" وہ تیز تیز بول رہا تھا۔ "میں کچھ ایسا جانتا ہوں جو یوسفز کو کبھی آپ کے خلاف اٹھنے نہیں دے گا۔"

"ہاشم کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ "مثلاً"....؟"

"مثلاً"!" احمر نے بھاری دل کے ساتھ گہری سانس لی۔ "سعدی یوسف کی بہن..... حنین..... اس نے بورڈ ایگزام میں اوسی پی صاحب کو بلیک میل کرکے پیپرز لیک کروائے تھے۔ میرے پاس تمام ثبوت ہیں۔ آپ ان کو رکھیں فارس کے سامنے اور اسے آفر دیں۔ وہ سب کچھ چھوڑ دے گا۔"

ہاشم کی آنکھوں میں چمک اتری۔ لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔

"مجھے نو بجے آفس میں ملو۔ تم واپس جاب پہ آچکے ہو' لیکن آئندہ اتنی صبح آکر میرا دروازہ مت کھٹکھٹانا۔" اور دروازہ اس کے منہ پہ بند کردیا۔ احمر نے گہری سانس لی اور سر جھٹکتے سیڑھیاں اترنے لگا۔ دل بہت بھاری ہو چکا تھا۔

فارس مسجد سے واپسی پہ تازہ دم سا' سڑک کنارے چلتا آرہا تھا۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ دل اور کندھے بوجھ سے آزاد تھے۔ بہت عرصے بعد اپنا آپ انسان لگا تھا جو کسی کی تقدیر کا فیصلہ نہیں کرسکتا تھا۔

چلتے چلتے اس نے موبائل جیب سے نکالا۔ رات بھر وہ سائلنٹ رہا تھا اور کالز اور میسجز کی بھرمار تھی۔ آب دار کی کالز سرفہرست تھیں۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے کال بیک کی اور فون کان سے لگایا۔

"ہیلو!" مردانہ آواز دوسری ہی گھنٹی پہ سنائی دی۔ فارس ٹھہر گیا۔ ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔

"کون....؟"

"تم مجھے بتاؤ تم کون ہو؟" جواب میں غصیلا لہجہ سنائی دیا تھا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم ہو کون' جس کو میری بیٹی نے پینتالیس دفعہ کال کی اور تم نے اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میں کون ہوں۔ آب دار ٹھیک ہے؟" وہ تیزی سے بولا تھا۔ چند ثانیے کی خاموشی دوسری طرف چھائی رہی۔

"میری بیٹی نے..... فارس غازی..... کل رات خودکشی کرلی ہے۔ وہ اس وقت آئی سی یو میں ہے۔"

"کدھر؟ کون سے اسپتال میں....؟" وہ کار کی چابیاں نکالتے ہوئے آگے کو بھاگا تھا۔

فوڈلی اور آنٹر کے تنہا پڑے لاؤنج میں زمر میز پہ ناشتا سجائے' بیٹھی بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

نعیمہ ناز

میری اماں

"میں نے آہٹ سنی تو آنکھیں کھول کے دیکھا۔ سر پر ملک الموت کھڑا تھا۔ میں اس وقت کمرے میں لیٹا تھا امی سو رہی تھیں۔

کیوں آئے ہو؟ میں نے پوچھا۔

"تمہاری امی کو لے جانا ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میرا دل ڈوب گیا، آنکھیں نم ہو گئیں۔

"ایسا مت کرو۔" میں گڑگڑایا۔ "مجھے امی سے بہت پیار ہے۔"

"میں اکیلا واپس نہیں جا سکتا۔" وہ بولا۔

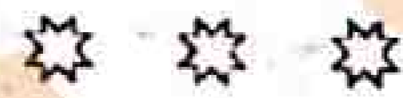
"آؤ! ایک سودا کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم امی کے بجائے مجھے ساتھ لے چلو۔"

"میں تمہیں ہی لینے آیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"لیکن تمہاری ماں نے پہلے سودا کر لیا۔"

(مبشر زیدی)



تو مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ہمارے علم میں لائے بغیر ایسے سودے کر لیتی ہیں۔ خاموشی سے ہاتھ چھڑا کر چل دیتی ہیں اور ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟

ضلع میمن سنگھ مشرقی پاکستان میں آنکھ کھولنے والی ہستی کے آخری آرام گاہ، کراچی کھوکھراپار میں بنی ہے۔ یہ لمبا سفر بجائے خود ایک طویل داستان ہے۔ میری اماں، اپنی جگہ ایک اہم کردار، "قریباً" بہتر برس کی زندگی کے ایک بھرپور کردار کو چند صفحات میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے تو یہ ہنر بھی نہیں آتا کہ دریا کو اس کی وسعت اور ہمہ گیریت کے ساتھ دکھاؤں کجا یہ کہ اس کوزے میں بند کرنا۔

اپنی اماں کی شخصیت اگر میں چند لفظوں میں بیان کروں تو ان کی شخصیت کی تصویر ان لفظوں سے بنے گی۔ سادگی، صبر، برداشت، توکل علی اللہ، صدق، تواضع و انکساری۔ مذہب سے قربت اور محبت تو ورثے میں ملی تھی پھر جماعت اسلامی سے منسلک ہوئیں تو یہ لگاؤ اور شغف اور نکھر گیا۔ میرے نانا حافظ قرآن تھے، کچھ ان کی محبت اور تربیت تھی اور زیادہ رنگ چڑھایا تھا ان کی نانی نے۔

ہماری اماں تقریباً "نو، دس برس کی عمر میں کراچی آئی تھیں، پھر یہیں کی ہو رہیں مگر وہ جو نو دس برس وہاں مشرقی پاکستان میں گزارے، وہ ان کی یادداشت میں بہت اچھی طرح محفوظ تھے۔ کسی ماہر داستان گو کی طرح وہاں کے قصے سناتیں تو گویا آنکھوں کے سامنے تصویر سی پھر جاتی، زیادہ تر اپنی نانی کے زیر سایہ رہیں، وہ تہجد گزار، جو کچھ خود پڑھتیں وہ نواسی کو بھی سکھا دیا، جس پر وہ اس وقت تک کاربند رہیں جب تک بیماری نے لاچار نہ کر دیا۔ سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران کی آخری آیات اور سورۃ ملک رات سونے سے پہلے، جمعے کے دن سورہ کہف، مغرب کی نماز کے بعد سورہ واقعہ، روزمرہ کی بیشتر مسنون دعائیں، قرآن کی بہت سی آیات اور مسنون دعائیں۔ "یہ سب ہماری نانی نے یاد کروایا تھا۔" ان کی یادوں کی پٹاری جب بھی کھلتی، یہ فقرا ضرور نکلتا تھا۔

✲ ✲ ✲

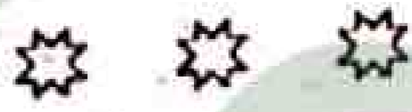
"وہاں سے یہاں کیسے آگئیں اور کیوں؟ اتنی دور؟"

میرے حیرت بھرے سوال پر وہ ہنس کر پہلا جواب یہی دیتیں کہ نصیب میں یہی لکھا تھا پھر آگے اصل تفصیلات اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتیں، حصول علم کا شوق تھا۔ پڑھنے کے شوق میں اپنی نانی کے بھائی کے ساتھ (جنہیں وہ نانا کہتی تھیں) کراچی آگئیں' نانا عالم تھے مسجد میں امامت کرتے تھے۔ پڑھائی وڑھائی تو ایک طرف رہ گئی' ایک آدھ سال میں ان کی شادی کی فکر ہونے لگی۔ انتہائی کم عمری میں بے حد سادگی کے ساتھ بیاہ بھی ہو گیا۔ شادی کے بعد جب اچھی طرح پرکھ لیا تو ہماری دادی نے ابا سے کہا۔ "تمہاری بیوی صبر والی ہے۔ چوری کی اور ہاتھ لپک کی عادت نہیں ہے۔" ان کا صبر آخری لمحے تک ان کے ساتھ رہا۔

دکھ بیماری' تکلیف یا کسی ناگہانی مصیبت میں ہم نے کبھی نہ انہیں واویلا کرتے دیکھا نہ اللہ سے شکوے شکایت کرتے سنا' پہلوٹھی کی بیٹی دس ماہ کی عمر میں ایسی بیماری کا شکار ہوئی کہ ذہنی نشوونما' عمر کے مقابلے میں بہت کم ہو گئی۔ اٹھائیس سال کی عمر میں وہ بیٹی فوت ہوئی اور اس کا دماغ چھ' سات سالہ بچے کا تھا' بچپن میں بیماری کا علاج کروانے میں کوئی ڈاکٹر' کوئی حکیم نہ چھوڑا۔ جس کسی نے بھی کسی معالج کی تعریف کی' وہیں لے کر گئے بچی کو' مگر بس ایک رستے پہ قدم نہ رکھا کہ فلاں پیر صاحب' فلاں درگاہ' فلاں مزار' ان کا رب ان کے بہت نزدیک تھا۔ شہ رگ سے بھی قریب۔ بس اسی سے رجوع کرتی رہیں' بڑے حوصلے اور استقامت کے ساتھ اس آزمائش کا سامنا کیا۔ ایسی اولاد کو پالنا پوسنا اس کا کام کرنا' میں سوچتی ہوں اللہ دانا ہے۔ اپنے منتخب بندوں کو ایسی آزمائش کے لیے منتخب کرتا ہے۔

دس بچے پیدا ہوئے۔ ایک بیٹی اٹھائیس سال کی عمر میں' ایک بیٹا دس سال کی عمر میں اور دو بچے شیر خوارگی میں فوت ہوئے۔ بچے پالے' گھرداری کی' حالات مشکل ہوئے تو معاشی جدوجہد میں شوہر کا ساتھ بھی دیا۔ پھر ابا کی نوکری P.I.A میں لگ گئی۔ تین بار بنگلہ دیش بھی ہو کر آگئیں۔ اپنے سارے بچوں کو اپنا میکہ' اپنا گاؤں دکھایا' جس کے قصے ابھی تک بھی وہ ہمیں سناتی رہتی تھیں۔

اتنے بڑے بڑے کٹھل' ایک ایک من کے' جو رسیوں سے باندھ کر درخت سے اتارے جاتے تھے۔ ہاتھ بھر لمبے کیلے (بیج والے کیلے' کھٹے کھٹے کمرخ یا کامرک اور وہ رسیلے انناس تو مجھے بھی یاد ہیں جو میں نے بچپن میں وہاں کھائے تھے اور بطخ کے انڈے بھی) ناریل' پان' چھالیہ' کھیت' کھلیان' درخت' جنگل اور دریا اور وہ مچھلیاں جن کا ذائقہ کراچی میں نہیں ملا۔ پٹ سن کے سنہری ریشوں کی کہانیاں' گنے کے رس کا گڑ' موٹے موٹے رسیلے لمبے لمبے گنے' جنہیں دانتوں سے چھیل چھیل کر کھایا جاتا' پیٹ بھر جاتا مگر نیت نہیں بھرتی تھی' یہی حال آموں کا تھا۔ آم کے موسم میں بس آم کھا کھا کر ہی پیٹ بھرا جاتا' بچوں کے آگے ٹوکرا بھر کے آم رکھ دیے جاتے تھے۔ بڑے بڑے مٹکوں کے برابر تربوز' اور لوکی کدو بھی اتنے ہی سائز کے ہوتے تھے کہ ان کے خول میں دس دس کلو اناج آجاتا۔ کھٹی میٹھی لیچی' شکرقندی تربوز اور خربوزے' مٹھاس جن کا لازمی جز تھی۔ (یہ ایک علیحدہ' بڑی لمبی داستان ہے۔)



کراچی میں پہلے پہل وہ بہت حیران ہوتی تھیں کہ یہ کیسی جگہ ہے' جہاں نہ کوئی دریا ہے نہ جنگل اور نہ ایسے گھنے چھتنار درخت' جیسے اپنے گاؤں میں دیکھے تھے' شادی کے بعد ہوا بندر (کلفٹن) دیکھا تو کچھ تسلی ہوئی چلو ایک سمندر تو ہے' دور ہی سہی۔

ان میں سیکھنے کی لگن تھی' کم یاب مواقع اور محدود وسائل میں بھی بہت کچھ سیکھا اور اسے زندگی کا حصہ بنایا' قرآن شریف پڑھا ہوا تھا مگر شادی کے بعد دوبارہ پڑھا' مسجد کے امام صاحب محلے دار تھے' ہماری دادی نے انہیں پڑھانے کے لیے بلا لیا' انہوں نے قرآن

سننے کے ساتھ ساتھ اردو پڑھنا بھی سکھا دی۔ ترجمے اور تفسیر سے قرآن ختم کروا دیا۔ پڑھنے کا شوق ساری عمر کے لیے لگ گیا۔ اخبار، رسالے، ڈائجسٹ۔ ان میں سے زیادہ تر وہ اسلامی صفحات یا اسی سے متعلق تحریریں ضرور پڑھتیں۔

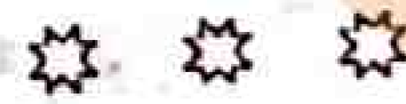
مطالعہ ان کی زندگی کا ایک لازمی حصہ تھا۔ "شاہنامہ اسلام" کی نظمیں، پتا نہیں کسی اخبار، رسالے میں پڑھیں یا ریڈیو سے سنیں، متاثر ہو کر ابا سے فرمائش کر دی۔ شاید 65 کی جنگ سے پہلے کی بات ہے، ابا کو کراچی میں یہ کتابیں کہیں نہیں ملیں پھر پنڈی سے منگوائیں، کپڑے کی جلد میں ملفوف یہ پورا سیٹ آج بھی میرے پاس ہے۔ اس کے بیشتر اشعار انہیں زبانی یاد ہو گئے تھے، ابا کو سنایا کرتی تھیں۔

لین دین میں بہت وضع دار اور رکھ رکھاؤ والی، رشتے دار ہوں یا محلے دار، سب کی خوشیوں کے موقع پہ دل اور ہاتھ ہمیشہ کشادہ رہے، خاص طور پر نومولود بچوں کو کپڑوں کے تحائف ضرور دیتیں، چھوٹے بچوں سے بے انتہا لگاؤ اور محبت رکھتیں، چاہے کسی کے بھی ہوں۔ بچوں کو ڈانٹنے یا مارنے پر بہت ناراض ہوتی تھیں۔

کراچی آ کر، یہاں بس کر، یہیں کے رنگ میں رنگ گئیں۔ ان سے ملنے والا کوئی بھی نیا فرد پہچان نہیں سکتا تھا کہ ان کا تعلق بنگال سے ہے۔ ان کی رنگت بہت صاف تھی۔ کسی دور میں بال بڑے خوب صورت اور لمبے تھے۔ زلف بنگال کی علامت، ساڑھی پہنے ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ چاول کی نسبت روٹی شوق سے کھاتی تھیں اور مچھلی، بہت اچھی، عمدہ ابا یا بھائی لے آتے تو کھاتی تھیں ورنہ ہر قسم کی مچھلی بھی انہیں پسند نہ تھی۔ عام بول چال میں اردو بہت شستہ اور لہجہ صاف ستھرا، باتوں میں اکثر وہی محاورے اور کہاوتیں ہوتیں جو ہماری دادی اور ابا کی گفتگو میں ہوتے تھے۔ اس غریب پرور شہر نے ان سے، ان کی اپنی چھاپ تلک سب چھین لی تھی۔ بنگلہ زبان بہت

عرصے تک آتی تھی۔ اکثر باتوں میں بنگلہ زبان کے چھوٹے چھوٹے فقرے، بچپن میں کھیل کود کے دوران گائے جانے والے گیت یا مختلف اشیاء کے نام، بنگلہ میں بتاتیں پھر اسے اردو میں ہمارے لیے ترجمہ کرتیں۔

قوت ارادی بلا کی تھی ان میں۔ 2003ء میں ان پر فالج کا اٹیک ہوا۔ بائیں طرف کا آدھا جسم مفلوج ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مسلسل علاج اور فزیوتھراپی کے بعد اس قابل ہو گئیں کہ چلنے پھرنے لگیں۔ گو کہ بائیں طرف کے ہاتھ اور ٹانگ میں کمزوری تھی۔ چال میں لنگ آگیا تھا، پھر بھی وہ اپنی ہمت سے چلتی پھرتی رہیں، خوشی غمی، آنا جانا، ملنا جلنا، بازار جانا پھر ان سب کے ساتھ ساتھ باقاعدگی سے درس قرآن میں شرکت، جماعت کے پروگرامز میں میٹنگوں میں، اجتماعات میں، ریلیوں میں شرکت کرتی رہیں۔ رمضان کے مہینے میں مصروفیت اور بھی بڑھ جاتی، پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ تہجد، چاشت، اشراق اور اوابین کا اہتمام عام دنوں سے کہیں زیادہ ہوتا۔ بیسویں روزے تک روزانہ دور قرآن میں شرکت۔



مہمان نواز بہت تھیں، کھلانے پلانے کا بہت اہتمام کرتیں۔ کہا کرتیں تھیں کہ "کوئی پیر اٹھا کر ہمارے گھر آتا ہے تو خاطر داری اس کا حق ہے اور ہمارا فرض۔" انہوں نے ہمیں بچپن سے اب تک بہت کہانیاں سنائیں، انبیاء کرام کے قصے، حیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف گوشے اور سبق آموز اصلاحی کہانیاں، ہمیں ہی نہیں ابا کو بھی سنایا کرتی تھیں۔ کبھی بیٹے، بیٹی میں کوئی فرق نہیں سمجھا۔ نصیحتیں ویسے تو سب کے لیے تھیں (ابا سمیت) مگر کچھ باتیں خاص طور سے بیٹوں کے لیے تھیں۔ "ارے بیٹا، قرآن کس لیے پڑھایا ہے؟ طاق میں رکھنے کے لیے؟ زیادہ نہیں، بس دو آیتیں روزانہ پڑھ لیا کرو۔ ترجمے اور تفسیر کے ساتھ۔" فرماں بردار بیٹے 'ہاں اماں جی، ہاں اماں جی' کرتے رہ جاتے۔

سب کے لاڈ ناز نخرے اٹھائے، جو ایک ماں ہی اٹھا سکتی ہے۔ سردیوں کی صبح میں پراٹھا بنا کر ہمیں آواز دیتیں۔

"پراٹھا ٹھنڈا ہو جائے گا، اٹھ جاؤ، ناشتہ کر لو۔"

"کس نے کہا تھا اتنی جلدی پراٹھے بنانے کو۔" ہم بد تمیز، جھنجلاتے اور لحاف لپیٹ کر اور گول مول ہو جاتے۔

پھر انہوں نے پیڑے بنا کر رکھنے شروع کر دیے، جب کوئی اٹھتا، پراٹھا بنا دیتیں۔

بازار جاتیں تو اکثر ہم دونوں بہنوں کے لیے ٹاپس، بندے، کلپ، کیچر، پونی یا اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں لے آتیں، کبھی سوٹ آجاتا۔ "پرنٹ اچھا لگ رہا تھا تو میں لے آئی۔" خیال رکھنے والے، محبت کرنے والے اور بھی ہیں دنیا میں، مگر ایسا خیال اور ایسی محبت اب کہیں نہیں، یہ سب تو بس ماں باپ کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ہی چلا جاتا ہے۔



ہماری اماں اور چچی ایک ہی گھر میں اٹھائیس سال رہیں ایک ساتھ۔ اس میں سولہ سال، ایک ہی کچن، ایک ساتھ کھانا پینا، بچوں کی فوج ادھر بھی ادھر بھی، کبھی لڑائی جھگڑا ہوا نہ کوئی رنجش۔ لوگ ان دیورانی جٹھانی کی مثالیں دیتے تھے، کیسے اتفاق اور سلوک سے رہتی ہیں۔ اس میں آدھا کمال ہماری چچی کا بھی تھا بلکہ اب تک ہے۔ وہ سب سے ہی محبت کرنے والی، شائستہ اور سادہ مزاج ہستی ہیں ہمارے خاندان کی۔ (اللہ انہیں صحت و زندگی دے) پھر اماں بتاتی ہیں کہ وہ کام بھی زیادہ کر لیا کرتی تھیں، جتائے بغیر، ناک بھوں چڑھائے بغیر۔

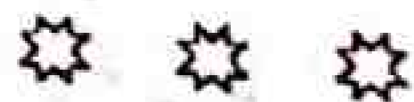
پھر تین سال پہلے شعبان کے مہینے میں ہی ' اماں دوبارہ بیمار ہو گئیں اور اس بار یہ مرض ' مرض الموت بن گیا۔ بیماری سے حلق یوں متاثر ہوا کہ بس۔ نرم اور پتلی غذائیں ہی آرام آرام سے کھالیتیں ' آواز رفتہ رفتہ بند ہو گئی تھی۔ بولنے کی کوشش کرتیں مگر بات نہیں کر سکتی تھیں اور مجھے یہ یقین ہے کہ ان کی یہ تکلیف ان کے لیے آزمائش تھی اور ہم لوگوں کے لیے قدرت کی طرف سے سزا ' ہم جو اپنی جہالت کے زمانے میں انہیں خاموش کردیا کرتے تھے۔

کبھی باتوں باتوں میں ' کبھی غصے میں کہتے۔ "اماں جی آپ چپ ہو جائیں ' آپ کو کیا پتا۔" وہ بے چاری خاموش ہو جاتیں۔

پھر اللہ نے انہیں خاموش کردیا۔ زندگی میں ہی ہم ان کی باتیں سننے کو ' آواز سننے کو ترس گئے۔ پورے تین سال اسی طرح گزرے۔ پتا نہیں ' کب کس موقعے پہ وہ کیا کہنا چاہتی ہوں ' مگر دل کی باتیں دل میں ہی رہ گئیں۔

ہم لوگ خود ہی ان سے باتیں کرتے ' بولتے۔ کبھی مسکرا دیتیں کبھی کسی بات کا جواب دینے کی کوشش کرتیں ' پھر لاچار ہو کر چپ ہو جاتیں۔ کہیں پڑھا تھا کہ "بیٹی کو اپنی ماں سے اصل محبت اس دن ہوتی جب وہ خود ماں بنتی ہے۔"

مجھے بھی اپنی شادی کے بعد اور ماں بننے کے بعد احساس ہوا کہ والدین کی صورت میں اللہ نے کتنی بڑی رحمت ہم پر اتاری ہے۔ ماں بنی تو اپنی ماں کا احساس ہوا۔ اپنی بیٹی سے محبت ہوئی تو احساس ہوا کہ ہماری ماں نے کیسے اپنا پیار اور ممتا ہم پر نچھاور کی ہے۔



ہفتے کے دن چھوٹی بہن نے نہلایا ' میں نے چوٹی باندھ دی۔ میں میکے ہی میں تھی اس دن ' پھر اگلے روز بہت اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنے آخری سفر پر چل دیں ' چھوٹی بہن نے انہیں پانی پلایا ' کھانسی آئی '

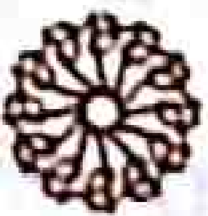
اس نے سہارا دے کر بٹھایا اور کمر سہلادی ' واپس لٹایا تو اماں نے خود ہی اپنی ٹانگیں سیدھی کیں اور روح جسم کے پنجرے سے نکل گئی۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت اور دل کی دھڑکن ختم (اے اللہ آخرت کے ہر ہر مرحلے پر ان سے ایسی ہی نرمی اور آسانی کا برتاؤ کرنا) چہرے پہ سکون اور اطمینان چھایا ہوا تھا۔

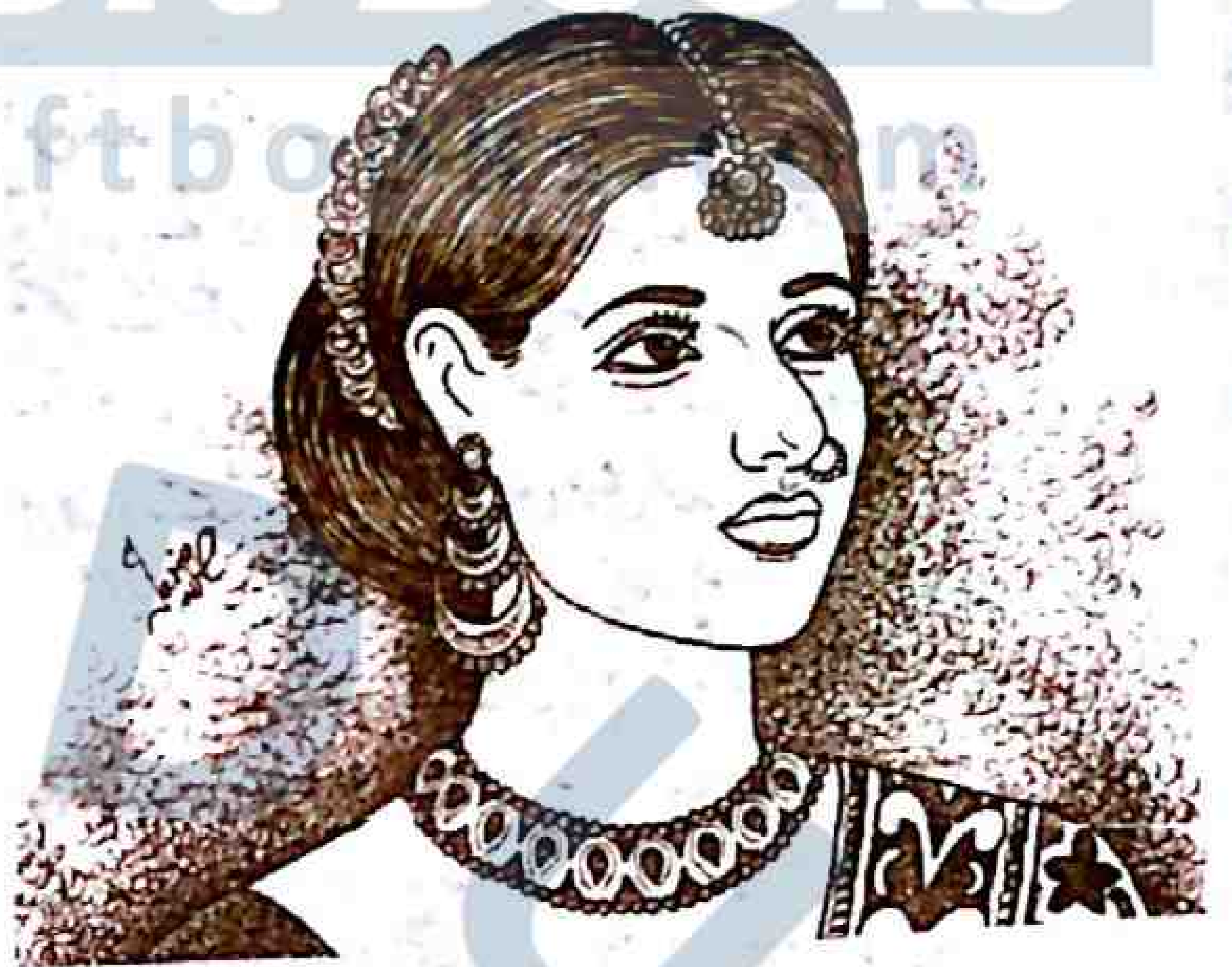
ایک دن پہلے باندھی ان کی چوٹی ' اگلے دن میں نے ہی اپنے ہاتھوں سے کھولی ان کے غسل کے وقت۔ دنیا کے سب سے کربناک لمحات ہوتے ہیں یہ ' جب آپ اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے ہیں آخری سفر کے لیے۔ ایک ایک لمحہ دل چیرنے والا تھا کہ بس آخری بار اس چہرے کو ' ان خدوخال کو غور سے دیکھ لو ' پھر یہ آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔

وہ جو ہمیں ہمیشہ کہتی تھیں کہ صبر بہت اچھی چیز ہے ' صبر سے کام لو۔ ان کی یہ نصیحت تو بہت پہلے ہی گرہ میں باندھی ہوئی تھی مگر کتنا مشکل ہوتا ہے یہ صبر ' مگر انہوں نے تو ہمیں یہی سکھایا تھا۔

پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے الفاظ۔ "دل غمگین ہے ' آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں مگر زبان وہی کہے گی جس سے ہمارا رب راضی ہو۔"

"پتا نہیں اپنا آپ خالی خالی ہو گیا ہے یا دنیا ہی خالی ہو گئی ہے۔ جیسے ' سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک ایسی کمی ہے جسے کوئی بھی ' کبھی بھی پورا نہیں کر سکتا۔ اب زندگی کی راہوں پہ سنبھل کے قدم رکھنے پڑیں گے کہ ہمارے لیے دعائیں کرنے والے لب خاموش ہو گئے ہیں۔





زندگی یوں بھی نہیں تھا

خود کو ہر بار بتاتے ہیں، تمہیں یوں بھی نہیں
تھی کوئی اور ہی وہ بات کہ جو ہو نہ سکی
اُس سے کچھ اور ہی کہنا تھا، بتانا تھا اُسے
اُس سے ملنا تھا کسی اور ہی موسم میں کہیں
یوں مگر کس نے لکھا تھا ہم کو
کس نے چاہا تھا کہ اس راہ پہ بھاگا جائے
ایک نادیدہ تمنّا کا تعاقب کرکے
ہم نے بس خود کو تھکایا ہے، ملا کچھ بھی نہیں
اُس کو دیکھا بھی نہیں جس کی طلب تھی دل کو
(اور طلب کیا تھی یہ دل ہی کو ہے بہتر معلوم)
اور یہ دل...
کہ یہ اک اور طرح کی دُنیا
اب کسی اور تمنّا کی طرف مائل ہے
وہ جو اک اور تمنّا کا سفر تھا پہلے
وہ تو اب ختم ہوا...

سیّد کامی شاہ

کچھ خوابوں کو روتے عمر گزاری ہے
یونہی جاگتے سوتے عمر گزاری ہے

مایوسی اور دُکھ کی کالی ڈوری میں
روشن خواب پروتے عمر گزاری ہے

شاید کوئی اشک ستارہ ہو جائے
ہم نے روتے روتے عمر گزاری ہے

کیا تعمیر ہوا ہے یہ معلوم نہیں
پتھر ڈھوتے ڈھوتے عمر گزاری ہے

جانے کون ہماری فصلیں کاٹے گا
ہم نے آنسو بوتے عمر گزاری ہے

علی ازمان



گزارنے سے کوئی دُکھ گزر نہیں جاتا
سو وہ بھی جا تو چکا ہے، مگر نہیں جاتا

کسی سے ربطِ محبّت بحال کرنے کو
میں دل سے کہتا ہوں جاتا ہوں پر نہیں جاتا

قیام جیسی کوئی حالتِ سفر ہے مری
ہوا میں جیسے پرندہ ٹھہر نہیں جاتا

اک ایسے پیڑ کا فصل ہے میرا عشق سعودؔ
جو مر تو جاتا ہے لیکن بکھر نہیں جاتا

سعود عثمانی

میں ہوں منزلوں سے ناآشنا مجھے راستوں کی خبر نہیں
بھٹک رہی ہوں یہاں وہاں جب تُو شریکِ سفر نہیں

یہ میرے نصیب کی تیرگی میرے ساتھ ساتھ ازل سے ہے
میرے بخت کو جو اُجال دے کہیں ایسی کوئی سحر نہیں

کہے میرے غم کو جو اپنا غم، میرے اشک پلکوں سے چُوم لے
کوئی ایسا دستِ شفا نہیں کوئی ایسا دستِ ہنر نہیں

میرے چارہ گر سے کہو کہ وہ کوئی زخم میرا ہرا کرے
ہوا اک زمانہ کہ مجھ کو بھی کوئی میری اپنی خبر نہیں

مرے ہم سفر ترا ساتھ تھا، میرے پاس گویا جہان تھا
تجھے کھو دیا تو گنوا نے کا مری ذات میں کوئی ڈر نہیں

نائلہ جاوید

شگفتہ نگاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر تم غلطیاں کرو کہ تمہاری غلطیاں آسمان تک پہنچ جائیں، پھر توبہ کرو تو (پھر بھی) اللہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔"

فائدہ:۔ یہ ضروری ہے کہ انسان گناہ کے بعد جلد از جلد توبہ کرلے، تاہم اگر نفس اور شیطان کے بہکاوے اور دل کی غفلت کی وجہ سے جلد توبہ نہ کی جاسکے تو جب بھی احساس ہو، توبہ کرلینی چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اتنے زیادہ گناہ ہوگئے ہیں۔ وہ معاف نہیں ہوں گے۔ البتہ توبہ وہ ہے جو دل سے ہو صرف زبان سے نہ ہو۔

صدقہ کی برکت،

سالم بن ابی الجعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم میں ایک شخص تھا، جو لوگوں کو بہت تکلیف پہنچایا کرتا تھا۔ لوگوں نے اس سے تنگ ہو کر حضرت صالح علیہ السلام سے شکایت کی اور درخواست کی کہ آپ اس کے لیے بددعا کردیں تاکہ ہماری جان اس بدبخت سے چھوٹ جائے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے جواب دیا کہ "جاؤ تم اس کے شر سے محفوظ ہو جاؤ گے۔"

وہ شخص روزانہ لکڑیاں چننے جایا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دن وہ حسب معمول لکڑیاں چننے جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ اس روز وہ اپنے ساتھ دو چپاتیاں لے کر گیا تھا۔ اس نے ایک خود کھالی اور دوسری کو صدقہ کردیا۔

وہ گیا اور لکڑی چن کر شام کو صحیح و سالم واپس لوٹ آیا۔ اسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ لوگوں کو یقین تھا کہ حضرت صالح کی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ اب ان کی بددعا سے۔ یہ شریر آدمی ضرور ہلاک ہو جائے گا۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تو وہ حضرت صالح علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

"وہ شخص تو لکڑیاں چن کر صحیح و سالم لوٹ آیا اسے کچھ بھی نہیں ہوا۔"

حضرت صالح علیہ السلام کو تعجب ہوا۔ انہوں نے اس شخص کو بلوایا اور اس سے دریافت کیا کہ تم نے آج کون سا عمل کیا ہے؟"

اس نے بتایا۔ "میں آج لکڑی چننے نکلا تھا اور میرے پاس دو روٹیاں تھیں۔ میں نے ایک کو صدقہ کردیا اور دوسری کو کھالیا تھا۔"

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا۔ "اس لکڑی کے گٹھڑ کو کھولو۔" لوگوں نے اسے کھولا تو اس میں ایک سیاہ سانپ (اسود سالخ) کسی درخت کے تنے کی مانند پڑا ہوا تھا۔ اور اپنا دانت لکڑی کے ایک موٹے تنے پر گاڑے ہوئے تھا تو حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا۔

"تیرے اسی عمل یعنی صدقہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تجھے اس سے بچالیا۔"

قول حضرت علی رضی اللہ عنہ،

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

"کوشش کرو کہ تم دنیا میں رہو، دنیا تم میں نہ رہے کیونکہ کشتی جب تک پانی میں رہتی ہے خوب تیرتی ہے لیکن جب پانی کشتی میں آجاتا ہے تو وہ ڈوب

جاتی ہے۔
ثمرہ، اقرأ۔ کراچی

وجہ یہ تھی کہ میرے بھاگنے کے لیے دروازہ کھلا تھا۔
الوینہ، نوشین۔ حیدرآباد

عجلت،

پلمبر نے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک خاتون نے سر نکالا تو پلمبر نے کہا۔
"محمود صاحب نے مجھے بلایا تھا، گھر کے نلکے وغیرہ ٹھیک کرنے کے لیے۔"
"لیکن وہ تو تین مہینے ہوگئے گھر چھوڑ کر دوسری جگہ جاچکے ہیں۔" عورت نے کہا۔
"کمال ہے۔" پلمبر بولا۔ "عجیب لوگ ہیں۔ ارجنٹ کام کے لیے بلاتے ہیں اور خود غائب ہو جاتے ہیں۔"
فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

اچھی کہاوتیں،

☆ بلندی پر اڑنے والوں کو پستیاں بھی اتنی ہی گہری ملتی ہیں۔

☆ لفظوں کے دانت نہیں ہوتے مگر پھر بھی یہ کاٹ لیتے ہیں اور جب یہ کاٹ لیتے ہیں تو ان کے دیے زخم عمر بھر نہیں بھرتے۔

☆ کاغذ پر زندگی کے نقوش مکمل طور پر کبھی نہیں اتارے جاسکتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کپڑے کا پرنٹ کاغذ پر اتارا جائے تو اس کا تاثر بدل جاتا ہے۔

☆ کاش کا لفظ آپ کی کوتاہیوں کو ظاہر کرتا ہے۔
انجل۔ ڈہرکی

وجہ،

"سچ سچ بتاؤ تم نے اپنی بیوی پر کس وجہ سے ہاتھ اٹھایا تھا۔" جج نے ملزم سے پوچھا۔
"تین باتوں کی وجہ سے جناب۔" ملزم نے جواب دیا۔ "پہلی وجہ یہ تھی کہ اس کی پیٹھ میری طرف تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ بیلن اس کے ہاتھ میں نہیں تھا اور تیسری

صاحب ایثار،

پھل نہ درخت کے ڈالے کو لگتا ہے اور نہ اس کے مضبوط تنے کو۔ پھل جب بھی لگتا ہے، لرزنے والی شاخ کو لگتا ہے۔ اور جہاں بھی لگتا ہے، کانپتی ہوئی ڈالی کو لگتا ہے۔ جس قدر شاخ رکوع میں جانے والی ہوگی، اسی قدر زیادہ پھل کی حامل ہوگی اور فائدہ درخت کو اس کا یہ کہ پھل کی وجہ سے کلہاڑے سے محفوظ رہتا ہے اور تنا بھی۔ درخت کی بھی عزت ہوتی ہے اور درخت کی وجہ سے سارا باغ عزت دار بن جاتا ہے۔ (اشفاق احمد)
رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

مجبوری،

تجھے میں بھول تو جاتا
مگر تیرے تعلق سے
جو چہرے سامنے آئے
جو رستے سامنے آئے
جو رشتے سامنے آئے
انہیں کیسے بھلاتا میں
تجھے کیسے بھلاتا میں
نسبت گیلانی۔ کہروڑ پکا

اظہار محبت،

مغربی ممالک میں اظہار محبت یوں بھی ہوتا ہے۔
"یہ تم کن جھنجٹوں میں پھنسی ہوئی ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں یہاں سے کہیں دور، بہت دور لے جاؤں۔ ہمارا ایک چھوٹا سا گھر ہو، جس کے آنگن میں خوشیوں کے پھول کھلیں۔ ننھے منے معصوم بچوں کی ہنسی کی جھنکار سے در و دیوار جھوم اٹھیں اور... اور..."
"کہو نا... خاموش کیوں ہوگئے ہو؟" دوسری طرف سے فوراً پوچھا جاتا ہے۔

"اور اگر حالات اجازت دیں تو پھر شادی بھی کر لیں۔" بہت محبّت سے جواب دیا جاتا ہے۔

ارم کمال۔ فیصل آباد

جیسے،

راز داری سے یہ سب فضل وکرم ہوتا ہے
کیا عجب کل کو میرے پاس بھی کار آجائے
اس طرح ہاتھ لگے میری متاع رشوت
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

اقصیٰ ناصر۔ عذرا ناصر۔ کراچی

علامہ اقبال کی عظمت،

1922ء میں علامہ اقبال لاہور میں ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ مکان بدنما اور ٹوٹی پھوٹی حالت میں تھا۔ کرایہ بھی زیادہ تھا۔ دوستوں میں سے کسی نے کہا۔

"حضرت! یہ مکان کسی وقت بھی گر سکتا ہے۔"

علامہ اقبال نے جواب دیا۔ "ہاں یہ تو میری دعاؤں سے ہی قائم ہے۔"

پوچھا گیا۔ "آپ اتنا کرایہ بھی دیتے ہیں، اس کرائے میں تو اس سے بہتر مکان مل سکتا ہے۔"

علامہ اقبال نے جواب دیا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ یہ مکان ایک ہندو بیوہ کا ہے جس کے بچوں کی گزر اوقات اسی مکان کے کرائے پر ہے۔ مجھے یہ مکان خالی کرنے یا کرایہ کم کروانے میں شرم آتی ہے۔"

ندا، نفسہ۔ فیصل آباد

پریشانی،

کلب میں پریشان اور اداس بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھنے پر اپنے دوست کو بتایا۔

"میری بیوی میری کار لے کر کسی آدمی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

"کون تھا وہ آدمی؟" دوست نے پوچھا۔

"وہ کوئی بھی ہو، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔"

وہ شخص بولا۔ "لیکن وہ تو میری نئی کار لے کر بھاگ گئی ہے۔"

صدف عمران۔ کراچی

پودینہ،

ماہرین کا کہنا ہے کہ پودینے کے پتے معدے اور سینے کے مختلف امراض دور کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ پودینے کے پتوں کے باقاعدہ استعمال سے معدہ اپنے افعال بہتر طور پر انجام دیتا ہے اور یہ پتے کھانا ہضم کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ پودینے کے پتے کھانے سے متلی اور سر درد کا خاتمہ ہوتا ہے اور یہ سینے کی تکالیف، حلق اور پھیپھڑے کے انفیکشن کو دور کر دیتا ہے جبکہ پودینے کا روزانہ استعمال دمے کے مریضوں کے لیے بھی مفید ہے۔

صائمہ جیمی۔ کراچی

اخلاق،

ہندوستان کے مشہور صوفی بزرگ حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنی مشہور کتاب "کشف المحجوب" میں یہ بات نقل کی ہے۔

ایک مرتبہ امام زین العابدینؓ سے کسی نے دریافت کیا۔

"اخلاق کیا ہوتا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔

"اخلاق یہ ہے کہ جب تم کسی سے راضی ہو تو باطل کی طرف جھکو نہیں اور جب کسی سے ناراض ہو تو حق کو چھوڑو نہیں۔"

شائستہ اکبر۔ گڈو کالونی



خالدہ جیلانی



حمیرا نوشین ___ منڈی بہاؤالدین

محسن غریب لوگ تو تنکوں کا ڈھیر ہیں
ملبے میں دب گئے کبھی پانی میں بہہ گئے

آمنہ اُجالا ___ ڈہرکی

دلوں میں فرق آجائے تو اتنا یاد رکھنا تم
دلیلیں، منتیں اور فلسفے بے کار جاتے ہیں

انجل ___ ڈہرکی

ہمیشہ کے لیے چہرے نقابوں میں نہیں رہتے
سبھی کردار کھلتے ہیں کہانی ختم ہونے پر

فاطمہ سکندر ___ لاہور

ان سے ملنے کا کیا سوال قدم
وہ سدا میرے پاس ہوتے ہیں

مدیحہ نورین مہک ___ برنالی

یہ میرا حوصلہ ہے تیرے بغیر
بات کرتا ہوں، سانس لیتا ہوں

فرحت افضل گھمن ___ سیدوالا

زیست ہاتھوں میں لیے پھرتی ہے پتھر قدم
ہم نے کس شوق سے گھر شیشے کے بنوائے تھے

نازیہ تارڑ، آسیہ تارڑ ___ سرگودھا

وہ اچھا ہے تو بہتر، برا ہے تو بھی قبول
مزاجِ عشق میں عیبِ یار دیکھے نہیں جاتے

آسیہ فرید ___ ملتان

مخلص ہوں میں دشمن پر کرتا ہوں بھروسا
تاعمر مجھے جینے کے آداب نہ آئے

سیدہ لوبا سجاد ___ کہروڑپکا

خطا کسی کی ہو لیکن سزا کسی کو ملے
یہ بات جبر نے چھوڑی ہے ہر صدی کے لیے
وہ مجھ کو چھوڑ گیا تو مجھے یقین آیا
کوئی بھی شخص ضروری نہیں کسی کے لیے

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ___ کراچی

تیز جگ کی اونچ نیچ نے پانی کا رخ موڑ دیا
تیری مل تو وہیں کھڑی ہے میری فصلیں ڈوب گئیں

عروسہ شہوار ___ جہلم

مانا کہ تم اُجالوں کے اُجالے ہو
اک دیا مگر احتیاط رکھنا
یہاں سب دل توڑنے کا ہنر رکھتے ہیں
پر تم دل جوڑنے کا ہنر رکھنا

ایس ایس ___ کوٹری

تم سے ملے بھی ہم تو جدائی کے موڑ پر
کشتی ہوئی نصیب تو دریا نہیں رہا
کہتے تھے ایک پل نہ جئیں گے تیرے بغیر
ہم دونوں رہ گئے ہیں وعدہ نہیں رہا

لاریب، ماہ زیب ___ چونیاں

نہ جانے کیا تھا اُن آنکھوں میں کہ سر خم کر دیا
ورنہ دل تو وہ سکندر جو کبھی ہارا نہ تھا

شبنم شمشاد ___ یزمان

کیا کہیں اب کہ عجب عشق ہوا ہے محسن
سرد شاموں کی طرح، گرم سویرے جیسا

ثمرہ، اقرا ___ کراچی

اتنا بے زار ہوں کہ مجھے اب تجھ سے
کچھ نہیں چاہیے، تو بھی نہیں

حرا قریشی ___ ملتان

ہم نے گلچیں کو بھی صیاد کو بھی جان لیا
تو نے بخشی جو نگاہوں کو بصیرت کی کرن

عمارہ نثار ___ ڈونگہ بونگہ

نیندیں گروی ہیں اس کے پاس
محبت ادھار تھی جس سے

امت الصبور

خواتین کی ڈائری

سیدہ لوبا سجاد کی ڈائری سے

اُداسیوں کے شاعر ناصر کاظمی نے جب بھی قلم اٹھایا زندگی کی حقیقت کو تحریر کر دیا۔

اجنبی شہر کے اجنبی راستے
میری تنہائی پر مسکراتے رہے

میں بہت دیر تک یونہی چلتا رہا
تم بہت دیر تک یاد آتے رہے

زہر ملتا رہا، زہر پیتے رہے
روز مرتے رہے، روز جیتے رہے

زندگی بھی ہمیں آزماتی رہی اور
ہم بھی اُسے آزماتے رہے

زخم جب بھی کوئی ذہن و دل پر لگا
زندگی کی طرف دریچہ کھلا

گویا ہم بھی کسی ساز کی طرح سے
چوٹ کھاتے رہے، گنگناتے رہے

اجنبی شہر کے، اجنبی راستے
میری تنہائی پر مسکراتے رہے

گڑیا شاہ کی ڈائری سے

جون ایلیا کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ انہوں نے اتنی سادگی کے ساتھ بڑی بڑی باتیں کہہ دی ہیں کہ اور کچھ لکھنا بے معنی سا لگتا ہے۔ آپ خود پڑھ کر دیکھیں یقیناً میرے ذوق کی داد دیں گی۔ تمام قاری بہنوں کے نام اور میری ایک معروف دوست کے نام۔ سنیعہ! دیکھو تمہارے لیے۔

نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم

خموشی سے ادا ہو رسم دوری
کوئی ہنگامہ برپا کیوں کریں ہم

یہ کافی ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں
وفاداری کا دعویٰ کیوں کریں ہم

نہیں ہے دُنیا کو جب پروا ہماری
تو پھر دُنیا کی پروا کیوں کریں ہم

برہنہ ہیں سرِ بازار تو کیا
بھلا اندھوں سے پردہ کیوں کریں ہم

صدف عمران کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر عدم کی یہ خوبصورت غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

ہم کچھ اس ڈھب سے تیرے گھر کا پتا دیتے ہیں
خضر بھی آئے تو گمراہ بنا دیتے ہیں

شیخ مت ساغرِ بادہ کی طرف ہاتھ بڑھا
آدمی دیکھ کر ہم آبِ بقا دیتے ہیں

ابنِ آدم کو نہیں ہوشِ سماعت ورنہ
دل کے ذرات خموشی میں صدا دیتے ہیں

اے جنوں! تو نے ہمیں فکر سے آزاد کیا
ہم تجھے سلطنتِ ارض و سما دیتے ہیں

ان کو مجبور نہ کر جلوہ نمائی پہ کلیم
رو میں آ جائیں تو خود پردہ اٹھا دیتے ہیں

ہم کو فرصت نہیں بے کار مشاغل کی قسم
دیکھنا طور سے وہ کس کو صدا دیتے ہیں

سدرہ علینہ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ خوبصورت نظم آپ سب قارئین کی نظر۔

"محبت توڑ سکتی ہے"

کوئی زنجیر ہو
آہن کی، چاندی کی، روایت کی
محبت توڑ سکتی ہے
یہ وہ ڈھال ہے جس پر
زمانے کی کسی تلوار کا لوہا نہیں چلتا
یہ وہ شہر ہے جس میں
کسی آمر، کسی سلطان کا سکہ نہیں چلتا
گر چشمِ تماشا میں ذرا سی بھی ملاوٹ ہو
یہ آئینہ نہیں چلتا
یہ وہ آگ ہے جس میں
بدن شعلوں میں جلتے ہیں تو روحیں مسکراتی ہیں
یہ وہ سیلاب ہے جس کو
دلوں کی بستیاں آواز دے کر خود بلاتی ہیں
یہ جب چاہے کسی بھی خواب کو تعبیر مل جائے
جو منظر بجھ چکے ہیں ان کو بھی تنویر مل جائے
دعا جو بے ٹھکانہ تھی اسے تاثیر مل جائے
کسی رستے میں رستہ پوچھتی تقدیر مل جائے
یہ چکنا چور آئینوں کی کرچیں جوڑ سکتی ہے
جدھر چاہے یہ باگیں موسموں کی موڑ سکتی ہے
کوئی زنجیر ہو، اس کو محبت توڑ سکتی ہے

ارم کمال کی ڈائری سے

خوشبوؤں کی شاعرہ میری فیورٹ پروین شاکر کی یہ غزل جو مجھے بے حد متاثر کرتی ہے۔ آپ سب بہنوں کے لیے۔

مشکل ہے کہ نکلے اب کوئی بھی گھر سے
بات آ گئی دستار تک ہوتی ہوئی سر سے

برسا بھی تو کس دشت کے بے فیض بدن پر
اک عمر مرے کھیت جس ابر کو ترسے

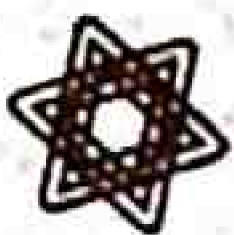
اب کسے چاہیں، کسے ڈھونڈا کریں
وہ بھی آخر مل گیا اب کیا کریں

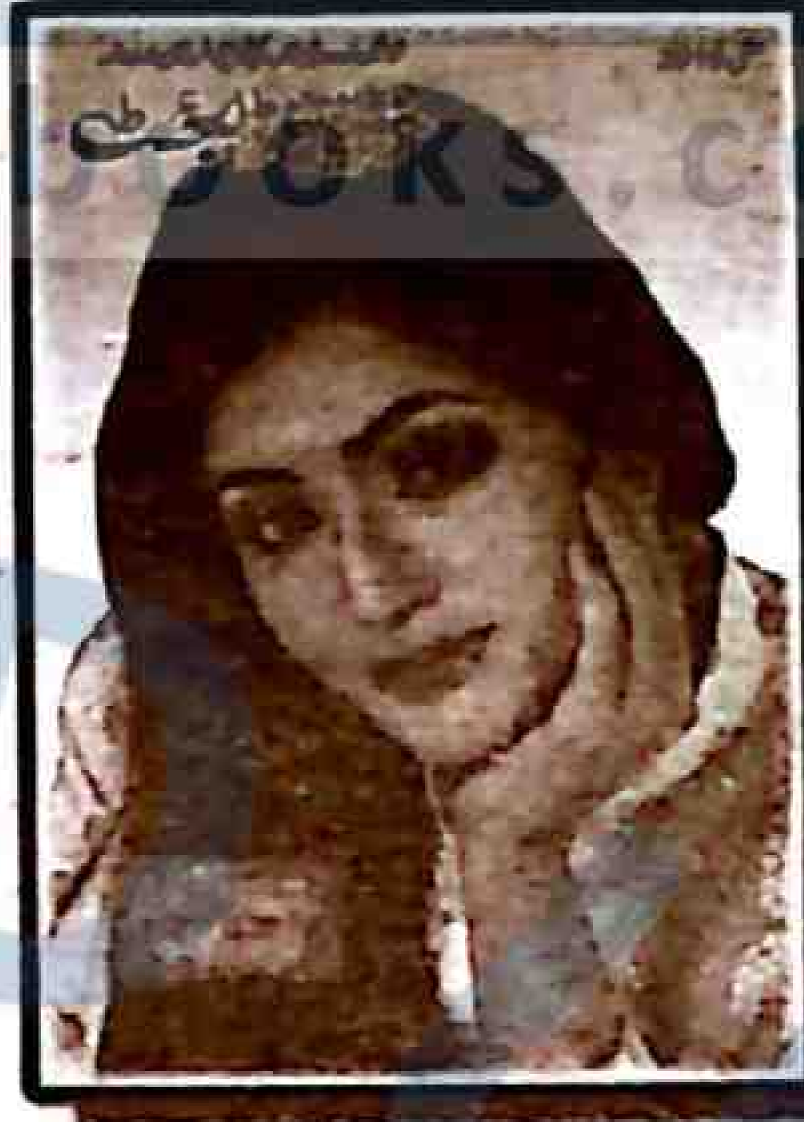
ہلکی ہلکی بارشیں ہوتی رہیں
ہم بھی پھولوں کی طرح بھیگا کریں

آنکھ موندے اس گلابی دھوپ میں
دیر تک بیٹھے اسے سوچا کریں

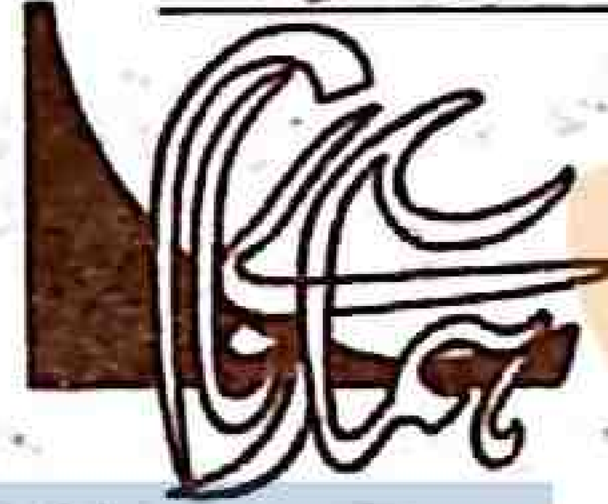
دل، محبت، دین، دنیا، شاعری
ہر دریچے سے تجھے دیکھا کریں

گھر نیا، کپڑے نئے، برتن نئے
ان پرانے کاغذوں کا کیا کریں





نادرہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

یاسمین حنفی ...... کراچی

"نمل" ہر بار کی طرح یہ قسط بھی سپرڈپر تھی... سعدی اور فارس کے ملنے کا انداز بہت اچھا تھا "دشت جنوں" آمنہ ریاض کا زبردست ناول ہے.... بس جس دن اسٹوری پڑھتی ہوں اس دن، سارا دن آیوشمتی اپنے آس پاس محسوس ہوتی ہے (ہاہاہا) افسانے سارے اچھے تھے پر "انوکھی کہانی" کی کیا ہی بات.... اس شمارے کی خاص بات جی بالکل سائرہ رضا کا ناول "دل دھڑکتا ہے" اچھی تحریر تھی ہر لحاظ سے.... ہر جملہ ہر لفظ دل سے لکھا گیا تھا تو پہنچا بھی ڈائریکٹ دلوں تک.... آب حیات کی کمی محسوس ہوتی تھی اگر سائرہ رضا کا ناول نہ ہوتا تو.... باقی تمام سلسلے بھی اچھے تھے ہمیشہ کی طرح۔

ویسے ازیکا ڈینیل کے انٹرویو میں سمجھ نہیں آیا کہ پہلے شادی والے سوال کا جواب نہ دینا پھر تین بچیوں کا ذکر کرنا؟ کچھ سمجھ نہیں آیا؟

ج پیاری یاسمین! خوشی ہوئی کہ آپ اتنی توجہ سے خواتین پڑھتی ہیں۔

جملہ یہ تھا صبح اٹھ کر اپنی تین عدد بلیوں کو دیکھتی ہوں سہوا "بلیوں کی جگہ بچیوں لکھ دیا گیا۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

صباح منہاس...... ڈیرہ غازی خان

ٹائیٹل بہت اچھا لگا۔ سائرہ رضا کا نام لکھا دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی نمل میری موسٹ فیورٹ کہانی ہے۔ ایک دم مزے کی، کچھ الگ سی اسٹوری زمر اور فارس کی نوک جھونک، سعدی کی باتیں، حنین کا قرآن پڑھنا اور سیکھنا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی پڑھنا سیکھ رہے ہیں۔ مجھے نمرہ سے شکایت ہے کہ جو اتنے سارے قارئین ان کے انٹرویو کے لیے مر رہے ہیں ان کو انٹرویو کیوں نہیں دیتیں اور سائرہ رضا کا ناول اف کیا اعلا ناول لکھا ہے۔ سائرہ رضا جب بھی لکھتی ہیں کمال کا لکھتی ہیں۔

اس کے علاوہ دشت جنوں بھی اچھی اسٹوری ہے۔ پانچویں قسط ہے پر کچھ خاص ہوا نہیں اور نہ ہی کہانی آگے بڑھی میرا مطلب ہے کہ کہانی کی ہر قسط میں کچھ نہ کچھ آگے پیش رفت ہوتی ہے تو یہاں تھوڑی اسپیڈ کم ہے لیکن کہانی بہت اچھی ہے۔ سسپنس ہے۔ بہت میں بہت ایکسائیٹڈ ہوں یہ جاننے کے لیے آیوشمتی آخر ہے کیا؟

ویسے آج کل خط بڑے چھائے ہوئے ہیں بہت مزہ آتا ہے خطوط پڑھ کر ساری قارئین اتنا اچھا لکھتی ہیں بہت مزہ آتا ہے۔ ان سے ایک ان دیکھی جان پہچان محسوس ہوتی ہے۔ اور آج کل نئی مصنفہ بنت سحر جو ہیں انہوں نے بھی اچھا خط لکھا تھا۔ یہ امایہ خان کہاں غائب ہیں اور نبیلہ رمضان بھی اس کے علاوہ افسانے سارے بس ٹھیک تھے.... ہاں امتہ العزیز شہزاد بھی اچھا لکھتی ہیں ان کا یہ افسانہ بھی اچھا ہے۔

ج آیوشمتی کیا ہے۔ یہ اگر ہم نے ابھی آپ کو بتا دیا تو پھر آپ کو ناول پڑھنے میں کیا مزا آئے گا۔ وقت آنے پر یہ اسرار بھی کھل جائے گا۔

کچھ نئی مصنفین واقعی بہت اچھا لکھ رہی ہیں اور ہمیں

ان سے بہت توقعات ہیں۔ اب اس پر منحصر ہے کہ وقت ان کا کتنا ساتھ دیتا ہے اور وہ خود کتنی محنت کرتی ہیں۔ کامیابی کے لیے کوشش کی نہیں مسلسل کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور آپ تو ماشاء اللہ بہت باصلاحیت بچی ہیں۔ اپنا جواب آپ کے قلم سے لکھا دیکھ کر مزا آگیا۔ بہت خوب۔ داستان ردی کی ٹوکری چونکہ ردی کی ٹوکری کے نام تھی اس لیے اسی کو دے دی ہم امانت میں خیانت نہیں کرتے۔ آپ کے لیے مشورہ یہ ہے کہ تھوڑا سا اپنا مطالعہ وسیع کریں پھر لکھیں۔

س۔ح۔۔۔ جھنگ صدر

عرصہ دراز سے خواتین و شعاع زیر مطالعہ ہیں۔ قلم اٹھانے پر مجبور سائرہ رضا نے کیا ہے سائرہ آپ کیا ہیں؟ کیوں کرتی ہیں ایسا؟ کیوں اتنا دل دکھاتی ہیں؟ آنسو ایسے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے بس آئندہ آپ کو نہیں پڑھنا!

ج س۔ح! ایسی بھی کیا راز داری، اپنا کوئی فرضی نام ہی لکھ دیتیں ۔۔۔ اللہ پاک نے ہر انسان کے نصیب میں تھوڑی تھوڑی چیزیں لکھ دی ہیں۔ تھوڑی سی خوشی تھوڑا سا غم، نفرت، محبت، آنسو، مسکراہٹ، فرصت، فراغت اور یہی زندگی کی خوب صورتی ہے۔ رنج و غم نہ ہوں تو خوشی کی قدر و قیمت کا احساس باقی نہیں رہے گا۔ اگر ہر روز 'روز عید ہو تو پھر عید کے دن کا انتظار کون کرے گا؟

سائرہ رضا نے وہی لکھا جو ہمارے اردگرد ہو رہا ہے۔ یہ سائرہ کا کمال ہے، ان کے قلم کی اثر آفرینی ہے جس نے آپ کی آنکھیں نم کردیں۔

بہت خوب صورت انداز میں آپ نے سائرہ رضا کو سراہا ہے۔ بہت شکریہ۔ ہم آپ کی یہ "خوب صورت تعریف" ان تک پہنچا رہے ہیں۔

ثمینہ اکرم۔۔۔ بہار کالونی لیاری۔ کراچی

میری سالگرہ 4 مئی کو ہوتی ہے اس دفعہ اکرم نے مجھے برتھ ڈے گفٹ 5 مئی کو دیا۔ پتا چلا کہ آج ہی خواتین ڈائجسٹ آیا ہے۔ اور یہی میرا تحفہ ٹھہرا۔۔ اس انمول تحفے کو پاکر میں بہت خوش ہوئی۔

8 مئی کو شہید معیز اکرم کے ایصال ثواب کا اہتمام کیا تو چودھری سرداز محمود صاحب کے لیے بھی بارگاہ الٰہی میں دعائے مغفرت اور بلند درجات کی خصوصی دعا کی۔۔ انٹرویو میں میر محمد علی سے ملے۔۔ سیلبرٹی ہونے کے باوجود وہ اتنے سادہ مزاج اور بناوٹ سے پاک شخصیت لگے۔۔ بڑی بات ہے بھئی۔ "کرن کرن روشنی" میں احادیث کی روشنی میں اپنے کردار کی تعمیر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ سلسلہ ترتیب دینے پر میرے دل سے آپ کے لیے بہت دعائیں نکلتی ہیں۔۔ انشاء جی کا کالم پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کہ وہ ہمارے کراچی کے حالات دیکھتے ہوئے عالم بالا سے کالم لکھ رہے ہوں۔ ان کے کالم ہمیشہ ہی اپ ٹوڈیٹ ہوتے ہیں۔

آمنہ ریاض "دشت جنوں" کو بہت خوب صورتی سے آگے بڑھا رہی ہیں مگر ان کے کرداروں کے اتنے مشکل مشکل نام۔۔ مجھے الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔

"ہمارے نام" میرا فیورٹ سلسلہ ہے مگر اس مرتبہ اکثر خطوط میں تبصرہ کم اور شکوہ شکایت زیادہ نظر آیا۔ ہر قاری بہن کو ہی اپنے سوتیلی قاری ہونے کا گمان ہونے لگا ہے۔ آپ سب کو بار بار ایک ہی تاویل اور وضاحت دے کر جیسے تھک سی گئی ہیں۔ جبکہ آج کل مشکل لفظوں سے مزین خطوط لکھنے کا رواج سا پڑ گیا ہے۔ یہ خطوط نہ ہوئے قصہ چہار درویش ہو گیا۔۔ سائرہ رضا کا نام دیکھ کر ہی دل خوشی سے دھڑک اٹھتا ہے لیکن "دل پھر بھی دھڑکتا ہے" میں حورے اور سبکتگین کی کہانی پڑھ کر تو دل دکھ سے بھر گیا۔ زینیا نے دو پیار کرنے والے دلوں کو آخر کار جدا کر ہی دیا جبکہ دادا بہت خود غرض ہو گئے اور انہیں بلیک میل کرنے پر آگئے۔ افسانوں میں بھی نکھار آتا جا رہا ہے۔ "کھرے معاملات" "گلاب" "انوکھی کہانی" اور خوشبو جیسے لوگ سب ہی افسانے بہترین لگے "گلوں میں رنگ بھرے" عتیقہ ملک کا ناولٹ ہے۔ عتیقہ ملک ہر بار ہی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ جبکہ اس دفعہ تو کائنات غزل نے "سانسوں کے بکھرے تار" ایک شاہکار کہانی تخلیق کی۔ ویل ڈن کائنات۔۔ آپ نے بہت اچھا لکھا۔

نمل کو ہر ماہ میں خصوصی توجہ دیتی ہوں۔ کہانی میں نمرہ احمد دین و دنیا کو ساتھ لے کر چل رہی ہیں۔ یہ ناول بہت فرصت اور یکسوئی سے پڑھتی ہوں اور یہ ہر مرتبہ ہی میرے علم میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ قرآن مجید کی آیات پر تدبر اور غور و فکر کرنا، ہر مسلمان کے لیے ایک ضروری امر ہے اس بات کا احساس نمرہ احمد نے اس ناول کے ذریعے ہمیں

دلایا۔ تلاوت قرآن کریم کے لیے بہترین وقت فجر اور ایک حافظ قرآن کے لیے تہجد کا وقت بہترین ہوتا ہے (میرا بیٹا عبدالمقیت بھی حافظ قرآن بن رہا ہے) پہلا قتل تو سعدی نے نادانستگی میں کیا جبکہ دوسرا قتل جان بوجھ کر کیا۔ اب معصوم سعدی یوسف بھی قاتل بن گیا۔ اب اجازت دیں اللہ حافظ۔

ج پیاری ثمینہ! آپ کا خط پا کر ہمیں ہمیشہ ہی خوشی ہوتی ہے کیونکہ آپ کا خط یہ اطلاع ہوتی ہے کہ آپ اللہ کے کرم سے صحت مند، خوش و خرم ہیں۔ تبصرہ ہمیشہ کی طرح جامع اور مفصل ہے لیکن صرف تعریفیں پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے بہت سارا میٹھا کھانے کے بعد کچھ نمکین کھانے کی خواہش ہونے لگی ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ عبدالمقیت کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔ یہ اس کے لیے اور آپ کے لیے بہت بڑی سعادت اور خوش بختی ہے۔

سعدی قاتل نہیں بنا ہے، اس نے دوسرا قتل بہت سارے لوگوں کی جان بچانے کے لیے کیا ہے کیونکہ فصیح کچن میں داخل ہو کر ابلتے دودھ میں زہر ملا چکا تھا۔

فصیح سعدی کو مارنے آیا تھا اگر وہ اپنے دفاع میں صرف اپنی جان بچانے کے لیے بھی قتل کرتا تو جائز ہوتا۔۔۔ یہاں تو بہت سارے بے گناہ لوگوں کی زندگی کا سوال تھا۔
نمرہ یہی تو بتانا چاہتی ہیں کہ ہر قتل قابل تعزیر نہیں ہوتا۔

ساجدہ افتخار۔۔۔ کراچی

خواتین ڈائجسٹ میری جان ہے، برسوں کا ساتھ ہے ہمیشہ کی طرح اس بار کا شمارہ بھی لاجواب ہے "کرن کرن روشنی" پڑھ کر جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ میر محمد علی سے ملاقات بہت اچھی رہی بشریٰ انصاری کا تفصیلی انٹرویو لے لیں پلیز۔ افسانے کوئی خاص پسند نہیں آتے مکمل تو ہے ہی سب کی جان "دل دھڑکتا ہے" اس بار بھی سائرہ رضا نے ہم سب کا دل جیت لیا۔ نبیلہ عزیز کی پھوپھی جان کا سن کر بہت افسوس ہوا اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

پیاری ساجدہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ بشریٰ انصاری کا انٹرویو ہم پہلے ہی کئی بار شائع کر چکے ہیں۔ شاید آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔

عائشہ رباب۔۔۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی

السلام علیکم! رات ایک بجے آنکھ کھلی تو بوجھل آنکھیں گھوما تا سر لیکن جیسے ہی نظر ڈائجسٹ پر پڑی۔ نیند اڑن چھو ہو گئی۔ جھٹ مکمل پر پہنچی شاندار کیا قسط تھی قدم قدم پر سانس رکی جا رہی تھی۔ جب فارس، سعدی سے ملا۔ اف اللہ سعدی کی طرح ہمیں بھی لگا یہ فصیح ہو گا۔ جواہرات اور ہارون عبید کا ڈنر والا سین ہر چیز بہترین تھی۔ بس ناول میں مزاح ختم ہوتا جا رہا ہے۔ نمرہ احمد پلیز تھوڑا لائٹ کریں پھر دشت جنوں پڑھا اللہ اللہ مجھے تو اپنے اردگرد "آیو شمتی" گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اتنی رات میں ایسی کہانی اف۔۔۔ اس بار کی قسط بھی اچھی رہی۔ معاویہ خود منفرا کی جانب بڑھ رہا ہے اچھا لگا جہاں تک میری ناقص معلومات ہیں "آب حیات" کے بارے میں عمیرہ احمد نے کہا تھا وہ یہ ناول کافی عرصہ پہلے مکمل کر چکی ہیں۔ تو یہ اعتذار کیوں؟ ہمیں یہ چھٹیاں پسند نہیں ہیں۔ "دل دھڑکتا ہے" سائرہ رضا نے اس بار بھی کمال کر دیا بہت بہترین تھا۔ دادا کی بے بسی نے رلا دیا۔ اینڈ بھی کمال کا تھا کھرے معاملات طرز تحریر پسند نہیں آیا۔ روکھی پھیکی سی کہانی لگی۔ سبق آموز تھی "خوشبو جیسے لوگ" اچھی تھی۔ "گلاب" کچھ خاص کہانی نہیں تھی بس طرز تحریر پسند آیا "انوکھی کہانی" بہت زبردست تھی۔ "گلوں میں رنگ بھرے" ستائش کی بزدلی پسند نہیں آئی۔ اینڈ اچھا تھا۔ "سانسوں کے بکھرے تار" بالکل پسند نہیں آئی۔ سمعان کی فلیٹ خریدنے والی بات پر جان جل گئی۔ عبدالوہاب کی بات الگ تھی۔ یہاں تو ماں کی کوئی اہمیت ہی نہیں دکھائی گئی۔ تمام مستقل سلسلے اچھے تھے۔ انشاء جی کو پڑھا بہت محظوظ ہوئی "روشنی باقی ہے" بنت سحر نے بہت اچھا لکھا ہے۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ ازکا ڈینیل، میر محمد علی، سعدیہ رئیس سے ملاقات اچھی رہی۔ رنگارنگ میں حج اچھا لگا۔ "باورچی خانہ" حنا گل کے جوابات نہایت مزاحیہ تھے۔ میری ڈائری سے لوبا سجاد اور نسبت زہرہ کی غزلیں پسند آئیں۔

ج پیاری عائشہ مفصل اور جامع تبصرہ بہت اچھا لگا۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہوں۔

دعا' پاکیزہ' سمیہ' کنزہ نورین' ندا' راحت' صنم۔۔۔ صادق آباد

خواتین کو پڑھتے ہوئے تیرہ سال ہو گئے ہیں لیکن لکھنے کی ہمت اب ہوئی ہم آٹھ کزنز ہر ماہ خواتین کا بے چینی سے انتظار کرتی ہیں۔ اللہ اللہ کر کے ملتا ہے تو پڑھنے کے لیے لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں (سیاست دانوں سے کم) ہم سب میں بہت پیار و محبت ہے (ان ڈائجسٹ کی وجہ سے کہ ایک دوسرے سے پڑھنے کے لیے مل جائیں گے اس لیے سب بنا کر رکھتی ہیں) خیر یہ تو مذاق تھا اب جس کہانی نے ہمیں خواتین میں خط لکھنے کی انرجی پیدا کی ہے وہ صرف اور صرف نمرہ احمد کی کہانی "نمل" نے بھلا اس کہانی کی تعریف کے لیے الفاظ کہاں سے ملیں گے۔ زمر اور فارس کی کھٹی میٹھی باتیں مزہ دوبالا کر دیتی ہیں سعدی تو ہماری جان ہے۔ ہاشم کا کردار برا ہے پھر بھی دل کو اچھا لگتا ہے "دشت جنوں" کی یہ قسط شاندار تھی۔ سائرہ رضا آپ کی پیارے ہاتھوں سے لکھی گئی تحریر پڑھ کر اچھا لگا لیکن ساتھ میں دل دکھی بھی ہو گیا۔ لیکن پھر بھی دل دھڑکتا رہے گا۔ "گلوں میں رنگ بھرے" اچھی تحریر تھی گلاب بھی گلاب کی طرح مہکتی لگی۔ خط ضرور شائع کریں ورنہ ہم آٹھ حسیناؤں کے دل ٹوٹ جائیں گے۔

ج۔ پیاری حسیناؤں ۔۔۔ شعاع کی تو سب ہی قارئین ہمیں حسین لگتی ہیں۔ ویسے بھی ہمارا خوب صورتی کا معیار قدرے مختلف ہے۔ ہمیں ذہین اور شفاف دل رکھنے والے لوگ حسین لگتے ہیں۔ ظاہری خوب صورتی کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اگر دل اچھا نہ ہو تو ایسی خوب صورتی ہمارے دل کو نہیں بھاتی اور ہم دل تو کسی کا بھی توڑنا پسند نہیں کرتے اور "معصوم" دل تو بالکل بھی نہیں۔۔۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کا یہ باہمی پیار ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین

سمیرا شفاقت۔۔۔ شینکہ حضرو

ادارے کے تینوں پرچوں (خواتین' شعاع' کرن) کے ساتھ میرا رشتہ میری پیدائش سے بھی پہلے کا ہے۔ جی ہاں آپ کی دیگر بہت سی قارئین کی طرح میں نے بھی اپنی پیدائش سے پہلے کے رسالے بھی پڑھ چکی ہوں یہ شوق مجھے اپنی مرحومہ خالہ جانی سے ورثے میں ملا ہے۔ طویل خاموشی توڑنے کی وجہ بنی ہیں نمرہ احمد' ایک کے بعد ایک سپرہٹ ناول نمرہ جی کہیں آپ کو کسی دشمن کی نظر نہ لگ جائے نظر اتارتی رہا کریں۔

نمرہ جی! ہیرو تو ہیرو' آپ کا تو ولن بھی اتنا شاندار ہے کہ مت پوچھیں۔ اور تھینکس آپ کا ہماری ذہنی الجھنوں کو سلجھانے کے لیے' اسلام واقعی ایک خوب صورت طرز زندگی کا نام ہے۔ کیری آن اللہ کرے انداز بیاں اور زیادہ۔

سائرہ جی میری فیورٹ رائٹرز میں سے ہیں اور ہمیشہ ہی شاندار لکھتی ہیں۔ روٹین سے ہٹ کر ڈفرنٹ موضوع جہاں حور کا دکھ دکھی کر گیا۔ کافی عرصے تک یاد رہ جانے والی تحریر' ناولٹ دونوں بس گزارے لائق ہی تھے' کچھ کچھ فلمی سے یا انڈین ڈراموں جیسے اتفاقات سے بھرپور "دشت جنوں" آمنہ جی خوبصورتی اور تجسس کو قائم رکھتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ افسانے سارے ہی بہت اچھے ہیں۔ سبق آموز' کم پیرائے میں زیادہ سبق فائزہ افتخار' ثمینہ عظمت اور ثمرہ بخاری! کہاں ہیں آپ لوگ' آپ کی ہلکی پھلکی شگفتہ رومانٹک کہانیوں کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ انیسہ جی نے بھی کافی عرصے سے سلسلے کے لیے کچھ نہیں لکھا ہم ہماری سیانی کو بہت مس کر رہے ہیں۔

اعتذار

مئی کے شمارے میں ازیکا ڈینیل کا انٹرویو شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک جملہ تھا۔

"صبح اٹھ کر اپنی تین عدد بلیوں کو دیکھتی ہوں۔"

سہواً "بلیوں کی جگہ "بچیوں" لکھ دیا گیا۔

اس سہو کے لیے، ہم ازیکا ڈینیل سے معذرت خواہ ہیں۔

ج پیاری سمیرا ــــ اتنا نازک سا دل ہے آپ کا کہ خط شائع نہ ہوا تو ٹوٹ گیا۔ معذرت چاہتے ہیں کہ آپ کے خطوط کو شامل اشاعت نہ کر سکے۔ کوشش تو ہم پوری کرتے ہیں کہ اپنی تمام پیاری نازک دل بہنوں کا خط خواہ مختصر ہی سہی ضرور شامل کریں مگر پھر بھی کوتاہی ہو جاتی ہے اور اس خطا پر جو مجبوری میں سرزد ہوتی ہے ہمارے دل کی جو حالت ہوتی ہے۔ وہ تو ہم بیان بھی نہیں کر سکتے کہ انسان کے نصیب میں کچھ مجبوریاں بھی ہیں۔

ج۔ تھوڑا دل مضبوط کیجئے یہ زندگی ہے' اس میں بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔

ام سعدی..... ملتان کینٹ

بعد سلام عرض ہے کہ قصہ کچھ یوں ہے کہ پچھلے ہفتے زندگی کا پہلا خط اور افسانہ آپ کو پوسٹ کیا اور پوسٹ کرتے ہی خود کو مصنفہ سمجھنے لگ گئے۔

اب حالت یہ ہے کہ سارا گھر تلپٹ پڑا ہے۔ سامان آدھا پیک باقی راہوں میں بکھرا نظر التفات کا منتظر ہم صفحات بکھرائے لکھنے میں مصروف 'اس ویک اینڈ یہاں سے کوچ کرنا ہے۔ گوجرانوالہ جا کے اگلی ملاقات ہو گی آپ سے۔ مگر اب کچھ نہیں لکھ کر بھیج رہے کہیں یہ نہ سننے کو مل جائے کہ یوں صفحات کے مقدر سیاہ کیے جا رہے ہیں پیشتر اس کے آپ کا مقدر سیاہ ہو جائے چھوڑیں یہ سب اور مطالعے پر توجہ دیں۔ اب اور کتنی توجہ دیں مطالعے پر' ہم تو ایک صفحہ تین دفعہ پڑھتے ہیں تاکہ ہر لفظ کا معانی و مطلب سمجھ میں آ جائے۔

خاندان میں اگر کسی کا لکھنے سے واسطہ ہے تو اتنا کہ چچا کو گھڑی کے شکریہ کا خط لکھ دیا۔ ہمارے خطوط کے سب دیوانے رہے۔ بھائی کی خواہش ہوتی تھی کہ خط تم ہی لکھنا۔ خالہ کہتی تھیں کہ تمہارا خط دیار غیر میں کسی باد نسیم کی طرح سے معطر کر دیتا ہے دل و جاں کو افسوس ان ناقدروں نے ہمارے خطوط نہ سنبھالے نہیں تو غالب کی طرح ہم بھی خطوط کی ہی کتابت کروا لیتے۔ مصنفہ بننے کا ہمارا خواب دیوانے کا تو نہیں یہ تو آپ ہی بتا سکتی ہیں۔

ج پیاری ام سعدی! کم از کم اپنا نام تو تحریر کرتیں' ہمیں بھی تو معلوم ہو تاکہ یہ معرکتہ الآرا خط کس نے لکھا ہے۔ مطالعہ پر توجہ دینے کے مشورے سے مراد ہوتی ہے کہ ادب کے بڑے بڑے ناموں کی تحاریر کا مطالعہ کریں۔ اپنا ہی لکھا ہوا تین تین مرتبہ پڑھنے کا فائدہ اور یہ چچا جان ابھی تک سالگرہ پر یا امتحان میں کامیابی پر گھڑیاں ہی بھیج رہے ہیں۔ اب تو اسمارٹ فون' لیپ ٹاپ کا زمانہ ہے' تحفہ ضرور بدل جانا چاہیے۔

صائمہ گل ــــ گاؤں چمدھری مردان

نمرہ کی تحریر پڑھتی نہیں ہوں بلکہ ان سے سیکھتی ہوں۔ اللہ بھلا کرے نمرہ کا جنہوں نے ہمیں بے برکتی کا سبب بتا دیا ہے۔ میں نے اپنی نو سالہ بیٹی کے ساتھ پھر سے ترجمہ شروع کر دیا ہے۔

سائرہ جی! محبتوں کو نبھانا کوئی آپ سے سیکھے۔ سچ ہے کسی کو پانا ہی محبت نہیں ہے بلکہ کسی کے پاس نہ ہوتے ہوئے بھی ہر پل محسوس کرنا محبت ہے۔

عنیقہ ملک کا آزمائشوں کے بعد ہیپی اینڈ والی تحریر تھی پڑھ کر اچھا لگا بلکہ بہت اچھا لگا۔ ایک ادنیٰ سا مشورہ ہے کہ "خبریں وبریں" کے بجائے مسنون دعائیں یا پھر وظیفے دیا کریں۔ تو زیادہ بہتر ہو گا تبصرہ خاصا لمبا ہو گیا۔ کیا کریں بھئی۔ کیا کریں تین سال کا ادھار تھا' اتارنا تو تھا۔

ج پیاری صائمہ! تین سال بعد آپ نے شرکت کی بہت خوشی ہوئی لیکن یاد رکھیں دوری ہمیشہ شدت کو جنم نہیں دیتی کبھی کبھی آنکھ اوجھل' پہاڑ اوجھل والا معاملہ بھی ہو جاتا ہے۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

ایمان جیلانی..... گاؤں دریا خان جلبانی

خواتین میں میرا نام پڑھ کر میرے بابا بہت خوش ہوئے آپ کا شکریہ۔ نمرہ جی نے دل خوش کر دیا کیا کمال کا بدلہ لیا ہے ہارون نے چڑیل جواہرات سے' سعدی بھائی کو پلیز پہلے جیسا بنا دیں۔ زمر کے ساتھ کچھ بھی برا مت کرنا نمرہ۔ سائرہ رضا کا ناول ہو اور وہ چھا نہ جائے۔ یہ ہو سکتا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ سبکتگین نام بہن سے رٹے لگوا کے یاد کرنا پڑا سعدیہ راجپوت کہاں ہیں؟ اور کنیز نبوی کے لیے اب اشتہار گمشدہ دینا پڑے گا۔ ایک گزارش تھی پڑھنے والوں سے ایک کہانی جس میں ہیرو کا نام حسن تھا اس کی کوئی کزن تھی جو اس سے سال دو سال بڑی تھی اسی کے کہنے پر وہ ڈاکٹر بنتا ہے لیکن حسن کا باپ اس کی شادی کہیں اور کروانا

ہے بعد میں طلاق ہو جاتی ہے پھر حسن ہی اس سے شادی کرتا ہے ان کے دو بچے بھی ہوتے ہیں حنان اور منان اگر اس کہانی کا پتا کس کی تھی، کس سال کسی مہینہ میں شائع ہوئی تھی تو بتائیں۔

پیاری ایمان! چڑیل جواہرات کے بارے میں ہارون کے خیالات جان کر ہمیں بھی بہت مزا آیا تھا' اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ جس کہانی کے بارے میں پوچھا ہے' وہ ہمیں یاد نہیں قارئین میں سے شاید کسی کو یاد ہو اگر کسی نے خط لکھا تو ہم شائع کر دیں گے۔

کرن مصطفیٰ' رابعہ مصطفیٰ...... جام پور ضلع راجن پور

کرن کرن روشنی میں ہمارے لیے مکمل رہنمائی ہے۔ ازیکا ڈینیل اور میر محمد علی سے ملاقات بہت پسند آئی اور پلیز ایمن خان اور منال خان کا انٹرویو بھی شامل کریں۔ ہمیشہ کی طرح "نمل" ٹاپ پر رہی واہ نمرہ جی کیا کہنے آپ کے' کہانی بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ آبدار کا دل نہ توڑیں اسے سعدی کی ہیروئین بنا دیں۔ سائرہ رضا کا "پھر بھی دل دھڑکتا ہے" بہت پسند آیا۔ حور عرش اپنے نام کی طرح خوب صورت ہے۔ مہرالنساء اور زیتیا نے بہت برا کیا حور کے ساتھ..... دادا جی تو بیٹی کی وجہ سے مجبور تھے۔ دشت جنوں ابھی پڑھنا شروع نہیں کی جب کہانی ختم ہو جائے گی پھر شروع کریں گے۔

تمام قارئین سے درخواست ہے کہ ہم نے بہت سال پہلے ایک کہانی پڑھی تھی۔ کہانی کا نام "میں محبت اور تم" تھا اور ہیروئن کا نام شاید نائرہ تھا۔ ہیرو کا نام یاد نہیں۔ ہیرو ٹی وی ایکٹر بننا چاہتا تھا اگر کسی کو یاد ہو یہ کہانی کب اور کس سن میں شائع ہوئی تھی تو ضرور بتائیں۔

ج۔ پیاری کرن اور رابعہ! آبدار کا دل تو فارس میں اٹکا ہے پھر کسی اور کی ہیروئین وہ کیسے بن سکتی ہے اور فارس اس کا دل رکھے گا تو بہت سارے دل ٹوٹ جائیں گے۔

دشت جنوں بہت مزے دار کہانی ہے۔ آپ پڑھ کر فٹافٹ اپنی رائے دیں۔ آمنہ اور ہم بھی آپ کی رائے کی شدت سے منتظر ہیں۔ کمال ہے اتنی دلچسپ کہانی کے لیے آپ ختم ہونے کا انتظار کر رہی ہیں۔

کہانی کسی کو یاد ہو تو بتا دیں۔ ہم شائع کر دیں گے۔

ثنا غوری...... چھورا اسٹیشن

خط لکھنے کی وجہ سائرہ رضا جی کا ناول ہے "پھر بھی دل دھڑکتا ہے" جو انہوں نے اسٹارٹ لیا تو مجھے یادوں میں کہاں سے کہاں لے گئیں۔ میرا ننھیال کراچی لیاقت آباد تھا بچپن وہیں گزرا۔ چھٹیوں میں گزرا وقت سائرہ جی نے دوبارہ یاد دلا دیا۔ وہ گلیاں' وہ لالو کھیت کی مارکیٹ وہ چنا چاٹ' دہی بڑے۔ اف کیا کیا یاد آیا نہ پوچھیں ایسے لگ رہا تھا میں بھی وہیں تھی اسی جگہ کا حصہ تھی اب تو یادیں ہی باقی ہیں اس جگہ کی۔

ج۔ پیاری ثناء بے شک بچپن ایسا ہی ہوتا ہے۔ عمر کتنی بیت جائے' زندگی میں کتنی ہی کامیابیاں اور خوشیاں ملیں مگر بچپن' اس کی یادیں ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں۔ وہ گلیاں' وہ کوچے کبھی نہیں بھولتے جہاں بچپن گزرا ہو۔

آپ کا تبصرہ پڑھ کر اچھا لگا لیکن یہ بات اچھی نہیں لگی کہ صرف ایک ناول پر تبصرہ۔

نیلی ظہیر...... کوٹلہ جام بھکر

سب سے پہلے ناول "نمل" نمرہ جی کیا بات ہے۔ میرا فیورٹ ناول جسے میں سانس روک کر پڑھتی ہوں کہ اب کیا ہوا؟ عنیزہ سید اور نمرہ احمد' میری پسندیدہ رائٹرز ہیں۔ خواتین میرا فیورٹ ڈائجسٹ ہے۔ نئی رائٹرز میں "بنت سحر" اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔ اور ہم آپ سے تو بھئی بہت ناراض ہیں۔ دکھ ہوتا ہے نا کہ ویلکم بھی نہیں کرتے۔ خوش قسمت ہیں وہ جن کے خط شائع ہو جاتے ہیں۔ اور بات جہاں "قسمت" اور "انتخاب" کی ہو وہاں "ہم" موجود ہوتے ہوئے بھی ناموجود کے جیسے ہیں۔

ج ڈیئر بلیو فیری! سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کتنی دفعہ اپنی مجبوری بتائیں۔ اب تو آپ لوگوں کو یہ بات ازبر ہو جانی چاہیے۔ پھر بھی ناراض پیاری نیلی! ہم آپ کو خواتین کی محفل میں کھلے دل سے خوش آمدید کہتے ہیں.....

ہم نہ ہوں گے تو بھلا کون منائے گا تمہیں
یہ بری بات ہے ہر بات پہ روٹھا نہ کرو

بہت بری بات ہے اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں میں قسمت کو درمیان میں لانا اور قسمت کو برا کہنا۔

کنیز فاطمہ...... جڑانوالہ

میر محمد علی کی عاجزی بہت پسند آئی۔ ڈرامہ نور جہاں کی نور جہاں سے مل کر بہت اچھا لگا لیکن ان کا نام بہت عجیب سا ہے۔ سائرہ رضا کا ناول "پھر بھی دل دھڑکتا ہے" دیکھ کر بہت خوشی ہوئی سائرہ جی کا تو نام ہی کافی ہے۔ نفسیات میں'

س۔ پھول نگر کا مسئلہ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ بھلا ایک ماں اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہے۔
ج۔ پیاری فاطمہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عظمیٰ شفیق۔۔۔ جڑانوالہ

ہر بار کی طرح دین کی باتیں ایمان تازہ کر دیتی ہیں دشت جنوں آہستہ آہستہ دلچسپی بڑھا رہا ہے سائرہ رضا اس بار بھی بے حد داد کی مستحق ٹھہریں' سائرہ جی اپنے ہر ناول کے ساتھ انصاف کرتی ہیں سائرہ رضا جی خدارا آپ بھی کہیں دوسری رائٹرز کی طرح ٹی وی کو پیاری نہ ہو جانا۔ خوشبو جیسے لوگ افسانہ اچھا تھا۔ انوکھی کہانی سبقت لے گیا۔ کائنات غزل کی تحریر اچھی کاوش تھی۔

ج۔ پیاری عظمیٰ! اللہ کا شکر ادا کریں کہ آپ کے خط کو چنا منا کرتے ہیں۔ گول مول کر کے ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالتے۔

ویسے ہمارا خیال ہے کہ اگر صرف آپ لوگوں کے خطوط شائع کر دیں اور ہم جواب دینا بند کر دیں تو کم از کم اتنی جگہ تو ضرور نکل آئے گی کہ مزید دو بہنوں کے خطوط شائع ہو جائیں۔ کیوں جناب! پھر کیا خیال ہے؟

ثانیہ مشعل اشرف۔۔۔ دیپال پور اوکاڑہ

آمنہ ریاض جی "ستارہ شام" ایک اچھی تحریر تھی مگر پتا نہیں کیوں کچھ تشنگی سی رہ گئی تھی۔ مگر "دشت جنوں" زبردست میں آپ کی ایسی ہی تحریر کی منتظر تھی۔ سائرہ رضا جی! میں بھی یہ ہی کہوں گی کہ "پھر بھی دل دھڑکتا ہے" بہت اچھی تحریر خوش رہیں۔ کائنات غزل جی! کہانی اچھی تھی مگر بس تھوڑی سی اور توجہ سے آپ اسے بہترین بنا سکتی تھیں۔

ایک اور بات کہنی تھی کہ اب "مہندی' چوڑی اور آنچل" جیسی تحاریر کتنی کم ہو گئی ہیں۔ فائزہ افتخار کی چٹکلے چھوڑتی تحاریر۔ جیسیں سسٹرز کی بادل' چاند اور خوشبو والی تحاریر۔ سعدیہ حمید جی کی ہجر کے دکھ میں ڈوبی ہوئی تحاریر۔ زندگی اس قدر تلخ ہے کہ اب سانس لینے کو ایک روزن چاہیے ہوتا ہے۔ مسکرانے کو بہانہ تو ہونا۔ نایاب جیلانی' ایمل رضا اور سحر ساجد کو ہماری یاد دلائیں بھی۔ آسیہ رزاقی کو بھی بلائیں۔ وہ صرف شادی کے احوال ہی نا بتلائیں۔ "خاتون کی ڈائری" سے اقراء صادق نے کالج کی یاد دلا دی۔ میں نے بہت بار یہ غزل اپنی کلاس میں سنائی تھی۔

ج۔ پیاری ثانیہ! مشکل تو یہی ہے کہ ہماری مصنفین کو بھی یہ احساس ہے کہ زندگی بہت تلخ ہے۔ اسی وجہ سے ان کی تحریروں میں زندگی کی تلخی نظر آتی ہے۔ ہم تو ان سے ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ کچھ ہلکی پھلکی مزاحیہ سی تحریر لکھیں اب آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

☆

قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، نا قابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ
37-اردو بازار کراچی

خامشی کو بیاں ملے

ادارہ

ثوبیہ نور۔ بھاول نگر

1۔ تعارف ہمارا، ہوا بہار کی تو ہرگز نہیں مگر "کی جاناں میں کون" کے مصداق تعارف کروانا بھی مشکل ہے۔

میرا نام ثوبیہ ہے اللہ جانے کس نے رکھا۔ بہت تحقیق کی، مگر کوئی بھی یہ الزام اپنے سر لینے کو تیار نہیں۔ چھوٹے سے شہر بھاول نگر کے مزید چھوٹے شہر (گاؤں) کشن گڑھ سے تعلق ہے۔ گریجویشن کے بعد بظاہر تو فارغ ہوں، مگر فرصت ہے کہ ملتی ہی نہیں۔ بی ایڈ کے پیپرز دے چکی ہوں، اب بس رزلٹ کا انتظار ہے۔ ایم اے کی تیاری چل رہی ہے۔ (اس طرح چل رہی ہے کہ کتابیں آئی رکھی ہیں اور کچھ خبر نہیں کہ کون کون سی موجود ہیں اور کون سی چوہے کھا گئے) پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ کر رہی ہوں۔

2۔ خوبیاں تو بے حد و حساب ہیں، مگر کور چشم لوگوں کو نظر ہی نہیں آتیں۔ (اور اب بتاتے وقت تو مجھے خود بھی یاد نہیں آرہیں، تو سمجھ لیں میری یادداشت بھی بہت اچھی ہے)

میری سب سے بڑی خامی میری غیر مستقل مزاجی ہے۔ میرا شمار اچھے خاصے ست الوجود لوگوں میں ہوتا ہے (جن پر لطیفے گھڑے جاتے ہیں) سستی پر لکھے پطرس بخاری اور ابن انشاء کے سارے مضامین اپنی ذات پر فٹ نظر آتے ہیں اپنی اس عادت کو میں بدلنا چاہتی ہوں (حالانکہ بہت "بڑے" لوگوں میں ملتی ہے یہ عادت، وہی "تصور جاناں کیے پڑے رہتے ہیں جو لوگ") اور خوبی یہ کہ تصویر کا مثبت رخ دیکھتی ہوں۔

اگر کسی کی کوئی بات بری لگے تو اپنی سات آٹھ بری عادتیں تو یاد آ ہی جاتی ہیں یعنی "مجھے" بھی تو برداشت کرتے ہیں۔ مجھے بھی "لوگوں" کو برداشت کرنا چاہیے۔

3۔ خواتین ڈائجسٹ سے میرا تعلق "کافی" پرانا ہے، مگر بہت زیادہ پرانا نہیں کیونکہ میں خود بہت زیادہ پرانی نہیں ہوں۔

ایسی بہت سے تحاریر ہیں جو فراموش نہیں کی جاسکتیں، خاص طور پر میں "رقص جنوں" کا ذکر کروں گی، چند سال پہلے کسی اولڈ بک شاپ سے لیے گئے شمارے میں یہ تحریر تھی، کیا خوب لکھا ہے اسے لکھنے والی نے کہ بندہ سانس روک کر پڑھے۔

عنیزہ سید کے تمام ناول ہی ناقابل فراموش ہیں نگہت سیما کے ناول اور پھر فرحت اشتیاق ہیں اگر متنوع کرداروں کی بات کی جائے تو فائزہ افتخار، سائرہ رضا اور تنزیلہ ریاض زندگی کے اتنے رنگ دکھا چکی ہیں کہ ہم نے بھی کرداروں کے ساتھ بہت سے رنگ دیکھ لیے زندگی کے گویا صدیاں جی لیں۔

سمیرا حمید کے افسانوں کی تو بات ہی الگ ہے۔ "دنمل" بھی سالوں یاد رہ جانے والا ناول ہے۔ اور بھی بہت سے ناول ہیں۔ سب کا ذکر کرنا تو ناممکن ہے۔

ایک دفعہ کسی پرانے شمارے سے ایک افسانہ پڑھا تھا "خالی کپ" رائٹر کا نام "کشمالہ اصغر تارڑ" تھا۔ وہ بھی بہت پسند آیا تھا میرا خیال ہے میں اس رائٹر کا ایک ہی افسانہ پڑھ پائی ہوں۔

4۔ مشاغل میں سرفہرست تو مطالعہ ہے۔ بھاول نگر کی اکلوتی لائبریری کی ممبر شپ لی ہوئی ہے اور کتابیں مانگنے میں بھی خاصی ڈھیٹ واقع ہوئی ہوں۔

5۔ سالگرہ باقاعدہ تو نہیں منائی جاتی، بس ارم اور شائستہ گفٹ دے دیتی ہیں اور کبھی کبھار چھاپہ مار کر جیب بھی ہلکی کروا لیتی ہیں۔ پچھلی دفعہ (2015ء میں) ارم نے دو مارچ کو ہی گفٹ بھجوا دیا اور اس کا

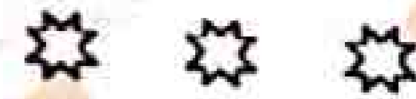
اصرار کہ خبردار، بارہ بجے سے پہلے نہیں کھولنا اور میرے یہ بتانے پر کہ میں تو نو بجے ہی سو جاتی ہوں اُس نے میسج کر کر کے بارہ بجے تک جگائے رکھا۔ (ڈیئر ارم! ان چاکلیٹس کے لیے شکریہ)

6۔ اتنے ڈھیر سارے اشعار میں سے ایک پسندیدہ شعر؟ ہے تو زیادتی مگر... مجھے غزلوں سے زیادہ نظمیں پسند ہیں۔ غزلوں میں سے تو چند ایک منتخب شعر ہی ڈائری کی زینت بنتے ہیں اور نظمیں بے شمار، فیض احمد کی "دل من مسافر من" اور "آئیے ہاتھ اٹھائیں دعا کے لیے" بہت پسند ہیں۔ امجد اسلام امجد کی نظمیں پسند ہیں جیسے ان کی یہ نظم

یہ جو وقت ہے میرے شہر پر
کئی موسموں سے رکا ہوا
اسے اذن دے کہ سفر کرے
اسے حکم دے کہ چل پڑے، میرے آسماں سے دور ہو
کوئی چاند حراکشا کرے، کوئی آفتاب ظہور ہو

ایک اور نظم جو پسند ہے وہ یہ ہے۔

در شاہی سے ٹکرا کر صدائیں لوٹ آئی ہیں
مجھے دربان نے صرف اتنا بتایا ہے
ہمارا بادشاہ بس بولتا ہے
سن نہیں سکتا



سیدہ لوبا سجاد... کہروڑپکا

1۔ تین بہنیں ہیں، سب سے چھوٹی ہوں۔ ایم اے بی ایڈ کیا ہے۔ پرائیویٹ اسکول میں میڈم کے فرائض سرانجام دے رہی ہوں۔ (اہم اہم) کتابیں پڑھنا اور نئی نئی ڈشز ٹرائی کرنا مشغلہ ہے۔

2۔ ہائے یہ بڑا ظالم سوال ہے۔ بقول امی کے ساری برائیاں ہیں۔ خاص طور پر سست ہوں، بہت ریزرو سی رہتی ہوں اور بڈھی روح ہوں (سب جھوٹ ہے) میری فرینڈز میں سے ٹھیک کمنٹ ملتے ہیں۔ بہت مخلص ہوں۔ سب سے اچھی رازدار ہوں، کیئرنگ ہوں اور مجھے خود اپنی خامی یہ لگتی ہے کہ ایک جگہ سے دھوکا کھا کر بھی دوبارہ اعتبار کر لیتی ہوں۔

3۔ خواتین اور شعاع 9th سے پڑھنا شروع کیا اور پہلی کہانی قسط وار ناول تھا "کوئی لمحہ گلاب ہو"۔ ہر اچھا لکھنے والا پسندیدہ رائٹر ہے۔

4۔ گرمیوں کی چلچلاتی دوپہر میں چار جون کو میری آمد ہوئی تھی۔ کیک تو ابھی تک کاٹتی ہوں اور گفٹ بھی ملتے ہیں۔ بہت دھوم دھام سے شوق نہیں ہے مجھے سالگرہ منانے کا کیونکہ موت کی طرف ایک قدم اور بڑھ جاتا ہے، خوشی کی کیا بات ہے۔

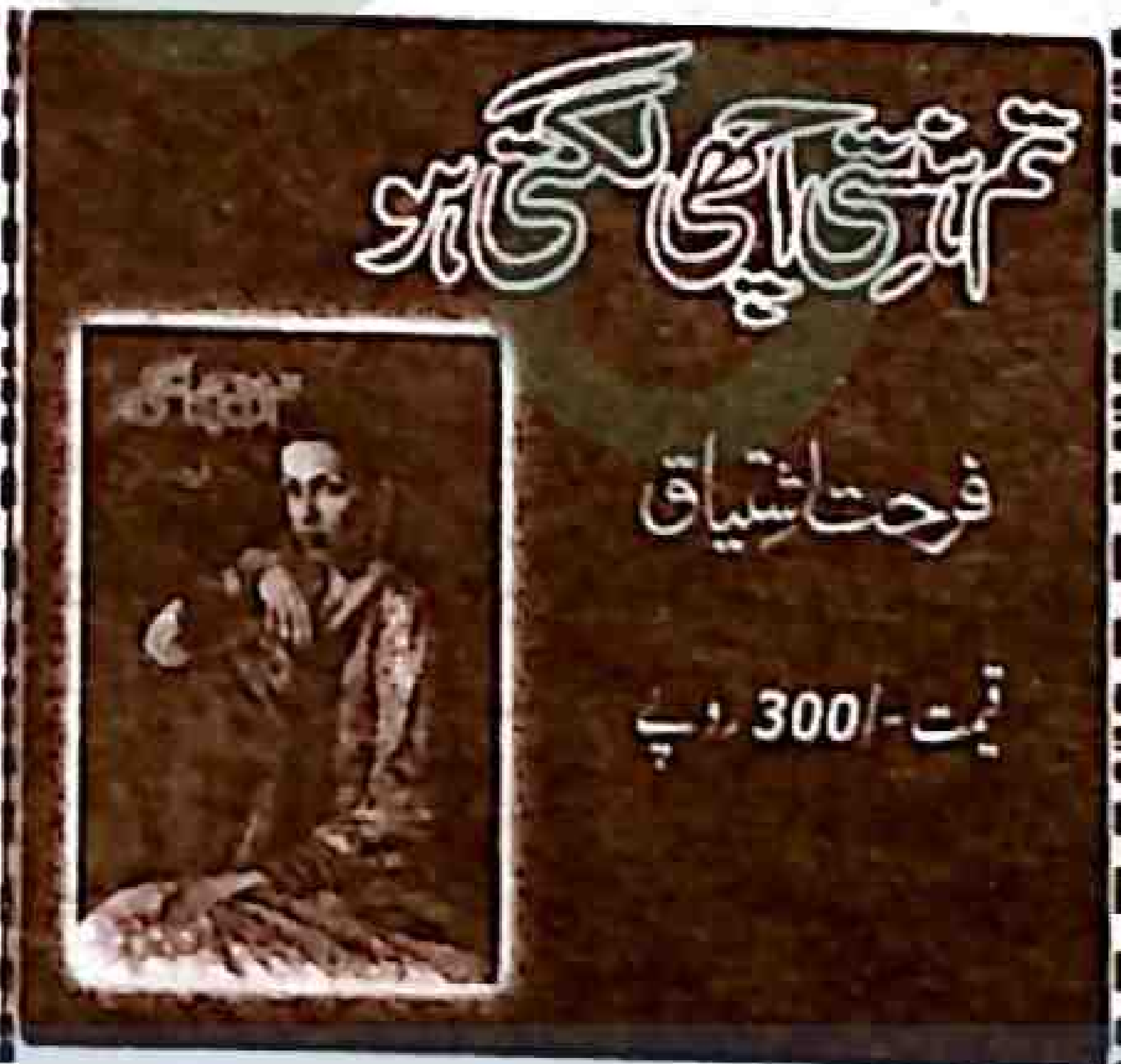
5۔ بے شمار کتابیں پڑھی ہیں پسندیدہ کتاب "رسول نمبر" تھی، ناولز میں بچپن کا دسمبر، پیر کامل، مصحف، حج اکبر اور عشق کا قاف ہیں۔ ہاشم ندیم اور علیم الحق حقی کے ناول ضرور پڑھتی ہوں۔

6۔ ملیں گی ہم کو ہمارے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے

یہ شعر بہت پسند ہے اور ایک شعر پر اختتام کروں گی جو پسندیدہ ہونے کے ساتھ حقیقت پر مبنی ہے۔

انا کا ہوں، نہیں قائل مجھے الفت سب ہی سے ہے
جو دل میں بغض رکھتے ہیں بس ان اپنوں سے ڈرتا ہوں





خبریں گیا وبریں

ڈاکٹر صفیہ سہیل



جذبہ

1965ء کی جنگ کے ہیرو ایم ایم عالم اس وقت اسکواڈرن لیڈر تھے۔ انہوں نے ایک مشن میں بھارتی فضائیہ کے پانچ ہنٹر طیارے ایک منٹ میں تباہ کرکے ایوی ایشن کی ایک نئی تاریخ رقم کی۔ ایم ایم عالم صاحب نے اس جنگ میں بھارت کے نو ہنٹر طیارے تباہ اور دو کو نقصان پہنچایا تھا۔ ایم ایم عالم صاحب کلکتہ میں پیدا ہوئے اور وہاں مسلمانوں کے لیے قائم ایک اردو میڈیم برٹش اسکول میں تعلیم حاصل کی اور 14 اگست 1947ء کو سرحد عبور کرکے مشرقی پاکستان آگئے۔ ایم ایم عالم صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ اس وقت کا ایک واقعہ مجھے آج بھی یاد ہے کہ ہماری ٹرین جہاں بھی رکتی تھی اور لوگ جب یہ دیکھتے تھے کہ میں اردو بولنا جانتا ہوں تو وہ مجھے روک لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ”پاکستان زندہ باد“ کہو۔ اس وقت وہاں اردو کو بہت اہمیت حاصل تھی اور وہاں کے اسکولوں میں اردو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔

خیال

فواد خان کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس لیے ہم کوئی تمہید باندھے بغیر بتاتے ہیں کہ فواد خان اپنی نجی زندگی میں انتہائی سلجھی ہوئی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی پہلی اور آخری محبت ان کی بیگم صدف خان ہیں۔ جن سے انہوں نے گیارہ سال قبل شادی کی تھی، فواد کہتے ہیں کہ ان کی ازدواجی زندگی بہت خوش گوار ہے۔ اس لیے انہیں کسی بھارتی حسینہ سے دل لگانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ انہیں اپنے بیٹے آیان سے بہت محبت ہے اور وہ فارغ وقت میں اپنے بیٹے کے ساتھ اس کے پسندیدہ کھیل کھیلتے ہیں۔ فواد خان سترہ برس کی عمر سے ذیابیطس کے مریض ہیں۔ ایک انٹرویو میں اس بارے میں گفتگو کرتے





ہوئے فواد نے بتایا کہ مجھے ذیابیطس کی ٹائپ ون ہے۔ میں جب اسکول میں تھا تو چھپ کر اسکول کے سوئمنگ پول کے پیچھے ہم دوست سگریٹ پیتے تھے' وہاں کچھ کنکریٹ کے پائپ تھے تو ایک مرتبہ مجھے بہت زیادہ خراشیں آگئیں۔ میں نے اس دوران سوئمنگ بھی کی۔ جس کی وجہ سے مجھے خطرناک انفیکشن ہوگیا۔ اس دوران میرا وزن دس کلو کم ہوا تو پھر پتا چلا کہ مجھے ذیابیطس ہوگئی ہے۔ اس کے بعد سے میں اپنے کھانے پینے میں بہت احتیاط کرتا ہوں۔ (یہ خبر دینے کا مقصد یہ ہے کہ جب فواد خان اس مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود اتنے فٹ ہیں تو ہر شخص تھوڑی احتیاط کے ساتھ اتنا ہی صحت مند رہ سکتا ہے۔)

مشورہ

پاکستان کے نئے چیف سلیکٹر انضمام الحق نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی سب سے پہلے احمد شہزاد اور عمر اکمل کو ڈسپلن کی خلاف ورزی کرنے پر ٹیم میں شامل نہیں کیا اور شاہد آفریدی کو آرام کرنے کو کہا ہے۔ تاکہ نئے کھلاڑیوں کو آزمایا جاسکے۔ شاہد آفریدی کا اس بارے میں کہنا ہے کہ۔۔۔ "پاکستان سپر لیگ" نئے کھلاڑیوں کے لیے ایک اچھا پلیٹ فارم تھا کہ وہ اچھی کارکردگی دکھا کر ٹیم میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ (پر آفریدی! آپ اور آپ جیسے بہت۔۔۔ سارے سینئرز ہی چھائے ہوئے تھے لیگ پر تو۔۔۔ پھر نئے کھلاڑی۔۔۔؟) پی ایس ایل کی وجہ سے جہاں کھلاڑیوں کو مالی فائدہ ہوا۔ (زور کس پہ ہوا مالی فائدہ۔) وہیں انہیں سینئرز کے ساتھ کھیلنے کا موقع بھی ملا۔ (اور سینئرز کو جونیئر کھلاڑیوں سے کیا سیکھنے کو ملا۔۔۔ جذبہ۔۔۔ بھئی جیتنے کا اور کیا؟)

خواہش

برطانوی نژاد پاکستانی 'سبیکا امام اپنے کشمیری حسن کی بدولت بہت جلد سب کی نظروں میں آگئیں۔ لیکن سبیکا کا اس بارے میں کہنا ہے کہ۔۔۔ "وہ ایسے کرداروں کی تلاش میں ہیں' جس میں وہ خوب صورت نہیں' بلکہ بدصورت نظر آئیں' کیونکہ وہ نہیں چاہتیں کہ لوگ ان کی خوب صورتی کو دیکھ کر یہ سمجھیں کہ انہیں صرف اپنی خوب صورتی دکھانے کا شوق ہے' بلکہ سبیکا کی خواہش ہے کہ ان کے اندر کا اداکار کردار میں اتنا ڈوب جائے گا کہ لوگ سبیکا کے بجائے ان کے کردار کو یاد رکھیں۔"

سبیکا نے نفسیات کی ڈگری کے ساتھ ساتھ امریکہ کے ڈراما اسکول سے بھی ڈگری لے رکھی ہے۔ اس بارے میں سبیکا کا کہنا ہے کہ ڈراما اسکول نے انہیں اداکاری کے دوران اپنے دفاع کا بہترین استعمال کرنا سکھایا ہے۔ (اچھا۔۔۔؟) اور نفسیات کی تعلیم انہیں کردار کی روح کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ (پر سبیکا! ہمارے یہاں اداکاری میں بھئی فلم کی۔۔۔ ان دونوں چیزوں کی ضرورت نہیں بلکہ۔۔۔؟)



آپ کا باورچی خانہ

صغریٰ کنول۔ شو اور کوٹ ڈی

1 ۔ کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند، ناپسند، غذائیت، گھر والوں کی صحت؟

پسند ناپسند، غذائیت اور گھر والوں کی صحت، ہر چیز کی اپنی اہمیت ہے اور ہمارے گھر میں ان سب چیزوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔۔۔ جناب ہماری خالہ ان سب چیزوں میں کافی ماہر ہیں۔۔۔ میرے خیال میں یہ وہ چیزیں ہیں جن کو ہر گھر میں ترجیح دی جاتی ہے۔۔۔ ہمارے ہاں ہر طرح کا کھانا چلتا ہے بشرطیکہ پکا گھر میں ہو۔۔۔ جہانگیر گوشت سے زیادہ شوربے کو اہمیت دیتا ہے۔ جی جناب۔۔۔ ان دونوں کے حساب سے کھانا، پسند کے حساب سے اور غذائیت سے بھرپور ہونا ضروری ہے۔۔۔ اور اسی کے حساب سے گھر والوں کی صحت کا خیال نہیں رکھو گے تو ڈاکٹر کا چہرہ دیکھنا پڑے گا۔۔۔ اس لیے سب چیزیں حساب سے ڈالنی ہوتی ہیں۔۔۔ صحت اور غذائیت کے بعد پسند ہم لڑکیوں کی چلتی ہے۔ یہ ہم پر منحصر ہے کہ کیا پکے مگر۔۔۔ پکاؤ تو کچھ ایسا سب کھائیں اور کیڑے نہیں نکالیں ہم بھی کچھ ایسا پکاتے ہیں جو سب پیٹ بھر کر کھالیں۔۔۔

2 ۔ گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں، کھانے کا وقت ہے۔ کسی ایسی ڈش کا نام بتائیں جو فوری تیار کر کے تواضع کر سکیں۔

اس حساب سے ہم کافی سگھڑ ہیں۔۔۔ گھر میں ہم لڑکیاں زیادہ ہیں، اس لیے فارغ اوقات میں مہمانوں کے لیے بندوبست کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔ کباب، سموسوں کا مسالا۔۔۔ ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ آج تک مہمانوں کی اچانک آمد سے ہم نہیں گھبرائے۔۔۔ ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔۔۔ اس لیے ہمارے گھر سے مہمان ہمیشہ خوش ہو کر نکلتے ہیں۔ چاہے کسی بھی وقت آئیں۔

3 ۔ کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

عورت کی سلیقہ مندی کا پتا اس کے کچن اور باتھ روم سے چلتا ہے اور گھریلو خاتون ان چیزوں کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ ہم بھی رکھتے ہیں۔ ہم ہمیشہ کچن میں سر ڈھانپ کر جاتے ہیں اور ننگے پاؤں جاتے ہیں۔ کیونکہ بقول خالا امی کے چپل میں کافی جراثیم ہوتے ہیں۔ ہم کچن میں آتے جاتے ہیں اس لیے اگر ہم چپل سمیت گزر گئے تو جراثیم اندر آجائیں گے اور بیماریاں پیدا ہو جائیں گی۔۔۔ اس لیے جناب ہماری شامت نہ آئے۔۔۔ ہم ایسی گستاخی نہیں کرتے۔۔۔ برتن وغیرہ کھانا کھا کر دھو لیتے ہیں۔ ورنہ محترمائیں میرا مطلب مکھیاں آجائیں گی۔۔۔ اور پھر بیماریاں۔۔۔ پھر کمبخت ڈاکٹر کا منہ کون دیکھے گا۔۔۔

4 ۔ صبح کا ناشتا ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں، ایسی خصوصی ڈش کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہوں۔

ہمارے گھر میں مرد حضرات نہیں ہیں۔۔۔ جن کے لیے ہم اب خصوصی اہتمام کریں۔۔۔ مگر جب ابو تھے تو ہر روز بقر عید، مطلب کے ابو کھانے کے شوقین تھے۔۔۔ اور بے حد صفائی پسند۔۔۔ اس لیے ان کے لیے کافی اہتمام ہوتا۔۔۔ یہاں بھی نام ابو کا اور صفایا زیادہ ہم کرتے۔۔۔ خالا خاصا اہتمام کر کے۔۔۔ دال پکوان۔۔۔ حلوہ پوری۔۔۔ مکھن لگی روٹی۔۔۔ آلو کے پراٹھے۔۔۔ گوبھی کے پراٹھے۔۔۔ کشمیری چائے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ میں آلو کے پراٹھوں کو زیادہ اہمیت دیتی ہوں۔۔۔ مگر جیسا کہ میں نے بقر عید کہا تو ہمارے گھر میں ابو کے دور میں ہر

روز قیمے بھرے پراٹھے شوق سے کھاتی تھی اس لیے یہ لیں ترکیب۔

ضروری اجزا :

قیمہ	آدھا کلو
میدہ	آدھا کلو
گھی	تلنے کے لیے
پیاز ایک گٹھی	چوپ کرلیں
کٹی ہوئی لال مرچ	ایک چمچہ
نمک، ہری مرچ، ہرا دھنیا، انار دانہ	حسب ضرورت

ترکیب :

سب مسالے ڈال کر قیمہ بھون لیں۔۔۔ میدہ پانی ڈال کر گوندھ لیں۔ پھر روٹی بنا کر قیمہ پھیلائیں اوپر دوسری روٹی پھیلا دیں۔ کنارے اچھی طرح دبا دیں گھی میں تل لیں۔۔۔ دہی کے سنگ مزے لے لے کر کھائیں۔

5 ۔ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں۔

ہم اکثر باہر کا کھانا گھر بیٹھے کھاتے ہیں۔۔۔ امی اور خالا منع کرتی ہیں مگر ہم نہیں مانتے ان لوگوں کے لیے گھر کا کھانا بناتے ہیں۔۔۔ مطلب کہ ہم لڑکیاں مہینے میں دو تین دفعہ چھوٹی سی پارٹی مناتے ہیں اور اگر سالگرہ وغیرہ ہے تو خوب مزا کرتے ہیں مگر باہر نہیں جاتے ہاں باہر کی ہر چیز گھر بیٹھے کھاتے ضرور ہیں۔اس کے علاوہ دو مرتبہ المنظر جام شورو گئے تھے۔ جہاں پر ڈنر کیا تھا۔ بالا گئے تھے مگر کھانا نہیں کھایا تھا۔۔۔ ہم اکثر اوقات آئس کریم کھانے باہر جاتے ہیں۔۔۔

6 ۔ کھانا کھانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مد نظر رکھتی ہیں۔

جی جناب موسم کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ہم لوگ بارش کے موسم کو خاصا انجوائے کرتے ہیں۔۔۔ جیسا کہ گرمیوں میں ہم زیادہ تر چاول بناتے ہیں کیونکہ گرمی میں روٹیاں ڈالنا میرے بس سے باہر ہے۔۔۔ سردی میں روٹیاں بناتی ہوں تاکہ آگ کے قریب رہ سکوں۔۔۔ بارش تو بن بلائے آجاتی ہے تو اس محترمہ کے لیے ہم پکوڑے۔۔۔ گڑ والے چاول۔ اس وقت بناتے ہیں موسم تو بہانہ ہے بات صرف اپنی سہولت کی ہے۔

7 ۔ اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں۔

ہمارے گھر میں عام دنوں میں کھانا بہت اہتمام سے تیار کیا جاتا ہے۔۔۔ اس لیے ہمارے گھر میں کھانا بنانے میں حد سے زیادہ محنت لگتی ہے۔۔۔ ہم بازاری مسالوں پر انحصار نہیں کرتے۔۔۔ اگر کچھ کم یا زیادہ ہوگیا تو ہم لوگ مینیج کرلیتے ہیں۔۔۔ ہم تو حد سے زیادہ محنت کے قائل ہیں۔۔۔ چوبیس گھنٹے ہمارا کچن بھرا رہتا ہے۔ رات کا کوئی بھی پہر ہو۔ اگر کھانا بنے گا تو بے حد اہتمام سے اور محنت سے۔۔۔

کچن کی کوئی ٹپ جو دینا چاہیں۔

ہری مرچوں کو اگر تیل لگا کر فرج میں رکھ دیں تو وہ زیادہ وقت تک چلیں گی۔۔۔



افطار و سحر کے پکوان

خالدہ جیلانی

پکوان اور سحر و افطار

رمضان میں اکثر گھروں میں سحر و افطار میں مخصوص پکوان بنتے ہیں۔ ایسے میں پورا مہینہ ایک ہی جیسی چیزیں کھا کھا کر جی بھر جاتا ہے۔ اس لیے آج ہم نے آپ کے دستر خوان کی رونق بڑھانے کے لیے چند نئی ڈشز کا انتخاب کیا ہے۔ امید ہے ان کو آزما کے لطف بھی اٹھائیں گی اور داد بھی پائیں گی۔

آملیٹ پراٹھا

ضروری اجزا :

پیاز	ایک عدد
ہری مرچیں	دو سے تین
لال کٹی مرچ	آدھا چمچہ
انڈا	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

انڈے میں پیاز، ہری مرچیں، کٹی مرچ، نمک ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ پراٹھا بیل کر توے پر ڈالیں اور جب ایک جانب سے تھوڑا سا سک جائے تو اسے پلٹ دیں اب سکی ہوئی سائڈ پر انڈا ڈال دیں اور تیل کو پراٹھے کی چاروں جانب ڈال دیں پھر پراٹھا پلٹ دیں۔ چولہا ہلکی آنچ پر رکھیں۔ پراٹھا سنہرا ہونے پر اتار لیں۔ اگر چاہیں تو مرغی کی بچی ہوئی بوٹی ریشے کر کے اس میں ملا لیں مزا دوبالا ہو جائے گا۔

آلو، ہری مرچ کے پکوڑے

ضروری اجزا :

آلو	دو عدد
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
ہری مرچیں	دو سے تین عدد
لال کٹی مرچیں	آدھا چائے کا چمچہ
بڑی ہری مرچ	چار سے پانچ عدد
املی	حسب پسند
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
بیسن	حسب ضرورت
نمک	حسب پسند
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

بیسن میں نمک، کٹی لال مرچ، زیرہ ڈال کر اور پانی ڈال کر پکوڑوں کا آمیزہ بنالیں۔ آلوؤں کو ابال کر چھیل لیں اور انہیں مسل کر اس میں نمک، لال کٹی مرچ، ہری مرچیں، ہرا دھنیا باریک کاٹ کر اور املی ملا دیں اچھی طرح۔ اب پکوڑوں کی ہری مرچوں کو بیچ سے چاک کر کے اس میں آلوؤں کا مسالا بھر دیں اور بیسن میں ڈبو کر اسے گرم گرم تیل میں تل لیں۔

مرغ کبابی

اجزا :

چکن	ایک کلو
پیاز	تین عدد
لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
دہی	ڈیڑھ پیالی
سرخ پسی مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
زردے کا رنگ	ایک چٹکی

نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	حسبِ ضرورت

ترکیب:

چکن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کریں اور دھو کر خشک کرلیں۔ پیاز کو باریک پیس کر ایک پیالی دہی میں ملائیں اور دیگر تمام مسالے بھی شامل کردیں۔ اس آمیزے میں چکن کو ڈبو کر تین گھنٹوں کے لیے رکھ دیں۔ پتیلی میں تیل گرم کرکے یہ آمیزہ ڈال کر درمیانی آنچ پر اتنا پکائیں کہ دہی کا پانی خشک ہوجائے۔ اس دوران چکن بھی گل جائے گا۔ بقیہ آدھی پیالی دہی پھینٹ کر چکن پر ڈالیں اور ایک دہکتا ہوا کوئلہ اوپر رکھ دیں۔ دہکتے ہوئے کوئلے پر دو چمچے تیل ڈال کر ڈھکن بند کردیں۔ دس منٹ بعد کوئلہ نکال لیں مگر چکن کو مزید پانچ منٹ کے لیے دم پر رہنے دیں۔ مزے دار مرغ کبابی تیار ہیں۔ چٹنی کے ساتھ مزے سے کھائیں۔

مینگو قلفی

ضروری اجزا:

آم کا گودا	دو کپ
دودھ	ایک کلو
کنڈینسڈ ملک	آدھا ٹن
کھویا	آدھا کپ

ترکیب:

دودھ کو پکا کر تین پاؤ کرلیں۔ بلینڈر میں دودھ، آم کا گودا، کھویا اور کنڈینسڈ ملک ڈال کر اچھی طرح بلینڈ کرلیں اور قلفی کے سانچوں میں ڈال کر جمانے رکھ دیں۔ فالودے کے ساتھ سرو کریں۔

میٹھے پکوڑے

انڈا	ایک عدد
میدہ	پانچ کھانے کے چمچے
سوجی	پانچ کھانے کے چمچے
دودھ	پانچ کھانے کے چمچے
کھانے کا سوڈا	ایک چٹکی
چینی	پانچ کھانے کے چمچے
گھی	تین کھانے کے چمچے
گھی	تلنے کے لیے

ترکیب

تمام اشیاء کو اچھی طرح مکس کریں۔ اور اتنا پھینٹیں کہ چینی گھل جائے اور آمیزہ پکوڑوں کے جیسا ہوجائے۔ گھی گرم کریں اور اس میں ان پکوڑوں کو تل لیں۔

انجیر کی چٹنی

اجزا:

انجیر	پندرہ عدد
املی پیسٹ	آدھا کپ
دار چینی پاؤڈر	دو چٹکی
سونٹھ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
چینی	ایک چوتھائی کپ

کھجور شیک

اجزا:

کھجور	آدھا پاؤ
دودھ	دو کپ
بالائی	چار کھانے کے چمچے

ترکیب:

کھجور کی گٹھلیاں نکال کر اسے اچھی طرح دھولیں۔ بلینڈر میں تمام اجزا ڈال کر دوبارہ بلینڈ کریں۔ گلاسوں میں نکال کر کٹی ہوئی برف ڈال کر پیش کریں۔ (گاڑھا لگے تو آدھا گلاس پانی بھی شامل کرسکتی ہیں)



عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

رومیصا ۔۔۔ کراچی

ایک شادی کی تقریب میں ایک دور کے رشتے دار لڑکے سے ملاقات ہوئی اس نے مجھ سے بات کی اور میرا فون نمبر مانگا' میں نے نمبر دے دیا۔ دوسرے دن ہی اس کا فون آگیا۔۔۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے بہت پسند کرتا ہے اور اپنے گھر والوں کو بھیجنا چاہتا ہے۔ میں کیا کہتی۔ فیصلہ تو گھر والوں کو کرنا تھا۔ میں نے اس سے یہی کہہ دیا۔ اس نے کہا کہ میں اپنے گھر والوں سے اس کے بارے میں عندیہ لوں' اگر وہ راضی ہیں تو وہ اپنے گھر والوں کو بھیجے گا۔ یہ بہت عجیب بات تھی۔ میں سن کر ہکا بکا رہ گئی۔ میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی گھر والوں سے کیا کہتی ۔ میرے صاف انکار کرنے پر اس نے غصے سے فون بند کر دیا۔ رات کو پھر اس کا فون آگیا۔ بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ یہ سلسلہ کافی دن چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ میرے دل میں بھی اس کی جگہ بن گئی۔ ایک دن اس نے پھر اپنی بات دہرائی تو اس بار میں نے انکار نہیں کیا۔ امی سے بات کی' پہلے تو وہ اس بات پر ناراض ہوئیں کہ میں نے فون پر اس سے بات کیوں کی۔ پھر کچھ نرم پڑیں اور کہا کہ میں تمہارے ابو سے بات کروں گی۔ امی نے جب ابو اور بھائیوں سے بات کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا' ان کا کہنا تھا کہ لڑکے کی نہ تو کوئی تعلیم ہے نہ ڈھنگ کی جاب ہے' اس صورت میں رشتہ مشکل ہے۔ امی سے انکار سن کر میری حالت خراب ہو گئی۔ خیر میرے رونے دھونے پر امی نے ابو اور بھائیوں کو بمشکل رضا مند کیا۔ وہ لوگ رشتہ لے کر آئے۔ رسمی سی بات چیت کے بعد میرے گھر والوں نے ہاں کر دی۔ گھر والوں کے ہاں کرنے کے بعد اس کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے۔ روزانہ شام کو آجاتا۔ امی نے مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ میں سامنے نہیں آؤں گی۔ (ہمارے ہاں رشتہ طے ہونے کے بعد لڑکے سے پردہ ہوتا ہے) بھائی اسے اٹینڈ کرتا لیکن کہاں تک' اس کی اپنی مصروفیات تھیں۔ ایک دن وہ آیا تو بھائی اٹھ کر چلا گیا۔ امی نماز پڑھنے اٹھ گئیں۔ وہ کافی دیر اکیلا بیٹھا رہا۔ اس بات پر وہ ناراض ہے۔ کہتا ہے تمہارے گھر والوں نے میری توہین کی تمہارا بھائی مجھ سے معافی مانگے۔ بھائی تک یہ بات پہنچی تو وہ بھڑک اٹھا۔۔۔ پھر میری خاطر' امی کے سمجھانے پر بھائی نے معذرت کر لی۔۔۔ اب وہ چاہتا ہے کہ میں اس سے کہیں باہر ملوں۔۔۔ میرے منع کرنے پر منگنی ختم کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔

ج۔ پیاری بہن! آپ کس دنیا میں رہتی ہیں' ہوش کے ناخن لیں۔ ایسے لڑکے سے رشتہ ختم ہو جانا ہی بہتر ہے' بہت اچھی بات ہے کہ وہ رشتہ ختم کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ آپ اس سے کہیں کہ ختم کر دے (لکھ کر رکھ لیں کہ وہ کبھی ختم نہیں کرے گا) آپ کے حق میں یہی بہتر ہے۔ اس سے شادی ہونے کے بعد آپ بہت پچھتائیں گی۔

آپ جائزہ لیں' شروع سے ہی اس کا رویہ غلط رہا ہے پہلے۔ اس نے آپ کو بے وقوف بنا کر اپنا رشتہ منظور کرایا کیونکہ اسے پتا تھا کہ آپ کے گھر والے کبھی نہیں مانیں گے۔ آپ کے گھر والوں نے آپ کی خاطر اس کا رشتہ قبول کر لیا۔ اس کے بعد اس کا روزانہ آپ کے ہاں آنا۔۔۔ کوئی بھی غیرت مند شخص اس طرح بن بلائے روزانہ نہیں آتا۔ بھائی اٹھ کر چلا گیا تو معافی منگوائی۔۔۔ اس کے پاس نہ تعلیم ہے نہ ڈھنگ کی جاب پھر بھی تکبر کا یہ عالم ہے۔ آپ سے شادی کے بعد وہ آپ کے گھر والوں کو کس طرح بلیک میل کرے گا۔ یہ ابھی سے نظر آرہا ہے۔

عافیت اسی میں ہے کہ آپ اس سے تعلق منقطع کر لیں اور اس سے صاف صاف کہہ دیں کہ وہ جو چاہے کرے' آپ اس کے لیے کچھ نہیں کریں گی۔

اپنے گھر والوں کی قدر کریں' وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہیں مزید آزمائش میں نہ ڈالیں۔ اس رشتہ کا ختم ہو جانا ہی آپ کے حق میں بہتر ہے۔

م-ع- کراچی

بیٹا سال کا تھا تو نا گزیر وجوہات کی بنا پر میں اپنے سسرال والوں سے الگ ہو گئی۔ میرے بیٹے نے گھر میں، ہم دونوں پاپا، مما کے علاوہ گھر میں کسی کو نہیں دیکھا۔ اکیلا رہا اور کوئی بہن بھائی بھی اللہ نے! اتنے عرصے میں نہیں دیا۔ سات سال کا ہونے والا ہے۔ میں نے کبھی گھر سے باہر کھیلنے کودنے نہیں دیا۔ نہ گھر میں کبھی کوئی بچہ کھیلنے آیا۔ ہر سہولت ہم نے دی وہ کارٹون شوق سے دیکھتا ہے۔ اسکول و مدرسہ ٹیوشن پڑھائی میں بھی اچھا ہے لیکن شخصیت دب گئی ہے۔ مجھے شدید احساس جرم ہوتا ہے میں نے اپنے بیٹے کا بچپن تباہ کر دیا ہے۔ گھر میں محدود رکھ کر۔ بہت روتا ہے مما میرا کوئی دوست نہیں بنتا مجھے لگتا ہے میں ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہوں۔ اور اس سال مزاج میں ضد، ہٹ دھرمی، چڑچڑا پن بہت آگیا ہے بلکہ ایک جنون آتا ہے، وہ چہرہ لال کر لیتا ہے۔ دانت بھینچ لیتا ہے اور میرے بال نوچتا ہے، مارتا ہے ٹانگوں ہاتھوں سے جو چیز سامنے آجائے اٹھا کر مارتا ہے، بھوک، پیاس بھی ختم ہے۔ سیرپ بھی بہت پلائے علاج بھی کروایا۔ اور ڈرتا بہت ہے، دن میں بھی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں نہیں جا سکتا اور اب اکثر میں نے دیکھا ہے، خود سے باتیں کرتا ہے۔ فرضی ناموں کے فرضی دوست بنائے ہوئے ہیں، جو دکھائی نہیں دیتے۔ ایکٹو نہیں ہے۔ اور ہاں کہیں بھی چلا جائے گھر واپس نہیں آتا، نہیں میں گھر نہیں جا رہا۔ "بہت مشکل سے آتا ہے۔

ج۔ اچھی بہن! سب سے پہلے تو آپ اپنے دل سے اس احساس جرم کو نکال دیں کہ آپ نے اپنے بچے کو باہر کھیلنے نہیں دیا۔ اس وجہ سے ایسا ہوا۔ آج کل ایسا ماحول نہیں ہے کہ بچے کو باہر کھیلنے بھیج دیا جائے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آپ بچے کو اپنے ساتھ لے کر جائیں، سات سال کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے۔ وقت ابھی آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ اپنے بچے کو اپنے ساتھ مختلف تفریحی مقامات پر لے کر جائیں۔ اگر پڑوس میں اس کے ہم عمر بچے ہیں تو انہیں گھر پر مدعو کریں۔ کبھی کیک، کبھی آئس کریم وغیرہ بنا کر اپنے بچے کو دیں کہ وہ ان کی تواضع کرے۔ ان بچوں کو کوئی گیم بھی کھلا سکتی ہیں۔ آپ کا بچہ ان کھیلوں میں حصہ لے گا تو اس کی جھجک دور ہو گی۔

لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے بچے کی جو کیفیات لکھی ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کو اسے دکھائیں.... اسے باقاعدہ علاج کی ضرورت ہے۔

اکثر والدین اپنے بچے کو گھر سے نکلنے نہیں دیتے لیکن کسی کی بھی وہ کیفیت نہیں ہوتی جو آپ نے لکھی ہے۔

م۔ علاقہ جرائے پٹھان خٹک

میں پانچ سال سے ڈپریشن کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ جس کا میں علاج کروا رہی ہوں، باقاعدگی سے ٹیبلٹ لیتی ہوں مگر میرے دو عجیب مسئلے ہیں۔ ایک یہ کہ میں مردوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی جو میرے محرم ہیں۔ غیر محرم سے تو میں پردہ کرتی ہوں اس کا تو کوئی مسئلہ نہیں، محرم میں بابا ہوں یا بھائی، ہوں بالکل نہیں بیٹھ سکتی، میرا دل تنگ ہوتا ہے۔ دل پر بوجھ ہوتا ہے ایسا نہیں کہ بابا، بھائی سخت ہیں وہ عام پٹھانوں کی طرح نہیں ہیں۔ ہم پر کوئی روک ٹوک نہیں کرتے ہم پر بہت اعتماد ہے اگر ہم دنیا میں کہیں بھی جائیں کچھ نہیں کہتے ہم سب بہنوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ میں کسی کے ساتھ بھی موبائل پر بات نہیں کر سکتی چاہے وہ میری بہن یا بھائی یا خالہ ہو یا کوئی اور رشتہ دار۔

ج اچھی بہن! یہ کوئی بیماری نہیں ہے۔ بعض بچے بہت حساس ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ بچپن میں کوئی واقعہ پیش آجائے تو ہمیشہ کے لیے ان کے دل میں ڈر اور خوف بیٹھ جاتا ہے۔ ممکن ہے بچپن میں آپ کے ساتھ بھی ایسا کچھ ہوا ہو، کسی رشتہ دار مرد کو غصہ کرتے یا مار پیٹ کرتے دیکھا ہو اور آپ کے دل میں خوف بیٹھ گیا ہو۔

آپ ڈاکٹر سے بھی مشورہ کر چکی ہیں۔ یہ بیماری نہیں ہے صرف خوف ہے۔ اس کے لیے آپ کو اپنی قوت ارادی سے کام لینا ہو گا۔ خوف کو صرف ایک چیز شکست دے سکتی ہے اور وہ ہے محبت۔ آپ خود کو بار بار یقین دلائیں کہ آپ کو اپنے والد اور بھائیوں سے بہت محبت ہے اور وہ بھی آپ سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے قریب جانے کی کوشش کریں خواہ کتنا ہی خوف آئے۔

موبائل کا مسئلہ بھی صرف خوف ہے، جو مختلف شکلیں بن کر آپ کے سامنے آتا ہے۔

آپ تین ماہ تک روزانہ ایک چمچہ شہد کھائیں، پھر خط لکھ کر بتائیں۔ ان شاء اللہ خوف میں کمی واقع ہو گی۔

امت الصبور

بیوٹی بکس

سمیرا شفاقت۔۔۔ شینکہ حضرو

س 1 ۔ گرمی کے موسم میں میری جلد بہت خراب ہوجاتی ہے۔ پورے چہرے کی جلد اور خاص طور پر ہونٹوں اور آنکھوں کے گرد کی جلد خشک ہو کر کھنچ جاتی ہے اور پھر اوپر سے اسکن اترنے لگتی ہے۔ گرمیوں میں۔۔۔ میں اپنی جلد کا خیال کیسے رکھوں۔

س 2 ۔ میرا پیٹ اور کمر وغیرہ ایک پری میچور ڈلیوری کے بعد بہت بڑھ گئے ہیں۔ چہرہ' بازو اور ٹانگیں بالکل پتلی ہیں۔ سارا موٹاپا جیسے اوپر والے دھڑ پر چڑھا ہوا ہے۔ پلیز۔ یہ کم کرنے کے لیے کوئی ورزش بتایئے۔

ج ۔ سمیرا' جلد کے مسئلہ کے لیے آپ کو اسکن اسپیشلسٹ سے رجوع کرنا پڑے گا۔ جلد کا اس طرح اترنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

پیٹ کم کرنے کے لیے درج ذیل ورزش کریں۔

سیدھی کھڑی ہو کر دونوں پاؤں کے پنجوں کو آپس میں ملالیں۔ پھر دونوں ہاتھوں کو بالکل سیدھا رکھتے ہوئے نیچے کی طرف جھکاتے ہوئے پاؤں کے پنجوں کو چھونے کی کوشش کریں۔ اس مشق کو کرتے وقت دونوں ٹانگوں کے گھٹنے بالکل سیدھے رہنے چاہئیں۔ اس مشق کو بارہ سے پندرہ بار تک دہرائیں۔ یہ کمر کو خوب صورت بنادے گی۔

ثانیہ کھوڑو۔ سکھر

س۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بال بہت کمزور ہیں اور گھنے نہیں ہیں۔ کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ گھنے ہوجائیں۔ میری خوراک بھی ٹھیک ہے۔ آپی کسی نے کہا ایلوویرا جیل لگانے سے بال گھنے ہوتے ہیں' مگر مجھے ایلوویرا جیل لگانے کا صحیح طریقہ نہیں معلوم اور چہرے کے لیے ابٹن گھر کی چیزوں سے بنانے کا طریقہ بھی بتائیں۔ پلیز۔۔۔۔

ج: بال کمزور ہونے کی کئی وجوہات ہیں۔ جن میں غیر متوازن غذا اور شیمپو کا غلط طریقے سے استعمال سرفہرست ہیں۔ آپ کی غذا ٹھیک ہے تو ممکن ہے' کسی وجہ سے آئرن یا وٹامن اے کی کمی کا شکار ہوں۔ آپ باقاعدگی سے گاجر اور سیب کھائیں' شیمپو ہفتہ میں صرف دو بار کریں۔ شیمپو کا زیادہ استعمال بھی بالوں کو کمزور کردیتا ہے۔ شیمپو کرنے کے بعد بال صاف میٹھے پانی سے اچھی طرح دھوئیں۔ شیمپو

کرنے سے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے تیل سے پندرہ منٹ بالوں کی مالش کریں۔ تاکہ تیل اچھی طرح جذب ہوجائے۔ پھر گرم پانی میں تولیہ بھگو کر نچوڑلیں اور اس تولیہ کو سر پر لپیٹ لیں۔ دس منٹ بعد شیمپو کرلیں۔ ایلوویرا لگانے کا طریقہ یہ ہے۔ ایلوویرا کا گودا لے کر پیسٹ بنالیں۔ پھر اسے بالوں میں لگائیں۔ پندرہ منٹ تک لگا رہنے دیں۔ پھر بالوں کو دھولیں۔

یمنیٰ ناصر۔۔۔ کراچی

س ۔ میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں جن کی وجہ سے میں بیمار نظر آتی ہوں حالانکہ قد کے لحاظ سے میرا وزن بالکل مناسب ہے۔ میں کسی قسم کی کمزوری بھی محسوس نہیں کرتی۔ لیکن چہرے پر شگفتگی نہیں ہے۔ اس لیے سب کہتے ہیں اپنی صحت پر توجہ دو' ڈاکٹر کو دکھاؤ۔

ج ۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہونے کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں جن میں ایک وجہ بہت زیادہ پڑھنا اور نیند کی کمی بھی ہے۔ لیکن چونکہ آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے چہرے پر بھی رونق نہیں ہے تو آپ کو اپنی خوراک پر توجہ دینا ہوگی۔

آج کل آڑو' خربوزہ' آم اور تربوز کا موسم ہے۔ آپ یہ پھل زیادہ استعمال کریں۔ روزانہ دوپہر کے کھانے میں کھیرا ضرور شامل کریں۔ آڑو جلد کے لیے انتہائی مفید ہے۔ شفاف چمک دار جلد کے لیے آڑو کھانا تو فائدہ مند ہے ہی' لیکن اس کا گودا بھی جلد کے لیے کسی ٹانک سے کم نہیں۔ ایک نرم آڑو لے کر اس کا اچھی طرح پیسٹ بنالیں اور اچھی طرح چہرے پر لگائیں۔ پندرہ منٹ بعد جب پیسٹ خشک ہوجائے تو چہرہ دھولیں' اگر آڑو نہ ہو تو آپ کیلے کو کچل کر اس کا پیسٹ بھی چہرے پر لگا سکتی ہیں۔ آپ دیکھیں گی کہ آپ کے چہرے پر حیران کن چمک آجائے گی۔

آنکھوں کے حلقوں کے لیے بادام کو دودھ میں بھگو دیں پھر دودھ میں پیس کر پیسٹ بنالیں اور آنکھوں کے حلقوں پر لگائیں۔

ایک گھنٹے بعد چہرہ پانی سے دھولیں دن میں ایک بار یہ عمل کرنے سے دو ہفتوں میں حلقے ختم ہوجائیں گے۔

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

